مکتبۂ جدید

میری لائبریری

ابوبکر رضؓ

— صدیقِ اکبر —

صاحبِ رسولؐ، ثانی اثنین، خلیفۂ اوّل
حضرت ابوبکرؓ کا پہلا شایانِ شان تذکرہ

محمد حسین ہیکل
مصنف : عمرؓ، فاروق اعظم

ساڑھے چار روپے
پہلی قیمت : دس روپے

ابوبکرؓ صدیق اکبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہِ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالکِ یوم الدین۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم ۵ غیر المغضوب علیھم۔ ولا الضآلین۔

ابوبکرؓ صدیق اکبر

تصنیف
محمد حسین ہیکل
سابق وزیر معارف حکومت مصر

ترجمہ
شیخ محمد احمد پانی پتی

مکتبۂ جدید لاہور

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ : ۱۹۶۱ء

طابع :۔۔۔۔۔ نقوش پریس، لاہور

ناشر :۔۔۔۔۔ رشید احمد چودھری

مکتبہ جدید۔ لاہور۔ ۷

ترتیب

انکارِ بیعت کی مشہور ترین روایت۔ انتخاب متفقہ کے متعلق روایات۔ بیعتِ علیؓ کے متعلق درمیانی رائے۔ بنو امیہ کی فتنہ کوشی۔ میراث کا مطالبہ۔ ابو بکرؓ کی پُر امن خلافت۔ مسلمانوں کا تصورِ خلافت۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔

(۳) عرب، رسول اللہ کی وفات کے وقت ۱۰۰

اہلِ مکہ ارتداد کے دروازے پر۔ فتنۂ ارتداد اور قبیلۂ ثقیف۔ دیگر قبائلِ عرب کا طرزِ عمل۔ بغاوت اور ارتداد کے عوامل جغرافیائی عوامل۔ اجنبی عوامل۔ منکرینِ زکوٰۃ کی منطق۔ مدعیانِ نبوت کا خروج۔ اسود عنسی کا فتنہ۔ یمن، فتنۂ اسود۔ اسود عنسی کے فتنے کا آغاز۔ فتنۂ عنسی کے عوامل۔ فتنے کا مقابلہ۔ اسود عنسی کے عہدیدار۔ اسود عنسی کے خلاف بغاوت۔ اسود کا قتل۔ جنوبی عرب میں بغاوت۔ مسیلمہ کا دعوائے نبوت۔ رسول اللہ کی حکمتِ عملی۔ عرب اور فتنۂ مدعیانِ نبوت۔ مدعیان کی عارضی کامیابی۔ فتنۂ ارتداد اور مستشرقین۔ ارتداد میں اجنبی ہاتھ۔

(۴) اسامہ کی روانگی ۱۲۳

خلیفہ اوّل کا پہلا حکم۔ رسول اللہ کی ہدایات۔ اسامہ سے رسول اللہ کی محبت۔ اسامہ کی امارت پر اعتراض۔ ابو بکرؓ کی ناراضی۔ لشکر کو روانگی کا حکم۔ روانگیٔ لشکر کی تیاریاں۔ لشکر کو نصیحتیں۔ لشکر کا بلقا کی جانب کوچ۔ اسامہ کی کامیاب واپسی۔ لشکر کا استقبال۔

(۵) منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ ۱۳۴

مدینہ میں بغاوتوں کی خبر۔ صحابہ سے مشورہ۔ دشمن قبائل کے وفود۔ وفود کی ناکام واپسی۔ ابو بکرؓ کی ہدایات۔ عہدِ صدیقی کا پہلا معرکہ۔ جنگ ذی القصہ اور جنگِ بدر۔ مشابہت۔ ابو بکرؓ کا عزم و ثبات۔ مشورۂ صحابہؓ کے عدمِ قبول کی وجہ۔ بیرونی مسلمانوں کی ادائے زکوٰۃ۔ شام سے اسامہ کی واپسی۔ دوبارہ جنگ۔ شکست خوردہ قبائل کی روش۔

(٦) مرتدین سے جنگ کی تیاریاں، ۱۴۷

جنگ کی تیاری۔ قیام مدینہ کی وجہ۔ مہاجرین کی قیادت کا سبب۔ ابوبکرؓ کی بے تعصبی۔ خالدؓ بن ولید۔ مرتدین کو آخری پیش کش۔ مرتدین کے نام خطوط۔ ہدایت کی کوشش۔ بہترین سیاست کا کرشمہ۔ جنگ ہائے ارتداد کی اہمیت۔

(۷) طُلیحہ اور جنگِ بزاخہ، ۱۵۹

طلیحہ کا دعوائے نبوت۔ مرتدین کی سرکوبی اور ضرار کی روانگی۔ عیینہ اور مسیلمہ کا الحاق۔ مرتدین کو ابوبکرؓ کی دھمکی۔ عدی کی سعی و جہد۔ بنی طیؔ کا دوبارہ قبولِ اسلام۔ مقابلے کے لیے طلیحہ کا اصرار۔ طلیحہ کے خلاف پیش قدمی۔ مسلمانوں میں اضطراب۔ بنی طیؔ کا اظہار معذرت۔ آغازِ جنگ اور فرار طلیحہ۔ طلیحہ کا دوبارہ قبولِ اسلام۔ دوسرے مرتد قبائل کا استیصال۔ بقیہ مرتد قبائل۔ قاتلوں پر خالد کی سختی۔ خالد کی روش پر ابوبکرؓ کی خوشنودی۔ مرتد قیدیوں کو ابوبکرؓ کی معافی۔ قرہ بن ہبیرہ۔ علقمہ بن علاثہ۔ فجاءہ ایاس۔ ابوشجرہ۔ ام زمل کا خروج۔ ام زمل کی شکست۔ جنوبی حصے کے مرتد

(۸) سجاح اور مالک بن نویرہ، ۱۸۲

بنو عامر اور ان کے مسکن۔ ادائے زکوٰۃ سے انکار — تمیم میں سجاح کا ورود۔ سجاح کے آنے کی غرض۔ بنی تمیم کا طرزِ عمل۔ سجاح اور مالک بن نویرہ۔ مالک بن نویرہ کے اوصاف۔ سجاح کی شکست۔ سجاح اور مسیلمہ کی شادی۔ سجاح کا مہر۔ مالک کی پریشانی۔ خالد کا کوچ۔ مالک کا اپنی قوم کو مشورہ۔ مالک بن نویرہ کی گرفتاری۔ قتل مالک پر مختلف روایتیں۔ خالد سے ابوقتادہ کی ناراضی۔ مدینہ میں خالد کی طلبی۔ خالد کے بارے میں عمر کا موقف۔ خالد کے بارے میں ابوبکر کا موقف۔ یمامہ پر خالد کی چڑھائی۔

(۹) جنگِ یمامہ، ۲۰۳

مسیلمہ کے خلاف خالد کی چڑھائی۔ مسلمانوں کی غیرمعمولی کامیابی۔ عکرمہ کی ہزیمت۔ مسیلمہ کی قوت

میں جمعِ قرآن۔ ابنِ مسعود کی ناراضی۔ زید کا طریقِ کار۔ کچھ سورتوں کی ترتیب۔ جمعِ قرآن کی تکمیل۔ ابوبکرؓ کا سب سے بڑا کارنامہ۔

(۱۷) خلافت ابوبکرؓ، ۴۲۰

خلافت کا تصور۔ عمرؓ کا لقب۔ عرب کا سیاسی نظام۔ مہاجرین و انصار کی خلافت۔ اسلام میں حکومت کا نظام۔ ابوبکرؓ اور عرب کی سیاسی وحدت۔ اسلام کی طاقت کا سبب۔ ابوبکرؓ کا نظامِ حکومت۔

(۱۸) ابوبکرؓ کی وفات، ۴۴۳

موت کے بارے میں روایات۔ جانشینی کا مسئلہ۔ محاسبۂ نفس۔ وظیفے کی واپسی۔ تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت۔ وفات

حرفِ اوّل

عالمِ اسلام کی تاریخ کا آغاز حقیقتاً اُس وقت سے ہوتا ہے جب رسول اللہؐ اپنے اہلِ وطن کے مسلسل مظالم سے نہایت درجہ پریشان ہو کر مکہ کی سرزمین سے ہجرت کرنے اور مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اِس عظیم الشان واقعے کو اسلامی تاریخ کا مبدأ اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ ترقیِ اسلام کی بنیاد اُسی وقت سے پڑی، اللہ کی تائید و نصرت نہایت شاندار طور پر ظاہر ہوئی اور کفارِ مکہ کو جو مسلسل تیرہ سال تک اسلام کی سخت مخالفت کرنے اور اپنے مقصد میں ناکام رہنے کے بعد بالآخر رسول اللہؐ کے قتل پر متفق ہو چکے تھے، ایک بار پھر زبردست ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس موقع پر ابوبکرؓ واحد شخص تھے جنھیں رسول اللہؐ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اِس واقعے کے دس برس بعد جب رسول اللہؐ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں تشریف نہ لا سکے تو آپ نے اپنی جگہ جس شخص کو امامت کے لیے منتخب کیا وہ بھی ابوبکرؓ ہی تھے۔ یہ عظیم الشان شرف ایسا تھا جو حضرت عمرؓ بن خطاب جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔

رسول اللہؐ نے ہجرت جیسے نازک موقع پر ابوبکرؓ کو اپنا ساتھی کیوں چنا اور مرض الموت میں اپنی جگہ نماز پڑھانے کا حکم کیوں دیا؟ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، ابوبکر ہی سب سے پہلے آپ کی رسالت پر ایمان لائے تھے اور دینِ حق کی خاطر جان، مال اور عزت کی قربانی دینے میں بھی ان کا قدم دوسرے تمام مسلمانوں سے آگے رہتا تھا۔ وہ قبلِ اسلام سے رسول اللہؐ کی وفات تک کے طویل عرصے میں برابر آپ کی اعانت، دینِ اسلام کی اشاعت اور کفار کے مظالم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے میں ہمہ تن مشغول رہے تھے۔ رسول اللہؐ کے ارشاد کو انھوں نے اپنے ہر کام پر مقدم رکھا تھا۔ رسول اللہؐ کے لیے اپنی جان تک کی مطلق پروا نہ کی تھی اور ہر جنگ میں آپ کے دوش بدوش کفار سے مقابلہ و مقاتلہ کیا تھا۔ نہایت پختہ ایمان کے علاوہ اُن کے اخلاقِ حسنہ بھی کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اسی حسنِ خلق کی بدولت وہ

بے حد عزیز تھے اور ہر مسلمان اُن سے محبت کرتا تھا۔

ابوبکرؓ کے دینی مرتبے اور اُن سے لوگوں کی حد درجہ عقیدت ہی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد جب آپ کی جانشینی کا سوال مسلمانوں کے سامنے آیا تو ان کی نظرِ انتخاب انھیں پر پڑی اور سب نے انھیں کو بالاتفاق پہلا خلیفہ تسلیم کرلیا۔ اپنے مختصر عہد خلافت میں اسلام کی سربلندی کے لئے انہوں نے جو اولوالعزمانہ کوششیں کیں اُن کی نظیر عالم اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابوبکرؓ ہی کے مبارک زمانے سے اُس اسلامی سلطنت کا آغاز ہوا جس نے پھیلتے پھیلتے دنیا کے کثیر حصے کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اِس عظیم الشان مملکت کے کنارے ایشیا میں ہندوستان اور چین تک، افریقہ میں مصر اور تونس و مراکش تک، اور یورپ میں اندلس و فرانس تک پھیل گئے۔ یہی سلطنت تھی جس نے انسانی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے کے لیے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا اثر رہتی دنیا تک رواں دواں رہے گا۔

اپنی کتاب 'حیاتِ محمد' اور 'فی منزل الوحی' سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسلامی سلطنت کی تاریخ اور اس کے عروج و زوال کے اسباب کے متعلق بھی کچھ تحقیقی کام کروں۔ اِس خیال نے اِس وجہ سے اور بھی شدت اختیار کی کہ اسلامی سلطنت کا قیام کلیۃً رسول اللہ کا رہینِ منت ہے۔ رسول اللہ نے انسانیت کی بقا اور ہدایت کے لیے جو بے مثال تعلیم پیش کی وہی اِس عظیم الشان سلطنت کے قیام کا باعث بنی اور اِس تعلیم کے مظاہر ہمیں جابجا اسلامی حکومت کے مختلف ادوار میں نظر آتے ہیں۔

فی الواقع ماضی، حال اور مستقبل آپس میں کچھ اس حد تک مربوط ہوتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے اِس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ اس کے ماضی کا بہ غور مطالعہ کیا جائے۔ قوم میں جو خرابیاں راہ پاجاتی ہیں انھیں دور کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ایامِ گذشتہ پر نظر دوڑائی جائے اور زمانۂ حال سے ان کا مقابلہ کر کے خرابیوں کے ازالے کی کوشش کی جائے، بالکل اسی طرح جیسے کسی مریض کے مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کے لئے مرض سے پہلے کے حالات کی اچھی طرح چھان بین کرنی ضروری ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں پر بھی انحطاط کا دور دورہ ہے۔ جو قوم صدیوں تک بڑی شان سے دنیا کے ایک بڑے خطے پر حکومت کرچکی ہے۔ وہ آج

قعرِ مذلت میں پڑی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم بھی چودہ سو برس پہلے کے واقعات و حالات کا بہ نظر غائر جائزہ لے کر وہ اسباب ڈھونڈیں جو ہمارے انحطاط کا باعث بنے اور وہ راستے تلاش کریں جن پر گامزن ہو کر ہمیں آج بھی اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت اور قدر و منزلت حاصل ہو سکتی ہے۔

میں انھیں افکار میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میرے بعض کرم فرماؤں نے میری کتاب حیاتِ محمدؐ پڑھ کر مجھ سے بہ اصرار کہا کہ میں اسی طرز پر رسول اللہؐ کے خلفا اور اسلام کے جلیل القدر فرزندوں کے سوانح حیات بھی معرضِ تحریر میں لاؤں۔ میں تو پہلے ہی اس امر کے متعلق سوچ رہا تھا دوستوں کے اصرار نے میرے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا اور میں نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں بلکہ اسے انجام دینے کے لیے اہل علم کی ایک پوری جماعت کی ضرورت ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب کے متعلق تو تحقیقی کام بہت ہو چکا ہے اور ان کی بیشتر سوانح عمریاں مختلف اصحاب کی طرف سے لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق کوئی مفصل سوانح عمری موجود نہ تھی اس لیے میں نے سب سے پہلے انھیں کے سوانح حیات کی طرف توجہ کی۔ ابوبکر رسول اللہؐ کے قدیم جاں نثار رفیق اور آپ کے کامل متبع تھے۔ پھر انتہائی پُرسوز دل اور بے نظیر صفات کے مالک تھے۔ عالمِ اسلام میں پھیلے ہوئے لاکھوں مسلمان ان سے منسوب ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ابوبکرؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انھیں بالاتفاق مسلمانوں کا پہلا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ جب مرتدین کے ہاتھوں اسلام اپنے نازک ترین دور میں سے گزر رہا تھا صرف ابوبکرؓ کی شخصیت تھی۔ جس نے مسلمانوں کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچایا۔ ایرانی اور رومی سلطنتوں پر فوج کشی کر کے انھوں نے اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کے اثرات آج تک اقوامِ عالم کے دلوں سے محو نہیں ہو سکے۔ اسی لیے میں اپنی اس کتاب میں جو کچھ بیان کروں گا اس کا تعلق محض سیرت و سوانح سے نہ ہوگا بلکہ یہ اصل میں اسلامی سلطنت کی تاریخ ہوگی جس کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد سے ہوئی۔

اس بابرکت عہد کے جو واقعات ہمیں مختلف کتابوں میں ملتے ہیں وہ انتہائی تعجب خیز اور مرعوب کن ہیں اور ان سے حضرت صدیقؓ کی عظیم شخصیت کے عجیب و غریب پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ایک طرف یہ مردِ حق غریبوں اور مسکینوں کی مدد کے لیے ہر لحظہ بے چین نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسا

دردمند انسان دنیا کے پردے پر کوئی نہ ہوگا۔ دوسری طرف اعلاءِ کلمۃ الحق اور اسلام کی سربلندی کی خاطر وہ بڑے سے بڑا خطرہ قبول کر لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی اسے اس کے عزم و ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ عزم و استقلال کا یہ عظیم پیکر تردد اور ہچکچاہٹ کے نام سے بھی ناآشنا تھا۔ اس عظیم الشان انسان کو لوگوں کی مخفی صلاحیتوں کو بھانپ کر انھیں اُجاگر کرنے اور ان سے ان کی استعداد کے مطابق کام لینے کا بہترین ملکہ حاصل تھا۔

رسول اللہؐ کے عہد میں ابوبکرؓ نے ایک عاشق صادق کی طرح زندگی بسر کی۔ جب قریش رسول اللہ کو ایذاؤں اور مظالم کا نشانہ بنا رہے تھے تو کفار کے مقابلے میں ابوبکر ہی سینہ سپر ہوتے تھے۔ رسول اللہ کی دعوت پر جس شخص نے سب سے پہلے لبیک کہا وہ ابوبکر ہی تھے۔ ابوبکرؓ نے ہجرت کے نازک ترین موقع پر غار ثور سے یثرب تک پوری جاں نثاری سے رسول اللہ کی رفاقت کی۔ مدینہ میں رسول اللہ کو یہود کی مکاریوں اور منافقین کی ریشہ دوانیوں سے واسطہ پڑا اور قریش مکہ اور یہود مدینہ کی پے در پے کوششوں کے نتیجے میں سارا عرب آپ کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا تو ابوبکر ہی نے آپ کے خاص الخاص مشیرکار کے فرائض انجام دیے۔

اسلام کی سربلندی کے لیے جو موقف ابوبکرؓ نے اختیار کیا اور رسول اللہؐ کی رفاقت کے ذیل میں جو بلند پایہ خدمات اُنھوں نے انجام دیں وہ نہ صرف مجموعی طور پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ابوبکرؓ کے نام کو ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابوبکرؓ کی رفعت شان کو احاطۂ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں کیونکہ اعلاءِ کلمۃ الحق کی خاطر جو قربانیاں اُنھوں نے پیش کیں ان کا تعلق اصل میں دل سے ہے اور یہ علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے کہ ابوبکرؓ کے دل میں اسلام اور رسول اللہؐ کی محبت کے جو جذبات موجزن تھے وہ ظاہر کے مقابلے میں کتنے شدید تھے اور اُن کا اندرونی اخلاص ظاہری اخلاص سے کتنا زیادہ تھا۔

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ابوبکر کے عہدِ خلافت میں جو واقعات پیش آئے ان سے ان کا حسن بصیرت اور دوررسی مزید آشکارا ہو گئی۔ مرتدین عرب سے فراغت پانے کے بعد جب آپ نے ایران اور روم پر توجہ مبذول کی تو سب سے بڑا ہتھیار جو اُنھوں نے ان دونوں سلطنتوں کے خلاف استعمال کیا وہ مساوات کا تھا جسے اسلام نے اصل الاصول کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

اس ہتھیار کا سامنا ایرانی سلطنت کر سکتی تھی نہ رومی مملکت۔ ایران اور روم کے باشندے شخصی اقتدار کی چکی میں پس رہے تھے، رعایا کے درمیان مختلف طبقات قائم تھے، نسلی امتیاز کی لعنت بری طرح مسلط تھی، حکمران طبقہ ملک میں بسنے والے دوسرے طبقوں کو اپنے سے کم تر بلکہ اچھوت سمجھتا تھا، اور انھیں ہر لحاظ سے دبانا فرض خیال کرتا تھا۔ عین اس وقت اسلام نے عدل و انصاف اور مساوات کا علم بلند کیا۔ ابوبکرؓ نے ایران اور روم جانے والی افواج کے سپہ سالاروں کو خاص طور پر ہدایات فرمائیں کہ وہ عدل و انصاف کا دامن کسی طرح ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور مفتوحہ ممالک کے تمام لوگوں سے بلا امتیاز مذہب و ملت مساوی سلوک کریں۔ اس طرح جو باشندے ایک عرصے سے جور و ستم اور عدم مساوات کا شکار چلے آ رہے تھے وہ اسلام کے منصفانہ اصولوں کی جھلکیاں دیکھ کر اس کے گرویدہ ہو گئے اور ان سلطنتوں کو اپنی زبردست عسکری قوت اور عظیم الشان مسلح افواج کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ظاہر ہے کہ ظلم و تشدد اور نسلی امتیاز روا رکھنے والی سلطنت، خواہ اس کی ظاہری طاقت کتنی ہی ٹھوس اور اس کی فوج کتنی ہی منظم ہو، ایسی قوم کے مقابلے میں کبھی نہیں ٹھہر سکتی جو عدل و انصاف اور مساوات کی نہ صرف علمبردار ہو بلکہ جس کی زندگی انہیں سانچوں میں ڈھلی ہو۔ یہ طرزِ زندگی رسول اللہ کے بعد کامل طور پر ابوبکرؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ ثانیہ کے اتصال کے باعث حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ رسول اللہ کا عہد ارشاد و اصلاح کا عہد تھا۔ آپ کے عہد میں شریعت کا نزول ہو رہا تھا، اللہ کی طرف سے بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسولؐ کو مسلسل احکام دیے جا رہے تھے۔ اس کے بالمقابل حضرت عمرؓ کا عہد تنظیمی تھا۔ نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کے لیے اصول و قواعد مرتب کیے جا رہے تھے اور مختلف محکموں کا قیام عمل میں لایا جا رہا تھا۔ ابوبکرؓ کا دور جہاں ان دونوں ادوار کی درمیانی کڑی تھا وہاں اُن غیر معمولی حالات کی وجہ سے جو آپ کے عہد میں پیش آئے ان دونوں سے بڑی حد تک مختلف بھی تھا۔

اپنے مختصر دور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جن مشکلات ..... اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کے باعث اسلام کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ رسول اللہ کی وفات کے معاً بعد اس وحدتِ عربیہ میں انتشار کے آثار نظر آنے لگے جسے آپ نے تیئس برس کی محنتِ شاقہ کے بعد قائم کیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار کے آثار رسول اللہ کی زندگی کے اواخر ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ مسیلمہ بن حبیب نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اپنے قاصدوں کے ہاتھ آپ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ مجھے بھی اللہ نے نبوت کے مقام پر سرفراز کیا ہے اس لیے عرب کی نصف زمین میری ہے اور نصف قریش کی۔

مسیلمہ کی دیکھا دیکھی اسود عنسی بھی نبی بن بیٹھا اور شعبدے دکھا دکھا کر اہل یمن کو اپنی طرف مائل لگا۔ طاقت حاصل ہونے پر اس نے جنوب کا رخ کیا اور رسول اللہ کے عمال کو وہاں سے نکال کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد وہ نجران کی طرف بڑھا اور وہاں بھی تسلط قائم کر لیا۔ یہ حالات دیکھ کر رسول اللہ کو مجبوراً اپنے عمال کو ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کرنا پڑا۔ اصل بات یہ تھی کہ عرب گو توحید کے قائل ہو چکے تھے اور بت پرستی بھی انھوں نے ترک کر دی تھی لیکن ان میں سے بیشتر کو اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ دینی وحدت اور سیاسی اتحاد میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اسلام قبول کرنے کا مطلب مدینہ کی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ اہل عرب آزاد منش انسان تھے اور کسی منظم حکومت کے آگے سر جھکانا اور دل و جان سے اس کی اطاعت کرنا ان کی سرشت کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جوں ہی رسول اللہ کی وفات کی خبر پھیلی، عرب کے اکثر قبائل نے اسلام سے ارتداد اور مدینہ کی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

بغاوت کا فتنہ جنگل کی آگ کی طرح عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔

جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں تو لوگوں میں سخت گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی . . . .

. . . . ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نازک موقع پر بغاوت فرو کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ بعض لوگوں کی ——— جن میں حضرت عمرؓ بن خطاب بھی شامل تھے ——— یہ رائے تھی کہ اس موقع پر مانعین زکوٰۃ کو نہ چھیڑا جائے اور جب تک وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقراری رہیں انھیں ان کے حال پر قائم رہنے دیا جائے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مانعین زکوٰۃ کو بھی مرتدین کے زمرے میں شامل کر لیا گیا تو جنگ کی آگ وسیع پیمانے پر پھیل جائے گی جس کا انجام خدا جانے کیا ہو لیکن ابوبکرؓ نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرتدین کی طرح مانعین زکوٰۃ سے بھی جنگ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور کوئی طاقت اور کوئی دباؤ انھیں ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

جنگہائے ارتداد کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ان جنگوں میں فریقین کی تعداد چند سو سے متجاوز نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس بعض لڑائیوں میں دس دس ہزار لوگوں نے حصہ لیا اور فریقین کے ہزاروں آدمی ان جنگوں میں کام آئے۔ مزید برآں تاریخِ اسلام میں انھیں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ اگر ابوبکرؓ اہلِ مدینہ کی اکثریت کی رائے قبول کر کے ان لوگوں سے جنگ نہ کرتے تو فتنہ و فساد میں کمی ہونے کے بجائے اور زیادہ شدت پیدا ہو جاتی اور اسلامی سلطنت کا قیام کبھی عمل میں نہ لایا جا سکتا۔ اگر خدانخواستہ ان جنگوں میں ابوبکرؓ کی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہوتی تو معاملہ انتہائی خوفناک شکل اختیار کر جاتا اور اس کا نتیجہ اسلام اور مسلمانوں دونوں کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا۔

یہ تمام حالات دیکھ کر بلا شبہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ابوبکرؓ نے مرتدین سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر کے اور ان پر کامل تسلط پا کر تاریخ عالم کے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور اس طرح گویا نئے سرے سے انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی۔

اگر جنگہائے ارتداد میں ابوبکرؓ کو کامیابی نصیب نہ ہوتی تو ایرانی اور رومی سلطنتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا فائز المرام ہونا تو کجا، عراق اور شام کی طرف پیش قدمی کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس وقت نہ ان عظیم الشان سلطنتوں کے کھنڈروں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکتی اور نہ ایرانی و رومی تہذیب و تمدن کے بجائے اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا۔

اگر مرتدین کی جنگیں وقوع میں نہ آتیں اور ان میں کثرت سے حفاظِ قرآن کا اتلافِ جان نہ ہوتا تو غالباً حضرت عمرؓ ابوبکرؓ کو جمع قرآن کا مشورہ نہ دیتے اور اس طرح قرآنِ کریم کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک جگہ محفوظ کرنے کا جلیل القدر کارنامہ عمل میں نہ آتا۔

اگر جنگہائے ارتداد خدانخواستہ مسلمانوں کی شکست پر منتج ہوتیں تو ابوبکرؓ کے لیے مدینہ میں بھی نظامِ حکومت قائم کرنا مشکل ہو جاتا اور اس نظام کی بنیاد پر حضرت عمرؓ ایک رفیع المنزلت عمارت کبھی تعمیر نہ کر سکتے۔

یہ عظیم الشان واقعات ستائیس ماہ کی قلیل ترین مدت میں انجام پا گئے۔ اس قلیل مدت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے ابوبکرؓ کے عہد کو نظر انداز کر کے اپنی تمام تر توجہ حضرت عمرؓ کے عہد کی جانب منعطف کر دی۔ ان کا خیال ہے کہ گنتی کے چند مہینے کسی طرح بھی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والے عظیم امور کی انجام دہی کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ وہ انقلاب جنھوں نے انسانیت کو

درجہ بہ درجہ اوجِ کمال تک پہنچایا، بالعموم قلیل وقفوں ہی میں برپا ہوتے رہے اور دنیا کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں پیدا ہونے والی بے انتہا مشکلات پر کس طرح قابو پایا اور ان مشکلات کے باوجود ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد کس طرح رکھ دی؟ یہ سوال ہے جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور ہمارے لیے اس کا جواب دینا ضروری ہے۔

لاریب ابوبکرؓ کی عدیم النظیر کامیابیوں میں ان کے ذاتی اوصاف کو بھی بڑی حد تک دخل تھا۔ لیکن سب سے بڑا دخل رسول اللہؐ کی اُس پاک صحبت کا ہے جو متواتر بیس سال تک انھیں حاصل رہی۔ اسی وجہ سے مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت صدیقؓ کی عظمت کلیۃً رسول اللہؐ کی صحبت کی رہینِ منت ہے۔ آپ ہی کے فیض کا نتیجہ تھا کہ اُن کی رگ رگ میں اسلام کی محبت سرایت کر گئی اور انھوں نے القا کے ذریعے سے اس حقیقی رُوح کو پالیا جو رسول اللہؐ کی دعوت میں پنہاں تھی۔ اسی القا کی روشنی میں انھیں اِس حقیقت کا ادراک بھی ہو گیا کہ ایمان ایک ایسی قوت ہے جس پر اس وقت تک کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی جب تک مومن تمام نفسانی خواہشات سے کلیۃً منزّہ ہو کر محض تبلیغ حق و صداقت کی خاطر اپنی زندگی وقف کیے رکھتا ہے۔

بلاشبہہ اِس حقیقت کا ادراک مختلف زمانوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کو ہوا ہے لیکن محض عقل و دانش اور غور و فکر کے نتیجے میں۔ اس کے بالمقابل ابوبکرؓ کے مصفّا اور پاک دل نے بغیر کسی خارجی دباؤ کے خود بخود اس حقیقت کی طرف اُن کی رہنمائی کی اور رسول اللہؐ کے مطہر نمونے اور عمل نے اس ادراک کو اس حد تک جلا دی کہ حضرت صدیقؓ کے دل میں کسی شک و شبہہ کا راہ پانا ممکن ہی نہ رہا۔

یہی ایمان صادق تھا جس کی بدولت ابوبکرؓ میں اِس قدر بے نظیر جرأت اور عدیم المثال عزیمت پیدا ہو گئی کہ جب مرتدین سے جنگ کرنے کا سوال پیش ہوا اور تمام صحابہ نے انھیں موقع کی نزاکت کے لحاظ سے نرمی برتنے کا مشورہ دیا تو انھوں نے نہایت سختی سے اسے رد کر دیا اور فرمایا کہ میں ضرور مرتدین سے جنگ کروں گا خواہ مجھے اس کے لیے تنہا ہی کیوں نہ نکلنا پڑے۔

اولوالعزمی کا یہ سبق رسول اللہؐ ہی نے ابوبکرؓ کو پڑھایا تھا اور اپنے پاک نمونے کے ذریعے سے ان کے دل میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ حق کے مقابلے میں جھکنے اور کمزوری دکھانے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا ابوبکرؓ وہ وقت بھول سکتے تھے جب شدید مخالفت کے باوجود رسول اللہ یکہ و تنہا مکہ کی گلیوں میں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے؟ مال و دولت اور عزت و وجاہت کا کوئی لالچ، ظلم و ستم، بائیکاٹ اور قتل کی کوئی دھمکی آپ کو صراطِ مستقیم سے بال برابر بھی ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور آپ معجزانہ اولوالعزمی واستقامت سے برابر یہ اعلان فرماتے رہے:

"اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ لا کھڑا کریں تو بھی میں تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے سے باز نہ آؤں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

کیا ابوبکرؓ کی نظروں سے وہ واقعہ اوجھل ہو سکتا تھا کہ احد کی جنگ میں صحابہ کی ایک کثیر تعداد کی شہادت کے باوجود جب رسول اللہ نے یہ سنا کہ کفار قریش پلٹ کر دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ تمام خطرات کو پسِ پشت ڈالتے اور تمام عواقب کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جنگِ احد میں شریک ہونے والے مسلمانوں کو لے کر (جن میں زخمیوں کی خاصی تعداد بھی شامل تھی) کفار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے اور حمراء الاسد پہنچ کر قیام فرمایا۔ مسلمانوں کا یہ استقلال دیکھ کر کفار کے حوصلے پست ہو گئے اور انھوں نے مقابلے میں آئے بغیر مکہ کوچ کر جانے ہی میں اپنی خیر سمجھی۔ اس طرح مسلمانوں کے دلوں سے وہ زخم بھی بڑی حد تک مندمل ہو گئے جو جنگِ احد کی وجہ سے انھیں پہنچے تھے۔

پھر ابوبکرؓ اس واقعے کو کس طرح فراموش کر سکتے تھے جب غزوۂ حنین کے موقع پر بعض نومسلموں کی بے تدبیری سے اکثر مسلمانوں کی سواریاں بھاگ کھڑی ہوئیں لیکن رسول اللہ چند صحابہ کے ہمراہ انتہائی پامردی سے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور ان کے تیروں کی بے پناہ بوچھاڑ کی مطلق پروا نہ کی۔ بالآخر جب حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔ "اے گروہ انصار! جنھوں نے رسول اللہ کو پناہ دی اور ہر موقع پر ان کی مدد کی اور اے گروہِ مہاجرین! جنھوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر موت کی بیعت کی، خدا کا رسول زندہ ہے اور تمھیں بلاتا ہے۔" تو مسلمان پلٹے اور دوبارہ میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے صف آرا ہو گئے۔

ابوبکرؓ کے سامنے رسول اللہ کے یہی نمونے تھے جو انھوں نے آپ کے سچے اور کامل متبع کی حیثیت سے اختیار کیے۔ اس اولوالعزمی ہی کے باعث مٹھی بھر مسلمانوں کو عرب کے طول و عرض

میں پھیلے ہوئے لاتعداد مرتد قبائل کے مقابلے میں زبردست کامیابی نصیب ہوئی اور ان کے دلوں میں یہ بات میخ فولاد کی طرح گڑ گئی کہ ان کی سرشت میں ناکامی کا خمیر ہی نہیں۔ حق و صداقت کے راستے میں شہادت پانے کا جذبہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ان کی نظروں میں شہادت ہی کامیابی کے حصول کا ذریعہ قرار پائی۔

آپ کو اس کتاب میں اس قسم کے بہت سے واقعات ملیں گے جن کی نظیر تاریخ میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ رسول اللہ کے عہد میں مسلمان اپنی کامیابی کی طرف سے پورے طور پر مطمئن تھے کیونکہ اللہ نے اپنے رسولؐ سے فتح و نصرت کا وعدہ فرما رکھا تھا اور ہر موقع پر ملائکہ کے ذریعے سے تائید ربانی کا نزول ہوتا تھا۔ لیکن ابوبکرؓ کے عہد میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وحی کا نزول رسول اللہ کی وفات کے بعد بند ہو چکا تھا۔ اب صرف دلوں میں جذبۂ ایمانی کو قائم رکھنے اور رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کو کاملاً اپنانے ہی سے مسلمان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے تھے۔

ابوبکرؓ نے کامیابی کا یہ گر معلوم کر لیا تھا اور یہی گر اختیار کرنے سے انھوں نے اپنے مختصر عہد خلافت میں وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن پر ایک دنیا انگشت بدنداں ہے۔

ایمان کا جو جذبہ آپ کے دل میں موجزن تھا اور دین کی خدمت کی جو تڑپ آپ کے اندر کام کر رہی تھی اسی کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ نہایت قلیل عرصے میں ایسے جلیل القدر امور انجام پا گئے جو عام حالات میں سالہا سال کی ان تھک کوششوں کے باوجود پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتے۔

رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کو پورے طور پر اپنانے سے ابوبکرؓ اس حقیقت کی تہ تک بھی پہنچ گئے تھے کہ قومی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مشکلات اور مصائب کو صبر و استقلال سے جھیلنے اور اپنے اندر ان پر قابو پانے کا ملکہ پیدا نہ کیا جائے۔ درحقیقت قوموں کی حیات و ممات کا راز اسی گر کو اختیار کرنے یا ترک کر دینے میں مستور رہے۔ ہر وہ قوم جو عزت کی خواہاں اور اقوامِ عالم میں اپنا ایک علحدہ، ممتاز مقام پیدا کرنے کی خواہش مند ہو، جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی ٹھوس لائحۂ عمل اپنے پاس رکھتی ہو اور اُسے یقین ہو کہ صرف اسی کے پیش کردہ پروگرام پر عمل کرنے میں انسانیت کی نجات اور دنیا کی فلاح و بہبود مضمر ہے اس کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اپنے اندر قوتِ برداشت پیدا کرے۔ اس کے راستے میں خواہ مشکلات کے پہاڑ ہی کیوں نہ حائل

ہو جائیں لیکن اُسے عزم و استقلال سے ہر دم اپنا قدم آگے ہی بڑھانا چاہیئے مشکلات خواہ کتنی ہی ہیبت ناک اور مصائب کتنے ہی حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں لیکن باہمت قوم کو انھیں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دینی چاہیے اور راستے کی تمام دشواریوں اور راہ ِ حق کی راہ میں تمام رکاوٹوں پر نہایت جرأت مندانہ و اولوالعزمانہ قابو پا کر منزلِ مقصود کی جانب قدم بڑھاتے رہنا چاہیے۔

اِن اسباب کی محافظت اس وقت اور بھی ضروری ہو جاتی ہے جب اِن قوموں کے لائحہ عمل اور دعوت کی بنیاد مساوات کے قیام اور ظلم و ستم کی بیخ کنی پر استوار ہو۔ اکثر سلطنتوں کا قیام محض اس لیے عمل میں آسکا کہ انھوں نے مساوات و جمہوریت کو اپنی اساس بنایا اور اسی کے سہارے استحکام حاصل کیا۔ اس کے برعکس بیشتر سلطنتیں مدت دراز تک اپنی شان و شوکت دکھانے کے بعد محض اس وجہ سے قلیل ترین عرصے میں نابود ہو گئیں کہ انھوں نے مساوات کے اہم ترین رکن کو ترک کر دیا تھا۔

مساوات اسلام کا بنیادی ستون ہے جس کے بغیر اس کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس بنا پر اسلام اصولاً ایک جمہوریت پسند مذہب ہے۔ اس حقیقت کو آج ہم نے محض اپنی عقل کے ذریعے سے معلوم کیا ہے اور ہم سے پہلے اِس حقیقت تک جن لوگوں کی رسائی ہو سکی ہے ان کی رہنمائی بھی اُن کی عقل کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ادراک کے باوجود نہ ہم اور نہ ہمارے پیش رو ہی پوری طرح اسلامی سلطنت کی حفاظت کر سکے۔ لیکن ابوبکرؓ کو اِس حقیقت کا علم غور و فکر اور تدبر کے ذریعے سے نہیں بلکہ القاء ربانی کے ذریعے سے ہوا۔ وہ حق الیقین سے اس پر نہ صرف ایمان لائے بلکہ اپنے ساتھیوں کو اِس نصب العین کی تکمیل کے لیے لگا بھی دیا۔

ابوبکرؓ اور مٹھی بھر مسلمانوں کی شبانہ روز جد و جہد کے نتیجے میں جو سلطنت عالم وجود میں آئی اس کی بنیاد کلیتہً مساوات پر تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ دوسری سلطنتوں کے برعکس چند روزہ بہار دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود نہ ہو گئی بلکہ صدیوں تک اپنی جلوہ افروزی سے دنیا کو منور کرتی رہی۔

ابوبکرؓ نے القاء کی روشنی میں معلوم کر لیا تھا کہ اسلام مساوات کا علم بردار ہے اور ذات پات اور نسل کی بنا پر بنی نوع انسان کے درمیان کسی تفریق کا حامی نہیں۔ اسی وجہ سے اس کی دعوت کسی ایک قوم کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام بنی نوع کے لیے عام ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانۂ مبارک میں عربوں کے علاوہ غلاموں اور عجمیوں کی ایک بڑی تعداد بھی اسلام میں داخل ہوئی لیکن کسی غلام

اور عجمی سے نفرت یا حقارت کا برتاؤ کرنا تو کجا اسلام نے اُن کی ذلت و نکبت، عزو شرف میں تبدیل کر دی اور اُن کا رتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ آج بھی اُن کا ذکر آنے پر ہر مسلمان فرطِ عقیدت سے سر جھکا دیتا ہے۔ ان لوگوں سے رسول اللہ کے سلوک کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سلمان فارسی آپ کے مقربین خاص میں سے تھے۔ زید بن حارثہ کو آپ نے آزاد کر کے اپنا متبنّٰی بنا لیا تھا۔ غزوۂ موتہ کے وقت لشکر کا قائد بھی انھیں کو بنایا۔ اس سے پہلے بھی متعدد اہم ذمہ داری کے کام ان کے سپرد کیے۔ زید کے بیٹے اسامہ کو اپنی وفات سے قبل شام پر حملہ کرنے والی فوج کا سردار مقرر کیا اور تمام بڑے بڑے مہاجرین و انصار کو جن میں ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی شامل تھے، ان کی ماتحتی میں دیا۔ بازان فارسی کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ ان مثالوں سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ کے نزدیک محض عربی یا معزز قبیلے کا فرد ہونا کسی شخص کی فضیلت کے لیے کافی نہ تھا۔ آپ کے پیش نظر فضیلت کی کسوٹی تقویٰ اور صرف تقویٰ تھی۔ رسول اللہ کے خاص مشیروں اور مقرب صحابہ پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کے محبوب صحابی بننے کا شرف صرف انھیں لوگوں کو حاصل ہوا جنھوں نے ایمان و اخلاص میں قابلِ رشک ترقی کی اور جو دینی و ملّی مفاد کی خاطر اپنی جان، مال، عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لیے ہر لحظہ مستعد رہتے تھے۔ رسول اللہ نے عربوں کے دلوں سے ان کی نسبی شرافت، عزت اور فضیلت کا غرور بالکل نکال دیا تھا اور عربی، عجمی آزاد اور غلام کا فرق مٹا کر انھیں ایک سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ ابوبکرؓ نے بھی اپنے آقا کی اِس سنت پر پوری طرح عمل کیا اور وہ لوگوں کے درمیان صحیح اسلامی مساوات قائم کرنے میں آخر وقت تک کوشاں رہے۔

اسی مساوات کا اثر تھا کہ مسلمان ایک ایسی متحدہ قوت بن کر اُٹھے جس کا مقابلہ کرنے سے ایرانی اور رومی افواج قاہرہ عاجز آگئیں اور انھیں ان مٹھی بھر لیکن آہنی طاقت والے عربوں کے سامنے سے بھاگتے ہی بن پڑی۔

ابوبکرؓ کو اِس حقیقت کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ صرف جزیرۂ عرب تک محدود نہیں بلکہ اس کے مخاطب دنیا کے آخری کناروں تک بسنے والے انسان ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ نے بیرونِ عرب کے بادشاہوں اور فرماں رواؤں کو کثرت سے تبلیغی خطوط اور فرامین ارسال فرمائے تھے۔

یہ امر تسلیم کرنے کے مترادف ہی ہر مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس نے جس عظیم الشان نعمت سے حصّہ لیا ہے اسے صرف اپنے تک محدود نہ رکھے بلکہ دوسروں کو بھی اس نعمت سے حصّہ عطا کرے اور دین خدا کی اشاعت میں جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرے۔ رسولؐ اللہ نے خدا کا پیغام بلالحاظ قوم و ملّت سب لوگوں تک پہنچایا تھا۔ آپ کی تقلید میں آپ کے خلفاء کا بھی یہی فرض تھا کہ وہ دعوت اسلام کو زمین کے کناروں تک پہنچاتے اور اس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔

ابوبکرؓ نے یہی کیا اور اسلام کو اقصائے عالم تک پہنچانے میں کوئی دقیقۂ سعی فروگزاشت نہ کیا۔ اس راہ میں انھیں شدید مشکلات اور مہیب مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے ابتدائے خلافت ہی سے جو عزم کر لیا تھا اس میں آخری لمحے تک مطلق کمی نہ آنے دی اور اپنی جدوجہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی چھوڑا۔ ابوبکرؓ کی مردانہ وار کوششوں اور اولوالعزمی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی سلطنت تھوڑے ہی عرصے میں معلومہ دنیا کے اطراف تک پہنچ گئی اور صدیوں تک اسی سلطنت نے دنیا میں تہذیب و تمدّن کا علم بلند اور علم و عمل کا چراغ روشن کیے رکھا۔

لمبے عرصے تک دنیا پر شان و شوکت سے حکمرانی کرنے کے بعد اسلامی سلطنت پر بھی دوسری حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح زوال آنا شروع ہوا اور بالآخر وہ انتہائی نکبت اور پستی کی حالت میں پہنچ گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس نکبت اور پستی کا سبب اسلام کے وہ بنیادی اصول تھے جن کا وہ علم بردار بن کر کھڑا ہوا تھا، یا ان بنیادی اصولوں کو پس پشت ڈال دینے کے باعث مسلمانوں کو اضمحلال اور کمزوری کا سامنا کرنا پڑا؟ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہماری پستی اور کمزوری کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہم نے ان بنیادی اصولوں کو ترک کر دیا ہے جو اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث بنے تھے۔ جو بھی شخص اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اسلامی سلطنت کا زوال اس وقت سے شروع ہوا جب مسلمانوں نے اتحاد جیسی نعمت کو خیر باد کہا۔

ابتداءً جزیرۂ عرب میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان معرکے سر ہونے لگے۔ بعد ازاں عربوں اور عجمیوں کے درمیان جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس نے مسلمانوں کی طاقت و قوت، عزّ و شرف، شان و شوکت اور رعب و داب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

اس عبرت ناک داستان کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے نہ تو وقت ہے اور نہ گنجائش اس لیے میں اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے بیان کو صرف عہدِ صدیقؓ تک محدود کروں گا جو اگرچہ بے حد مختصر تھا مگر اثر پذیری کے لحاظ سے بڑی بڑی سلطنتوں پر حاوی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کی جد وجہد کے بعد قائم ہونے والی سلطنتیں اڑھائی سال کی اس مختصر زرین حکومت کے مقابلے میں ہیچ تھیں۔

ابوبکرؓ کے عہد کا حال بیان کرتے ہوئے مجھے قلبی مسرت محسوس ہو رہی ہے اور میں سچے جوش سے یہ تذکرہ لکھ رہا ہوں۔ اگر میں اس کتاب کے ذریعے سے قارئین کے سامنے ابوبکرؓ کے عہد کی واضح تصویر اور رسول اللہ کے اس عاشقِ صادق کے اپنے حسن کمال کا پورا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہو سکوں تو یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ابوبکرؓ کا عہد اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف کتابوں کے مطالعے سے انسان ان کے عہدِ زرین کی بعض جھلکیاں دیکھ کر ان کی رفیع المنزلت شخصیت کا کچھ اندازہ تو کر سکتا ہے لیکن اس کے پہلوؤں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ یہ کام ایک عظیم جد وجہد اور صبر آزما تحقیق و تدقیق کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوبکرؓ کے متعلق تحقیق کا حق ابھی تک ادا نہیں ہو سکا۔ اس بے نظیر انسان کی زندگی کے سیکڑوں گوشے ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکے اور یہ نورانی شخصیت اپنے پورے جلوے سے دنیا کے سامنے اب تک بے نقاب نہیں ہو سکی۔ اشد ضرورت ہے اس امر کی کہ ان کے سوانح لکھنے کے لیے از سر نو ایک ان تھک جد وجہد کی جائے اور ان کی سیرت و سوانح کے مخفی گوشے اجاگر کرنے کے علاوہ معاصرین سے ان کا کامل موازنہ کیا جائے، یہ بھی بتایا جائے کہ ان کی ہم عصر قومیں تہذیب و تمدن کے کس دور میں سے گزر رہی تھیں، ان کے مقابلے میں اہلِ عرب کی کیا حالت تھی، اور ابوبکرؓ نے انھیں کس طرح ان اقوام کا ہم پایہ بلکہ ہر لحاظ سے ان سے بدرجہا بہتر بنا دیا۔

مجھے یقین ہے کہ باہمت مورخین مستقبل قریب میں اس اہم کام پر توجہ مبذول کریں گے اور مسلسل جد وجہد اور کاوش کے بعد ابوبکرؓ کی زندگی کے تمام گوشے اور اس عہد کی تمام تفاصیل واضح طور پر بیان کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ابوبکرؓ کے عہد سے متعلق تو بالخصوص انتہائی چھان بین اور تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔

قدیم عربی مآخذ جن سے اُن کے عہد کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے روایات کے لحاظ سے آپس میں اتنے مختلف ہیں کہ بعض اوقات کسی واقعے کا صحیح صحیح حال معلوم کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ بعض روایات تو محض لغویت کی پوٹ اور مجموعۂ خرافات ہیں۔ بعض روایات کو پڑھ کر انسان ہکّا بکّا رہ جاتا ہے، اس کی عقل چکرانے لگتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا واقعی ایسے واقعات کا معرضِ وجود میں آنا ممکن ہے؟

پھر بھی روایات میں تناقض اور اضطراب کے لیے متقدمین کو مجبور ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ جس زمانے میں ابوبکرؓ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تھی وہ کلیۃً جدال و قتال کا دور تھا۔ ہر مسلمان شوقِ جہاد میں دیوانہ وار میدانِ جنگ کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ کوئی بھی دن امن اور چین سے نہ گزرتا تھا۔ کسی شخص کو پچھلے واقعات پر نظر دوڑانے اور ان پر غور و فکر کرنے کی فرصت نہ تھی بلکہ ہر ایک کی نظر مستقبل ہی پر جمی رہتی تھی۔ اِسی وجہ سے کسی شخص نے اس زمانے میں پیش آنے والے واقعات کو باقاعدہ مرتب کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ کسی کو ایسا موقع میسّر آ سکا۔ روایات کی تدوین بعد کے زمانوں میں ہوتی لیکن وہ بھی کسی باقاعدگی کے تحت نہیں بلکہ لوگوں نے جو روایات ایک دوسرے سے سن کر سینوں میں محفوظ کر رکھی تھیں انھیں بغیر کسی چھان بین اور نقد و جرح کے ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ اِن روایات کے جمع کرنے میں وہ احتیاط بھی نہ برتی گئی جو احادیثِ رسولؐ بیان کرنے میں برتی جاتی تھی۔ اور ایسا ہونا ممکن بھی کس طرح تھا جب اس زمانے میں مسلمان فتوحات میں مصروف اور ایک ایسی عظیم سلطنت کی تشکیل و تنظیم میں مشغول تھے جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

چونکہ اِس عہد کی روایات جمع کرنے میں کسی اصول اور قاعدے کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا اِس لیے کتبِ تاریخ میں ہر قسم کی رطب و یابس روایات جمع ہو گئی ہیں۔ دورِ حاضر کے مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ کسی واقعے کے متعلق اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے وہ کسی ایک روایت پر انحصار نہ کرے بلکہ امکانی حد تک اِس واقعے کے متعلق بیان کردہ تمام روایات کی چھان بین کرے، ایک روایت کا دوسری روایت سے موازنہ کرے اور اس طرح اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

قدیم مورخین نے روایات کی جرح و تعدیل میں خاصی محنت کی ہے۔ پھر بھی اُن کی کوششوں کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے کے باوجود ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ابوبکرؓ اور ان کے عہد کی ایسی روشن تصویر ہمارے سامنے پیش نہیں کی جس کے حسن و جمال سے ہماری آنکھیں فرحت محسوس کر سکیں۔

ہم نے آخر میں اُن کتابوں کی فہرست درج کی ہے جن سے اِس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے۔ قارئین یہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں، انھیں ہمارے دعوے کی صداقت کا علم ہو جائے گا۔ بعض مؤرخین نے تو اپنی کتابوں میں ابوبکرؓ کے جلیل القدر کارناموں اور اس عہد میں رونما ہونے والے عظیم الشان واقعات کو بیان ہی نہیں کیا۔ اگر کہیں کیا بھی ہے تو نہایت معمولی طریقے سے۔ چنانچہ طبری، ابن اثیر اور بلاذری نے جمع قرآن کے متعلق کچھ نہیں لکھا حالانکہ جمع قرآن کا کارنامہ اتنا مہتم بالشان ہے کہ اگر ابوبکرؓ اس کے سوا اور کچھ بھی نہ کرتے تو بھی یہ اُن کے نام کو بقائے دوام کا خلعت پہنانے کے لیے کافی تھا۔ جنگہائے ارتداد، فتح عراق اور فتح شام کے متعلق ان مؤرخین نے جو روایات بیان کی ہیں ان میں اس قدر اختلاف اور تضاد ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہی نہیں کہ ایک کتاب میں کوئی روایت ہے اور دوسری میں کوئی بلکہ ایک ہی کتاب میں ایک واقعے کے متعلق مختلف اور باہم متضاد روایات درج ہیں۔ جب انسان یہ روایات پڑھتا ہے تو سر چکرانے لگتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس روایت کو لے اور کسے چھوڑے۔

واقعات کے زمانۂ وقوع کے متعلق بھی اختلاف کی کمی نہیں بعض اوقات تو اس باب میں انتہائی بے پروائی برتی گئی ہے اور آنکھیں بند کر کے روایات درج کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ طبری میں مذکور ہے کہ جنگہائے ارتداد ۱۱ھ میں وقوع پذیر ہوئیں، فتوحات عراق ۱۲ھ میں مکمل ہو گئیں اور فتوحات شام کی تکمیل ۱۳ھ میں ہوئی۔ واقعات کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالنے سے یہی خیال ذہن میں آتا ہے کہ عراق کی فتوحات اس وقت تک شروع نہ ہوئیں جب تک جنگہائے ارتداد کا خاتمہ نہ ہو گیا اور فتوحاتِ شام کی ابتدا اس وقت تک نہ ہوئی جب تک فتوحات عراق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ گئیں حالانکہ واقعۃً ایسا نہیں۔ عراق پر لشکر کشی کی ابتدا جنگہائے ارتداد کے دوران ہی میں ہو چکی تھی اور فتوحاتِ شام کا سلسلہ جنگہائے ارتداد کے معاً بعد اس وقت شروع ہو چکا تھا جب خالد بن ولید کی فوجیں عراق

میں ایرانیوں سے برسرِ پیکار تھیں۔

اختلافات کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کتابوں میں جہاں واقعات کے وقوع اور زمانۂ وقوع کے متعلق اختلافات کی بھرمار ہے وہاں مقامات کے متعلق اختلافات کی بھی کمی نہیں۔ بسا اوقات ان اختلافات کے باعث روایت کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل حقیقت سے کس طرح آگاہی حاصل کی جائے۔ بعض اوقات ایک ہی نام کے کئی مقامات مختلف جگہوں پر ہوتے ہیں لیکن روایت سے قطعاً پتا نہیں چلتا کہ اس جگہ کون سے مقام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ بعض مقامات کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے اور ان کا حقیقی محلِ وقوع معلوم کرنا نہایت دشوار ہے (گو مستشرقین نے اس مشکل کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے اور ایسے نقشے تیار کیے ہیں جن کی مدد سے نابود مقامات کا صحیح محلِ وقوع معلوم ہو سکتا ہے)۔ بعض روایات اس قدر مشکوک ہیں کہ ان کی صحت پر مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر دورِ حاضر کے بعض مؤرخین نے ابوبکرؓ کے عہد میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق بے حد تردد کا اظہار کیا ہے اور وہ ان واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ بیشتر مؤرخین نے ان کے عہد کا تذکرہ نہایت اختصار سے کیا ہے جس سے نہ واقعات کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، نہ اُس جاہ و جلال کا کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے کھنچتا ہے جو عہدِ صدیقی رضؓ کا طرۂ امتیاز تھا اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ صدیقی رضؓ کو تاریخِ اسلام اور اسلامی سلطنت کے قیام میں فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی۔

عہدِ صدیقی رضؓ کے ابتدائی ماخذوں پر نظر ڈالنے سے ایک اور عجیب و غریب امر کا پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مؤرخین ابوبکرؓ کے متعلق اتنا بھی بیان نہیں کرتے جتنا خالد بن ولید اور اُن سپہ سالاروں کے متعلق بیان کرتے ہیں جنھوں نے شام جا کر وہاں کی فتوحات میں حصہ لیا۔ جب کوئی شخص ان کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابوبکرؓ کو یادِ الٰہی کے سوا کوئی کام نہ تھا اور وہ مدینہ میں بیٹھے دن رات عبادت اور تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے تھے۔ امورِ سلطنت کی دیکھ بھال یا تو عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرتے تھے یا قائدینِ عساکر اور مختلف علاقوں کے عمال۔ حالانکہ یہ بات صریحاً غلط اور سخت گمراہ کن ہے۔ ابوبکرؓ کے عہد میں استحکامِ دین اور تعمیر

سلطنت کے سلسلے میں جو کچھ ہؤا وہ سب کچھ محض ان کی ذاتی توجہ اور کوششوں کے نتیجے میں ہؤا اور اس کا سہرا ان کے سوا کسی کے سر پر نہیں باندھا جا سکتا۔

ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مرتدین اور مانعین زکواۃ کا فتنہ اُٹھنے پر جب ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اکثر مسلمانوں نے، جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، ابوبکرؓ کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا اور انتہائی اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا خواہ مجھے اکیلا ہی ان کے مقابلے میں نکلنا پڑے۔ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی جانب سے امداد کی درخواست موصول ہونے پر ابوبکرؓ ہی نے ان کی مدد کے لیے خالد بن ولید کو عراق بھیجا۔ جب شام پر فوج کشی کرنے کا مرحلہ درپیش ہؤا تو سارے عرب سے فوجیں انھیں نے اکٹھی کیں اور جب ابوعبیدہ بن جراح اور شام میں مقیم دوسرے اسلامی سپہ سالاروں نے رومی سلطنت پر یورش کرنے میں سستی دکھائی تو انھیں نے اپنے خاص حکم کے ذریعے سے خالد بن ولید کو اِس اہم کام کی انجام دہی کے لیے مامور کیا۔

ایک طرف ابوبکرؓ عراق اور شام کی جانب فوجوں پر فوجیں اور کمک پر کمک روانہ فرما رہے تھے اور دوسری جانب بیت المال کی تنظیم، مالِ غنیمت کی تقسیم، عمال کے تقرر اور سلطنت کے انتظام و انصرام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ امور سلطنت کی انجام دہی میں انھیں کسی چیز کا حتیٰ کہ اہل و عیال کا بھی ہوش نہ تھا۔ ایک ہی دُھن تھی اور ایک ہی لگن اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے آپ کو جو ذمہ داری تفویض کی گئی ہے اس کی بجا آوری میں سرِمُو فرق نہ آنے پائے۔ امورِ سلطنت میں اِس درجہ انہماک ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے انتہائی قلیل مدت میں وہ عظیم الشان کام کر دکھائے جو دوسرے لوگ سالہا سال کی طویل اور مسلسل جدوجہد کے باوجود نہیں کر سکتے اور نہ کر سکے۔

مؤرخین کا ابوبکرؓ اور اُن کے عہد کی طرف سے اتنی بے پرواہی برتنے کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ انھیں مسلسل بیس سال تک رسول اللہؐ کی مبارک اور پاک صحبت میں زندگی بسر کرنے کا شرف حاصل ہؤا۔ اِس دوران میں ان کا جو تعلق آپ سے رہا اس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا:

"اگر میں بندوں میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔"

اس بنا پر مؤرخین اور راویوں نے یہ خیال کر لیا کہ رسول اللہؐ کی پاک صحبت اور ابوبکرؓ کے حق میں

آپ کے ان الفاظ کے مقابلے میں زمانۂ خلافت میں رونما ہونے والے تمام واقعات اور کارنامے بالکل ہیچ ہیں، اس لیے ان کا تفصیل سے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

بے شک رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے باہمی تعلقات کی نوعیت معمولی نہیں بلکہ اپنے اندر انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن ان کی خلافت کا زمانہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بست سالہ صحبت کے دوران میں جو ایقان و ایمان انھیں حاصل ہوا تھا اس کے عملی اظہار کا وقت تو زمانۂ خلافت ہی میں میسر آیا تھا اور یہ عملی اظہار انھوں نے جس طرح کیا اور اس امانت کا حق، جو ان کے سپرد کی گئی تھی، جس طرح ادا کیا وہ تاریخ عالم کا ایک فراموش نہ ہونے والا ورق ہے۔ اس لحاظ سے اُن کا عہد مستحق ہے کہ اس کی مفصل تاریخ قلم بند کی جائے۔

ماخذوں میں اختلاف اور عہد صدیقیؓ کی نسبت مندرجہ بالا تاثر کے باعث متقدمین کی کتابوں میں ابوبکرؓ کے متعلق بہت ہی کم مواد ملتا ہے۔ اس کا اثر متاخرین کی کتابوں میں بھی ظاہر ہوا کیونکہ ان کی بنیاد کلیۃً متقدمین اور ابتدائی مورخین کی کتابوں اور روایات پر تھی بعض متاخرین تو عہدِ صدیق رضؓ کا ذکر انتہائی اختصار سے کر کے ہر تن عہد عمرؓ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن بعض مؤرخ تو دونوں کے عہد کا موازنہ شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ انتہائی نامناسب امر ہے۔ بڑو بزرگ عظمت و شوکت کے لحاظ سے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سیاست دان سے کم نہ تھے حضرت عمرؓ کا عہد یقیناً اسلام کا انتہائی درخشاں عہد ہے۔ اس میں سلطنت کی بنیادیں استوار کی گئیں، قواعدِ مملکت مرتب کیے گئے، نظامِ حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم کیا گیا، مصر اور دیگر رومی و ایرانی مفتوحات پر پہلی بار اسلامی علم لہرایا گیا۔ لیکن اس امر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمرِ فاروقؓ کا یہ عظیم دَور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد کا تتمہ و تکملہ تھا، بالکل اسی طرح جیسے ابوبکرؓ کا دَور رسول اللہؐ کے عہد کا تتمہ و تکملہ تھا۔

اگرچہ موجودہ زمانے میں بہت کم کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں جن میں ابوبکرؓ اور ان کے عہد کا ذکر تفصیل و توضیح اور تحقیق و تدقیق سے کیا گیا ہو پھر بھی مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض مستشرقین نے عہدِ صدیقؓ کی اہمیت محسوس کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی میں ُ اے بے دی مارینی، نے تاریخ اہل عرب (History of the Arabians)

کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس میں ابوبکرؓ کا ذکر خصوصیت اور تحقیق سے کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں "کوسین دی پرسیوال" نے ایک کتاب (Essai sur l' Historie des Arbes) کے نام سے تالیف کی۔ اس میں بھی ابوبکر کا ذکر تفصیل و توضیح سے کیا گیا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں "سر ولیم میور" نے (Annals of the Early Caliphate) تالیف کی اور اس کے اندر بڑے فاضلانہ انداز میں ابوبکرؓ کے عہد اور ان کے کارناموں پر تبصرہ کیا۔ اس وقت سے آج تک جرمنی، اٹلی، فرانس، انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کے متعدد مستشرقین تاریخ اسلام کے اس عہد زریں کے متعلق تحقیق و تدقیق میں مشغول رہے ہیں اور انھوں نے اس ضمن میں نہایت قابل قدر کام کیا ہے۔

جہاں میں نے مستشرقین کی کوششوں کا ذکر کیا ہے وہاں بعض ایسے مسلمان اور عرب مؤرخین کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے عہد صدیقؓ کی اہمیت سمجھ کر اپنی کتابوں میں ان کے متعلق تفصیل اور تحقیق سے کام لیا ہے۔

مشہور مؤرخ "رفیق بک العظم" نے اپنی کتاب "اشہر مشاہیر الاسلام" کے جزو اول میں بالخصوص ابوبکرؓ اور ان کے عہد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر حصوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس کے مؤلف متقدمین کے طریقوں سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ مرحوم شیخ محمد خضری بک نے بھی ابوبکرؓ کے عہد کا تذکرہ تفصیل و توضیح سے کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:۔

> "ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وجود نہ ہوتا تو تاریخ اسلام کا دھارا کسی اور ہی طرف مڑا ہوا ہوتا۔ جب آپ نے عنان خلافت ہاتھ میں لی تو تمام مسلمانوں کے دلوں پر خوف و خطر طاری اور مایوسی و بددلی محیط تھی لیکن حضرت صدیقؓ نے حیرت انگیز اولوالعزمی سے تمام فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کر ڈالا اور اسلام کا قافلہ شان و شوکت سے دوبارہ اپنے راستے پر گامزن ہو گیا۔"

استاد عمر ابوالنصر نے اپنی کتاب "خلفاء محمدؐ" کا پہلا حصہ کلیۃً ابوبکرؓ کے حالات کے لیے وقف کیا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالوہاب نجار اور بعض دوسرے مورخین نے بھی ان کے متعلق بہت حد تک تحقیقی کام کیا ہے۔

میں یہ تمہید اس دعا پر ختم کرتا ہوں، اللہ ہمارے علماء اور مؤرخین کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ ابوبکرؓ کا حقیقی مقام سمجھیں اور کاوش و جاں فشانی سے ان کے متعلق ایسا تحقیقی مواد تیار کردیں جس سے ان کی عظیم شخصیت صحیح رنگ میں دنیا کے سامنے آسکے اور اب تک جو ناانصافی آپ سے ہوتی رہی ہے اس کی تلافی ہو جائے ——— آخر میں مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے کسی حد تک مجھ ناچیز کو یہ فریضہ بجا لانے کی توفیق عطا فرمائی اور حقیقت تو یہ ہے کہ تمام کام اسی کی مہربانی و توفیق سے انجام پاتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے حالات کے بعد اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی تو حضرت عمرؓ کے حالات بھی اسی نہج پر لکھنے کا ارادہ ہے۔

محمد حسین ہیکل

(۱)

ابوبکرؓ رسولؐ اللہ کی زندگی میں

ابتدائی حالات

حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے بچپن اور جوانی کے متعلق اتنے کم واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں کہ اُن سے نہ اُس دور میں ان کی شخصیت کے صحیح خط و خال معلوم ہوتے ہیں اور نہ اُن کے والدین کے ناموں کے سوا اُن کے بارے میں کسی اور بات ہی کا پتا چلتا ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت ان کے والد بہ قیدِ حیات تھے لیکن تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ اُن کے والد پر اُن کے اسلام لانے کا کیا اثر ہوا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد سے ان کی زندگی میں کیا اثر لیا، البتہ جہاں تک آپ کے قبیلے کا تعلق ہے مؤرخین نے اُس کا ذکر کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے اور بتایا ہے کہ قریش میں اس قبیلے کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔ مرتبے کا ذکر خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات محض قبیلے کے ذکر سے کسی شخص کے عادات و اطوار اور اخلاق و خصائل کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

قبیلہ

حضرت ابوبکرؓ قبیلہ تیم بن مرہ بن کعب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نسب آٹھویں پشت میں مرہ پر جا کر رسولؐ اللہ سے مل جاتا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

مرہ ─┬─ کلاب ── قصی ── عبد مناف ── ہاشم ── عبدالمطلب ── عبداللہ ── محمد رسولؐ اللہ
     └─ تیم ── سعد ── کعب ── عمرو ── عامر ── عثمان (ابو قحافہ) ── ابوبکر صدیقؓ

مکہ میں بسنے والے تمام قبائل کو کعبہ کے مناصب میں سے کوئی نہ کوئی منصب ضرور سپرد ہوتا تھا۔ بنو عبد مناف کے سپرد حاجیوں کے لیے پانی کی بہم رسانی اور انھیں آسائش پہنچانے کے انتظامات تھے۔ بنو عبد الدار کے ذمے جنگ کے وقت علم برداری، کعبہ کی دربانی اور دار الندوہ کا انتظام تھا۔ لشکروں کی سپہ سالاری خالد بن ولید کے اجداد بنو مخزوم کے حصے میں آئی تھی۔ خوں بہا اور دیتیں اکٹھا کرنا بنو تیم بن مرہ کا کام تھا۔ جب ابوبکرؓ جوان ہوئے تو یہ خدمت اُن کے سپرد کی گئی۔ خوں بہا اور دیتوں کے تمام مقدمات اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے اور جو فیصلہ وہ کرتے تھے اسے قریش کو منظور کرنا ہوتا تھا۔ خون بہا کے متعلق تمام اموال بھی ان کے پاس جمع ہوتے تھے۔ اگر ان کے سوا کسی اور شخص کے پاس جمع ہوتے تھے تو قریش اسے تسلیم نہ کرتے تھے۔

بنو تیم کے جو اوصاف کتابوں میں بیان ہوئے ہیں وہ دوسرے عرب قبائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان میں کوئی ایسا مخصوص وصف نہ پایا جاتا تھا جو انھیں ان کے ہم عصر دوسرے قبائل سے ممتاز کر سکے۔ شجاعت، سخاوت، مروت، بہادری اور ہمسایوں کی حمایت و حفاظت کی جو صفات دوسرے قبائل عرب میں موجود تھیں وہی بنو تیم میں بھی تھیں۔

نام، لقب اور کنیت

حضرت صدیق رضؓ کا نام عبد اللہ تھا اور کنیت ابوبکرؓ۔ والد کی کنیت ابو قحافہ تھی اور نام عثمان بن عامر۔ والدہ کی کنیت ام الخیر تھی اور نام سلمیٰ بنت صخر بن عامر۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اسلام لانے سے قبل ابوبکرؓ کا نام عبد الکعبہ تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہؐ نے یہ مشرکانہ نام تبدیل کر کے عبد اللہ رکھ دیا۔ بعض روایات کے مطابق انھیں عتیق بھی کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کی والدہ کے لڑکے زندہ نہ رہتے تھے۔ انھوں نے نذر مانی کہ اگر اُن کے لڑکا پیدا ہوا اور زندہ رہا تو وہ اس کا نام عبد الکعبہ رکھیں گی اور اسے کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ چنانچہ جب ابوبکر پیدا ہوئے تو انھوں نے نذر کے مطابق ان کا نام عبد الکعبہ رکھا۔ جوان ہونے پر وہ عتیق (آزاد کردہ غلام) کے نام سے موسوم کیے جانے لگے کیونکہ انھوں نے موت سے رہائی پائی تھی۔ بعض راویوں کا خیال ہے کہ عتیق کا لقب انھیں نہایت سرخ و سفید ہونے کے باعث دیا گیا۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ اُن کی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بعض لوگوں نے

پوچھا کہ ان کے والد کو عتیق کیوں کہا جاتا تھا تو انھوں نے فرمایا:

"ایک مرتبہ رسول اللہ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا 'ہذا عتیق اللہ من النار' (اللہ کا یہ بندہ آگ سے آزاد شدہ ہے")

یہ روایت اِس طرح بھی آئی ہے کہ ایک مرتبہ ابوبکر چند لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں دیکھ کر آپ نے فرمایا:

"جو چاہتا ہو کہ آگ سے آزاد شدہ شخص کو دیکھے وہ ابوبکرؓ کو دیکھ لے۔" ابوبکرؓ ان کی کنیت تھی اور عمر بھر اپنی کنیت ہی سے موسوم کیے جاتے رہے۔ لیکن اس کنیت کا حقیقی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں آنے والے بعض مورخین کہتے ہیں، یہ کنیت اس لیے پڑی کہ آپ سب سے پہلے اسلام لائے (انه بکر الی الاسلام قبل غیره[1])

بچپن اور جوانی

بچپن کا زمانہ انھوں نے اپنے دوسرے ہم سن بچوں کے ساتھ مکہ کی گلیوں میں کھیلتے گزارا۔ جوان ہونے پر ان کی شادی قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے ہوئی۔ ان سے عبداللہ اور اسمار پیدا ہوئے۔ اسمار کا لقب بعد میں ذات النطاقین قرار پایا۔ قتیلہ کے بعد انھوں نے ام رومان بنت عامر بن عویمر سے شادی کی۔ ان سے عبدالرحمٰن اور عائشہؓ پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مدینہ آکر پہلے انھوں نے حبیبہ بنت خارجہ سے شادی کی پھر اسمار بنت عمیس سے۔ اسمار کے بطن سے محمد پیدا ہوا۔

پیشہ، حلیہ اور اخلاق و عادات

قریش کی ساری قوم تجارت پیشہ تھی اور اس کا ہر فرد اسی شغل میں مشغول تھا۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے بھی بڑے ہو کر کپڑے کی تجارت شروع کر دی جس میں انھیں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور ان کا شمار بہت جلد

---

[1] مورخین نے اس کنیت سے مشہور ہونے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ عربی میں بکر جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ چونکہ انھیں اونٹوں کی غور و پرداخت سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے علاج معالجے میں بہت واقفیت رکھتے تھے اس لیے لوگوں نے انھیں ابوبکرؓ کہنا شروع کر دیا جس کے معنی ہیں: اونٹوں کا باپ۔ (مترجم)

مکہ کے نہایت کامیاب تاجروں میں ہونے لگا۔ تجارت کی کامیابی میں ان کی جاذبِ نظر شخصیت اور بے نظیر اخلاق کو بھی بڑا خاص دخل تھا۔

ان کا رنگ سفید، بدن دبلا، ڈاڑھی خشخاشی، چہرہ شگفتہ، آنکھیں روشن اور پیشانی فراخ تھی وہ بہترین اخلاق کے مالک، رحم دل اور نرم خو تھے۔ ہوش و خرد، عاقبت اندیشی اور بلندیٔ فکر و نظر کے لحاظ سے مکہ کے بہت کم لوگ ان کے ہم پلہ تھے۔ عقل و خرد جہاں انسان کے قلب و نظر کو جلا بخشتی ہے وہاں بسا اوقات بے راہ روی کا موجب بھی ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی طرف سے ابوبکرؓ کو قلبِ سلیم ودیعت ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی قوم کے اکثر گمراہ کن اعتقادات اور رسوم و عادات سے بالکل الگ رہتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انھوں نے جاہلیت اور اسلام، دونوں زمانوں میں شراب کا قطرہ تک نہ چکھا حالانکہ اہلِ مکہ شراب کے عادی ہی نہیں بلکہ عاشق تھے۔ ابن ہشام اپنی سیرت میں ان کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ابوبکر اپنی قوم میں بہت ہر دل عزیز تھے۔ علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ قریشِ مکہ کے تمام خاندانوں کے نسب انھیں ازبر یاد تھے اور ہر قبیلے کے عیوب و نقائص اور محامد و فضائل سے بہ خوبی واقف تھے۔ اس وصف میں قریش کا کوئی فرد ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ خلیق، ایمان دار اور ملنسار تاجر تھے۔ قوم کے تمام لوگ ان کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ برتاؤ کے معترف تھے اور انھیں فضائل کے باعث ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔"

رسول اللہؐ سے تعلق اور قبولِ اسلام

ابوبکرؓ کا قیام مکہ کے اس محلے میں تھا جہاں حضرت خدیجہؓ بنت خویلد اور دوسرے بڑے بڑے تاجر سکونت پذیر تھے اور جن کی تجارت یمن و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی محلے میں رہنے کے باعث رسول اللہؐ سے ان کا رابطہ پیدا ہوا اور دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ حضرت خدیجہ سے شادی کرنے کے بعد انھیں کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ ابوبکرؓ رسول اللہؐ سے دو سال چند ماہ چھوٹے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ہم عمری، پیشے میں

اشتراک، طبیعتوں میں یک جہتی، قریش کے عقائدِ فاسدہ سے نفرت اور بری عادتوں سے اجتناب، اِن تمام باتوں نے دونوں کی دوستی کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دی۔ مؤرخین اور راویوں میں دونوں کی دوستی کے متعلق بھی اختلافات ہے۔ بعض تو یہ لکھتے ہیں کہ بعثت سے پہلے ہی رسول اللہؐ سے ابوبکرؓ کی گہری دوستی ہو چکی تھی اور یہی دوستی و یک جہتی ان کے سب سے پہلے اسلام لانے کا محرک ہوئی لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ دونوں کے تعلقات میں استواری اسلام کے بعد ہوئی، اسلام سے پہلے دونوں کے تعلقات صرف ہمسایگی اور ذہنی میلانات و رجحانات میں یکسانی تک محدود تھے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ بعثت سے قبل رسول اللہؐ عزلت اور گوشہ نشینی پسند کرتے تھے اور اُنھوں نے کئی سال سے لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا تقریباً ترک کر رکھا تھا۔ جب اللہ نے آپ کو رسالت کے شرف سے مشرف کیا تو خیال آیا کہ ابوبکرؓ کو اللہ نے عقل و خرد سے حصّہ وافر دے رکھا ہے اس لیے سب سے پہلے اُنھیں اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ آپ ان کے پاس گئے اور انھیں اللہ کی طرف بلایا جس پر ابوبکرؓ نے کسی تردد کا اظہار نہ کیا اور ایک لمحے کے توقف کے بغیر ایمان لے آئے۔ اُس وقت سے دونوں کے درمیان تعلقات کا آغاز ہوا اور ان تعلقات میں روز بروز استواری پیدا ہوتی چلی گئی۔ ابوبکرؓ نے رسول اللہ کی محبت و اُلفت میں اپنے آپ کو سرتاپا غرق کر دیا اور ایمان کا وہ نمونہ پیش کیا جس کی نظیر رہتی دنیا تک پیش نہ کی جاسکے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اپنے والدین کو دین اسلام کی محبت میں ترقی ہی کرتے دیکھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب رسول اللہؐ ہمارے گھر صبح و شام تشریف نہ لاتے ہوں۔

آغازِ اسلام ہی سے ابوبکرؓ اپنے اندر دین حق کی اشاعت و ترویج میں رسول اللہؐ کی امداد و اعانت کا غیر معمولی جذبہ رکھتے تھے اور ہر وقت نہایت اخلاص سے اِس میں مشغول رہتے تھے۔ چونکہ ابوبکرؓ عوام و خواص میں بہت ہر دلعزیز تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی بے حد عزت و عقیدت تھی اس لیے بہت جلد متعدد اشخاص ان کی تبلیغ سے اسلام لے آئے۔ عثمانؓ بن عفان، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، طلحہؓ بن عبیداللہ، سعدؓ بن ابی وقاص اور زبیرؓ بن عوام جو اوّلین صحابہ میں سے ہیں، ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے اِسلام لائے تھے۔ بعد میں بھی

ابو عبیدہؓ بن جراحؓ اور اکثر دوسرے لوگ ان کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہوئے۔

بلا تردد قبولِ اسلام کا سبب

ابوبکرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ پڑھتے ہی طبعاً دل میں خیال آتا ہے، یہ بڑی ہی حیرت انگیز بات ہے کہ انھوں نے اسلام قبول کرتے وقت کسی ہچکچاہٹ اور تردد کا اظہار نہ کیا اور جونہی رسول اللہ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا انھوں نے فوراً بے پس و پیش اُسے قبول کر لیا۔ چنانچہ خود رسول اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے جس کسی کو اسلام کی طرف بلایا اُس نے کچھ نہ کچھ تردد اور ہچکچاہٹ کا اظہار کیا سوا ابوبکر بن ابی قحافہ کے جب میں نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے بغیر کسی تامل کے فوراً میری آواز پر لبیک کہا۔"

صرف یہی امر تعجب انگیز نہیں کہ ابوبکرؓ نے توحید کی دعوت سنتے ہی اِس امر پر لبیک کہا بلکہ جب رسول اللہ نے غارِ حرا میں فرشتے کے نزول اور وحی اُترنے کا واقعہ انھیں سنایا تو بھی انھوں نے خفیف ترین شک کا اظہار نہ کیا اور بے پس و پیش آپ کی تمام باتوں کا یقین کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوبکرؓ مکہ کے اُن عقل مند انسانوں میں سے تھے جو ایک طرف بتوں کی عبادت کو حماقت سے تعبیر کرتے تھے اور دوسری طرف دل و جان سے رسول اللہ کی صداقت، امانت، نیکی اور پاک بازی کے قائل تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ کی باتیں سنیں تو کوئی شک دل میں لائے بغیر وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئے کیونکہ انھیں نہ صرف آپ کی صداقت پر کامل یقین تھا بلکہ آپ کی پیش کردہ تمام باتیں بھی سراسر حکمت پر مبنی نظر آتی تھیں اور وہ انھیں عقل و فکر کے تقاضوں پر پورا اُترتے دیکھتے تھے۔

جرأتِ ایمانی

ہمارے نزدیک ان کے بلا توقف اور بلا تردد اسلام قبول کرنے سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر ان

---

[1] یہ سب کے سب بلند پایہ صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے جن لوگوں کو مسلمان کیا وہ تمام اپنے ایمان و اخلاص میں بے نظیر ثابت ہوئے۔ (مترجم)

کی وہ بے نظیر جرأت ہے جو اسلام قبول کرتے ہی انھوں نے اس کی اشاعت کے سلسلے میں دکھائی۔
وہ نہ صرف دل و جان سے توحید و رسالت پر ایمان لائے بلکہ علانیہ ان باتوں کی تبلیغ بھی شروع کر دی
اور اس بات کا مطلق خیال نہ کیا کہ اس طرح آئندہ چل کر ان کے لیے کتنے خطرات پیدا ہوں گے۔ ان کا
شمار مکہ کے معزز تاجروں میں ہوتا تھا۔ اور ایک تاجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے گہرے
دوستانہ و روادارانہ تعلقات رکھے اور ان باتوں کے اظہار سے احتراز کرے جو عوام کے مروّجہ عقائد
و اعمال کے خلاف ہوں، مبادا اس کی تجارت پر برا اثر پڑے۔ دُنیا میں اس قسم کے مظاہر عام طور پر
نظر آتے ہیں کہ اکثر لوگ عامۃ النّاس کے عقائد و خیالات پر اعتقاد نہ رکھنے کے باوجود نہ صرف اپنے
فائدے، مصلحت یا عافیت کی خاطر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے خاموش بیٹھے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات
اپنے ذاتی خیالات کے برعکس عوام کی انہی باتوں کی تائید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنھیں وہ اپنے
دل میں غلط، فضول اور لایعنی سمجھتے ہیں۔ عام لوگوں ہی کا یہ حال نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جنھیں قوم کی قیادت
کا دعویٰ ہوتا ہے اور جو اس کے لیے راہِ عمل متعین کرنے کے مدعی ہوتے ہیں، بالعموم رائے عامہ
کی کھلم کھلا مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ لیکن ابوبکرؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد پہلے ہی
دن سے جو عظیم الشان نمونہ دکھایا وہ نظیر نہیں رکھتا۔ اگر وہ خفیہ طور پر صرف رسول اللہ کی تصدیق
پر اکتفا کرتے اور تجارت میں نقصان کے ڈر سے اپنے اسلام کو مخفی رکھتے تو بھی رسول اللہ کو شاید
کوئی اعتراض نہ ہوتا اور آپ ان کی طرف سے محض اسلام کے اظہار ہی کو کافی سمجھتے، لیکن ابوبکرؓ
نے ایسا نہ کیا۔ وہ علانیہ اسلام لائے اور معاً بعد اپنی ساری زندگی اسلام کی خدمت کے لیے
وقف کر دی۔ انھوں نے نہ اپنی تجارت کا خیال کیا اور نہ کفارِ مکہ کی مخالفت و ایذا رسانی کا بلکہ بڑے
انہماک سے تبلیغِ دین میں مشغول ہو گئے۔ ایسا جرأت مندانہ اقدام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے
دین کے راستے میں نہ جان کی پروا ہو نہ مال کی، اور جو مال و منال اور دنیوی وجاہت و عزت کو دین
کی خدمت اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھتا ہو۔

خادمِ اوّلیں

بے شک حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن خطاب نے بھی اسلام کی سربلندی اور اس کی

اشاعت کے لیے زبردست کوشش کی اور ان کے ذریعے سے دین کو بے حد تقویت پہنچی لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ابوبکرؓ ہی وہ شخص تھے جنھیں اللہ نے سب سے پہلے اپنے دین کی خدمت کے لیے چنا۔ دین اسلام اور اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ نے اس نیک نفس اور انتہائی رقیق القلب شخص کے دل میں وہ قوت ایمانی پیدا کر دی تھی جس کا پیدا کرنا دنیا میں کسی بھی طاقت کے بس میں نہ تھا۔ اور ایک ابوبکرؓ کی مثال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قوتِ ایمانی اپنے اندر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے۔

غرباء، مساکین اور مظلوموں کی امداد

ابوبکرؓ نے اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو تبلیغ کرنے اور ان بیکس و مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی کرنے ہی پر اکتفا نہ کی جو قریشِ مکہ کے ہاتھوں محض اسلام لانے کی وجہ سخت مظالم برداشت کر رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنا مال بھی ان غریب لوگوں پر دل کھول کر خرچ کیا جنھیں اللہ نے اسلام کی جانب رہنمائی کی تھی اور دشمنانِ حق نے انھیں تکالیف پہنچانے اور ان پر نت نئے مظالم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جس روز وہ اسلام لائے ان کے پاس چالیس ہزار درہم موجود تھے۔ تجارت کا سلسلہ انھوں نے اسلام لانے کے بعد بھی جاری رکھا اور اس سے وافر نفع حاصل کیا لیکن اس کے باوجود جب دس سال بعد ہجرت کا موقع پیش آیا تو اُن کے پاس صرف پانچ ہزار درہم باقی تھے۔ اس دوران میں انھوں نے جو کچھ کمایا اور جو کچھ پہلے پس انداز کر رکھا تھا وہ سب کا سب اللہ کی راہ میں اسلام کی تبلیغ میں اور ان غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کر دیا جو محض اسلام لانے کے جرم میں اپنے بے دین آقاؤں کے ہاتھوں ہولناک سختیاں برداشت کر رہے تھے۔

ایک روز انھوں نے بلال کو دیکھا کہ ان کے آقا نے انھیں دوپہر کے وقت شدید دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹایا اور ان کے سینے پر پتھر رکھ کر کہا "اسلام چھوڑ دینے کا اعلان کرو ورنہ اسی طرح مار ڈالوں گا۔" یہ دردناک منظر دیکھ کر ابوبکرؓ نے انھیں ان کے آقا سے خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح ایک اور غلام عامر بن فہیرہ کو مسلمان ہونے کی وجہ سے سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ ابوبکرؓ نے انھیں بھی خرید کر اپنی بکریوں کی نگہداشت اور چرانے کا کام سپرد کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے اور

بھی بیسیوں غلام خرید کر انھیں اللہ کی راہ میں آزاد کیا۔

رسولؐ اللہ کی تائید و حمایت

رسولؐ اللہ کا مرتبہ قریش میں بہت بلند تھا۔ آپ کا شمار قبیلے کے معزز ترین افراد میں ہوتا تھا علاوہ ازیں بنو ہاشم بھی آپ کی حمایت پر تھے لیکن ان باتوں کے باوجود آپ قریش کی ایذا رسانیوں سے بچ نہ سکے۔ یہی حال ابوبکرؓ کا بھی تھا۔ انھیں بھی شہر کا سربرآوردہ فرد ہونے کے باوجود محض اسلام لانے کے جرم میں قریش کے مظالم کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ لیکن اس پر بھی جب کبھی آپ نے دیکھا کہ قریش رسولؐ اللہ کو تکلیفیں پہنچا رہے ہیں تو انھوں نے جان تک کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو حضورؐ کے بچانے کے لیے پیش کر دیا۔ ابنِ ہشام اپنی سیرت میں لکھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کو قریش کے ہاتھوں سب سے زیادہ تکلیف اس وقت پہنچی جب بت پرستی کی مذمت میں آیات نازل ہوئیں۔ وہ لوگ خانہ کعبہ میں اکٹھے ہوئے اور ایک شخص کہنے لگا "تم نے سن لیا محمد ہمارے بتوں کے متعلق کیا الفاظ کہتا ہے۔ یہ محض تمھاری کمزوری کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمھارے دین اور تمھارے بتوں کے متعلق جس قسم کے الفاظ چاہتا ہے کہتا ہے لیکن تم خاموش رہتے ہو۔" ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ بھی ادھر سے گزرے۔ جب انھوں نے آپ کو دیکھا تو یک دم آپ پر جھپٹ پڑے اور کہنے لگے "تم نے ہمارے بتوں کے متعلق یہ یہ الفاظ استعمال کیے ہیں؟" رسولؐ اللہ نے فرمایا "بے شک! میں نے ہی یہ الفاظ کہے ہیں۔" اس پر ایک آدمی نے آپ کی چادر چھین لی اور اسی سے آپ کا گلا گھونٹنے لگا۔ اتنے میں ابوبکرؓ بھی ادھر تشریف لے آئے۔ انھوں نے یہ دیکھ کر آپ کو کفار کے نرغے سے چھڑایا اور ان سے کہا "کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کر ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" راوی ذکر کرتا ہے کہ یہ وہ دن تھا جب رسولؐ اللہ کو کفار کے ہاتھوں سخت ترین تکلیف پہنچی۔

صرف اسی موقع پر نہیں بلکہ بعد میں بھی اکثر مواقع پر ابوبکرؓ نے خدا کی وحدانیت اور رسولؐ اللہ کی رسالت پر ایمان کامل کا ثبوت دیا۔ ان کے اسی جذبۂ ایمانی کو دیکھ کر بعض مستشرقین کو رسولؐ اللہ کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کو محمدؐ سے کسی قسم کے دنیوی فائدے

کی توقع نہ تھی۔ اس کے برعکس وہ شب و روز یہ دیکھتے تھے کہ مکہ والے محمدؐ کو ہر قسم کی تکلیفیں دیتے، آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے ماننے والوں کو تنگ کرتے ہیں۔ اگر محمدؐ اپنے دعوے میں جھوٹے ہوتے تو ابوبکرؓ جیسے عقل مند اور مدبّر شخص کو آپ پر ایمان لانے آپ کے دعاوی کی تصدیق کرنے، آپ کی ہر طرح مدد کرنے اور قریش میں خود اپنی پوزیشن خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ محض اپنی عقل و فراست کے بل بوتے پر اپنے اندر وہ ایمان پیدا نہ کر سکتے تھے جو انسان کو تمام خطرات سے بے پروا کر کے اس میں شدید تڑپ اور دھن پیدا کر دیتا ہے۔ جس ایمان کا مظاہرہ ابوبکرؓ نے کیا اور جس طرح انھوں نے رسول اللہؐ کے ہر قول و فعل کی تصدیق کی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام یقیناً خدا کی طرف سے ہے کیونکہ ایک باطل مذہب اور ایک جھوٹا شخص کبھی اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا ایمان پیدا نہیں کر سکتا۔

اسراء کے موقع پر

اسراء کے موقع پر ابوبکرؓ نے جس قوّتِ ایمانی کا ثبوت دیا وہ نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ اس نے بہت سے مسلمانوں کو ٹھوکر کھانے سے بچا لیا۔ جب رسول اللہؐ نے اہلِ مکہ سے بیان فرمایا کہ رات آپ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس لے جایا گیا اور وہاں آپ نے مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھی تو مشرکین نے آپ کا مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ مکّہ سے شام تک کا فاصلہ ایک مہینے کا ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ محمدؐ بیت المقدس جائیں اور ایک ہی رات میں دو مہینے کی مسافت طے کر کے واپس آ جائیں۔ بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھی تردد پیدا ہو گیا اور انھوں نے جا کر ابوبکرؓ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ یہ سن کر ابوبکرؓ پر دہشت سی طاری ہو گئی اور وہ کہنے لگے کہ تم رسول اللہؐ پر بہتان باندھتے ہو۔ لوگوں نے کہا "ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے، آپ نے ابھی مسجد میں یہ بات بیان فرمائی ہے۔" یہ سن کر ابوبکرؓ کہنے لگے "اگر آپ نے واقعی یہی کہا ہے تو بالکل سچ کہا ہے۔ جب اللہ آسمان سے چند لمحوں میں وحی نازل فرما دیتا ہے تو اس کے لیے رات بھر میں آپ کو مکّہ سے بیت المقدس لے جانا اور واپس لے آنا کیا مشکل ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسجد میں آئے۔ آپ اس وقت بیت المقدس کا حال بیان فرما رہے تھے۔ ابوبکرؓ بیت المقدس ہو آئے تھے جب آپ مسجدِ اقصیٰ کا حال بیان کر کے فارغ

ہوئے تو ابوبکرؓ نے کہا "یا رسول اللہ! آپ بالکل سچ فرماتے ہیں"۔ اس وقت آپ نے ابوبکرؓ کو 'صدیق' کا لقب عطا فرمایا۔

اگر ابوبکرؓ بھی اسراء کے واقعے میں شک کا اظہار کرتے تو یقیناً بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے اور جو لوگ اسلام پر قائم بھی رہتے ان کے دلوں میں بہر حال شکوک و شبہات گھر کر جاتے۔ لیکن ابوبکرؓ کی قوتِ ایمانی نے نہ صرف لوگوں کو مرتد ہونے سے بچایا بلکہ ان کے دلوں کو بھی شکوک و شبہات سے پاک کر دیا۔ یہ واقعات دیکھ کر بہر صورت ماننا پڑتا ہے کہ ابوبکرؓ کے ذریعے سے دین اسلام کو جو تقویت حاصل ہوئی وہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے ذریعے سے بھی حاصل نہ ہو سکی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے خود رسول اللہ نے فرمایا تھا 'لو کنت متخذا من العباد خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا' یعنی اگر میں بندوں میں سے کسی کو گہرا اور دلی دوست بناتا تو یقیناً ابوبکرؓ کو بناتا (گہرا اور دلی دوست سوا خدا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا)۔

اسراء کے بعد

اسراء کے واقعے کے بعد ابوبکرؓ سارا وقت رسول اللہ کی صحبت، کمزور اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت اور اسلام کی تبلیغ میں گزارنے لگے۔ تجارت صرف اسی حد تک کرتے جس سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا گزارہ چلا سکیں۔ اس دوران میں رسول اللہ، ابوبکرؓ اور دوسرے مسلمانوں پر قریش کے مظالم میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی۔ . . . . قریش نے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ سعی باقی نہ چھوڑا۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو حبشہ کی جانب ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ متعدد مسلمان ان مظالم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے لیکن ابوبکرؓ نے رسول اللہ کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا[1] اور بدستور مکہ میں رہ کر تبلیغ کرنے، مظلوموں

---

[1] اس کے برعکس ایک روایت میں مذکور ہے کہ ابوبکرؓ بھی حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں مکہ کا ایک سردار ابن دغنہ الحبش ملا۔ جب اسے ان کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بولا "آپ ہجرت نہ کریں۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، نہایت صادق القول ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور بیکسوں اور مظلوموں کا دکھ درد دور کرتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴ پر)

کی مدد کرنے اور انھیں بے دینوں سے چھڑانے کے کام میں سرگرمی سے معروف رہے، اور مکہ میں اسلام پھیلانے کا فرض پوری خوبی اور تن دہی سے انجام دیتے رہے۔

جب رسول اللہؐ اہلِ مکہ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو آپ نے دوسرے قبائل عرب تک خدائی پیغام پہنچانے کا ارادہ فرمایا۔ اِس غرض کے لیے آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن انھوں نے آپ سے جو سلوک کیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اِس دوران میں ابوبکرؓ مکہ میں رہ کر مسلمانوں کی ہمتیں اور حوصلے بلند رکھنے اور انھیں حتی المقدور کفّار کے مظالم سے بچانے میں مشغول رہے۔

کمزور مسلمانوں کی حفاظت

گو اِس سلسلے میں مؤلفین سیرت اور ابوبکرؓ کے سوانح نگاروں نے کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالی پھر بھی ابوبکرؓ کی زندگی پر گہری نظر رکھنے والے لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اِس دوران میں وہ خاموش نہ بیٹھے بلکہ انھوں نے حسبِ معمول حضرت حمزہؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے معزز و سربرآوردہ مسلمانوں سے مل کر کمزور مسلمانوں کو قریش کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے وسیع اثر و رسوخ کے ذریعے سے کفار میں ایسے اشخاص سے بھی تعلق قائم کیا جو بتوں کو پوجنے اور اسلام کی مخالفت کرنے کے باوجود قریش کی ان ایذا رسانیوں کو، جو وہ غریب و بیکس مسلمانوں پر روا رکھتے تھے، نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے انھیں اِس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے بھائی بندوں کی ان انسانیت سوز حرکات پر برملا نفرت کا اظہار کریں اور انھیں ایسا کرنے سے روکیں۔ چنانچہ کتب سیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) ہیں۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں، آپ واپس مکہ چلیے۔" چنانچہ وہ مکہ آ گئے۔ ابن دغنہ نے اپنے وعدے کے مطابق خانۂ کعبہ میں اعلان کر دیا کہ مَیں نے ابوبکرؓ کو پناہ دے دی ہے۔ قریش نے بھی اِس پناہ کو قبول کر لیا۔ ابوبکرؓ نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا رکھی تھی جہاں وہ نماز پڑھتے اور پرسوز لہجے میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ مشرکین کی عورتیں اور بچے تلاوت کی آواز سن کر اُن کے گرد جمع ہو جاتے اور بڑے انہماک سے قرآن مجید سنتے رہتے تھے۔ جب قریش نے یہ دیکھا تو انھیں ڈر پیدا ہوا کہ کہیں اُن کی عورتیں اور بچے ابوبکرؓ کی تلاوت سن کر اسلام کا اثر قبول نہ کر لیں۔ انھوں نے ابن دغنہ سے شکایت کی جس پر اُس نے اپنی پناہ واپس لے لی اور ابوبکرؓ پھر کفّار کے مظالم کا نشانہ بن گئے۔

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ میں سے بعض ایسے منصف مزاج آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جو اپنے ہم مذہب لوگوں کو مسلمانوں پر ظلم کرنے سے روکتے تھے۔ اس کی واضح مثال اس وقت نظر آتی ہے جب قریش نے معاہدہ کر کے رسول اللہؐ اور مسلمانانِ مکہ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا اور آپ شعب ابی طالب میں محصور رہنے پر مجبور ہوئے تھے۔ بائیکاٹ کا یہ سلسلہ لگا تار تین سال تک جاری رہا۔ مسلمانوں پر معاش کے تمام دروازے بند کر دیے گئے اور انھیں ایسی ایسی تکالیف پہنچائی گئیں جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی قلم تھرتھراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ آخر قریش ہی میں سے بعض لوگ اس ظالمانہ معاہدے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور رسول اللہؐ اور دوسرے مسلمانوں کو مکمل بائیکاٹ اور محاصرے سے رہائی ملی۔ ہمیں یقین ہے کہ ابوبکرؓ ہی نے ان نیک دل لوگوں سے مل کر انھیں معاہدے کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار کیا ہوگا۔

اسلام کے اوّلین دور میں مسلمانوں کی مدد کرنے اور ہمہ تن اسلام کی تبلیغ میں مشغول رہنے کے باعث ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان ایسا تعلق قائم ہو گیا جس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔ بیعت عقبہ کے بعد جب یثرب میں اسلام پھیل گیا تو رسول اللہؐ نے اپنے متبعین کو اجازت دے دی کہ وہ یثرب ہجرت کر جائیں۔ قریش قطعاً لاعلم تھے کہ آیا اس مرتبہ محمدؐ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر جائیں گے یا ہجرتِ حبشہ کی طرح مسلمانوں کو یثرب بھیج کر خود مکہ ہی میں مقیم رہیں گے۔ اس موقع پر ابوبکرؓ نے بھی ہجرت کرنے کی اجازت مانگی لیکن رسول اللہؐ نے یہ فرما کر انھیں یثرب جانے سے روک دیا:

"ابھی ایسا نہ کرو، شاید اللہ تمھارا کوئی ساتھی پیدا کر دے جو ہجرت کے موقع پر تمھارے ہمراہ ہو۔"

ہجرت کی تیاری اور ہجرت

اس واقعے سے ابوبکرؓ کی پختگیِ ایمان کا ایک اور ثبوت ملتا ہے اور وہ یہ کہ آپ کو پتا تھا جب سے قریش کو مسلمانوں کی یثرب کی جانب ہجرت کرنے کی خبر ملی ہے وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان مکہ سے کسی طرح باہر نہ نکلنے پائیں تاکہ وہ انھیں ستا ستا کر اور عذاب دے دے کر ہوسِ انتقام کی تسکین کا سامان پیدا کر سکیں۔ ابوبکرؓ کو یہ بھی علم تھا کہ قریش دارالندوہ میں جمع ہو کر رسول اللہؐ کے قتل

کے منصوبے باندھ رہے ہیں اور اگر وہ (ابوبکر) ہجرت کے موقع پر آپ کے ساتھ ہوئے اور قریش خدانخواستہ آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ آپ کے ساتھ انھیں بھی قتل کر دیں گے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب رسولؐ اللہ نے انھیں ہجرت میں توقف کرنے کا ارشاد فرمایا تو وہ نہ صرف اپنے ارادے سے باز ہی رہے بلکہ ان کے دل میں سرور و بہجت کی ایک لہر دوڑ گئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ رسولؐ اللہ انھیں ہجرت کے موقع پر اپنا ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔ رسولؐ اللہ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنا وہ نعمت تھی کہ دنیا کی ساری نعمتیں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ آپ کے حسبِ ارشاد ٹھہر گئے اور سمجھ لیا کہ اس موقع پر شہادت بھی نصیب ہو گئی تو یہ ایسی شہادت ہو گی جو اپنی جلو میں جنت اور اس کی تمام نعمتوں کو لیے ہو گی اور جس پر ہزاروں برس کی زندگی بخوشی قربان کی جا سکتی ہے۔

اسی روز ابوبکرؓ نے دو اونٹنیوں کا انتظام کیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب ہجرت کا حکم نازل ہو کر انھیں رسولؐ اللہ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ایک روز حسبِ معمول شام کے وقت آپ ان کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے انھیں یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ ابوبکرؓ نے بے تابی سے رفاقت کی خواہش ظاہر کی جسے آپ نے بڑی خوشی سے قبول فرما لیا اور بعض ضروری ہدایات دے کر واپس اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اسی دن قریش کے نوجوانوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور انتظار کرنے لگے کہ کب آپ باہر نکلتے ہیں اور انھیں کب آپ کو قتل کرنے کے لیے اپنی تلواروں کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ آپ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو حکم دیا کہ وہ آپ کی سبز حضرمی چادر اوڑھ لیں اور بے خوف و خطر آپ کے بستر پر سو جائیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو آپ قریش کے لوگوں کو غفلت کی حالت میں پا کر اپنے گھر سے نکلے اور ابوبکرؓ کے پاس پہنچے۔ وہ جاگ رہے تھے۔ فوراً دونوں گھر کی پشت کی ایک کھڑکی سے باہر نکلے اور جانب جنوب تین چار میل کی مسافت طے کر کے غار ثور تک پہنچے اور وہاں چھپ گئے۔

صبح ہونے پر جب قریش کو رسولؐ اللہ کے مکہ سے نکل جانے کا پتا چلا تو انھوں نے چاروں طرف آپ کی تلاش میں آدمی دوڑائے۔ مکہ کے قریب کوئی وادی کوئی میدان اور کوئی پہاڑ نہ تھا جو انھوں نے نہ چھان مارا ہو۔ وہ لوگ آپ کو تلاش کرتے کرتے غار ثور تک بھی پہنچ گئے اور ایک آدمی نے غار میں

اُترنے کا ارادہ بھی کیا۔ جب ابوبکرؓ نے ان لوگوں کی آوازیں سنیں تو ان کی پیشانی سے پسینہ چھوٹ پڑا اور انھوں نے اپنا سانس تک روک لیا مبادا کسی قسم کی آواز نکل کر دشمنوں کو ان کے یہاں ہونے کا احساس دلا دے، لیکن رسول اللہ بڑے اطمینان سے اللہ کے ذکر اور دعاؤں میں مشغول رہے۔ جب آپ نے ابوبکرؓ کی گھبراہٹ دیکھی تو جھک کر ان کے کان میں کہا لاتحزن ان اللہ معنا (ڈرو مت، اللہ ہمارے ساتھ ہے) ادھر قریشی نوجوان نے اپنی نظر غار کے اردگرد دوڑائی تو دیکھا کہ غار کے منہ پر ایک مکڑی نے جالا تن دیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ واپس ہو گیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس سے غار میں نہ اُترنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ غار کے منہ پر ایک مکڑی نے جالا تن رکھا ہے۔ اگر محمد غار میں جاتے تو یقیناً جالا ٹوٹ جاتا اس لیے میں واپس آ گیا۔ یہ سن کر وہ لوگ حالتِ مایوسی میں وہاں سے چلے گئے۔ جب وہ دُور نکل گئے تو رسول اللہ نے پکار کر فرمایا "اللہ اکبر، اللہ اکبر" ابوبکرؓ بھی خدا کی قدرت کا یہ عجیب تماشا دیکھ کر وجد میں آ گئے۔

غارِ ثور میں گھبراہٹ کی وجہ

اِس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ کی گھبراہٹ — جس کے باعث ان کی پیشانی سے پسینے چھوٹنے لگے تھے اور ان کا سانس تک رُک گیا تھا — اپنی جان جانے کے خوف سے تھی یا اس وجہ سے کہ رسول اللہ کا بال بیکا نہ ہو جائے؟ آیا اس وقت انھیں اپنی جان کا خیال تھا یا رسول اللہ اور حضرت رسول اللہ کی جان کا؟ اس کا تسلی بخش جواب ہمیں مندرجہ ذیل روایات میں ملتا ہے۔

ابنِ ہشام حسن بن ابوالحسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ اور ابوبکرؓ آدھی رات کو غار پر پہنچے تو آپ سے پہلے ابوبکرؓ غار میں داخل ہوئے اور اسے اچھی طرح دیکھا بھالا، مبادا اس میں کوئی سانپ، بچھو یا درندہ چھپا بیٹھا ہو اور رسول اللہ کو خدانخواستہ کوئی ضرر پہنچ جائے۔ بالکل یہی جذبہ ان کا اُن نازک لمحات میں تھا جب انھوں نے غار کے سرے پر قریش کے نوجوانوں کو دیکھا۔ اس وقت انھوں نے جھک کر رسول اللہ کے کان میں کہا "اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کے نیچے نظر کرے تو یقیناً ہمیں دیکھ لے گا۔" اس وقت ابوبکرؓ کو اپنی جان کا مطلق خیال نہ تھا اگر خیال تھا تو صرف رسول اللہ کا اور اس دین کا جس کی خاطر انھوں نے اپنی جان کی کوئی حقیقت نہ سمجھی تھی۔

انھیں نظر آ رہا تھا کہ اگر اس وقت خدانخواستہ کفار نے رسول اللہ پر قابو پا لیا تو دینِ اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا اپنی ذات کا خیال انھیں آ ہی کس طرح سکتا تھا جب انھوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ کی محبت اور دین اسلام کے عشق میں بالکل جذب کر لیا تھا۔

وہ تو اپنے نفس کو پہلے ہی عشق رسول اللہ میں فنا کر چکے تھے۔ اس لیے اللہ کے رستے میں دوبارہ فنا ہونے سے انھیں کیا ڈر ہو سکتا تھا؟

تاریخ کے مطالعے سے متعدد ایسے اشخاص کے حالات معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی جانیں اپنے سرداروں اور بادشاہوں پر قربان کر دیں۔ آج کل بھی اکثر زعما، ایسے ہیں جنھیں ان کے معتقدین انتہائی تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے اور انھیں اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ لیکن ابوبکرؓ نے غار میں جو نمونہ دکھایا وہ ان سب سے الگ اور بالا حیثیت رکھتا ہے۔ کیا بادشاہوں اور لیڈروں کی تاریخوں میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے کہ ان کی رعایا یا معتقدین میں سے کسی فرد نے ان کے لیے ایسی قربانی پیش کی ہو؟ ایثار اور قربانی کی اس مثال کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔

جب کفار کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑا اور انھیں ان دونوں کے ملنے سے مایوسی ہو گئی تو آپؐ اور ابوبکرؓ غار سے نکلے اور یثرب کا رُخ کیا۔ رستے میں بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جو خطرے کے لحاظ سے اس واقعے سے کم نہ تھے جو غار میں پیش آ چکا تھا۔ ابوبکرؓ نے مکہ سے نکلتے ہوئے پانچ ہزار درہم بھی ساتھ لے لیے تھے جو تجارت کے منافع میں سے ان کے پاس باقی بچ گئے تھے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے ایک عام مہاجر کی سی زندگی بسر کرنی شروع کی اگرچہ ان کی حیثیت بدستور رسول اللہ کے وزیر اور مشیر کی تھی۔

مدینہ میں

مدینہ میں ان کا قیام شہر کے نواح میں مقام سنح پر خارجہ بن زید کے ہاں تھا جو قبیلہ خزرج کی شاخ بنو حارث سے تعلق رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کا سلسلہ قائم کر دیا تو ابوبکرؓ اور خارجہ کو بھائی بھائی بنا یا۔ جب ابوبکرؓ کے اہل و عیال مکہ سے مدینہ پہنچ گئے تو

انھوں نے ان سے مل کر روزی کے وسائل تلاش کرنے شروع کیے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے رشتہ داروں کی طرح ان کے رشتہ دار بھی انصار کی زمینوں پر اُن کے مالکوں سے مل کر کام کرنے لگے جن میں خارجہ بن زید بھی شامل تھے۔ خارجہ کے ساتھ ان کے تعلقات اِس حد تک بڑھ گئے کہ اُنھوں نے اپنی بیٹی حبیبہ کو ان کے عقد میں دے دیا حبیبہ کے بطن سے ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ ابوبکرؓ کی وفات کے وقت حبیبہ حالتِ حمل میں تھیں۔

ابوبکرؓ کے اہل وعیال ان کے ساتھ مقام سنح میں خارجہ بن زید کے ہاں نہ ٹھہرے تھے، بلکہ ام رومان، ان کی بیٹی عائشہ اور ابوبکرؓ کے تمام لڑکے مدینہ میں حضرت ابوایوب انصاری کے مکان کے قریب مقیم تھے۔ ابوبکرؓ سنح سے روزانہ وہاں آیا کرتے تھے البتہ ان کا مستقل قیام اپنی نئی بیوی کے ساتھ سنح ہی میں تھا۔

ہجرت کے چند روز بعد وہ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ صرف وہی نہیں بلکہ آب وہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مہاجرین بخار سے بیمار ہو گئے تھے۔ مکّہ کی آب وہوا، صحرا میں واقع ہونے کے باعث خشک تھی۔ اس کے مقابلے میں مدینہ کی آب وہوا مرطوب تھی کیونکہ وہ بارانی علاقہ تھا اور وہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔

جب انھیں اطمینان ہوا اور روزی کی طرف سے بے فکری نصیب ہوئی تو وہ اسلام کی اشاعت، رسولؐ اللہ کی معاونت اور مسلمانوں کے نئے مرکز کے استحکام میں اسی طرح منہمک ہو گئے جس طرح مکہ میں مشغول رہتے تھے۔

غیرتِ ایمانی

ابوبکرؓ نہایت نرم مزاج انسان تھے لیکن جب وہ یہود اور منافقین کی زبانوں سے دینِ خدا کے متعلق تمسخر آمیز باتیں سنتے تھے تو ان کے غصے کی انتہا نہ رہتی تھی۔ مدینہ تشریف لانے پر رسولؐ اللہ اور یہود کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت یہود اور مسلمانوں دونوں کو اپنے اپنے دین کی تبلیغ واشاعت اور اپنے اپنے رسوم ورواج پر عمل کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ یہود کا شروع میں یہ خیال تھا کہ وہ مہاجرین کو اپنے ڈھب پر لا کر انھیں مدینہ کے قبیلوں اوس وخزرج کے خلاف

استعمال کر سکیں گے لیکن چند ہی روز میں انھیں پتا چل گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور مہاجرین و اہلِ مدینہ میں ایسا تعلق قائم ہو چکا ہے جو کسی صورت ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس وقت انھوں نے اپنی پہلی روش بدل کر مسلمانوں کی مخالفت پر کمر باندھی اور اسلام کے متعلق تمسخر اور استہزار کی باتیں کرنی شروع کیں۔
ایک دن کا واقعہ ہے کہ چند یہودی اپنے ایک عالم فنحاص کے گھر میں جمع ہوئے۔ اتفاق سے اسی وقت ابوبکرؓ بھی اس طرف آ نکلے۔ انھوں نے یہودیوں کے اجتماع کو غنیمت جانتے ہوئے انھیں اسلام کی تبلیغ کرنی چاہی اور فنحاص سے کہنے لگے:

"اے فنحاص! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔ اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور اسی کی جانب سے تمھارے پاس وہ حق لے کر آئے ہیں جسے تم توریت میں لکھا ہوا پاتے ہو۔"

یہ سن کر فنحاص کے لبوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگا:

"خدا کی قسم، اے ابوبکر! ہمیں خدا سے کسی چیز کی حاجت نہیں، خود اسے ہماری حاجت ہے۔ ہم اس کی طرف نہیں جھکتے، بلکہ وہ ہماری طرف جھکنے پر مجبور ہے۔ ہم اس کی مدد سے بے پروا ہیں لیکن وہ ہماری امداد سے مستغنی نہیں۔ اگر وہ ہماری امداد سے مستغنی ہوتا تو کبھی ہمارے مال ہم سے بطورِ قرض نہ مانگتا جس طرح تمھارے رسولؐ کا خیال ہے۔ اللہ تمھیں سود لینے سے منع کرتا ہے لیکن خود ہمیں سود دیتا ہے۔ اگر وہ ہم سے مستغنی ہوتا تو ہمیں سود کیوں دیتا؟"

اس ناپاک گفتگو سے فنحاص کا مقصد دراصل اس آیت پر چوٹ کرنا تھا جس میں اللہ فرماتا ہے: من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیرۃ (کون ہے جو اللہ کو قرض دے اس کے بدلے میں اللہ اس کے مال کو کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا)۔
ابوبکرؓ نے فنحاص کو اللہ کے قول اور اس کی وحی کا مذاق اڑاتے دیکھا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور فنحاص کے اتنے زور سے ایک تھپڑ مارا کہ اس کے حواس بجا نہ رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

"اے اللہ کے دشمن! اگر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو اللہ

کی قسم! میں تیری گردن اڑا دیتا۔"

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب اور بردبار ہونے کے باوجود اس موقع پر جوش میں آ گئے حالانکہ آپ کی عمر بھی پچاس برس سے متجاوز ہو چکی تھی اور اس مرحلے پر بالعموم انسان میں جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ تھا اور اس بات کا ثبوت کہ آپ اللہ کی آیات اور اس کے رسولؐ پر استہزاء کرنے کو کسی صورت برداشت نہ کر سکتے تھے۔

رومیوں کے غلبے کی پیش گوئی

اسی قسم کی ایک اور بھی مثال ہمیں ابوبکرؓ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ ہجرت سے دس سال قبل رونما ہوا تھا جب ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کے دوران میں ایرانی رومیوں پر غالب آ گئے تھے۔ چونکہ ایرانی مجوسی تھے اور رومی اہلِ کتاب اس لیے مسلمانوں کو اہلِ کتاب کے مقابلے میں مشرکوں کے غالب آ جانے سے فطرتاً رنج پہنچا تھا۔ ان کی عین خواہش تھی کہ رومی فتح یاب ہوں کیونکہ وہ ان کی طرح اہلِ کتاب تھے۔ ایک مشرک نے ابوبکرؓ سے اس کا ذکر کیا اور اپنے ہم مذہب لوگوں کے فتح یاب ہونے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ یہ سن کر ابوبکرؓ کو سخت طیش آیا۔ اسی زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں: الم۔ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین (اگرچہ رومی ایرانیوں کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند ہی سال میں وہ پھر غالب آ جائیں گے) ابوبکرؓ نے اس پیشگوئی کی بنا پر اس مشرک سے شرط لگائی کہ ایک سال کے اندر اندر رومی ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے۔ (بعد میں رسول اللہؐ کے ارشاد پر انھوں نے یہ مدت نو سال متعین کر دی) اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اسے دس اونٹ دیں گے۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ جیسے حلیم الطبع اور نرم مزاج انسان کا غصہ صرف اس وقت بھڑکتا تھا جب عقیدے اور ایمان کا سوال درپیش ہوتا تھا۔

جب سے ابوبکرؓ رسول اللہؐ کی بیعت کر کے آپ کے دین میں داخل ہوئے اسی وقت سے ان کی رگ رگ میں ایمانِ صادق رچ گیا تھا۔ ان کے تمام اعمال و افعال میں اسی ایمانِ صادق

کا رنگ نمایاں تھا۔ تجارت، خاندان، خواہشات، غرض دنیا کی کوئی بھی چیز جو لوگوں کی زندگیوں پر اثرانداز ہوتی ہو، اُن کی نظر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ ان کا جسم، دل و دماغ اور ان کی روح خالص اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے تھی۔ یہی جذبۂ ایمانی تھا جس نے انھیں روحانیت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا کر صدیقین کے زمرے میں شامل کر دیا۔

جنگِ بدر

ہجرت کے کچھ عرصے بعد بدر کا معرکہ پیش آتا ہے۔ قریشِ مکّہ اور مسلمان اپنی اپنی صفیں مرتب کیے ایک دوسرے کے بالمقابل میدانِ جنگ میں کھڑے تھے۔ مسلمانوں نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے مشورے سے قریب کی ایک پہاڑی پر ایک شامیانہ لگا دیا اور رسولؐ اللہ سے عرض کیا کہ آپ اِس شامیانے میں تشریف رکھیں اور اگر مسلمانوں کی حالت دگرگوں دیکھیں تو اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں۔ ابوبکرؓ بھی رسولؐ اللہ کے ہمراہ تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی اور رسولؐ اللہ نے دشمن کی کثرت اور مسلمانوں کی قلّت دیکھی تو آپ نے قبلہ رو ہو کر اپنے آپ کو خدا کے حضور گرا دیا اور اس سے اس کے وعدوں کی یاد دلا دلا کر مسلمانوں کے لیے فتح و نصرت کی دعائیں مانگنی شروع کیں۔ آپ فرما رہے تھے: "اللھم ھذہ قریش قد اتت بخیلائھا تحاول ان تکذب رسولک! اللھم فنصرک الذی وعدتنی! اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ الیوم لا تعبد!" (اے اللہ! یہ قریش اپنے عظیم الشان لشکر کے ہمراہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اے اللہ! اپنے اس وعدے کو پورا فرما جو تو نے مسلمانوں کی فتح کے متعلق کیا ہے۔ اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہو گئی تو آئندہ تیرا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا)۔ آپ اِس قدر زاری اور اتنی بے چینی اور گھبراہٹ کی حالت میں اپنے رب کو پکار رہے اور ہاتھ دعا کے لیے پھیلا رہے تھے کہ بار بار آپ کی چادر زمین پر گر جاتی تھی۔ بالآخر آپ پر غنودگی کی حالت طاری ہوئی اور اللہ کی طرف سے ایک بار پھر بڑے زور سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی۔ آپ مطمئن ہو کر شامیانے سے باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے مسلمانوں کو کفار پر حملہ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ فرما رہے تھے: "مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ آج کے روز جو شخص

کفار سے لڑے گا اور اس حالت میں شہید کیا جائے گا کہ اس کے پیشِ نظر صرف اللہ کی رضا اور اس کے دین کی مدد کا جذبہ ہوگا اور اس نے میدانِ جنگ میں کفار کو پیٹھ نہ دکھائی ہوگی۔ اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔"

گو پہلے ہی سے اللہ نے رسولؐ اللہ کو فتح کی خوشخبری دے دی تھی لیکن اس کے باوجود آپ برابر گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہے جب تک ایک بار پھر اللہ کی طرف سے واشگاف الفاظ میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کا وعدہ نہ دے دیا گیا اور آپ کو دلی اطمینان نصیب نہ ہوگیا۔

واقعی ایک پیغمبر کی شان یہی ہوتی ہے۔ آپ جانتے تھے کہ اللہ کے وعدے سچے ہیں اور وہ ضرور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا۔ لیکن ساتھ ہی آپ کو یہ علم بھی تھا کہ اللہ غنی عن العالمین بھی ہے۔ ممکن ہے کہ مسلمانوں سے دورانِ جنگ میں کوئی ایسی کوتاہی سرزد ہو جائے جس کے باعث فتح و نصرت کا وعدہ دور جا پڑے اور مسلمان اوّلین مرحلے میں اپنا مقصود حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس پورے عرصے میں ابوبکرؓ رسولؐ اللہ کے ساتھ ساتھ رہے انھیں یقین تھا کہ اللہ ضرور مسلمانوں کی مدد کرکے انھیں فتح سے ہمکنار کرے گا۔ اسی لیے وہ حیرت و تعجب سے آپ کی مناجات سن رہے تھے۔ آپ انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہے اور اسے اس کا وعدہ یاد دلا رہے تھے۔ آپ کی چادر بار بار زمین پر گر پڑتی تھی اور اسے ابوبکرؓ اٹھا کر آپ کے کندھوں پر ڈالتے اور کہتے تھے :

"یارسولؐ اللہ! آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ نے آپ کو فتح و نصرت کا وعدہ دیا ہے، اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔"

اکثر دیکھا گیا ہے بعض لوگ اپنے عقیدے میں اس قدر راسخ ہوتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے جو ان عقائد میں اختلاف رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ حقیقی ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ مخالفین سے تعصب، تندی اور سختی کا برتاؤ کیا جائے لیکن ابوبکرؓ کامل الایمان ہونے کے باوجود نہایت نرم دل انسان تھے۔ سب و شتم، تندی اور سختی سے وہ کوسوں دور تھے۔ قابو پانے کے بعد مخالف کو معاف کر دینا اور فتح یاب ہونے کے بعد دشمن پر احسان کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اس طرح ان میں حق و صداقت کی محبت اور رحم و کرم کا جذبہ بیک وقت پایا جاتا تھا۔ حق کے راستے

میں وہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان کو بھی ہیچ سمجھتے تھے اور اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کو بخوشی تیار ہو جاتے تھے لیکن جب حق غالب آجاتا تو دشمن سے سختی کا برتاؤ اور اس سے مظالم کی جواب دہی کرنے کے بجائے ان میں رحم و کرم کا جذبہ ابھر آتا تھا۔

اسیرانِ بدر کی سفارش

مسلمانوں کو جنگِ بدر میں فتح نصیب ہوئی اور وہ قریش کے ستر قیدی ہمراہ لے کر مدینہ واپس آگئے۔ یہ قیدی وہی تھے جنھوں نے مکہ میں تیرہ برس تک مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ انھیں دکھائی دے رہا تھا کہ ان مظالم کا بدلہ چکانے کا وقت آپہنچا ہے اور اب مسلمان ان پر جس قدر بھی سختی کریں کم ہے۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کی سختیوں سے بچانے کی کوئی تدبیر انھیں اس کے سوا سمجھ میں نہ آئی کہ وہ ابوبکرؓ سے رحم کی التجا کریں۔ چنانچہ قریش نے انھیں بلایا اور کہا:

"اے ابوبکر! تم جانتے ہو کہ ہم قیدیوں میں سے کوئی تم لوگوں کا باپ ہے کوئی بھائی، کوئی چچا ہے اور کوئی ماموں۔ اب اگر تم ہمیں قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے تو اپنے قریبی رشتہ داروں ہی کو قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے۔ ہم رشتہ داری کا واسطہ دے کر تم سے التجا کرتے ہیں کہ تم محمدؐ سے کہ کر ہماری جان بخشی کرا دو۔ یا وہ ہم پر احسان کر کے ہمیں رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔"

ان کی یہ عاجزانہ التجا سن کر ابوبکرؓ نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی بھلائی کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تدبیر کریں گے۔ قریش کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں عمرؓ کوئی گڑبڑ نہ کر دیں۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کو بلا کر ان سے بھی وہی بات کہی جو حضرت ابوبکرؓ سے کہی تھی۔ حضرت عمر نے خشمگیں نظر سے انھیں دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابوبکرؓ اپنے وعدے کے مطابق رسول اللہؐ کے پاس گئے اور آپ سے ان مشرک قیدیوں کی سفارش کی۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اصرار کر کے اپنی بات منوا ہی لی اور تمام قیدی زرِ فدیہ کے عوض رہا کر دیے گئے۔

ابوبکرؓ کا یہ فعل ان کی پاکیزگیٔ قلب اور حد درجہ نرم دلی پر دلالت کرتا ہے۔ شاید یہ وجہ بھی ہو، انھوں نے دوربین نظر سے اس امر کا مشاہدہ کر لیا تھا کہ مشرکین مکہ بالآخر رحم کے مظاہر ول ہی کے

ذریعے سے مغلوب ہوں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ رسولؐ اللہ نے ہر قسم کی طاقت وقوت رکھنے کے باوجود ان سے مروّت و احسان کا سلوک کیا ہے تو وہ آپ سے آپ اسلام کی آغوش میں آ گریں گے (انھیں اچھی طرح علم تھا کہ ظاہری قوت کے ذریعے سے مخالف پر جسمانی لحاظ سے تو قابو پایا جا سکتا ہے لیکن اس کے دل کو مطیع نہیں کیا جا سکتا۔ مخالف کے دل پر اسی وقت فتح حاصل کی جا سکتی ہے جب طاقت کے ذریعے سے نہیں بلکہ پیار اور محبت کے ذریعے سے اسے اپنی طرف مائل کیا جائے۔)

جنگِ بدر کے بعد

غزوۂ بدر جس طرح مسلمانوں کے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا اسی طرح ابوبکرؓ کی کتابِ زندگی کا بھی ایک نیا ورق تھا۔ اِس جنگ کے بعد مسلمانوں نے ایک نئے نہج سے اپنی سیاست کو مرتب کرنا شروع کیا۔ بدر کی فتح سے مسلمانوں کو بہت بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور ان کے مخالفین کے دلوں میں ان کی جانب سے حسد اور غصے کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اس فتح نے جہاں یہود کو چوکنا کر دیا تھا اور انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب مسلمان ان کے دستِ نگر بن کر نہیں رہ سکتے وہاں مدینہ کے اردگرد بسنے والے قبائل کو بھی یہ فکر پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا مسلمانوں کا رُخ ان کی طرف پھر جائے۔ چنانچہ یہود اور مدینہ کے نواحی قبائل نے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

ان امور کی موجودگی میں رسولؐ اللہ کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ آپ ہر آن اور ہر لحظہ سختی سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہیں اور صحابہ سے مشورہ لینے کے بعد ان حالات کے مطابق اپنی پالیسی وضع کریں۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ آپ کے خاص الخاص مشیر تھے۔ ان دونوں کی طبیعتوں میں بے حد فرق تھا لیکن با ایں ہمہ دونوں نہایت مخلص اور رسولؐ اللہ کے جاں نثار تھے اور ہر مشورہ انتہائی غور و فکر سے دیتے تھے۔ ان مشوروں کی روشنی میں رسولؐ اللہ کے لیے راہِ عمل متعین کرنے میں بہت آسانی رہتی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ آپ دوسرے مسلمانوں کو بھی اپنے مشوروں میں برابر شریک کرتے تھے جس کا اثر لوگوں پر بہت اچھا پڑتا تھا اور ہر شخص خیال کرتا تھا کہ اسے رسولؐ اللہ کا اعتماد حاصل ہے اور آپ اسے بھی مشوروں میں شریک کر کے خدمت کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔

میں وہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان کو بھی ہیچ سمجھتے تھے اور اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کو بہ خوشی تیار ہو جاتے تھے لیکن جب حق غالب آجاتا تو دشمن سے سختی کا برتاؤ اور اس سے مظالم کی جواب دہی کرنے کے بجائے ان میں رحم و کرم کا جذبہ ابھر آتا تھا۔

اسیرانِ بدر کی سفارش

مسلمانوں کو جنگِ بدر میں فتح نصیب ہوئی اور وہ قریش کے ستر قیدی ہمراہ لے کر مدینہ واپس آگئے۔ یہ قیدی وہی تھے جنھوں نے مکہ میں تیرہ برس تک مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے تھے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ انھیں دکھائی دے رہا تھا کہ ان مظالم کا بدلہ چکانے کا وقت آپہنچا ہے اور اب مسلمان ان پر جس قدر بھی سختی کریں کم ہے۔ اپنے آپ کو مسلمانوں کی سختیوں سے بچانے کی کوئی تدبیر انھیں اس کے سوا سمجھ میں نہ آئی کہ وہ ابوبکرؓ سے رحم کی التجا کریں۔ چنانچہ قریش نے انھیں بلایا اور کہا:

"اے ابوبکر! تم جانتے ہو کہ ہم قیدیوں میں سے کوئی تم لوگوں کا باپ ہے کوئی بھائی، کوئی چچا ہے اور کوئی ماموں۔ اب اگر تم ہمیں قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے تو اپنے قریبی رشتہ داروں ہی کو قتل کرو گے یا ایذا پہنچاؤ گے۔ ہم رشتہ داری کا واسطہ دے کر تم سے التجا کرتے ہیں کہ تم محمدؐ سے کہ کر ہماری جان بخشی کرا دو۔ یا وہ ہم پر احسان کر کے ہمیں رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔"

ان کی یہ عاجزانہ التماس کر ابوبکرؓ نے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی بھلائی کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تدبیر کریں گے۔ قریش کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں عمرؓ کوئی گڑبڑ نہ کر دیں۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کو بلا کر ان سے بھی وہی بات کہی جو حضرت ابوبکرؓ سے کہی تھی۔ حضرت عمر نے خشمگیں نظر سے انھیں دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابوبکرؓ اپنے وعدے کے مطابق رسول اللہؐ کے پاس گئے اور آپ سے ان مشرک قیدیوں کی سفارش کی۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اصرار کر کے اپنی بات منوا ہی لی اور تمام قیدی زرِ فدیہ کے عوض رہا کر دیے گئے۔

ابوبکر کا یہ فعل ان کی پاکیزگیٔ قلب اور حد درجہ نرم دلی پر دلالت کرتا ہے۔ شاید یہ وجہ بھی ہو، انھوں نے دوربین نظر سے اس امر کا مشاہدہ کر لیا تھا کہ مشرکین مکہ بالآخر رحم کے مظاہر ول ہی کے

طرف یہودی بن اخطب کے زیر سرکردگی مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے سوچ رہے تھے، دوسری طرف قریش مکہ اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں کو زیر کرنے اور ان پر غالب آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں اور لڑائیوں کے علاوہ بنونضیر، خندق (احزاب) اور بنو قریظہ کے غزوات یہود کی فتنہ انگیز سیاست اور قریش کے غیظ و غضب کے نمایاں مظاہر ہیں۔ ان تمام لڑائیوں اور غزوات میں ابوبکرؓ نے ہمیشہ رسولؐ اللہ کے دوش بدوش حصہ لیا اور دوسرے تمام مسلمانوں سے زیادہ بہادری، صدق و ثبات اور ایمان کا ثبوت دیا۔

صلح حدیبیہ

ہجرت کے چھ سال بعد رسولؐ اللہ نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کو مکہ چلنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملنے پر قریش نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی صورت آپ اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ رسولؐ اللہ مکہ سے کچھ فاصلے پر حدیبیہ میں فروکش ہوئے اور مکہ والوں کو کہلا بھیجا کہ آپ کے آنے کا مقصد جنگ اور قریش مکہ سے چھیڑ چھاڑ کرنا نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنا ہے۔ قریش کے سفیر آپ کے پاس آنے شروع ہوئے۔ بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر عمرہ کریں۔

مسلمانوں اور بالخصوص حضرت عمرؓ بن خطاب کو معاہدے کی شرطیں سخت ناگوار گزریں۔ وہ ان شرائط کو اپنی جنگ سمجھتے اور اپنی کمزوری کا مظاہرہ خیال کرتے تھے لیکن ابوبکرؓ صدق دل سے رسولؐ اللہ کے ہر قول و فعل کے آگے سر تسلیم کیے ہوئے تھے اور انھیں پختہ یقین تھا کہ آپ کی کوئی بات اور کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اور جو کچھ آپ نے کیا ہے وہ یقیناً دین اسلام اور مسلمانوں کے فائدے کی خاطر کیا ہے۔ اس طرح آپ نے ایک بار پھر عمل سے اپنا صدیق ہونا ثابت کر دیا۔

بعدازاں جب سورۃ فتح نازل ہوئی تو مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ صلح حدیبیہ اصل میں ایک فتح مبین ہے جو اللہ نے رسولؐ اللہ کو عطا فرمائی ہے۔

اب مسلمانوں کو آئے دن قوت اور روزافزوں ترقی حاصل ہونے لگی۔ خیبر، فدک اور تیما میں یہود کا محاصرہ کیا گیا اور انھیں مطیع ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ رسولؐ اللہ نے فارس، روم، مصر، حیرہ،

یمن اور دوسرے علاقوں کے بادشاہوں اور امراء کو خطوط لکھے جن میں انھیں اسلام کی دعوت دی گئی۔
فتح مکہ اور محاصرۂ طائف کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی عروج پر پہنچ گئی۔ سارا جزیرہ نمائے عرب اسلام کے نور سے جگمگا اٹھا اور اسلامی سلطنت کی سرحدیں ایران اور روم کی عظیم الشان حکومتوں سے ٹکرانے لگیں جو اس زمانے میں دنیا کے بیشتر حصے پر قابض تھیں۔ اس وقت رسول اللہؐ اور مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ اب کوئی طاقت اس نور کو بجھا نہیں سکتی اور اسلام کا غلبہ اب کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔

جب عربوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی قوت روز بہ روز ترقی پذیر ہے اور ان کے منصوبے اور کوششیں اسے ضعف پہنچانے کے بجائے اس کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں تو وہ فوج در فوج عرب کے گوشے گوشے سے اسلام قبول کرنے کے لیے دوڑے چلے آنے لگے۔ دیدۂ بینا کے لیے یہ بات کس قدر اثر انگیز ہے کہ ایک شخص یکہ و تنہا ایک مشن لے کر اٹھتا ہے، اس کی قوم اس کے ساتھ نہیں، یہود اس کے مخالف ہیں، قبائل عرب اس کے دشمن ہیں لیکن وہ تمام مخالفتوں، رکاوٹوں اور پے در پے حملوں کے باوجود بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یقیناً حق ہی غالب ہوتا ہے اور باطل مغلوب۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ رسول اللہؐ حق پر تھے یا ناحق پر اور آپ کی دعوت سچی تھی یا جھوٹی، صرف یہی دلیل کافی ہے کہ آپ نے شدید مخالفت کے ہوتے ہوئے ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل کیا اور یہ طاقتیں اپنا پورا زور لگانے کے باوجود رسول اللہؐ کے مقابلے میں خائب و خاسر رہیں۔ آپ کا مقصد ان پر غلبہ حاصل کرنا اور انھیں فتح کر کے ان پر حکومت چلانا نہ تھا بلکہ آپ صرف یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ اللہ پر ایمان لا کر خدائی مملکت میں داخل ہو جائیں اور نیک اعمال بجا لا کر جنت کے وارث بنیں۔

امیر الحج

فتح مکہ کے بعد رسول اللہؐ کے سامنے سے تمام رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں اور آپ اسلام کے تمام فرائض و واجبات نہایت آسانی سے بجا لا سکتے تھے۔ حج بھی ایک دینی فریضہ ہے لیکن وفود کے

جوق در جوق مدینہ آنے کی وجہ سے آپ کو مکہ جانے اور بیت اللہ کا حج کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ اِس لیے فتح مکہ کے اگلے سال آپ نے اپنی جگہ ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر فرما کر روانہ کیا۔ وہ تین سو مسلمانوں کو لے کر مکہ پہنچے اور وہاں حج کے فرائض ادا کیے۔ اِسی حج کے موقع پر علیؓ بن ابی طالب نے اور بعض روایات کے مطابق خود ابوبکرؓ نے اعلان کیا کہ اِس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے مشرکین کے لیے چار مہینے کی مہلت کا اعلان کیا کہ اِس عرصے میں وہ مکہ چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں چلے جائیں۔ اس وقت سے آج تک کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کر سکے گا۔

حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال رسولؐ اللہ خود حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اِس حج کو حجۃ الوداع کہتے ہیں کیونکہ یہ آپ کا آخری حج تھا۔ آپ کے ساتھ ابوبکرؓ، دوسرے صحابہ اور آپ کی ازواجِ مطہرات بھی تھیں۔ اِس موقع پر عرفات کے میدان میں مسلمانوں کا بے نظیر اجتماع منعقد ہوا۔ یہی جگہ تھی جہاں کبھی کوئی شخص رسولؐ اللہ کی بات تک سننے کو تیار نہ ہوتا تھا لیکن آج اسی جگہ ایک لاکھ سے زاید اشخاص آپ کی اونٹنی کے گرد سر جھکائے مؤدبانہ کھڑے تھے اور انتہائی خاموشی سے آپ کے روح پرور ارشادات سن رہے تھے۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ مدینہ آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آپ نے شام پر فوج کشی کرنے کے لیے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ جس کا سردار آپ نے اسامہؓ بن زید کو بنایا اور بڑے بڑے صحابہ کو، جن میں ابوبکرؓ و عمرؓ بھی شامل تھے، لشکر کے ساتھ جانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ یہ لشکر مدینہ کے ایک قریبی مقام جرف ہی تک پہنچا تھا کہ رسولؐ اللہ کی علالت کی خبر آئی۔ یہ سن کر لشکر نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور وہ آپ کی زندگی میں شام روانہ نہ ہو سکا۔

نماز پڑھانے کا حکم

جب رسولؐ اللہ کی علالت نے شدت اختیار کی تو آپؐ نے حکم دیا کہ ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

اس ذیل میں حضرت عائشہ کی ایک روایت قابلِ اندراج ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

"جب رسولؐ اللہ زیادہ بیمار ہوتے تو بلال نماز کے لیے عرض کرنے آئے۔ آپ نے فرمایا ابوبکرؓ سے کہ دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، میں نے کہا ابوبکرؓ بہت رقیق القلب انسان ہیں۔ جب وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو ضبط نہ کرسکیں گے اور اس طرح لوگوں کی نماز میں خلل پڑے گا۔ اگر آپ عمرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیں تو بہتر ہو۔ آپ نے یہ سن کر پھر فرمایا، ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ اس پر میں نے حفصہ سے کہا، ابوبکرؓ رقیق القلب ہیں وہ نماز میں رونا شروع کر دیں گے اور لوگوں کی نماز میں خلل پڑے گا۔ تم رسولؐ اللہ سے کہو کہ وہ ابوبکرؓ کی جگہ عمرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیں۔ چنانچہ حفصہ نے جا کر یہی بات آپ سے کہ دی۔ اس پر آپ نے فرمایا، یقیناً یقیناً تم وہی عورتیں ہو جنھوں نے یوسفؑ کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اس پر حفصہ نے مجھ سے کہا تم نے مجھے ناحق شرمندہ کرایا۔"

رسولؐ اللہ کے حسب ارشاد ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔ ایک دن ابوبکرؓ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو نہ پا کر حضرت عمرؓ سے نماز پڑھانے کو کہا۔ حضرت عمرؓ بلند آواز تھے۔ جب آپ نے تکبیر کہی تو اس کی آواز حضرت عائشہ کے حجرے میں رسولؐ اللہ کے کانوں تک پہنچی۔ آپ نے فرمایا "ابوبکرؓ کہاں ہیں؟ اللہ اور مسلمان یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔"

بعض لوگ اس واقعے سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس طرح آپ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ فرما کر ابوبکرؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا کیونکہ لوگوں کو نماز پڑھانا رسولؐ اللہ کی جانشینی کا پہلا مظہر ہے۔

ابوبکرؓ، رسولؐ اللہ کی نظر میں

بیماری کے دوران ہی میں ایک روز رسولؐ اللہ مسجد میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

"اللہ نے اپنے بندے کو یہ حق دیا کہ خواہ وہ دُنیا کو اختیار کرے خواہ آخرت کو لیکن اس نے آخرت میں اللہ کے قرب کو اختیار کیا۔"

ابوبکر سمجھ گئے کہ رسول اللہ خود اپنا ذکر فرما رہے ہیں۔ وہ زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی اور انھوں نے کہا،

"یارسول اللہ! آپ پر ہماری جانیں اور ہماری اولاد قربان ہو کیا ہم آپ کے بعد زندہ رہ سکیں گے؟"

رسول اللہ نے یہ سن کر فرمایا "مسجد میں لوگوں کے گھروں کے جس قدر دروازے ہیں وہ بند کر دیے جائیں سوا ابوبکرؓ کے دروازے کے۔" پھر ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"میں نے اپنے صحابہ میں سے ابوبکرؓ سے افضل کسی کو نہیں پایا اور اگر میں بندوں[1] میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن ابوبکرؓ سے میرا تعلق ہم نشینی، بھائی چارے اور ایمان کا ہے یہاں تک کہ اللہ ہمیں اپنے پاس اکٹھا کرے۔"

وفات کے دن صبح کے وقت رسول اللہ حضرت علیؓ اور فضل بن عباس کا سہارا لیے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ اس وقت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ جب لوگوں نے آپ کو دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ نماز ہی میں رستہ بنانے کے لیے اِدھر اُدھر سمٹنے لگے۔

رسول اللہ نے اشارے سے انھیں اپنی جگہ رہنے کا حکم دیا۔ جب ابوبکرؓ نے آہٹ سنی تو سمجھ گئے کہ رسول اللہ تشریف لائے ہیں۔ اس پر وہ اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے تاکہ آپ کے لیے جگہ خالی کر دیں لیکن رسول اللہ نے اشارے سے انھیں اپنی جگہ ہی کھڑا رہنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ پھر آپ ابوبکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے نماز پڑھی۔

نماز کے بعد آپ حضرت عائشہ کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد آپ کو دوبارہ بخار آ گیا۔ آپ نے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی منگوایا اور اسے اپنے چہرے پر ملنے لگے۔ اس سے تھوڑی دیر بعد آپ کی مقدس روح ملاء اعلا کی طرف پرواز کر گئی۔

---

[1] یہ روایت ابن ہشام کی ہے۔ یہی حدیث صحاح میں مختلف الفاظ سے آئی ہے۔ ان میں سے کسی میں "بندوں" کا لفظ نہیں بلکہ بعض میں "میری اُمت" بعض میں "اس اُمت" بعض میں "لوگوں" اور بعض میں "اہلِ زمین" کے الفاظ ہیں۔

(۲)

بیعتِ خلافت

وفاتِ رسول اللہ پر مسلمانوں میں سراسیمگی

۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ مطابق ۷ جون ۶۳۲ء کو اللہ نے رسول اللہ کو جوارِ رحمت میں بلا لیا۔ اس دن صبح کے وقت آپ نے مرض میں کچھ افاقہ محسوس کیا جس پر آپ حضرت عائشہؓ کے حجرے سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے اور لوگوں سے کچھ باتیں کیں، اسامہ بن زید امیر لشکر کی کامیابی کی دعا کی اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ مملکت روم کی جانب روانہ ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ واپس حجرے میں تشریف لے آئے۔ کچھ ہی دیر بعد جب لوگوں کو اچانک معلوم ہوا کہ ان کا محبوب آقا ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے تو ان کی حالت مارے غم کے دیوانوں کی سی ہو گئی۔ حضرت عمرؓ تلوار لے کر مسجد میں کھڑے ہو گئے اور کہنا شروع کیا:

> "جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ فوت ہو گئے، میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ ہرگز فوت نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے موسیٰؑ تشریف لے گئے تھے اور چالیس رات غیر حاضر رہنے کے بعد واپس اپنی قوم میں آ گئے تھے رسول اللہ بھی یقیناً واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔"

رسول اللہ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں واپس پہنچانے کے بعد ابوبکرؓ آپ کی صحت کے بارے میں مطمئن ہو کر مدینہ کے نواح میں اپنے گھر تشریف لے گئے تھے جو مقام سنخ میں تھا۔ جب آپ کی خبرِ وفات پھیلی تو ایک شخص نے ابوبکرؓ کو جا کر خبر کی۔ وہ فوراً مدینہ آئے۔ مسجد نبوی میں حضرت عمر تلوار ہاتھ میں لیے لوگوں کو ڈرا دھمکا رہے تھے مگر انھوں نے اس طرف التفات نہ فرمایا بلکہ

سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں چلے گئے جہاں رسول اللہ کا جسد اطہر رکھا ہوا تھا۔ ابوبکرؓ نے رُخ مبارک سے کپڑا اٹھایا اور رخسار کو بوسہ دے کر فرمایا "کیا ہی بابرکت تھی آپ کی زندگی اور کیا ہی پاکیزہ ہے آپ کی موت" اس کے بعد حجرے سے باہر آئے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا:

"ایھا الناس، من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت" (اے لوگو! جو شخص محمد کو پوجتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ تو فوت ہو گئے لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ یقیناً زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہ ہوگی)۔

اس کے بعد یہ آیت پڑھی:

"وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔ ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین" (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسولؑ گزر چکے ہیں۔ اگر محمدؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل (کفر کی جانب) پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا)۔

جب حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو ان کے دماغ پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور بالآخر انھیں یقین ہو گیا کہ واقعی رسولؐ اللہ فوت ہو چکے ہیں۔ اس یقین کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ نہ سہار سکیں اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑے۔

آئیے ذرا غور کریں اور اپنے نفوس میں اس واقعے کا بہ نظر غائر جائزہ لیں جس سے ابوبکرؓ کی شخصیت کا ایک اور عظیم الشان پہلو واضح ہوتا ہے مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص ایسا تھا جو رسولؐ اللہ کی وفات کے صدمے کے اثر سے اس حد تک پہنچ سکتا تھا جس حد تک حضرت عمرؓ پہنچے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ آپ کے صفی اور ہم نشین تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر آپ کی خدمت اور آپ کے لائے ہوئے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی جب رسولؐ اللہ نے فرمایا، اللہ نے اپنے ایک بندے کو حق دیا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی زندگی اختیار کر

لے یا آخرت کی زندگی اور اس نے آخرت کی زندگی اختیار کر لی تو ابوبکرؓ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی اور آپ نے کہا تھا "یا رسولؐ اللہ! آپ پر ہماری جانیں اور ہماری اولاد قربان ہو، کیا ہم آپ کے بعد زندہ رہ سکیں گے ؟" لیکن رسولؐ اللہ کی وفات کا سخت صدمہ آپ کو حضرت عمرؓ کی طرح بے ہوش نہ کر سکا اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ آپ ملاءِ اعلیٰ کو تشریف لے گئے ہیں تو انھوں نے فوراً مجمع عام میں آکر اس کا اعلان کر دیا۔

ابوبکرؓ کا ضبطِ نفس

جو تقریر انھوں نے اس وقت کی اور جو آیت اس موقع پر پڑھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل تھا اور ان میں مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی کتنی زبردست قوت موجود تھی کہ رسولؐ اللہ کی وفات جیسے عظیم الشان صدمے کی بھی خبر سن کر انھوں نے ہوش و حواس بجا رکھے اور ان پر کسی قسم کی سراسیمگی طاری نہ ہوئی۔ ہماری حیرت اور تعجب کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اوصاف ایک ایسے شخص سے ظاہر ہوئے جو انتہائی رقیق القلب تھا اور جو رسولؐ اللہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

یہ گھڑی مسلمانوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ ابوبکرؓ نے نہ صرف ایسے سخت وقت میں اپنے اوسان بجا رکھے بلکہ بعد میں بھی جب کبھی مسلمانوں پر کوئی برا وقت پڑا تو اسی قوتِ ارادی اور اولوالعزمی سے کام لے کر تمام خطرات کو دور کر دیا۔ یہی قوتِ ارادی تھی جسے بروئے کار لا کر ابوبکرؓ نے مسلمانوں اور اسلام کو ایک ایسے فتنے سے بچا لیا جو اگر خدانخواستہ شدت اختیار کر لیتا تو نہ معلوم اسلام کا کیا حشر ہوتا۔

مسئلۂ خلافت

حضرت عمرؓ اور وہ لوگ جو مسجد میں ان کے گرد جمع تھے انتہائی رنج و الم کے باعث سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ رسولؐ اللہ کے بعد مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا کیا انتظام ہونا چاہیے لیکن جن لوگوں کو آپ کی وفات کا یقین ہو گیا تھا ان کی نظر سب سے پہلے اسی مسئلے پر پڑی اور حزن و الم انھیں اس اہم

معاملے پر غور و فکر کرنے سے روک نہ سکا۔

ہجرت کے بعد مدینہ کا سارا انتظام رسولؐ اللہ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ کی حکومت صرف مدینہ تک محدود نہ رہی بلکہ آہستہ آہستہ سارے عرب پر محیط ہوگئی۔ عرب کے تقریباً تمام باشندے مسلمان ہوگئے اور جو لوگ مسلمان نہ ہوئے انھوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اب مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس سلطنت کا انتظام کون سنبھالے گا اور رسولؐ اللہ کی جانشینی کا فخر کسے نصیب ہوگا؟

انصار اور مہاجرین میں اختلاف

انصار کا خیال تھا کہ انھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور آڑے وقت میں جب ان کی اپنی قوم نے انھیں نکال دیا تھا ان کی مدد کی، اس لیے خلافت کے حق دار وہ ہیں۔ رسولؐ اللہ کی زندگی میں بھی انصار کے بعض لوگوں کی زبانوں سے اس قسم کے فقرات نکل گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مہاجرین پر فائق سمجھتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد جب حنین اور طائف کے معرکے پیش آئے اور کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو رسولؐ اللہ نے مکہ کے ان لوگوں کی تالیفِ قلوب کے لیے جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور ان جنگوں میں شریک ہوئے تھے مالِ غنیمت انھیں میں تقسیم کر دیا۔ یہ دیکھ کر انصار کے بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے اور مال مکہ والے لے گئے ہیں۔ جب رسولؐ اللہ کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو حکم دیا کہ وہ تمام انصار کو جمع کریں۔ جب تمام لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا:

> "اے انصار! تم لوگوں کی طرف سے مجھے ایک بات پہنچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں تم لوگوں کو شکایت ہے لیکن اس بات سے قطع نظر مجھے اس بات کا جواب دو، کیا یہ واقعہ نہیں کہ تم گمراہ تھے میرے ذریعے سے اللہ نے تمھیں ہدایت دی۔ تم غریب تھے میرے ذریعے سے اللہ نے تمھیں امیر بنایا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، میرے ذریعے سے تمھارے درمیان الفت اور محبت پیدا کی۔"

انصار نے یہ سُن کر شرمندگی سے سر جھکا لیا اور کہا:

"یا رسولؐ اللہ! بیشک اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم پر بڑے بڑے احسانات کیے۔"

رسولؐ اللہ نے پھر فرمایا:

"اے انصار! تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

لیکن وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے اور اس کے سوا کچھ نہ کہا:

"یا رسولؐ اللہ! ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ یقیناً اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہم پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔"

اس پر خود رسولؐ اللہ نے ان کی طرف سے جواب دیا:

"اللہ کی قسم! اگر تم چاہتے تو کہہ سکتے تھے اور تمھارا کہنا بالکل سچ ہوتا کہ اے رسولؐ اللہ! آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کی، آپ ہمارے پاس آئے ہم نے آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی قوم نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا تھا، ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ غریبی اور تنگ دستی کی حالت میں ہمارے پاس آئے، ہم نے آپ کی ضرورت کا سارا سامان مہیا کیا۔ آپ دل شکستہ تھے، ہم نے آپ کی دل جوئی کی۔"

یہ الفاظ ادا کرتے وقت آپ پر ایک خاص قسم کی کیفیت اور تاثر طاری تھا۔ آپ نے فرمایا:

"دنیا کی چند حقیر چیزوں کی خاطر تم نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے وہ مال قریش کو محض تالیفِ قلوب کے لیے دیا تاکہ وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں۔ تم پہلے ہی سے اسلام پر پختہ ہو۔ تمھیں تالیفِ قلوب کے لیے دینے کی ضرورت نہ تھی۔ اے انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم اپنے ساتھ رسولؐ اللہ کو لے جاؤ۔ مجھے اُس ذات کی قسم ہے جس کے

ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار کا ایک فرد ہوتا۔ اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں کی اولاد پر رحم فرما۔"

رسول اللہؐ کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ان پُر درد باتوں نے انصار پر بے حد اثر کیا۔ وہ اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور سب نے بہ یک زبان کہا:

"ہم رسول اللہؐ کی تقسیم اور بخشش پر دل و جان سے راضی ہیں۔"

انصار کے اندیشوں کا اظہار حنین کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت ہی نہ ہوا تھا بلکہ اس سے پہلے فتح مکہ کے وقت بھی ہو چکا تھا جب انھوں نے رسول اللہؐ کو کوہِ صفا پر اہلِ مکہ سے خطاب کرتے، خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑتے، اور رسول کے پرانے جانی دشمنوں کو اسلام کی آغوش میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس موقع پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب رسول اللہؐ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ واپس تشریف نہیں لے جائیں گے۔ بعض لوگوں نے اس کا اظہار کھلے لفظوں میں بھی کر دیا اور کہا:

"اب کہ رسول اللہؐ نے مکہ فتح کر لیا ہے اور آپ کا وطن آپ کے قبضے میں آ چکا ہے آپ مدینہ کیوں واپس جانے لگے؟"

جب رسول اللہؐ کو یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا:

"میرا جینا اور مرنا سب تمھارے ساتھ ہے۔ میں تم سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا۔"

ان امور کی موجودگی میں رسول اللہؐ کی خبرِ وفات سنتے ہی انصار کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا قدرتی امر تھا کہ آیا مدینہ کا انتظام اور امورِ سلطنت کی دیکھ بھال ان مہاجرین کے ہاتھ میں رہے گی جو مکہ سے بہ حالت تباہ مدینہ پہنچے، اہلِ مدینہ نے انھیں پناہ دی اور انھیں عزت اور قوت و طاقت بخشی، یا یہ کام اہلِ مدینہ کے سپرد کیا جائے گا جن کے متعلق خود رسول اللہؐ فرما چکے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کی تکذیب کی جا رہی تھی، آپ ان کے پاس آئے تو انھوں نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو آپ کی قوم نے چھوڑ دیا تھا، انھوں نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو مکہ

سے نکال دیا گیا تھا، انھوں نے آپ کو پناہ دی۔ آپ دل شکستہ تھے، انھوں نے آپ کی دل جوئی کی۔

سقیفہ بنی ساعدہ

اسی مسئلے کو طے کرنے کے لیے بعض انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اپنے ایک سردار سعد بن عبادہ کو جو اس وقت بیمار تھے، ان کے گھر سے وہاں لے آئے اور بحث شروع کی۔ پہلے تو سعد ان کی باتیں سنتے رہے پھر انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا:

"میں اپنی بیماری کے سبب تمام لوگوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا۔ تم میری باتیں سن کر انھیں بتا دو۔"

چنانچہ انھوں نے تقریر شروع کی اور ان کا لڑکا ان کی باتیں لوگوں تک پہنچاتا گیا۔ انھوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا:

سعد بن عبادہ کی تقریر

"اے انصار! تمھیں دینِ برحق کی امداد کرنے کا جو شرف اور اسلام کی اعانت کرنے کی جو فضیلت حاصل ہے وہ عرب کے اور کسی قبیلے کو حاصل نہیں۔ رسول اللہؐ اپنی قوم کے درمیان تیرہ سال تک مقیم رہے اور اسے اللہ کی عبادت کرنے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی تلقین کرتے رہے لیکن سوا چند لوگوں کے کسی نے آپ کی باتیں قبول نہ کیں۔ مگر وہ لوگ بھی جو آپ پر ایمان لائے، رسول اللہؐ کی مدافعت کرنے، دین کو عزت بخشنے اور خود اپنے آپ کو کفار کے مظالم سے بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس وقت اللہ نے تمھیں اپنے انعامات کا وارث بنانے، فضیلت عطا کرنے اور بزرگی سے سرفراز کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس نے تمھیں ایمان کی نعمت سے بہرہ ور کرنے، رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ کی حفاظت کرنے، دین کی عظمت قائم کرنے، اپنی جانیں اسلام پر قربان کرنے

اور دشمنوں سے جہاد کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ تم رسول اللہؐ کے دشمنوں پر سب سے زیادہ سخت تھے۔ تمہاری تلواروں نے اسلام کی فتح کے دن کو قریب سے قریب تر کر دیا اور عربوں کو بامرِ مجبوری دینِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اب رسول اللہؐ وفات پا چکے ہیں۔ وہ عمر بھر تم سے راضی رہے۔ تم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ اب تم خلافت اپنے ہاتھ میں لے لو کیونکہ تمہارے سوا خلافت کا مستحق کوئی نہیں۔"

حاضرین نے سعد کی باتوں کو غور سے سنا اور بالاتفاق جواب دیا:

"آپ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا۔ ہم آپ کی رائے سے اختلاف نہ کریں گے۔ خلافت کا کام ہم آپ ہی کے سپرد کرتے ہیں کیونکہ آپ ہی اس کے مستحق، صالح اور عبادت گزار بندے ہیں۔"

انصار کی پہلی کمزوری

انصار نے کہنے کو تو یہ بات کہ دی لیکن اس پر قائم نہ رہ سکے قبل اس کے کہ ساری قوم سعد بن عبادہ کی بیعت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی بیعت کی دعوت دیتی، ایک شخص نے اُٹھ کر کہا:

"اگر مہاجرین نے ہماری بیعت سے انکار کیا اور کہا کہ ہم مہاجرین ہیں، رسول اللہؐ کے اوّلین صحابہ میں سے ہیں۔ آپ کے اہلِ خاندان ہیں اس لیے ہمیں خلافت کے مستحق ہیں اور انصار کو ہمارے اس حق کا انکار نہ کرنا چاہیے تو کیا ہوگا؟"

یہ بات سُن کر مجمع پر سناٹا چھا گیا اور کسی سے اس سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ آخر بہت کچھ غور و فکر کے بعد ایک شخص نے اُٹھ کر کہا:

"اس وقت ہم اُن سے کہیں گے کہ اگر ایسا ہی ہے تو ایک امیر تم میں سے ہو جائے ایک امیر ہم میں سے۔ ہم اس کے سوا اور کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔"

سعد بن عبادہ خوب جانتے تھے کہ یہ تجویز لایعنی ہے اور اس سے انصار کو کسی قسم کا

فائدہ نہ پہنچ سکے گا چنانچہ انھوں نے کہا:

"تم نے تو ابتدا ہی میں کمزوری کا مظاہرہ شروع کر دیا۔"

ان کا اشارہ دراصل بنو اوس کی طرف تھا کیونکہ انھیں کے ایک فرد نے یہ بات کہی تھی۔ خزرج ایسی بات نہ کہہ سکتے تھے کیونکہ ان کے سردار سعد بن عبادہ تھے اور اُن کی عین خواہش تھی کہ خلافت کی عنان انھیں کے ایک فرد کے سپرد کی جائے۔

اوس و خزرج کی موروثی عداوت

اسلام سے پہلے اوس اور خزرج ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ان دونوں قبیلوں میں اس وقت سے دشمنی چلی آتی تھی جب سے ان کے آبا و اجداد یمن سے منتقل ہو کر یثرب میں آباد ہوئے تھے۔ اس وقت یثرب اور اس کے گرد و نواح پر یہودیوں کا تسلط تھا۔ اوس و خزرج بھی مدت دراز تک یہود کے اثر و اقتدار کے تحت غلامانہ حالت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ بالآخر ان کی غیرت و حمیت نے جوش مارا اور انھوں نے یہود کے خلاف بغاوت کر کے یہود کو اس مرتبے سے محروم کر دیا جس پر وہ مدّت دراز سے فائز تھے۔

یہود کے پنجے سے تو انھوں نے رہائی حاصل کر لی لیکن خود ان کے درمیان اختلاف کی بنیاد پڑ گئی جس نے بڑھتے بڑھتے شدید دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ جنگ بعاث بھی اسی دشمنی کا شاخسانہ تھی جس میں طرفین کے سیکڑوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جنگ کے بعد یہودیوں نے یثرب میں پھر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کیا۔ اوس و خزرج یہود کے پہلے سلوک کو نہ بھولے تھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے آپس میں صلح کر لی اور طے پایا کہ خزرج کے ایک شخص عبداللہ بن اُبی بن سلول کو اپنا سردار بنا لیا جائے۔

وہ لوگ انھیں تیاریوں میں مشغول تھے کہ ان کی ایک جماعت حج کے موقع پر مکہ آئی۔ وہاں ان کی ملاقات رسول اللہ سے ہوئی۔ آپ نے انھیں توحید کی تبلیغ کی۔ اس پر انھوں نے ایک دوسرے سے کہا:

"اللہ کی قسم! یہ وہی نبی ہے جس کی خبر ہمیں یہود دیا کرتے ہیں۔ ہمیں اسے

قبول کرلینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود اسے قبول کر کے ہم سے بڑھ جائیں۔"
چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور اسلام لے آئے۔ پھر آپ سے کہا:
"ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں کہ عداوت اور بغض و عناد میں کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ امید ہے کہ اللہ آپ کے ذریعے سے انھیں متحد کر دے گا۔ اگر وہ آپ کے ذریعے سے متحد ہو گئے تو یثرب کا کوئی شخص عزت اور بزرگی میں آپ سے بڑھ کر نہ ہوگا۔"
یثرب واپس آکر انھوں نے اپنی قوم سے سارا حال بیان کیا اور یہی واقعہ بیعت عقبۂ الکبریٰ کا باعث، یثرب میں اسلام پھیلنے کا موجب اور رسول اللہ کی ہجرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

اہلِ یثرب میں اتحاد

اسلام نے یثرب کے تمام مومنوں کو اکٹھا کر دیا اور رسول اللہ کی شخصیت نے تمام مسلمانوں کو اس طرح بھائی بھائی بنا دیا کہ دنیوی تعلقات میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں کے اس عدیم النظیر اتحاد سے یہود کی قوت کو زبردست ضعف پہنچا۔ پھر بھی اوس و خزرج کے دلوں میں پرانی عداوت کے دھندلے دھندلے کچھ نقوش باقی رہ گئے۔ یہود اور منافقین کے جوش دلانے سے یہ عداوت کبھی ظاہر بھی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سعد بن عبادہ نے دیکھا کہ انصار کے بعض لوگ اس شخص کی باتوں سے متاثر ہو رہے ہیں جس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک امیر قریش میں سے ہونا چاہیے اور ایک امیر انصار میں سے تو انھوں نے کہا:
"یہ پہلی کمزوری ہے جو ابتدا ہی میں تم سے ظاہر ہوئی ہے۔"
کیونکہ یہ بات کہنے والا قبیلہ اوس کا ایک فرد تھا۔

عمرؓ اور ابوعبیدہ میں گفتگو

جب انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے متعلق مشغولِ بحث تھے تو حضرت عمرؓ بن خطاب، ابوعبیدہ بن جراح اور دوسرے بڑے بڑے صحابہ مسجدِ نبوی میں رسول اللہ کی وفات کے سانحۂ عظیم

کا ذکر کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے اہل بیت رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔ جب حضرت عمرؓ کو آپ کی وفات کا کامل یقین ہو گیا تو انھوں نے بھی خلافت کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ انصار پہلے ہی اس معاملے پر بحث و تمحیص میں مشغول ہیں اور اپنے میں سے کسی شخص کو امیر بنانا چاہتے ہیں۔

ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ابوعبیدہؓ بن جراح کے پاس آئے اور کہا:

"اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں کیونکہ رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے آپ کو 'امین الامت' کا لقب مل چکا ہے۔"

ابوعبیدہؓ نے یہ سن کر کہا:

"عمرؓ! تمھارے اسلام لانے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے تمھارے منہ سے ایسی جہالت کی بات سنی ہے۔ کیا تم میری بیعت کرو گے جب ہم میں وہ شخص موجود ہے جسے بارگاہِ خداوندی سے 'ثانی اثنین' اور 'صاحبِ رسولؐ' کا خطاب اور رسول اللہؐ سے 'صدیق' کا لقب مل چکا ہے؟"

یہ دونوں انھیں باتوں میں مشغول تھے کہ انھیں سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے اجتماع کی خبر ملی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو جو اس وقت حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تھے، کہلا بھیجا کہ ذرا باہر تشریف لائیے۔ ابوبکرؓ نے جواباً کہا "میں مشغول ہوں، اس وقت باہر نہیں آسکتا۔"

حضرت عمرؓ نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ فوری طور پر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا ہے جس میں آپ کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔

عمرؓ اور ابوبکرؓ سقیفہ بنی ساعدہ میں

اس پر ابوبکرؓ باہر تشریف لائے اور عمرؓ سے پوچھا "رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین سے زیادہ اس وقت

اور کون سا کام ضروری ہے جس کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے؟"

عمرؓ نے کہا "آپ کو پتا بھی ہے انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور ارادہ کر رہے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنا دیں؟ ان میں سے ایک شخص نے یہ کہا ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر قریش میں سے"

یہ سن کر ابوبکرؓ فوراً عمرؓ کے ساتھ سقیفہ کی جانب چل پڑے۔ ابو عبیدہؓ بن جراح بھی ساتھ تھے۔

یہ تینوں ابھی راستے ہی میں تھے کہ انھیں عاصم بن عدی اور عویم بن ساعدہ ملے۔ یہ دونوں سقیفہ سے آرہے تھے اور انصار نے انھیں یہ کہہ کر اپنی مجلس سے رخصت کر دیا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ جو تم چاہتے ہو وہ نہ ہوگا۔ جب انھوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کو آتے دیکھا تو کہنے لگے: "آپ لوگ اپنا کام کریں اور انصار کے پاس مت جائیں۔"

عمرؓ نے جواب دیا "یہ نہیں ہو سکتا، ہم ضرور جائیں گے۔"

چنانچہ یہ تینوں حضرات سقیفہ میں پہنچے۔ انصار کی گفتگو اور بحث ابھی جاری تھی۔ انھوں نے نہ تو سعد کی بیعت کی تھی اور نہ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچے تھے۔

انصار نے جب ان تینوں کو دیکھا تو بڑے پریشان ہوئے اور بالکل خاموش ہو گئے۔

عمرؓ نے پوچھا: "یہ شخص کون ہے جو درمیان میں کمبل اوڑھے بیٹھا ہے؟" لوگوں نے کہا: "یہ سعد بن عبادہ ہیں اور اس وقت بیمار ہیں۔" ابوبکرؓ اور ان کے دونوں ساتھی بھی انصار کے درمیان بیٹھ گئے۔ اب ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ اجتماع کس حد پر جاکر ختم ہوگا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی اہمیت

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی زندگی میں اس اجتماع کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ اگر اس موقع پر ابوبکرؓ اپنی اصابت رائے، قوت ارادی اور ذہانت و فرزانگی کو کام میں نہ لاتے تو خود اسلام کے مرکز میں وہ فتنہ پھیل جاتا جو بعد میں عرب کے دوسرے شہروں میں بھی پھیلا اور اس عالم میں پھیلتا کہ اسلام کے بانی کی نعش ابھی گھر ہی میں پڑی ہوتی۔

ذرا غور کیجیے اگر انصار سعد بن عبادہ کی باتوں میں آکر اصرار کرتے کہ خلافت ان کا حق ہے اور انھیں کو ملنا چاہیے اور دوسری طرف قریش اپنے سوا کسی کی خلافت پر راضی نہ ہوتے تو اس فتنے کا انجام کیا ہوتا؟ خصوصاً اس حالت میں کہ اسامہ کا لشکر ہتھیاروں سے لیس، دشمن سے جنگ کے لیے کوچ کرنے پر بالکل تیار تھا۔ کیا اس صورت میں وہی ہتھیار ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوتے؟ اگر سقیفہ جانے والے مہاجرین ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کے سوا دوسرے لوگ ہوتے جنھیں رسول اللہؐ کے مشیرِ کار ہونے کا شرف حاصل ہوتا اور نہ امین الامت ہونے کا اعزاز تو انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف کی خلیج بے حد وسیع ہو جاتی اور اس کا جو ہولناک انجام ہوتا اس کا اندازہ بھی آج کا مؤرخ نہیں کر سکتا۔

واقعات کا صحیح اندازہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس اہم اجتماع کو اسلام کی تاریخ میں اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی بیعت عقبۃ الکبریٰ اور رسول اللہؐ کی ہجرت مدینہ کو۔ یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہیں کہ ابوبکرؓ نے اس موقع پر جو کارنامہ انجام دیا اس نے صریحاً ثابت کر دیا کہ وہ دینی لحاظ سے نہایت بلند مرتبہ رکھنے کے علاوہ بحرِ سیاست کے شناور، انتہائی دوررس اور نتائج و عواقب پر گہری نظر رکھنے والے بھی تھے اور ہر معاملے میں ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس سے بہتر نتائج برآمد ہوں اور ہر ایسی بات سے پہلوتہی کی جائے جس سے شر و فساد پھوٹنے کا امکان ہو۔

حاضرینِ سقیفہ سے ابوبکرؓ کا خطاب

موجودہ زمانے میں اسلوبِ بیان کے بعض پہلوؤں کو ماہرینِ سیاست نو ایجاد سمجھتے ہیں۔ منجملہ دیگر اسالیبِ بیان کے ایک اسلوب یہ بھی ہے، مدِمقابل سے اس طرح گفتگو کی جائے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس بھی نہ لگے اور اسے قائل بھی کر لیا جائے۔ یہ طرز بالکل نو ایجاد سمجھا جاتا ہے لیکن ابوبکرؓ نے انصار سے جس طرز پر بات کی اور جس خوش اسلوبی سے معاملے کو سلجھایا آج کل کے ماہرینِ سیاست کو اس کی ہوا تک نہیں لگی۔

جب یہ تینوں مہاجرین اطمینان سے بیٹھ گئے تو انصار کی پریشانی کچھ کم ہوئی اور انھوں

نے مہرِ سکوت توڑ کر اسی قسم کی باتیں شروع کیں کہ خلافت صرف ان کا حق ہے اور یہ حق انھیں کو ملنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں "میں نے بعض باتیں سوچ رکھی تھیں جنھیں میں اس مجلس میں بیان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جب میں تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہونے لگا تو ابوبکرؓ نے کہا:

"ذرا ٹھہرو۔ مجھے بات کر لینے دو۔ اس کے بعد تم بھی اپنی باتیں بیان کر دینا۔"

اصل میں ابوبکرؓ کو ڈر تھا کہ کہیں عمر تیزی میں نہ آجائیں کیونکہ یہ موقع تیزی یا سختی کا نہ تھا بلکہ نرمی اور بردباری برتنے کا تھا۔ عمرؓ، ابوبکرؓ کی بزرگی اور ان کی سبقت فی الاسلام کا لحاظ کرتے ہوئے بیٹھ گئے اور ابوبکرؓ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حمد و ثنا کے بعد رسول اللہ اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کا ذکر کیا پھر فرمایا:

"...... عربوں کے لیے اپنے آباو اجداد کا دین ترک کر دینا نہایت شاق تھا اور وہ ایسا کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہ تھے۔ اس وقت اللہ نے آپ کی قوم میں سے مہاجرین اولین کو آپ کی تصدیق کرنے، آپ پر ایمان لانے، آپ کی دل جوئی کرنے اور اپنی قوم کے مظالم کو صبر سے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہر شخص ان کا مخالف تھا، ان پر ظلم و ستم توڑے جاتے تھے، انھیں بدترین ایذائیں دی جاتی تھیں لیکن وہ قلتِ تعداد اور کثرت اعدا کے باوجود مطلق خوف زدہ نہ ہوئے۔ وہ اس سرزمین میں اولین اشخاص ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے اور اس طرح اللہ کے حقیقی بندے بننے کی توفیق ملی۔ وہ رسول اللہ کے محب اور رشتہ دار ہیں اس لیے خلافت کے وہی مستحق ہیں اور اس بارے میں صرف ظالم ہی ان سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔

"اور تم اے گروہ انصار! وہ لوگ ہو جن کی فضیلت دینی اور اسلام میں سبقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے تمھیں اپنے دین اور اپنے رسولؐ کا مددگار بنایا۔ رسول خداؐ نے ہجرت تمھاری طرف کی، آپ کی اکثر ازواج اور بیشتر

صحابہ تمھیں میں سے تھے۔ مہاجرین اولین کے بعد تمھارا ہی مرتبہ ہے۔ اس لیے ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر۔ نہ تمھارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کیا جائے گا اور نہ تمھیں شریک کیے بغیر کوئی کام انجام دیا جائے گا۔"

اسی سے ملتا جلتا ایک فقرہ پہلے بھی ایک انصاری کے منہ سے نکل چکا تھا یعنی "۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک امیر ہم میں سے ہو ایک امیر مہاجرین میں سے۔"

مگر یہ بات ناقابلِ عمل تھی لیکن ابوبکرؓ کی تجویز نہ صرف قابلِ عمل بلکہ اعلیٰ سیاست کا کرشمہ بھی تھی جس سے ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا تھا اور انصار کا تردد بھی دور ہو جاتا تھا۔

اوس نے، جو خزرج کے خلاف منافست کے جذبات رکھتے تھے اور اپنے آپ پر خزرج کا غلبہ گوارا نہ کر سکتے تھے، ابوبکرؓ کی اس تجویز پر اطمینان کا سانس لیا۔ خزرج کے بھی بہت سے افراد نے اس سے دلی اتفاق کیا کیونکہ ابوبکرؓ نے سعد بن عبادہ کی طرح صرف مہاجرین کو سلطنت کا انتظام سنبھالنے کا حق دار نہ ٹھہرایا تھا بلکہ انصار کو وزراء کی حیثیت میں مہاجرین کا شریکِ کار بھی بنایا تھا کیونکہ دونوں فریق رسول اللہ پر سچے دل سے ایمان لانے، آپ کی مدد کرنے اور جان نثاری کا ثبوت دینے میں مساوی تھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے امارت اور وزارت کا حق دار علی الترتیب مہاجرین و انصار کو ٹھہرایا، کسی اور قبیلے کو جو عرب میں آباد تھا شریکِ کار نہ بنایا۔ وجہ یہ تھی کہ دوسرے قبائل کو دین میں وہ سبقت حاصل نہ تھی جو مہاجرین و انصار کو حاصل تھی، نہ انھوں نے دین کے راستے میں وہ کارہائے نمایاں ہی انجام دیے تھے جو مہاجرین و انصار نے انجام دیے۔

بعض انصار کی مخالفت

ابوبکرؓ کے دلائل کی روشنی میں تمام لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی تمام باتیں مبنی برحق اور قرینِ انصاف تھیں لیکن بعض لوگوں نے جنھیں مہاجرین کی امارت سرے سے ناپسند تھی، ان کے دلائل سے کوئی اثر قبول نہ کیا کیونکہ ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ مہاجرین ان کا حق غصب کر لیں گے اور سلطنت پر قابض ہو کر من مانی کارروائیاں کریں گے۔ چنانچہ ان میں سے

ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"ہم اللہ کے انصار اور اسلام کا لشکر ہیں اور تم اے مہاجرین! ہم سے قلیل التعداد ہو لیکن اب تم ہمارا حق غصب کرنا اور ہمیں سلطنت سے محروم کرنا چاہتے ہو، ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔"

یہ سُن کر بھی ابوبکرؓ کے ماتھے پر بل نہ پڑے اور وہ بہ دستور اپنے دھیمے پن سے مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ انھوں نے فرمایا:

"اے لوگو! ہم مہاجرین اوّلین اشخاص ہیں جو اسلام لائے حسب نسب اور عزوشرف کے لحاظ سے بھی ہم تمام عربوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہمیں رسول اللہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ہم تم سے پہلے ایمان لائے اور قرآن میں ہمارا ذکر تم سے مقدّم ہے۔ اللہ فرماتا ہے والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان۔ ہم مہاجرین ہیں اور تم انصار۔ تم دین میں ہمارے بھائی، غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے مددگار ہو۔ باقی تم نے اپنی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ تم واقعی اس کے اہل ہو اور روئے زمین پر سب سے زیادہ تعریف کے مستحق۔ لیکن عرب اس بات کو کبھی نہ مانیں گے کہ سلطنت قریش کے سوا کسی اور قبیلے کے ہاتھ میں رہے۔ اس لیے امارت تم ہمارے سپرد کر دو اور وزارت خود سنبھال لو۔"

حباب بن منذر انصاری

لیکن اس پر بھی انصار کے ایک طبقے کا جوش و خروش ٹھنڈا نہ ہوسکا چنانچہ حباب بن منذر بن جموح اُٹھے اور کہنے لگے:

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ لوگ تمھارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمھارے خلاف آواز اُٹھا سکے یا تمھاری رائے

کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہلِ عزت و ثروت ہو، تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمھاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمھاری بات ماننے پر مجبور رہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انھیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

حضرت عمرؓ کی تقریر

حباب نے ابھی اپنی تقریر ختم بھی نہ کی تھی کہ حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے۔ وہ اِس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے منع کرنے سے مجبوراً خاموش ہو رہے تھے لیکن اب اُن سے ضبط نہ ہو سکا اور انھوں نے کہا:

"ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمھیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو اُنھیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اِس معاملے میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو کار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے تیار ہو۔"

حضرت عمرؓ اور حباب میں جھڑپ

حباب نے انصار کو مخاطب کر کے حضرت عمرؓ کی تقریر کا جواب یہ دیا:

"اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔

اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمھارا حصہ غصب کر لیں گے
اگر یہ تمھاری مخالفت کریں تو انھیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود
قابض ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی قسم! تمھیں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو تمھاری
ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اِس لیے اس
کی قدر و منزلت کا موجب تمھیں ہو تمھیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی
پشت پناہ ہو اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔"
حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا:

"اگر تم نے اِس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمھیں ہلاک کر ڈالے گا۔"

حباب نے جواب دیا:

"ہمیں نہیں! اللہ تمھیں ہلاک کرے گا۔"

حباب کی باتیں (اگر درست تسلیم کر لی جائیں تو) ایک خطرناک دھمکی کا رنگ رکھتی تھیں۔
اگر انصار کی اکثریت حباب کے ساتھ ہوتی اور وہ سعد بن عبادہ کی بیعت پر رضامند ہو جاتے تو
مہاجرین بھی انصار کے مقابلے میں اپنی من مانی کرتے اور ایک عظیم اور تباہ کن فتنہ برپا ہو جاتا
جو کسی کے روکے نہ رکتا۔

بعض منافقین کی شرارت

کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض منافقین نے حضرت عمرؓ اور حباب کی تلخ کلامی سے فائدہ
اٹھاتے ہوئے شرارت برپا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ طبری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خود
حباب نے باتیں کرتے کرتے تلوار سونت لی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ہاتھ جھٹک کر تلوار ان کے ہاتھ
سے گرا دی اور آگے بڑھ کر سعد بن عبادہ کی طرف بڑھے۔ اس وقت ابو عبیدہ بن جراح 'جو اب تک
خاموش بیٹھے فریقین کی باتیں سُن رہے تھے' اِس معاملے میں دخل دیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ اٹھے
اور اہلِ مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے انصار! تم ہی تھے جنھوں نے اس دین کی نصرت و حمایت کے لیے

سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا تھا اب تمھیں سب سے پہلے اس کی تباہی کے درپے ہو رہے ہو۔"

بشیر بن سعد کی تقریر

ابو عبیدہ کے اس فقرے کا قبیلہ خزرج کے ایک سردار بشیر بن سعد ابو النعمان بن بشیر پر بے حد اثر ہوا۔ وہ کھڑے ہوئے اور یہ تقریر کی:

"اللہ کی قسم! اگرچہ ہمیں مشرکین سے جہاد اور دین میں سبقت اختیار کرنے کے معاملے میں مہاجرین پر فضیلت حاصل ہے لیکن ہم نے یہ سب کچھ محض اپنے رب کی رضا، اپنے نبیؐ کی اطاعت اور اپنے نفس کی اصلاح کے لیے کیا تھا، اس لیے ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ان باتوں کی وجہ سے فخر و مباہات کا اظہار کریں اور اپنی دینی خدمات کے بدلے دنیا کا مال و منال طلب کریں۔ اللہ ہی ہمیں اس کی جزا دے گا اور اس کی جزا ہمارے لیے کافی ہے رسول اللہ قریش میں سے تھے۔ اور آپ کی قوم ہی اس کی سب سے زیادہ حق دار ہے۔ اللہ نہ کرے کہ ہم اس بارے میں ان سے جھگڑا کریں۔ اس لیے اے انصار! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، مہاجرین کی مخالفت نہ کرو اور ان سے مت جھگڑو۔"

بشیر بن سعد کی یہ باتیں سن کر ابوبکرؓ نے انصار کی طرف نظر دوڑائی تاکہ دیکھیں انھوں نے کہاں تک ان باتوں کا اثر قبول کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ اوس آپس میں آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ ادھر بنی خزرج کے چہروں سے بھی مترشح ہوتا تھا کہ ان کے دلوں پر بشیر کی باتوں کا بہت اثر ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر ابوبکرؓ کو یقین ہو گیا کہ معاملہ سدھر گیا ہے اور یہی لمحات فیصلہ کن ہیں، انھیں ضائع نہ کرنا چاہیے۔ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ انصار کو اتحاد کی تلقین کی اور تفرقے سے خبردار کیا، پھر فرمایا:

"یہ عمرؓ اور ابو عبیدہ بیٹھے ہیں، ان میں سے جس کی بیعت چاہو کر لو۔"

عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کی بیعتِ ابوبکرؓ

اس وقت شور و شغب بہت بڑھ گیا حضرت عمرؓ کی دینی فضیلت سے کسی شخص کو انکار نہ تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کے معتمد علیہ اور ام المومنین حضرت حفصہ کے والد تھے لیکن ان کی سختی اور تیز مزاجی سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ اسی لیے شخص ان کی بیعت سے پس و پیش کر رہا تھا۔ جہاں تک ابوعبیدہؓ کا تعلق تھا ان میں عمرؓ کی سی سختی نہ تھی لیکن انھیں دینی لحاظ سے حضرت عمرؓ کا سا مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا۔

اگر چند سے اور یہی حالت رہتی تو اختلاف انتہائی شدت اختیار کر لیتا لیکن حضرت عمرؓ نے اسے بڑھنے نہ دیا اور بلند آواز سے کہا:

"ابوبکرؓ! اپنا ہاتھ بڑھائیے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً آپ کی بیعت کر لی اور کہا:

"ابوبکرؓ! کیا آپ کو رسولؐ اللہ نے حکم نہ دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں اس لیے آپ ہی خلیفۃ اللہ ہیں۔ ہم آپ کی بیعت اس لیے کرتے ہیں کہ آپ ہم سے زیادہ رسولؐ اللہ کے محبوب تھے۔"

حضرت ابوعبیدہؓ نے بھی یہ کہتے ہوئے آپ کی بیعت کر لی:

"آپ مہاجرین میں سب سے برتر ہیں۔ آپ غار میں رسولؐ اللہ کے ساتھی تھے رسولؐ اللہ کی غیر حاضری میں آپ ہی نماز پڑھایا کرتے تھے اس لیے آپ سے زیادہ کون شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اسے خلافت کی اہم ذمہ داریاں سپرد کی جائیں۔"

بشیرؓ بن سعد اور دوسرے انصار کی بیعت

حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے بیعت کر لینے کے بعد بشیر بن سعد بھی جلدی سے آگے بڑھے اور بیعت کر لی۔

بشیر بن سعد کو بیعت کرتے دیکھ کر حباب بن منذر سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ کہنے لگے:

"اے بشیر بن سعد! تم نے اپنی قوم کی ناک کاٹ ڈالی تمھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تم امارت کے معاملے میں اپنے چچیرے بھائی (سعد بن عبادہ) کی مخالفت کرو گے؟"

بشیر نے جواب دیا:

"میں نے اپنی قوم کو ذلیل نہیں کیا۔ لیکن مجھے یہ بات ناپسند تھی کہ میں مہاجرین سے اس حق کے بارے میں جھگڑا کرتا جو اور کسی نے نہیں بلکہ خود اللہ نے انھیں دیا تھا۔"

اُسید بن حضیر، رئیس اوس نے جو بشیر بن سعد کی کارروائی کو بہ نظرِ غائر دیکھ رہے تھے، اپنے قبیلے کی طرف رُخ کیا اور کہنے لگے:

"اللہ کی قسم! اگر خزرج ایک بار بھی خلافت پر قابض ہو گئے تو اس کے سبب انھیں تم پر ہمیشہ کے لیے فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ تم انھیں کبھی اس میں حصہ دار نہ بننے دو اور ابوبکرؓ کی بیعت کر لو۔"

چنانچہ اوس نے آپ کی بیعت کر لی۔ ادھر خزرج اپنے سردار بشیر بن سعد کی باتوں سے مطمئن ہو چکے تھے وہ بھی آگے بڑھ کر بیعت کرنے لگے۔

سعد بن عبادہ کا انکارِ بیعت

لوگوں کو بیعت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ ایک کے اوپر ایک گرا پڑتا تھا۔ بیعت کرنے کی عجلت میں انھیں سعد بن عبادہ کا خیال بھی نہ رہا اور وہ انھیں روند کر بیعت کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا:

"ارے دیکھو! کہیں سعد تمھارے پاؤں کے نیچے نہ روندے جائیں۔"

عمرؓ نے کہا:

"وہ ہے ہی روندے جانے کے قابل۔ اللہ اُسے ذلت نصیب کرے۔"

ساتھ ہی سعد سے کچھ سخت کلامی کی۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

"عمرؓ! کیا کرتے ہو؟ نرمی سے کام لو۔ یہ موقع سختی کا نہیں۔"

سعد بن عبادہ کو اُن کے ساتھی اُٹھا کر اُن کے گھر لے گئے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام خاموشی اور تنہائی سے گزار دیے۔ ان سے کہا گیا:

"آپ بھی بیعت کر لیجیے کیونکہ تمام مسلمانوں نے اور خود آپ کی قوم نے بیعت کر لی ہے۔"

لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا

"اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا جب تک میرے ترکش کا آخری تیر تم پر وار کرنے میں ختم نہ ہو جائے۔ میرے نیزے کا پھل تمھارے خون سے سرخ نہ ہو جائے میری تلوار کے جوہر نمایاں نہ ہو جائیں اور میں اپنے اہلِ خاندان اور پیرو کاروں کے ساتھ تم سے جنگ نہ کر لوں۔"

جب ان کی یہ باتیں حضرت ابوبکرؓ تک پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے کہا:

"اب سعد کو اس وقت تک نہ چھوڑنا چاہیے جب تک ان سے بیعت نہ لے لی جائے۔"

لیکن بشیر بن سعد نے حضرت عمرؓ کی مخالفت کی اور کہا:

"ان کا انکار حد کو پہنچ چکا ہے۔ وہ لڑ کر مر جائیں گے مگر بیعت نہ کریں گے۔ اور وہ اس وقت تک قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے بیٹے اہلِ خاندان اور مددگار ان پر نثار نہ ہو جائیں۔ اس لیے تم انھیں چھوڑ دو۔ ایسا کرنے سے تمھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا کیونکہ اب ان کی حیثیت فردِ واحد کی ہے۔"

ابوبکرؓ نے بشیر کی رائے سے اتفاق کیا اور سعد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ سعد نہ ان کے ساتھ نماز پڑھتے اور نہ اُن کے ساتھ شامل ہو کر حج کے ارکان بجا لاتے۔

ابوبکرؓ کی وفات تک ان کی یہی حالت رہی۔

سقیفہ کی بیعت میں حضرت علیؓ بن ابی طالب اور بعض کبار صحابہ شریک نہ ہو سکے کیونکہ وہ رسول اللہ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ مسجد نبوی میں مہاجرین بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

چونکہ انھیں واقعۂ سقیفہ کی خبر نہ تھی اس لیے وہ بھی اس بیعت میں شریک نہ تھے۔ بیعت سقیفہ کے متعلق بعض راوی حضرت عمرؓ کی جانب یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ یہ بیعت بغیر کسی ارادے کے محض اتفاقاً ہو گئی۔ بعض راوی یہ ذکر کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہؓ پہلے ہی سے یہ اتفاق کر کے سقیفہ گئے تھے کہ منصب خلافت پر ابوبکرؓ کو سرفراز کیا جائے گا۔ بہرحال ان دونوں روایتوں میں سے خواہ کوئی سی بھی صحیح ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ سقیفہ بنو ساعدہ میں جو کچھ ہوا اس نے اسلام کو ایک ایسے ہولناک فتنے سے بچا لیا جس کا انجام اللہ جانے کیا الم ناک صورت اختیار کرتا۔

بیعت پر انصار کا قیام

اس دن کے بعد پھر کبھی انصار کی طرف سے خلافت کی خواہش نہ کی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی بیعت ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد تخت خلافت پر حضرت عثمانؓ متمکن ہوئے لیکن انصار نے خلافت کا دعویٰ نہ کیا۔ حضرت علیؓ کے عہد میں آپ کے اور حضرت معاویہ کے درمیان اختلاف برپا ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس اختلاف کے موقع پر بھی انصار کی طرف سے خلافت کے حصول کی کوئی کوشش نہ کی گئی حالانکہ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو بخوبی اٹھا سکتے تھے۔ لیکن وہ ابوبکرؓ کے اس قول پر صدق دل سے ایمان لا چکے تھے:

"عرب سوا قریش کے اور کسی کی خلافت پر راضی نہ ہوں گے۔"

بعد میں وہ ہمیشہ رسول اللہ کی حسب ذیل وصیت کے مطابق مہاجرین کے زیر سایہ اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے:

"اے مہاجرین انصار سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ عرب کے اور قبیلوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا لیکن انصار کی تعداد میں اضافہ نہ ہو گا۔ میں نے انہی میں پناہ لی تھی اس لیے تم بھی ان پر احسان اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنا۔"

مسجد نبوی میں بیعتِ عامہ

سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت ختم ہونے پر مسلمان مسجد نبوی میں واپس آ گئے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اگلے روز حضرت ابوبکرؓ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور پچھلے روز کے واقعے پر اظہارِ افسوس کیا جب انھوں نے تلوار ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ جو شخص کہے گا رسول اللہ فوت ہو گئے ہیں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا:

"میں نے تم سے کل ایسی بات کہی تھی جو نہ کتاب اللہ میں پائی جاتی ہے اور نہ میں نے رسولؐ اللہ سے کبھی سنی تھی۔ لیکن میں اپنی محبت کے جوش میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہمارے تمام کاموں کی نگرانی بنفسِ نفیس فرماتے رہیں گے لیکن اللہ نے تمھارے لیے وہ کتاب باقی رکھی ہے جس سے خود رسولؐ اللہ نے ہدایت حاصل کی۔ پس اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اسی طرح ہدایت پاؤ گے جس طرح آپ نے پائی۔ تمھارا خلیفہ اللہ نے اس شخص کو بنایا ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے۔ یہ رسولؐ اللہ کا مقرب ہے اور یہی ہے وہ جسے غار میں آپ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اس لیے اٹھو اور اس کی بیعت کرو۔"

چنانچہ اس وقت عام بیعت ہوئی جب کہ سقیفہ بنی ساعدہ کی بیعت میں صرف خاص خاص لوگ شریک تھے۔

خلافت کا پہلا خطبہ

بیعت کے بعد ابوبکرؓ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا جو خلافت کا پہلا خطبہ تھا۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"اے لوگو میں تمھارا حاکم بنایا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں نیک کام

کروں تو اس میں میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تمھارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تمھارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس کے ذمے جو حق ہے وہ اس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے اُس پر اللہ ذلت وخواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لیے کھڑے ہو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

ابوبکرؓ کی بیعت بالاجماع

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابوبکرؓ کی بیعت مسلمانوں کے اجماع سے ہوئی تھی جس میں سوا سعد بن عبادہ کے (جنھوں نے سقیفہ کی خاص بیعت میں ان کی بیعت سے انکار کر دیا تھا) باقی تمام صحابہ کبار شریک تھے یا بعض صحابہ بیعت سے الگ بھی رہے تھے؟

بیعت سے مہاجرین کبار کی علیحدگی

کچھ روایات میں مذکور ہے کہ بعض مہاجرین کبار بیعت سے علیحدہ رہے تھے جن میں حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عباس بن عبدالمطلب شامل تھے۔ شیعہ مؤرخ یعقوبی لکھتا ہے:

"مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب، فضلؓ بن عباس، زبیرؓ بن عوام بن العاص، خالدؓ بن سعید، مقدادؓ بن عمرو، سلمانؓ فارسی، ابوذرؓ غفاری، عمارؓ بن یاسر، براءؓ بن عازب، ابیؓ بن کعب

ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح اور مغیرہؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارے
میں مشورہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملیے اور
خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجیے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔
اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف
واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلے میں فائدہ مند ثابت
ہو گی۔

اس مشورے کے مطابق ابوبکرؓ عباس سے ملے۔ دونوں کے درمیان طویل گفتگو
ہوئی۔ ابوبکرؓ نے کہا:

"آپ رسول اللہؐ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی
ہو جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔"

لیکن عباس نے یہ پیشکش رد کر دی اور کہا کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت
لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔"

مخالفین کا اجتماع

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے، مذکور ہے کہ مہاجرین
اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ بنت
رسول اللہؐ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعید بھی تھے۔ خالد نے حضرت علیؓ سے کہا:

"اللہ کی قسم! رسول اللہؐ کی جانشینی کے لیے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی
نہیں اس لیے آپ ہماری بیعت قبول کیجیے۔"

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت
فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے
پہلے ان کی مٹ بھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے
لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ باہر آئیں اور کہا:

"یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم! میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی[1] اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔"

حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علیؓ کے جنھوں نے چھ مہینے تک بیعت نہ کی مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انھوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔

ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔

انکارِ بیعت کی مشہور ترین روایت

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیر بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلے کے لیے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"زبیر کو پکڑ لو۔"

لوگوں نے زبیر کو پکڑ کر ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیر نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔

[1] کیا حضرت فاطمہ بنت رسول اللہؐ جیسی باحیا، باعصمت خاتون اپنے منہ سے (نعوذ باللہ) اس قسم کے رکیک الفاظ نکال سکتی تھیں؟ ان الفاظ ہی سے روایت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے (مترجم)

حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا:

"میں تمھاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حق دار ہوں اور تمھیں میری بیعت کرنی چاہیے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حق دار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمھیں چاہیے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ رسولؐ اللہ ہم میں سے تھے اس لیے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کر دو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی، اب میں تمھارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لیے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرّہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمھیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمھارا جی چاہے کرو تمھیں اختیار ہے۔"

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر جواب دیا:

"میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔"

حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آ گئے اور کہنے لگے:

"عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمھارا بھی حصّہ ہے۔ آج تم اس لیے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمھارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔"

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے انھوں نے کہا:

"علی! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمھیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابو عبیدہ بن جراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا:

"بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمھیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے

اور نہ تم ان کی طرح جاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجالا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابو بکرؓ ہیں اس لیے تم اُن کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل دینی رتبے، فہم و ذکا، سابقیت اسلام، حسب و نسب اور رسول اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمھیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصّے سے بولے:

"اللہ اللہ اے گروہ مہاجرین! تم رسول اللہ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو۔ اور ان کا حق انھیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حق دار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہ، رسول اللہ کی سنت کا عالم، رعایا کی ضرورتوں سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے۔ اس لیے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔"

راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعد بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا:

"اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں، انصار کا گروہ ابو بکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمھارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علی طیش میں بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انھیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں[1]

---

[1] حضرت فاطمہؓ کی شان سے یہ بات قطعاً بعید ہے کہ وہ گھر گھر جا کر اپنے خاوند کی بیعت کے لیے لوگوں کو تیار کرتیں۔ (مترجم)

اوران سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انھیں یہی جواب ملتا:

"اے بنت رسول اللہ! ہم ابو بکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سُن کر حضرت علیؓ غصے میں آکر جواب دیتے:

"کیا میں رسول اللہ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر لوگوں سے آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟"

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں:

"ابوالحسن (علی) نے وہی کیا جو ان کے لیے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔"

انتخاب متفقہ کے متعلق روایات

یہ تو ہیں روائتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ان کے برعکس بعض ایسی روائتیں بھی ہیں جن میں اس امر سے صراحتاً انکار کیا گیا ہے کہ بنو ہاشم اور بعض مہاجرین بیعت سے علیحدہ رہے۔ ان روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ سقیفہ کی خاص بیعت کے بعد عام بیعت کا وقت آیا تو مہاجرین اور انصار بالاجماع آپ کی بیعت میں شریک تھے۔

چنانچہ طبری میں مذکور ہے کہ کسی شخص نے سعید بن زید سے پوچھا:

"کیا آپ رسول اللہ کی وفات کے وقت مدینہ میں موجود تھے؟"

انھوں نے جواب دیا:

"ہاں۔"

اس شخص نے پوچھا:

"حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کب کی گئی؟"

انھوں نے جواب دیا:

"اسی روز جب رسول اللہ کی وفات ہوئی۔ صحابہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ

وہ ایک بھی روز بغیر خلیفہ کے زندگی گزاریں۔"

اس پر اس شخص نے پوچھا:

"کیا کسی شخص نے حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت بھی کی؟"

انھوں نے جواب دیا:

"نہیں، سوا مرتدین کے، یا ان لوگوں کے جو حالت ارتداد کے قریب پہنچ چکے تھے۔"

پوچھا گیا:

"کیا مہاجرین میں سے بھی کسی نے بیعت کرنے سے انکار کیا؟"

جواب دیا:

"نہیں۔ مہاجرین نے تو اس بات کا انتظار بھی نہ کیا کہ کوئی شخص انھیں آکر بیعت کے لیے بلائے بلکہ انھوں نے خود ہی آکر ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔"

ایک روایت یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت علیؓ کو اپنے گھر میں یہ خبر ملی کہ حضرت ابوبکرؓ بیعت لینے کے لیے مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں تو ان کے بدن پر ایک قمیص کے سوا کوئی کپڑا نہ تھا۔ لیکن وہ اسی حالت میں گھر سے باہر نکل آئے اور جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے مسجد میں پہنچ گئے مبادا بیعت کرنے میں دیر ہو جائے۔ جب بیعت کر لی تو اس کے بعد گھر سے اور کپڑے منگوا کر پہنے۔

بیعتِ علی کے متعلق درمیانی رائے

بعض روایات میں حضرت علیؓ کی بیعت کے بارے میں درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے۔ ان روایات کا ملخص یہ ہے کہ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے حاضرین پر نظر دوڑائی تو زبیر کو نہ پایا۔ آپ نے انھیں بلا بھیجا اور کہا:

"اے رسول اللہ کے برادر عم زاد اور حواری! کیا آپ مسلمانوں کی لاٹھی کو توڑنا چاہتے ہیں؟ (کیا بیعت نہ کر کے مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں)"

انھوں نے کہا:

"یا خلیفۂ رسولؐ اللہ! مجھے سرزنش نہ کیجیے۔ میں بیعت کرتا ہوں۔"

چنانچہ انھوں نے کھڑے ہو کر بیعت کر لی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے پھر ایک نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ بھی موجود نہیں۔ آپ نے انھیں بھی بلایا اور کہا:

"اے رسولؐ اللہ کے برادر عم زاد اور آپ کے محبوب داماد! کیا آپ مسلمانوں کی لاٹھی کو توڑنا چاہتے ہیں؟"

انھوں نے بھی جواب دیا:

"یا خلیفۂ رسولؐ اللہ! میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر بیعت کر لی۔

بنوامیہ کی فتنہ کوشی

بعض روایات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بنوامیہ نے بنی ہاشم اور ابوبکرؓ کے درمیان اختلافات پیدا کر کے مسلمانوں میں فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ مذکور ہے کہ جب لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے مسجد میں جمع ہوئے تو ابوسفیان بنی ہاشم کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"مَیں ایک غبار دیکھتا ہوں جو خون بہانے ہی سے چھٹ سکتا ہے۔ اے آلِ عبد مناف! ابوبکرؓ تمھارے امور کے نگران کب سے ہو گئے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو کمزور رہنا پسند کرتے ہیں؟ کہاں ہیں علیؓ اور عباسؓ جنھیں ذلّت و خواری ہی محبوب ہے؟"

اس کے بعد یہ شعر پڑھے:

ولا یقیم علی ضیم یراد بہ — الا الاذلان عیر الحی والوتد

ھذا علی الخسف مربوط برمتہ — وذا یشج فلا یبکی لہ احد

(دو ذلیل چیزوں کے سوا کوئی بھی ظلم پر صبر نہیں کر سکتا۔ ایک تو قبیلے کا گدھا، دوسری مینخ۔ گدھا بوسیدہ رسی سے بندھا ہوا بھی ہر قسم کی ذلّت سہتا رہتا ہے اور مینخ گاڑتے وقت زخمی کیا جاتا ہے لیکن کوئی اس پر آنسو نہیں بہاتا۔)

میراث کا مطالبہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بیعت نہ کرنے کے متعلق روایات غالباً عباسی عہد میں بعض مخصوص سیاسی اغراض کی خاطر وضع کی گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیعہ حضرات حضرت علیؓ کے بیعت نہ کرنے کے ثبوت میں ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ اس واقعے کے درست ہونے میں تو کوئی شک نہیں لیکن اس کا بیعت کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ اور حضرت عباسؓ عمِ رسول اللہ ان کے پاس آئے اور آپ کی اس میراث کا مطالبہ کیا جو ارض فدک اور خیبر کی جائدادوں میں آپ کے حصے پر مشتمل تھی۔ ابوبکرؓ نے فرمایا:

"میں نے رسول اللہ سے یہ حدیث سنی ہے: نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ (ہم انبیاء کا گروہ ہیں۔ ہم کوئی میراث نہیں چھوڑتے، اپنے پیچھے ہم جو کچھ چھوڑیں گے وہ صدقہ ہوگا) اس جائداد کی آمدنی سے جس کا ذکر تم نے کیا ہے آپ کے اہل و عیال کا گزارہ چلتا تھا اس لیے میں بھی اسے وہیں خرچ کروں گا جہاں آپ خرچ کیا کرتے تھے۔"

اس پر حضرت فاطمہؓ ناراض ہو گئیں اور آخری وقت تک انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کلام نہ کیا[1]۔ وفات کے بعد حضرت علیؓ نے انھیں رات ہی کو دفن کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع نہ دی۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات رسول اللہ کی وفات کے چھ مہینے بعد ہوئی تھی۔ ابوبکرؓ سے حضرت فاطمہؓ کی ناراضی کے باعث حضرت علیؓ بھی ان سے کشیدہ خاطر تھے لیکن حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انھوں نے مصالحت کر لی۔

---

[1] میراث کے مطالبے پر حضرت فاطمہؓ کا حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا جب ابوبکرؓ نے رسول اللہ کی حدیث سے آگاہ کر دیا تھا تو ان کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو یہ کہ وہ اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیتیں یا آپ کے ارشاد پر سر تسلیم خم کر دیتیں کسی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ انھوں نے ابوبکرؓ کی بیان کردہ حدیث کی صحت سے انکار کیا ہو جب یہ بات نہیں تو فاطمہؓ جیسی پرہیزگار خاتون کس طرح آپ کے ارشاد سے منہ موڑ کر محض زمین کے چند قطعات کے لیے ابوبکرؓ سے ناراض ہو سکتی تھیں؟ (مترجم)

یہ ہے وہ اصل روایت جس میں ابوبکرؓ سے حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی ناراضی اور ان سے بول چال ترک کر دینے کا بیان ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ٹکڑا بھی ملا دیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات تک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی۔ وفات کے بعد ابوبکرؓ تعزیت کے لیے حضرت علیؓ کے پاس گئے۔ علیؓ ابوبکرؓ کو آتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

"اب ہمیں آپ کی بیعت کرنے میں کوئی روک نہیں لیکن ہمارے خیال میں خلافت ہمارا ہی حق ہے آپ نے اس پر قابض ہو کر ہمارا حق چھینا ہے اور اس طرح ہم پر ظلم کیا ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں کہا:

"اس مال و جائداد کے سلسلے میں جو میرے اور تمھارے درمیان وجۂ نزاع بنی رہی، میں نے جو کارروائی کی وہ محض تمھاری بھلائی کے لیے تھی۔"

مذکورہ صدر اصحاب یہ کہتے ہیں کہ روایت کا آخری حصّہ درایتاً ناقابلِ قبول ہے۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ حضرت ابوبکرؓ سے رسول اللہؐ کی میراث کا مطالبہ اسی وقت کر سکتے تھے جب مسلمان بالاتفاق بیعت کر کے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیتے۔ خلافت سے پہلے اس قسم کا مطالبہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ اگر حضرت علیؓ اور بنو ہاشم نے ان سے بیعت کی ہی نہ تھی اور انھیں خلیفہ تسلیم ہی نہ کیا تھا تو ان سے میراث کا مطالبہ کرنا بے معنی تھا۔

جن لوگوں کا یہ دعوے ہے کہ حضرت علیؓ نے بلا توقف حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تھی، ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ ان کی بیعت نہ کرنے سے متعلق روایات عباسیوں کے عہد میں بعض مخصوص سیاسی اغراض کے پیشِ نظر گھڑی گئیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ روایات عباسیوں سے بھی پہلے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگوں کے دوران میں بنی ہاشم اور بنی امیہ کی چشمک کے باعث وضع کی گئیں۔

مؤخر الذکر گروہ کا بیان ہے کہ عراق اور فارس کی فتح کے بعد وہاں ایرانی النسل لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اپنے فائدے کی خاطر اس قسم کی روایات وضع کرنی شروع کیں۔ سلطنتِ اسلامیہ پر امویوں کے قبضے کی وجہ سے یہ لوگ کھلم کھلا ان روایات کی تشہیر تو نہ کر سکتے

تھے لیکن خفیہ طور پر ان کی اشاعت وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب موقع ملے اور وہ کھلم کھلا اپنے عقائد کا اظہار کر سکیں۔ ابومسلم خراسانی کے خروج نے اُن کی یہ دیرینہ تمنا پوری کر دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جس طرح ان روایات کا سہارا لے کر بنو عباس نے سلطنت حاصل کی وہ تاریخ کا ایک خونیں باب ہے۔

جن لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ اور بنو ہاشم نے چالیس دن یا چھ مہینے کے بعد بیعت کی وہ اپنی دلیل میں گذشتہ روایات کے علاوہ یہ امر پیش کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور ان کے مددگار لشکرِ اسامہ میں شامل نہ ہوئے حالانکہ حضرت علیؓ کی شجاعت اور مردانگی ضرب المثل تھی۔ جس کا اظہار وہ رسول اللہ کے عہد میں کر چکے تھے۔

علاوہ بریں مہاجرین نے سقیفہ بنی ساعدہ میں بہ مقابلہ انصار اپنی خلافت کی دلیل یہ پیش کی تھی کہ رسول اللہ سے روحانی تعلق کے علاوہ ان کا جسمانی تعلق بھی ہے اور عرب سوائے قریش کے اور کسی کی اطاعت قبول نہ کریں گے کیونکہ وہ کعبہ کے نگہبان ہیں اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام لوگوں کی نگاہیں ہر امر میں قریش ہی کی طرف اُٹھتی ہیں۔ یہ دلیل بہ ذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ بنو ہاشم دوسرے لوگوں کی نسبت رسول اللہ کی جانشینی کے زیادہ حق دار تھے۔ اس لیے لازم تھا کہ وہ اپنا حق مقدم سمجھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے سے رُکے رہتے اور یہی حضرت علیؓ نے کیا بھی۔ اگر بعد میں وہ بیعت پر رضامند ہو گئے تھے تو محض اس لیے کہ کہیں ایسا فتنہ پیدا نہ ہو جائے جو مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کر دے، خصوصاً اس صورت میں کہ عرب کے طول و عرض میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا تھا اور مدینہ کی حکومت کے خلاف عربوں کی بغاوت سے دین اسلام کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ابوبکرؓ کی پُرامن خلافت

خواہ مورخین میں حضرت علیؓ اور بنی ہاشم کی بیعتِ خلافت کے متعلق کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اوّل روز ہی سے خلافت کا کاروبار بغیر کسی شور و شر اور فتنہ و فساد کے سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں ایک بھی روایت موجود نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ بنی ہاشم کے

کسی فرد یا کسی اور شخص نے ابوبکرؓ کے خلاف مسلح بغاوت یا اعلان جنگ کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ چاہیے اس کا باعث لوگوں کے دلوں میں اس بلند ترین مرتبے کا احساس ہو جو رسول اللہ کی بارگاہ میں ابوبکرؓ کو حاصل تھا یہاں تک کہ آپ نے فرمایا تھا "اگر میں بندوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا"، یا وہ شرف قربت ہو جو ہجرت کے موقع پر انھیں حاصل ہوا یا ان کے وہ فضائل جو محاسن ہوں جن کے باعث لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت کا احساس پیدا ہو گیا تھا، یا وہ مدد ہو جو ہر موقع پر رسول اللہ سے روا رکھتے تھے یا یہ واقعہ ہو کہ آپ نے اپنی آخری علالت میں انھیں نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ بہرحال ان کی بیعت کا سبب خواہ کوئی بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ ان کے مقابلے میں کوئی شخص اٹھا اور نہ کوئی شخص جس نے ایک مرتبہ ان کی بیعت کر لی تھی، بیعت سے کنارہ کشی کرنے والوں کے پاس گیا۔

یہ امر اس بات کی محکم دلیل ہے کہ اوّلین مسلمانوں کے دلوں میں خلافت کا جو تصوّر تھا وہ اس تصور سے بالکل مختلف تھا جو بعد میں بنی امیہ کے زمانے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اوّلین مسلمانوں کے دلوں میں خلافت کا تصوّر اس عربی تمدّن کے عین مطابق تھا جو رسول اللہ کی بعثت کے وقت عرب میں رائج تھا۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے وسعت اختیار کی اور عربوں کا اختلاط کثرت سے مفتوحہ قوموں کے ساتھ ہونے لگا تو اس اختلاط اور مملکتِ اسلامیہ کی وسعت کے نتیجے میں خلافت کے متعلق مسلمانوں کے تصوّر میں بھی فرق آ گیا۔

مسلمانوں کا تصوّرِ خلافت

ابتدا میں مسلمانوں کا تصوّرِ خلافت خالص عربی نقطۂ نگاہ سے تھا۔ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ نے کسی شخص کے لیے خلافت کی وصیت نہ فرمائی۔ اس امر کے پیش نظر جب ہم رسول اللہ کی وفات کے دن سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان تنازع اور عام بیعت کے بعد بنی ہاشم اور دوسرے تمام مہاجرین کے درمیان خلافت کے سلسلے میں پیدا شدہ چشمک پر غور کرتے ہیں تو بلا شبہ صریحاً عیاں ہو جاتا ہے کہ خلیفۂ اوّل کا انتخاب کرنے کے موقع پر اہل مدینہ نے اجتہاد سے کام لیا۔ کتاب و سنت میں خلافت کے لیے کوئی

سند نہ تھی۔ اس لیے مدینہ کے مسلمانوں نے جس شخص کو خلافت کی گراں بار ذمہ داری اٹھانے کا اہل سمجھا اُسے خلافت سپرد کر دی۔ اگر انتخابِ خلیفہ کا معاملہ مدینہ سے باہر دوسرے قبائلِ عرب تک بھی محیط ہو جاتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے اور اس صورت میں حضرت عمر کے قول کے مطابق حضرت ابوبکر کی بیعت اتفاقیہ اور نا گہانی نہ ہوتی۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے موقع پر جو طریقہ استعمال کیا گیا تھا وہ بعد کے دو خلیفوں (حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ) کے انتخاب کے وقت استعمال نہ کیا جا سکا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمر کی خلافت کی وصیت فرما دی تھی اور حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے انتخابِ خلیفہ کے لیے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی۔ جب حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اس کے نتیجے میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیانی اختلافات رونما ہو کر بالآخر خلافت امویوں کے ہاتھ میں آئی تو انتخاب کا طریقہ بالکل بدل گیا اور خلافت باپ کے بعد بیٹے اور بیٹے کے بعد پوتے کی طرف منتقل ہونے لگی۔

ان واقعات اور حوادث کو دیکھتے ہوئے اس قول کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی کہ اسلام نے سلطنت کا نظام سنبھالنے کے لیے باقاعدہ اصول مقرر کیے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر ایک اجتہادی معاملہ ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلتا چلا گیا ہے اور مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوتا چلا آیا ہے۔

اسلام کا نظامِ حکومت

ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں جو نظام جاری کیا وہ خالص عربی نظام تھا۔ رسول اللہ کے زمانے سے اتصال اور خود ان کے آپ سے گہرے تعلق کے باعث ان کے زمانے میں جو نظام رائج ہوا وہ تقریباً وہی تھا جو رسول اللہ کے زمانے کا تھا۔ لیکن جب حالات متغیر ہوئے اور اسلامی فتوحات میں وسعت پیدا ہوئی تو یہ نظام بھی آہستہ آہستہ مٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عہدِ عباسیہ کے زمانۂ عروج اور ابوبکرؓ کے زمانے کے نظام ہائے حکومت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بعد میں آنے والے تین خلفاء کے جاری کردہ نظاموں میں بھی بہت فرق تھا۔

ابوبکرؓ کا عہد اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ ان کا زمانہ رسول اللہؐ کی دینی سیاست اور حکومت کی دنیوی سیاست کا سنگم تھا۔ یہ درست ہے کہ دین مکمل ہو چکا تھا اور کسی شخص کو اس میں تغیر و تبدل اور اس کی تنسیخ کرنے کا حق حاصل نہ تھا لیکن رسول اللہؐ کی وفات کے معاً بعد عرب میں ارتداد کی وبا پھیل گئی اور بہت سے قبائل اسلام سے روگرداں ہو گئے۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں ابوبکرؓ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اس عظیم الشان خطرے کو دور کرنے کے لیے ایک مضبوط پالیسی مرتب کریں۔ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں ہمسایہ مملکتوں کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کا ایک اہم فریضہ بھی شروع کیا تھا۔ ابوبکرؓ کو اسے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

انھوں نے یہ کام کس طرح انجام دیا؟ اور یہ اہم ذمہ داری کس طرح ادا کی؟ اس کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ ابواب میں کریں گے۔

(۳)

عرب رسول اللہؐ کی وفات کے وقت

اِدھر مدینہ میں ابوبکرؓ کی بیعت کی جا رہی تھی اُدھر قبائل عرب میں رسول اللہؐ کی خبرِ وفات آگ کی سی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب میں کوئی خبر اتنی تیزی سے نہیں پھیلی جتنی وفاتِ رسول اللہؐ کی اطلاع۔ جونہی اِس حادثے کی شہرت ہوئی عربوں نے فوراً حکومت مدینہ کا جُوا کندھوں سے اتارنے اور بعثت نبوی سے قبل کی بدویانہ و غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آناً فاناً عرب کے ہر قبیلے میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی، نفاق کا ستارہ اوج پر پہنچ گیا یہودیوں اور نصرانیوں کی بن آئی اور چاروں طرف مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ رسول اللہؐ کی وفات سے مسلمانوں کی حالت اس بکری کی سی ہو گئی جو جاڑے کی سرد اور بارش والی رات کو صحرائے لق و دق میں بغیر چرواہے کے رہ جائے اور اُسے سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ مل سکے۔

قبل ازیں مہاجرین اور انصار کے درمیان قضیۂ خلافت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے اگر اِس موقع پر اللہ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی اور ابوبکرؓ و عمرؓ کی حکمتِ عملی آڑے نہ آ جاتی تو یہ قضیہ کسی صورت دبائے نہ دبتا اور مسلمانوں کو کبھی اتفاق و اتحاد نصیب نہ ہوتا۔

اہلِ مکہ ارتداد کے دروازے پر

اگر مدینہ اور مکہ کے حالات کا موازنہ کیا جائے تو مدینہ کے واقعات مکہ کے حالات کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ مدینہ میں تو صرف خلافت پر جھگڑا تھا لیکن اہلِ مکہ نے تو ارتداد کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور عاملِ مکہ، عتاب بن اسیدؓ لوگوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔ اللہ

کو یہ منظور تھا کہ اہل مکہ فتنے کی آگ سے بچے رہیں اس لیے وہ رسول اللہ کے مخلص صحابی سہیلؓ بن عمرو کی سعی کے بل پر ارتداد سے محفوظ رہے۔ ہوا یہ کہ جب انھوں نے اہل مکہ کے تذبذب کی حالت دیکھی تو تمام لوگوں کو جمع کیا اور رسول اللہ کی وفات کا ذکر کر کے کہا:

"آپ کی وفات سے اسلام کی قوت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس بارے میں جو شخص شک و شبہ میں گرفتار ہوگا، تذبذب کی راہ اختیار کرے گا اور ارتداد کے متعلق سوچے گا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔"

ممکن تھا کہ دھمکی کا اثر الٹا ہوتا اس لیے سہیلؓ نے دھمکی کے ساتھ ساتھ ترغیب و تحریص سے بھی انھیں اسلام پر قائم رہنے کی تلقین ان الفاظ میں کی:

"یقیناً اسلام بدستور قائم رہے گا۔ اسے کوئی ضعف نہ پہنچے گا اور رسول اللہ کے حسبِ ارشاد خلافت بھی تمھارے ہی حصے میں آئے گی۔[1]"

سہیلؓ کے اس پُر زور دعوے نے اہل مکہ کے دلوں پر دھمکی سے زیادہ اثر کیا، وہ ارتداد اختیار کرنے سے رُک گئے اور فوراً بعد انھوں نے یہ بھی سُن لیا کہ خلافت ابوبکرؓ کے حصے میں آئی ہے جو قریش کے ایک معزز فرد ہیں۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئے اور بدستور اسلام پر قائم رہے۔

فتنۂ ارتداد اور قبیلۂ ثقیف

طائف کے قبیلے ثقیف نے بھی ارتداد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جب وہاں کے عامل عثمان بن ابو العاص کو معلوم ہوا تو انھوں نے قبیلے والوں کو اکٹھا کر کے کہا:

"اے ابناء ثقیف! تم لوگ سب سے پیچھے اسلام لائے تھے۔ اب سب سے پہلے ارتداد اختیار کرنے والے مت بنو۔"

ثقیف کو وہ سلوک یاد تھا جو حنین کی جنگ کے بعد رسول اللہ نے ان سے کیا تھا۔ پھر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے اور اہل مکہ کے درمیان قرابت ہے اس لیے وہ عثمان بن ابو العاص کے سمجھانے بجھانے پر اپنے ارادے سے باز آ گئے اور بدستور اسلام پر قائم رہے۔ غالباً ابوبکرؓ

---

[1] سہیل کا اشارہ رسول اللہ کے اس قول کی طرف تھا: الائمۃ من قریش یعنی خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔

کی خلافت نے ثقیف پر بھی وہی اثر کیا جو اہل مکہ پر کیا تھا۔

دیگر قبائلِ عرب کا طرزِ عمل

جس طرح مکہ، مدینہ اور طائف کے درمیان بسنے والے قبائل اسلام پر قائم رہے اسی طرح مزینہ، غفار، جہینہ، بلی، اشجع، اسلم اور خزاعہ نے بھی اسلام کو ترک نہ کیا لیکن ان قبائل کے سوا سارے عرب میں اضطراب برپا ہو گیا۔ جن لوگوں کو اسلام قبول کیے زیادہ دن نہ گزرے تھے یا جن لوگوں کے دلوں نے اسلامی تعلیمات کا اثر قبول نہ کیا تھا انھوں نے کھلم کھلا ارتداد اختیار کر لیا۔ باقیوں کے بھی عقائد میں فرق آ گیا۔ ایک گروہ ایسا تھا جو گو اسلام پر تو قائم تھا لیکن مدینہ کی حکومت اور غلبے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا خواہ اس پر مہاجرین غالب ہوں یا انصار۔

یہ لوگ ادائے زکوٰۃ کو جزیہ سمجھتے تھے جو حکومتِ مدینہ نے ان پر لگا رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رسول اللہ کی زندگی تک تو زکوٰۃ ادا کرنے میں کوئی حرج نہ تھا کیونکہ آپ نبی تھے، آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور جو کچھ آپ ان سے طلب کرتے تھے وہ آپ کا حق تھا لیکن اب کہ آپ کو اللہ نے جوارِ رحمت میں بلا لیا ہے اہل مدینہ ان سے کسی بات میں بڑھے ہوئے نہیں اور انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ رسول اللہ کی طرح ان سے ادائے زکوٰۃ کا مطالبہ کریں۔

جن قبائل نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا تھا وہ مدینہ کے قریبی قبائل عبس اور ذبیان اور ان سے ملحقہ قبائل بنو کنانہ، غطفان اور فزارہ تھے لیکن جو قبائل مدینہ سے خاصے فاصلے پر واقع تھے وہ ارتداد کی رو میں بہ گئے تھے اور اکثر نے حسب ذیل مدعیانِ نبوت کاذبہ کی پیروی اختیار کر لی تھی:

طلیحہ جس نے بنی اسد میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔
سجاح جس نے بنی تمیم میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔
مسیلمہ جس نے یمامہ میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔
ذوالتاج لقیط بن مالک جو عمان میں شورش برپا کرنے کا ذمہ دار تھا۔
ان کے علاوہ یمن میں اسود عنسی نے اپنے حامیوں کی ایک بھاری تعداد جمع کر لی تھی۔

یہ لوگ اس کے قتل ہونے تک لڑتے رہے اور بعد میں بھی جب تک جنگہائے ارتداد کا مکمل خاتمہ نہ ہوگیا وہ بہ دستور فتنہ و فساد میں مصروف رہے۔

بغاوت اور ارتداد کے عوامل

غلبۂ قریش کے خلاف عرب کے شہریوں اور بدویوں کا اُٹھ کھڑا ہونا اور کثیر قبائل کا اسلام سے ارتداد اختیار کر لینا صرف اس وجہ سے نہ تھا کہ یہ قبائل مدینہ سے خاصے فاصلے پر واقع تھے اور انھوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا بلکہ اس کے علاوہ بعض اور عوامل بھی تھے جنھوں نے اس فتنے کو پروان چڑھنے میں مدد دی۔

اسلام عرب کے طول و عرض اور مکہ و مدینہ سے دور دراز کے علاقوں میں اس وقت تک نہ پھیل سکا جب تک فتح مکہ، غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف کے واقعات پیش نہ آگئے۔ اس عرصے تک رسول اللہ کا دائرۂ کار مکہ، مدینہ اور ان دونوں شہروں کے درمیان بسنے والے قبائل ہی تک محدود رہا۔ اسلام ہجرتِ مدینہ سے بہت تھوڑا عرصہ قبل مکہ کی حدود سے نکلا تھا ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک رسول اللہ مدینہ میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ بعد میں جب مسلمانوں نے یہود کے اثر و اقتدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور قریش کو زیر کر کے مکہ فتح کر لیا تو دیگر قبائلِ عرب بھی اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور عرب کے طول و عرض سے وفود مدینہ آکر قبولِ اسلام کا اعلان کرنے لگے۔ رسول اللہ نے بھی اپنے عمال کو دین کا علم سکھانے اور صدقات وغیرہ وصول کرنے کے لیے ان علاقوں میں بھیجنا شروع کیا۔

جغرافیائی عوامل

یہ طبعی امر تھا کہ ان قبائل کے دلوں میں مکہ، مدینہ اور قریبی علاقوں کے مسلمانوں کی طرح دینِ اسلام کی حقانیت راسخ نہ ہوئی تھی۔ اسلام کو پوری طرح پاؤں جمانے میں بیس سال صرف ہوئے مسلمانوں کو اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لیے سخت جدوجہد سے کام لینا، سالہا سال تک مخالفین کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا اور متواتر دشمن سے لڑائیوں میں مصروف رہنا پڑا تھا۔ بالآخر مخالف زیر ہو گئے اور

مکہ، طائف، مدینہ اور قریبی قبائل کے لوگوں کے دلوں میں جنھیں رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ سے بہ کثرت ملنے جلنے کا موقع ملا، اسلامی تعلیمات راسخ ہوگئیں۔ لیکن ان لوگوں پر اسلامی تعلیمات کا کوئی اثر نہ ہوسکا جو اسلامی مراکز سے دور تھے اور جنھوں نے اسلام کی خاطر مسلمانوں کی جدوجہد کو نہ آنکھوں سے دیکھا تھا اور نہ اُن کی قربانیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد انھوں نے اس نئے دین سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی شروع کردی جو ان کے خیال میں زبردستی ان پر مسلّط کردیا گیا تھا۔

اجنبی عوامل

جغرافیائی عوامل کے علاوہ اجنبی عوامل بھی ان قبائل کے خلاف اسلام اُٹھنے میں کم اثر انگیز نہ تھے۔ مکہ، مدینہ کے اردگرد کے علاقے تو ایرانیوں اور رومیوں کی دستِ برد سے محفوظ تھے لیکن عرب کا شمالی حصہ جو شام سے متصل تھا اور جنوبی علاقہ جو ایران سے ملا ہوا تھا ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے زیرِ اثر تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کو ان علاقوں میں بہت اثر و رسوخ حاصل تھا اور یہاں کے سردار بھی براہِ راست رومیوں اور ایرانیوں کے تابع تھے۔ ان امور کی موجودگی میں کچھ تعجب نہیں کہ ارتداد کی رو میں مندرجہ ذیل عوامل کام کر رہے ہوں:

(۱) شخصی آزادی اور خود مختاری کا جذبہ

(۲) شمال میں مسیحی اور جنوب و مشرق میں مجوسی سلطنتوں سے قرب کے باعث مسیحیت اور مجوسیت کا دلوں پر اثر

(۳) آبائی عقیدے (بت پرستی) کی کشش

جونہی رسول اللہؐ کی خبرِ وفات مشہور ہوئی ان عوامل نے اثر دکھانا شروع کر دیا اور جا بجا ارتداد کا فتنہ برپا ہونے لگا۔ بعض علاقوں میں تو رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں ان عوامل نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان ہوگی۔ متعدد ایسے لوگ اُٹھ کھڑے ہوگئے جنھوں نے اپنے قبیلوں کو بغاوت کرنے پر اُکسانا اور اپنے جھنڈے تلے جمع کرنا شروع کیا اور اس طرح عرب کے طول و عرض میں ایک زبردست فتنہ پھیل گیا۔

منکرین زکوٰۃ کی منطق

جو لوگ ادائے زکوٰۃ سے انکاری تھے آپس میں کہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار چونکہ خلافت کے بارے میں جھگڑا کر چکے ہیں اور رسول اللہؐ نے وفات سے قبل کسی شخص کی خلافت کے متعلق وصیت نہیں کی اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام پر قائم رہتے ہوئے خود مختاری کی حفاظت کریں اور ہمیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ انصار و مہاجرین کی طرح ہم بھی اپنے میں سے کسی شخص کو اپنا امیر مقرر کر لیں جو ہمارے لیے جانشین رسول اللہؐ کے طور پر ہو۔ ابوبکرؓ یا ان کے سوا کسی اور کی اطاعت سے متعلق نہ دین میں کوئی نص موجود ہے اور نہ کتاب اللہ سے اس کا پتا چلتا ہے اس لیے ہم پر صرف اسی شخص کی اطاعت واجب ہے جسے ہم خود اپنا امیر مقرر کریں۔

یہ لوگ اپنی تائید میں یہ امر بھی پیش کرتے تھے کہ رسول اللہؐ نے عرب کے متعدد شہروں کو اپنی زندگی ہی میں بڑی حد تک خود مختاری عطا فرما دی تھی۔ اب اگر آپ کی وفات کے بعد وہ مکمل خود مختاری چاہتے ہیں تو اس میں کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ نے یمن کے عامل بدھان (یا بازان) کو جو ایرانیوں کی جانب سے وہاں حکومت کر رہا تھا مجوسیت ترک کرنے اور اسلام لانے کے بعد بدستور وہاں کا حاکم بنائے رکھا۔ اسی طرح بحرین اور حضرموت وغیرہ کے تمام امراء کو بھی قبولِ اسلام کے بعد ان کے عہدوں پر برقرار رکھا اور اپنی طرف سے کوئی نیا عامل ان علاقوں میں نہ بھیجا۔

زکوٰۃ کے بارے میں ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اصل میں جزیہ ہے جو ان پر عائد کیا گیا ہے حالانکہ جزیہ صرف غیر مسلموں پر واجب ہے۔ اس صورت میں کہ وہ ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے مدینہ والے تو وہ کیوں حاکمِ مدینہ کو زکوٰۃ ادا کریں؟ ان کے اور اہلِ مدینہ کے درمیان صرف ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے دین اسلام، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدینہ والے ان پر حکومت کرنے کے بھی حق دار ہیں۔ اہلِ مدینہ کو بے شک اسلام میں اولیت کا شرف حاصل ہے لیکن دوسرے قبائل پر اپنی اس فضیلت کا اظہار وہ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ ان کی طرف معلمین بھیجیں جو انھیں دین کا علم سکھائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے رسول اللہؐ کیا کرتے تھے۔ وہ اور ہم بے شک

ایک ہی امت ہیں لیکن اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ کسی فریق کو دوسرے فریق پر غلبہ و تسلط حاصل ہو اور ایک قبیلے کو اس کی آزادی و خودمختاری کی نعمت سے محروم کر دیا جائے۔

اِس قسم کے خیالات ان قبائل میں پیدا ہو رہے تھے جو مکہ، مدینہ اور طائف کے قریب واقع تھے۔ لیکن یمن اور دور دراز کے علاقوں کے حالات بالکل مختلف تھے۔ ان لوگوں میں جونہی رسول اللہ کی خبرِ وفات مشہور ہوئی ان کے ایمان متزلزل ہونے لگے اور انھوں نے نہ صرف ارتداد اختیار کر لیا بلکہ ان لوگوں کے جھنڈے تلے جمع ہو کر سلطنتِ اسلامیہ سے بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں جنھوں نے قبائلی عصبیت کی آگ بھڑکا کر لوگوں کے دلوں میں اہلِ مکہ و مدینہ کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہ لوگ کسی تبلیغ کی وجہ سے مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ کا اقتدار نہایت تیزی سے روم و ایران کی سرحدوں تک پھیل گیا ہے اور سارے عرب پر آپ کی حکومت قائم ہوگئی ہے طوعاً و کرہاً اسلام لانے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کے وفود مدینہ میں آتے اور اپنے اور اپنے قبیلوں کی طرف سے اسلام لانے کا اعلان کرتے تھے۔

مدعیانِ نبوّت کا خروج

فتنے کی آگ سب سے زیادہ بھڑکانے والے لوگ وہ تھے جو نبوّت کے مدعی بن کر کھڑے ہوئے اور دعوے کرنے لگے کہ ان پر اسی طرح وحی نازل ہوتی ہے جس طرح محمدؐ پر۔ ان لوگوں نے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بعد میں خود نبوّت کا دعویٰ کر دیا بعض نے تو رسول اللہ کے زمانے ہی میں خروج کر دیا تھا۔

بنی اسد میں طلیحہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک بار وہ اپنی قوم کے ساتھ سفر کر رہا تھا سخت گرمی کے دن تھے اور پیاس کے مارے لوگوں کا دم نکلا جا رہا تھا۔ اچانک انھیں صحرا میں ایک شیریں چشمہ مل گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی نبوّت پر لوگوں کا ایمان مستحکم ہوگیا۔

بنی حنیفہ میں مسیلمہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس نے صرف دعوائے نبوّت پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ رسول اللہ کے پاس پیغام بھی بھیجا کہ "مجھے نبوّت میں آپ کا شریک کیا گیا ہے۔ اِس لیے نصف زمین قریش کی ہے اور نصف زمین میری لیکن قریش بڑی بے انصاف قوم ہے۔"

یمن میں اسود عنسی نبوت کا مدعی بن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے طاقت حاصل کر کے یمن پر قبضہ کر لیا اور رسول اللہ کے عامل کو وہاں سے نکال دیا۔

رسول اللہ نے ان مدعیان نبوت کی طرف زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ آپ کو یقین تھا، دین خدا میں اتنی قوت موجود ہے کہ ان مدعیوں کے کذب و افترا کے مقابلے میں کافی ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کا ایمان اس قدر مضبوط ہے کہ وقت پڑنے پر بہ خوبی ان لوگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اسود عنسی کا فتنہ

یہ مدعیانِ نبوت بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ رسول اللہ کی زندگی میں وہ آپ کے مقابلے پر ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اور اسی احساس کے باعث اسود عنسی کے سوا اور کسی مدعیٔ نبوت نے آپ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے کی جرأت نہ کی۔ اسود عنسی کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور آپ ہی کے عہد میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس نے بھی اپنے بھائیوں کی سی روش اختیار کیے رکھی . . . .

. . . . اور اندر ہی اندر اپنے لیے زمین ہموار کرتا رہا، رسول اللہ کی وفات کے بعد اس نے علانیہ اسلام کے خلاف بغاوت کر دی اور میدان مقابلہ میں آ گیا۔ یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

> "اسود عنسی نے رسول اللہ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے ترقی کرنی شروع کی اور اس کی قوم کے ہزاروں افراد اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے لگے۔ بالآخر دو شخصیتوں: قیس بن مکشوح المرادی اور فیروز دیلمی نے اس کے گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اس وقت وہ نشے کے عالم میں تھا۔"

طبری بھی اپنی ایک روایت میں لکھتا ہے:

> "رسول اللہ کی وفات کے بعد مرتدین سے پہلی جنگ یمن میں اسود عنسی کے خلاف لڑی گئی۔"

رسول اللہ کی زندگی کے آخری حصے میں عرب کاملاً پرسکون نہ تھا بلکہ اندر ہی اندر فتنے کی آگ سلگ رہی تھی۔ عرب کا شمال مشرقی اور جنوبی حصہ سارے کا سارا اس آگ میں جل رہا تھا۔ اس حالتِ انتشار کو وہ روحانی قوت ہی دور کر سکتی تھی جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو مرحمت فرمائی تھی۔ اگر رسول اللہ کی بالغ نظری، حکمتِ عملی اور حسنِ تدبیر کے ساتھ اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو سخت خطرہ تھا کہ یہ آگ آپ کی زندگی ہی میں پورے زور سے بھڑکنے لگتی اور سارا عرب اس میں جل کر خاکستر ہو جاتا۔

یمن میں فتنۂ اسود

اغلب گمان یہی ہے کہ اسود عنسی کا فتنہ رسول اللہ کی زندگی کے آخری حصے میں برپا ہوا تھا مورخین اِس بغاوت کا حال جس طرح بیان کرتے ہیں اِس سے بعض ایسے پہلو نمایاں ہوتے ہیں جو خاصے غور و فکر کے محتاج ہیں۔

اس واقعے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب رسول اللہ نے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھنے شروع کیے تو کسریٰ شاہ فارس کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے اسلام لانے کی دعوت دی۔ جب اسے خط کے مضمون کا ترجمہ سنایا گیا تو اس نے اپنے عامل یمن بازان[1] کو حکم بھیجا کہ "حجاز سے اس آدمی کا سر منگوا کر مابدولت کے پاس بھیج دو جس نے عرب میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔"

اس زمانے میں رومی ایرانیوں کے زیرنگیں تھے لیکن کسریٰ کے یہ خط لکھنے کی دیر تھی کہ حالات بدل گئے اور وہ رومی جو اس سے قبل ایرانیوں کی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے اب ان کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کو تیار ہو گئے۔ نہ صرف انھوں نے ایرانیوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لی بلکہ ان پر غلبہ پا کر ان کی طاقت و قوت کو بے حد کمزور بھی کر دیا۔

جب بازان کو اپنے آقا کا خط ملا تو اس نے اپنے دو آدمیوں کو وہ خط دے کر رسول اللہ کی خدمت میں بھیجا مگر آپ نے ان آدمیوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا:

"میرے اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ تمھارے بادشاہ (کسریٰ) کو اس کے بیٹے

---

[1] بعض روایات میں عامل کا نام بازان کے بجائے بدھان آیا ہے۔

شیرویہ نے ہلاک کر دیا ہے اور اس کی جگہ خود بادشاہ بن بیٹھا ہے۔"

ساتھ ہی آپ نے باذان کو اسلام لانے کی دعوت بھی دی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اسلام لے آیا تو آپ اسے بدستور یمن کا حاکم بنائے رکھیں گے۔ اسی عرصے میں ایران کی گڑبڑ، تخت شاہی پر شیرویہ کے قبضے اور رومیوں کے غلبے کی خبریں بھی باذان کو مل گئیں۔ اس نے رسول اللہؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے اپنے وعدے کے مطابق اسے بدستور یمن کا حاکم بنائے رکھا۔

باذان کی وفات کے بعد رسول اللہؐ نے یمن کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے پر مختلف آدمیوں کو حاکم مقرر کر دیا۔ باذان کے لڑکے شہر کو صنعا، اور اس کے گرد و نواح کی حکومت تفویض ہوئی۔ باقی عاملوں میں سے بعض تو یمن ہی کے باشندے تھے اور بعض کو رسول اللہؐ نے مدینے سے حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ ان عمال نے اپنی اپنی ولایت میں پہنچ کر نظم و نسق سنبھالا ہی تھا کہ انھیں اسود عنسی کا پیغام ملا کہ وہ فوراً یمن سے نکل جائیں کیونکہ یمن پر حکومت کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ یہ تھی اس فتنے کی ابتدا۔

اسود عنسی کے فتنے کا آغاز

اسود اصل میں ایک کاہن تھا جو یمن کے جنوبی حصے میں رہتا تھا۔ اس نے شعبدہ بازی اور مسجع و مقفیٰ گفتگو کی وجہ سے بہت جلد لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ بالآخر وہ نبوت کا مدعی بن بیٹھا اور اپنا لقب 'رحمان الیمن' رکھا۔ بعینہٖ جیسے مسیلمہ نے اپنا لقب 'رحمان الیمامہ'[1] رکھا تھا۔ وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے پاس ایک فرشتہ آتا ہے جو ہر بات اسے بتا دیتا ہے اور اس کے دشمنوں کے تمام منصوبے طشت از بام کر دیتا ہے۔ اس کا قیام مذحج کے علاقے میں ایک غار میں تھا جسے خبان کہتے تھے۔ جہلا کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی باتوں سے مسحور ہو کر

---

[1] لغت کی کتاب لسان العرب میں لکھا ہے کہ رحمٰن اللہ کی صفت ہے جو اس کے سوا اور کسی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ رحمٰن کالفظ عبرانی ہے اور رحیم عربی۔ بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل عرب کے جنوبی حصے میں ایک معبود کا نام رحمان تھا جس سے اہل حجاز واقف نہ تھے۔

اس کے گرد اکھٹی ہوگئی۔

اسود اس جماعت کو لے کر نجران کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے مسلمان حاکموں: خالد بن سعید اور عمرو بن حزم کو شہر سے نکال دیا۔ اہلِ نجران کی ایک بھاری تعداد بھی اسود کے ساتھ مل گئی تھی وہ اسے لے کر صنعاء روانہ ہوا۔ وہاں شہر بن بازان سے مقابلہ پیش آیا۔ اسود نے اسے شہید کر دیا اور اس کی فوج کو شکست دی۔ یہ دیکھ کر صنعاء میں مقیم مسلمانوں کو وہاں سے بھاگ کر مدینہ آنا پڑا۔ انھیں لوگوں میں معاذ بن جبل بھی تھے۔ ادھر خالد بن سعید اور عمرو بن حزم بھی نجران سے مدینہ پہنچ گئے۔ اب یمن پر اسود قابض تھا اور حضر موت سے بحرین، احسا اور عدن تک اسی کا طوطی بول رہا تھا۔

فتنۂ عنسی کے عوامل

جب اسود صنعاء میں شہر بن بازان کے مقابلے پر آیا تھا تو اس کے ساتھ صرف سات سو سوار تھے جن میں سے بعض اس کے ساتھ مذحج سے آئے تھے اور بعض نجران سے ہمراہ ہو لیے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل تعداد سے یہ کاہن اس علاقے کے لوگوں پر کس طرح فتح یاب ہو گیا اور کسی جانب سے بھی اس کے خلاف آواز کیوں نہ اُٹھی؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس علاقے کے باشندے پہلے ایرانیوں کے زیرِ نگیں تھے، ان کے بعد حجازی مسلمانوں کے زیرِ تسلط آ گئے۔ یمن اور حجاز کے لوگوں میں دیرینہ خصومت اور بغض و عناد پایا جاتا تھا۔ جب اسود عنسی نے کھڑے ہو کر یہ نعرہ لگایا کہ یمن صرف یمنیوں کا ہے تو وہاں کے باشندے اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ کوئی شخص مسلمانوں کی حمایت میں اس کاہن اور شعبدہ باز کے لیے کھڑا نہ ہوا۔ یمن مختلف مذاہب کا اکھاڑہ تھا۔ یہاں یہودیت بھی پائی جاتی تھی نصرانیت کا وجود بھی ملتا تھا اور مجوسیت نے بھی اثر جما رکھا تھا۔ ان کے بعد اسلام نے اپنا علم بلند کیا لیکن ابھی تک اصولِ اسلام یمنیوں کے ذہنوں میں راسخ نہ ہوئے تھے جب مدعیٔ نبوت کھڑا ہوا۔ لوگوں کو تحفظِ وطنیت کا واسطہ دے کر اپنی طرف بلایا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اجنبی عناصر کو یہاں سے کلیتہً نکال پھینکے گا تو وہ لوگ جو ایک عرصے سے اجنبی تسلط کے باعث تنگ آ چکے تھے، اس کی امداد کو دوڑ پڑے۔ اس صورت میں مسلمانوں کے لیے فرار کے سوا کوئی چارۂ کار

نہ رہا۔ بقیہ ایرانیوں کے لیے بجز اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ یا تو اسود عنسی کی اطاعت قبول کرلیں یا اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

فتنے کا مقابلہ

جب یہ تشویش ناک خبریں مدینہ میں پہنچیں تو رسول اللہؐ غزوۂ موتہ کا انتقام لینے اور شمالی جانب سے حملوں کا سدِ باب کرنے کے لیے رومیوں پر چڑھائی کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اسامہؓ کے لشکر کو تیاری کا حکم دے چکے تھے، مگر جب یہ خبریں ملیں تو اب آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے، ایک یہ کہ آپ اس لشکر کو بغاوت کے فرو کرنے کے لیے یمن بھیج دیں تاکہ مسلمان وہاں دوبارہ قابض ہو سکیں یا پروگرام کے مطابق اسے رومی سرحد ہی کی جانب روانہ کر دیں اور اسود عنسی کا مقابلہ کرنے کے لیے فی الحال انہی مسلمانوں سے کام لیں جو یمن میں موجود تھے۔ اگر وہ اس پر غالب آ گئے تو اِس سے بہتر کوئی بات نہیں ہو سکتی ورنہ جب اسامہ کا لشکر رومیوں پر فتح یاب ہو کر آئے گا تو اسود اور دیگر باغیوں کے مقابلے اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے روانہ کر دیا جائے گا۔

بہت ہی احتیاط سے معاملے پر غور کرنے کے بعد رسول اللہؐ نے دوسری تجویز پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور وبر بن یحنس کو یمن کے مسلمان سرداروں کے نام یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کی پوری جدوجہد کریں۔ اسود سے جنگ جاری رکھیں اور ہر ممکن طریقے سے اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کریں۔ آپ نے یمن کے متعلق فی الحال یہی کارروائی کرنی مناسب سمجھی اور پوری قوت سے لشکر اسامہ کی تنظیم میں مصروف ہو گئے۔

ابھی اسامہ کا لشکر روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ رسول اللہؐ بیمار ہو گئے اور لشکر رُک گیا۔ دریں اثنار اسود عنسی اپنی سلطنت مضبوط کرنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ اُس نے تمام علاقوں میں اپنے عامل مقرر کیے اور جا بجا فوجیں متعین کیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ جلد ہی اس نے زبردست قوت حاصل کر لی اور عدن تک کا سارا ساحل اور صنعاء سے طائف تک کی تمام وادیاں اور پہاڑ اس کے زیرِ نگیں آ گئے۔

اسود عنسی کے عہدیدار

قیس بن عبدلغیوث کو اسود عنسی نے اپنا سپہ سالار بنایا اور دو ایرانیوں: فیروز اور داذویہ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس نے شہر بن بازان کی بیوہ آزاد سے شادی بھی کر لی جو فیروز کی چچیری بہن تھی۔ اس طرح عرب اور عجم دونوں اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ جب اُس نے اپنی یہ شان و شوکت دیکھی تو خیال کر لیا کہ روئے زمین کا مالک وہی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔

اسود عنسی کے خلاف بغاوت

لیکن وہی عوامل جو اس کی فتح مندی کا موجب ہوئے تھے، بالآخر اس کے زوال کا باعث بنے۔ انہی قیس، فیروز اور داذویہ سے جنھیں اُس نے اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا تھا، اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اور مؤخرالذکر شخصوں اور یمن میں مقیم تمام ایرانیوں کے متعلق تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ حیلوں، سازشوں اور مکر و فریب سے اس کی سلطنت کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں ہیں۔

اسود کی ایرانی بیوی کو بھی اسود کی زبانی ان لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہو گیا۔ اس کی رگوں میں بھی ایرانی خون دوڑ رہا تھا اور وہ دل میں اس کاہن کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پنہاں کیے ہوئے تھی جس نے اس کے پیارے خاوند کو اس سے جدا کر دیا تھا، پھر بھی اس نے نسوانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نفرت و حقارت کو اس سے چھپائے رکھا، اور طرزِ سلوک سے اس پر ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ وہ اس کی نہایت وفادار بیوی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسود اپنی بیوی کی طرف سے بالکل مطمئن رہا اور اس کے دل میں یہ شائبہ تک نہ گزرا کہ وہ کبھی اسے دغا دے سکتی ہے لیکن وہ اپنے دونوں وزیروں اور قائدِ لشکر سے مطمئن نہ تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس وفاداری کا ثبوت بہم نہیں پہنچا رہے جو غلام اپنے آقا اور ولی نعمت سے کیا کرتے ہیں۔ قیس کی طرف سے وہ خصوصاً فکرمند تھا۔ کیونکہ سارا لشکر اس کے ماتحت تھا اور وہ لشکر کی مدد سے اس کے خلاف جو چاہتا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے قیس کو

بلایا اور کہا میرے فرشتے نے مجھ پر یہ وحی نازل کی ہے کہ:

"اگرچہ تو نے قیس کی ہر طرح عزت افزائی کی لیکن جب اس نے ہر طرح عمل دخل کر لیا اور وہی عزت جو تجھے حاصل تھی اسے بھی حاصل ہو گئی تو اب وہ تیرے دشمنوں سے ساز باز کر رہا ہے اور تجھ سے غداری کر کے تیرا ملک چھیننے کے درپے ہے۔"

قیس نے جواب دیا:

"آپ کا خیال درست نہیں۔ میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت بدستور ہے اور میں آپ کے خلاف بغاوت کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اسود نے گہری اور غائر نظر سے قیس کا جائزہ لیا اور بولا:

"کیا تو فرشتے کو جھٹلاتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ فرشتے نے ضرور سچ کہا ہے۔ البتہ مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ تو اپنی پچھلی کارروائیوں پر نادم ہے اور جو مخفی ارادے تو نے میرے متعلق کر رکھے تھے ان سے توبہ کرتا ہے۔"

قیس کو اسود کی باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ وہ اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے اس لیے وہ وہاں سے نکل کر فیروز اور داذویہ سے ملا اور ساری سرگزشت انھیں سنا کر رائے دریافت کی۔ انھوں نے کہا خود ہمیں بھی اسود کی طرف سے خطرہ ہے۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسود نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم قیس سے مل کر میرے خلاف سازشیں کر رہے تھے لیکن یاد رکھو میری مخالفت کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ ان دونوں کو بھی یہ باتیں سن کر یقین ہو گیا کہ اسود کی نیت ان دونوں کی طرف سے ٹھیک نہیں۔

ان واقعات کی خبریں یمن کے دوسرے مسلمانوں کو بھی ہو گئیں۔ ان کے پاس رسول اللہؐ کی طرف سے یہ ہدایت پہلے ہی آ چکی تھی کہ جس طرح بھی ہو اسود عنسی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے۔ انھوں نے قیس اور اُس کے ساتھیوں کو پیغام بھیجا کہ اسود کے معاملے میں ہم سب کی رائے ایک ہے اِس لیے اس کے خلاف بالاتفاق کارروائی کرنی چاہیے۔ نجران اور اس کے قریبی علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی ان واقعات کا علم ہو گیا۔ انھوں نے اپنے

ساتھیوں کو جو اسود کے قریب رہتے تھے لکھا کہ وہ بھی دل و جان سے قتلِ اسود کے خواہش مند ہیں اور اس کام میں ہر طرح ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ادھر سے انھیں جواب ملا کہ فی الحال وہ اپنی اپنی جگہوں ہی پر مقیم رہیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اسود کو شبہہ ہو کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔

ان لوگوں کی یہ رائے بالکل درست تھی کہ اسود کے خلاف جو کارروائی کی جائے خفیہ کی جائے کیونکہ رازداری سے اس کا کام تمام کر دینا کھلم کھلا لڑائی کرنے سے بہرحال بہتر تھا۔ اب ان لوگوں کے مشوروں میں اسود کی بیوی آزاد بھی شامل ہو گئی، اگرچہ بظاہر وہ اپنے خاوند کو یہی جتاتی تھی کہ اسے اس سے بے انتہا محبت ہے۔ اس نے فیروزؓ، داذویہ اور قیس کو ساتھ ملایا اور انھیں اسود کے سونے کا کمرہ دکھا کر ہدایت کی کہ وہ رات کو نقب لگا کر محل میں داخل ہو جائیں۔ محل کے ہر گوشے میں اسود کے سپاہی موجود ہوتے ہیں لیکن سونے کے کمرے کی پشت سپاہیوں سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ وہ پشت سے داخل ہوں اور اسے خواب کی حالت میں اچانک قتل کر ڈالیں، خود بھی اس سے نجات حاصل کر لیں اور اُسے بھی ایسے ظالم انسان سے مخلصی دلائیں۔

اسود کا قتل

چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور رات کو پشت کی طرف سے محل میں داخل ہو کر اسود کو قتل کر ڈالا۔ صبح ہونے پر انھوں نے اذانیں دینی شروع کیں اور بلند آواز سے کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور عبہلہ (اسود عنسی کا نام) کذاب ہے۔ اسود کا سر بھی انھوں نے محل کے باہر پھینک دیا۔ ان کی آوازیں سن کر محل کے پہرے داروں نے ان کا محاصرہ کر لیا، لیکن اسی دوران میں اہلِ شہر کو اسود عنسی کے قتل ہونے کا پتا چل چکا تھا۔ وہ محل کی طرف بھاگے۔ اس وقت ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ قیس، فیروز اور داذویہ تینوں یمن کا انتظام سنبھالیں گے۔

اِس بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ اسود عنسی رسول اللہؐ کی وفات سے قبل قتل ہوا یا بعد میں۔ اِس سلسلے میں یعقوبی کی روایت ہم پہلے درج کر چکے ہیں طبری اور ابن اثیر

کا بیان ہے کہ وہ آپ کی وفات سے پہلے ہی جہنم واصل ہو گیا تھا۔ جس رات اس کے قتل کا واقعہ ہوا اسی رات اللہ نے بذریعہ وحی آپ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا:

"عنسی قتل کر دیا گیا۔ اسے ایک بابرکت آدمی نے قتل کیا جو خود بھی ایک بابرکت خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

لوگوں نے دریافت کیا:

"حضورؐ! اس کا قاتل کون ہے؟"

آپ نے فرمایا "فیروز"

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسود عنسی کے قتل کی خبر رسول اللہ کی زندگی میں مدینہ نہیں پہنچ سکی بلکہ بعد میں پہنچی اور یہ پہلی خوش خبری تھی جو ابوبکرؓ کو ملی۔

ایک روایت خود فیروز کی زبانی مروی ہے جس میں وہ کہتا ہے:

"جب ہم نے اسود کو قتل کیا تو وہاں کا انتظام اسی طرح برقرار رکھا جس طرح اسود کے تسلط سے پہلے تھا۔ ہم نے پہلے معاذ بن جبل کو بلا بھیجا کہ وہ ہمیں نماز پڑھائیں اور دین کی تعلیم دیں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ ہم نے اپنے بہت بڑے دشمن سے نجات حاصل کی تھی۔ یکایک رسول اللہ کی خبر وفات پہنچی اور یمن میں دوبارہ اضطراب پیدا ہو گیا۔"

یہ اضطراب کیوں اور کس طرح پیدا ہوا؟ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، یہ بیان مرتدین کی جنگوں کے ذیل میں آئے گا۔

جنوبی عرب میں بغاوت

یمن کی مذکورہ بالا بغاوت تو اسلام کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ تھا ہی لیکن یمامہ اور خلیج فارس سے ملحقہ قبائل میں بھی حالات پرسکون نہ تھے بلکہ وہاں بھی اندر ہی اندر بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ مسلمان اس صورت حال سے خاصے پریشان تھے۔ کبھی تو وہ شورش کے بانیوں سے

صلح کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور کبھی طاقت کے ذریعے سے ان کا سر کچلنے کی تدابیر میں مصروف ہو جاتے تھے تاکہ ان کا غلبہ و اقتدار بہ دستور قائم رہے اور اُسے کوئی ضعف نہ پہنچے۔ یہ علاقے ایک طرف تو مکہ اور مدینہ سے دُور تھے اور اسلام کی تعلیم ان لوگوں کے دلوں میں راسخ نہ ہوئی تھی، دوسری طرف یہ فارس سے متصل تھے اور ایرانیوں سے ان لوگوں کا تجارتی رابطہ قائم تھا، اِس لیے تعجب نہیں کہ ان بغاوتوں اور شورشوں میں ایرانیوں کا بھی خفیہ ہاتھ ہو۔

مسیلمہ کا دعوائے نبوّت

گزشتہ اوراق میں ہم اجمالاً بیان کر چکے ہیں کہ بنی حنیفہ کے مدعیٔ نبوّت مسیلمہ بن حبیب نے دو قاصدوں کے ہاتھ رسول اللہ کو یہ خط مدینہ بھیجا تھا۔

"من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ۔ سلام علیک، اما بعد فانی قد أشرکت فی الامر معک، وان لنا لنصف الارض ولقریش نصف الارض، ولکن قریشاً قوم لا یعدلون۔"

(مسیلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد رسول اللہ کی طرف آپ پر سلامتی ہو۔ بعد ازاں واضح ہو کہ میں آپ کا شریک بنایا گیا ہوں۔ اِس لیے نصف زمین ہماری ہے اور نصف قریش کی۔ لیکن قریش کی قوم انصاف سے کام نہیں لیتی۔)

رسول اللہ نے یہ سنا تو قاصدوں سے دریافت فرمایا:

"تم اِس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا:

"ہم وہی کہتے ہیں جو خط میں لکھا ہے۔"

آپ نے غضب ناک نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"اللہ کی قسم! اگر قاصدوں کا قتل روا ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اُڑا دیتا۔"

اس کے بعد مسیلمہ کو یہ جواب لکھوایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الیٰ مسیلمۃ الکذاب
امابعد فان الارض اللہ یرثہا من یشاء من عبادہ المتقین۔"
(محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کی طرف بے شک زمین اللہ کی
ہے وہ اپنے متقی بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے)

رسول اللہ اس خط کے مضمرات سے ناواقف نہ تھے۔ آپ نے اہل یمامہ کے دلوں سے مسیلمہ کا اثر زائل کرنے اور انھیں اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے مدینہ سے ایک شخص نہار الرحال کو یمامہ بھیجا لیکن وہ جاکر مسیلمہ سے مل گیا اور اہل یمامہ کے سامنے گواہی دی کہ واقعی مسیلمہ محمد رسول اللہ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ نہار الرحال کی تائید نے مسیلمہ کے اثر و نفوذ میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور اہل یمامہ جوق در جوق مسیلمہ کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہونے لگے۔ پھر بھی رسول اللہ خدائی رحمت سے قطعاً ناامید نہ ہوئے۔ آپ کو یقین تھا کہ اللہ مسلمانوں کو رومیوں پر ضرور فتح عطا فرمائے گا اور اس فتح کے نتیجے میں تمام داخلی فتنے اپنی موت آپ ہی مر جائیں گے۔

رسول اللہ کی حکمتِ عملی

اس وقت رسول اللہ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ ہر قیمت پر رومیوں کو زیر کیا جائے اور عرب کی شمالی حدود کو ہرقل کی فوجوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جائے۔ اس زمانے میں ہرقل کی قوت و طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا اس نے اپنے وہ تمام علاقے جو کچھ عرصہ قبل ایرانیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے واپس چھین لیے تھے اور صلیب اعظم کو بھی ایرانیوں سے چھڑا کر بیت مقدس واپس لے آیا تھا۔ اس بات کا زبردست خطرہ تھا کہ کہیں رومی فوجوں کا رخ عرب کی جانب نہ پھر جائے کیونکہ وہاں کے حکمران سرزمین عرب میں ایک نئی قوت کو ابھرتے دیکھ کر سخت پریشان ہو رہے تھے۔ غزوۂ موتہ میں اسلامی لشکر رومیوں کے مقابلے کی تاب نہ لاکر واپس ہونے پر مجبور ہوا تھا (گو اسے ان کے مقابلے میں شکست کا سامنا نہ کرنا پڑا) غزوۂ تبوک نے مسلمانوں کے رعب و داب میں خاصا اضافہ کر دیا تھا پھر بھی عرب پر رومیوں کے حملے کا خطرہ کلیتہً دور نہ ہوا۔ رسول اللہ کا خیال تھا کہ اگر اسلامی فوجیں رومیوں پر غالب آگئیں تو نہ صرف

آئندہ کے لیے عرب علاقوں پر ان کی تاخت و تاراج کا سلسلہ رک جائے گا بلکہ شوریدہ سر عربی قبائل بھی دبک کر بیٹھ جائیں گے اور طوعاً و کرہاً مسلمانوں کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوں گے۔

آپ کا یہ خیال بالکل درست تھا کیونکہ اس زمانے میں عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں ہی کا غلغلہ برپا تھا۔ انھیں عرب کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یمامہ میں مسیلمہ، عمان میں لقیط اور بنی اسد میں طلیحہ اس قابل نہ تھے کہ مسلمانوں سے کھلم کھلا جنگ چھیڑ کر فتح یاب ہو سکتے۔

لقیط، طلیحہ اور مسیلمہ تینوں ایسے مناسب موقع کے انتظار میں تھے جب باقاعدہ بغاوت کا اعلان کر کے مسلمانوں کا تختہ اُلٹ سکیں۔ ابتدا میں ان تینوں نے رسول اللہؐ پر طعن و تشنیع اور آپ کی رسالت پر اعتراض کیے بغیر اپنا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ تینوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نبی ہیں اور جس طرح ہر قوم میں اللہ کی طرف سے نبی مبعوث کیے گئے ہیں، انھیں بھی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ وہ انھیں ہدایت کا راستہ دکھائیں۔

یہ صورتِ حال ان علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ ان کے زیرِ پا فتنہ کی آگ سلگ رہی تھی اور کسی کو علم نہ تھا کہ کب یہ آگ زور شور سے بھڑک اُٹھے۔

جونہی رسول اللہؐ کی خبرِ وفات مشتہر ہوئی یہ آگ بھڑک اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے عرب ایک آتش فشاں پہاڑ میں تبدیل ہو گیا جس سے آگ اور سیال لاوا نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ یہ فتنہ مختلف علاقوں کے اندر مختلف صورتوں میں پھیلا اور ہر جگہ اس کے اسباب و عوامل بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان تمام باتوں کا ذکر ہم آگے چل کر وضاحت سے کریں گے لیکن یہاں بعض ضروری باتوں کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب اور فتنۂ مدعیانِ نبوت

فتنہ و فساد کے اس طوفان پر نظر ڈالنے سے بعض اہم امور کا علم ہوتا ہے جن پر غور و فکر سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بھی فتنہ اُٹھا بڑی تیزی سے اُٹھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

اسود عنسی نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور اس کی حکومت جنوب میں حضر موت سے مکہ و طائف تک پھیل گئی مسیلمہ اور طلیحہ نے بھی غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مزید براں جن علاقوں میں ارتداد کی وبا پھیلی اور جہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کی اطاعت کا جوا کندھوں پر اُٹھانے سے انکار کر دیا وہ علاقے تہذیب و تمدن اور دولت و ثروت کے لحاظ سے تمام قبائل عرب سے بڑھے ہوئے تھے اور اُن کی حدود مملکت ایران سے بہت قریب تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابوبکرؓ نے اِس فتنے کو فرو کرنے میں پوری طاقت صرف کر دی اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک ان علاقوں میں اسلامی سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر کے امن و امان بحال نہ کر دیا۔

اسود عنسی کی بغاوت اور مسیلمہ و طلیحہ کی تیاریوں سے اِس امر کا بھی علم ہوتا ہے، اس زمانے میں دینی اضطراب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اگر کوئی شخص مذہب کا نام لے کر ذاتی مفاد کے لیے کوئی تحریک چلانا چاہتا تو بڑی آسانی سے کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں میں کسی خاص مذہب کے متعلق تعصب پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس کوئی بھی عقیدہ ان لوگوں کے دلوں میں راسخ نہ تھا۔ نصرانیت، یہودیت، مجوسیت، بت پرستی، غرض ہر مذہب و ملت کے پرستار اور مددگار یہاں موجود تھے لیکن سب کے سب باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ہر مذہب کے پرستاروں کا دعویٰ تھا کہ انھیں کا مذہب مبنی بر حق ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا راستہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چونکہ ہر مذہب سچائی کا مدعی تھا۔ اِس لیے عام انسان کے لیے فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کس مذہب کو قبول کرے اور کسے چھوڑے۔ اندریں حالات مدعیانِ نبوّت کے لیے یہ بات آسان ہو گئی کہ وہ اپنے اپنے قبیلے میں عصبیت کے جراثیم پھیلا کر اور مختلف شعبدوں کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر کے انھیں اپنی طرف مائل کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان مدعیانِ نبوّت نے کثیر التعداد لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اسلامی حکومت کے خلاف بظاہر کامیابی حاصل کر لی۔

مدعیانِ نبوّت کی عارضی کامیابی

ان مدعیانِ نبوّت کی عارضی کامیابی کا راز ان کے دعوے اور لوگوں کے ان پر ایمان لانے

میں مضمر نہ تھا بلکہ اس میں بعض اور عوامل بھی کام کر رہے تھے۔ چنانچہ اسود عنسی کی کامیابی کی بڑی وجہ وہ بے پناہ نفرت تھی جو اہلِ یمن کو اہل فارس اور اہلِ حجاز سے تھی۔ اسود نے یمنیوں کا یہ جذبۂ نفرت اُبھار کر انھیں آسانی سے حجازیوں کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔

مسیلمہ اور طلیحہ نے بھی اسود عنسی کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اپنی قوم میں عصبیت کے جذبات کو بھڑکایا اور اس طرح لوگوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ اگر ان علاقوں میں اسلام کی بنیاد مضبوط ہوتی اور اس کے اصول لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوتے تو ان مدعیانِ نبوت کو کبھی حکومت کے مقابلے میں کھڑے ہونے اور کثیر التعداد لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لینے کی توفیق نہ ملتی۔ کیونکہ جو عقیدہ دلوں پر غلبہ حاصل کر چکا ہو اسے شاذ و نادر ہی کوئی طاقت مغلوب کر سکتی ہے لیکن مذکورہ بالا علاقوں کے لوگوں کا ایمان چونکہ محض رسمی تھا اور وہ اسلام کی حقیقت و ماہیت سے قطعاً ناواقف تھے اس لیے جونہی قومیت کے نام سے تحریکیں شروع ہوئیں اور عصبیت کا واسطہ دلا کر انھیں ابھارا گیا وہ اسلام کو خیرباد کہہ کر اسود اور مسیلمہ جیسے لوگوں کے پیچھے چل کھڑے ہوئے۔

ہمارے نظریے کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اس عظیم الشان شورش کے وقت مکہ اور طائف والے بدستور اسلام پر قائم رہے۔ یہ درست ہے کہ یمن میں اسلام کا چرچا وہاں کے حاکم باذان کے قبولِ اسلام کے وقت سے شروع ہو گیا تھا اور یہ واقع فتح مکہ و طائف سے پہلے کا ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سیزدہ سالہ قیام کے دوران میں رسول اللہ کے مشن کی سخت مخالفت کے باوجود آپ کی تعلیمات نے اہلِ مکہ کے دلوں پر اسلام کے متعلق ایسا مخفی لیکن گہرا اثر چھوڑا تھا جو باذان کے قبولِ اسلام اور معاذ بن جبل کی تعلیم و تربیت کے باوجود اہلِ یمن کے دلوں پر نہ ہو سکا۔

تیسری بات جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یمن کی بغاوت ہی نے بنی یمامہ اور بنی اسد کو اسلامی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کی جرأت دلائی۔ طلیحہ اور مسیلمہ دونوں مسلمانوں کی بے پناہ قوت سے خوف کھاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کبھی جیت نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے انھوں نے حکومت سے بغاوت اور سرکشی کی جرأت نہ کی۔ لیکن جب اسود عنسی

میدانِ مقابلہ میں آگیا اور اسے ابتداءً کامیابی بھی ہوئی تو ان دونوں کو بھی علمِ بغاوت بلند کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ رسول اللہؐ کی وفات سے ان کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ اگر اسود عنسی مسلمانوں کے خلاف کھڑا نہ ہوتا اور یمن میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ نہ بھڑکتی تو ان دونوں کو کبھی مسلمانوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوتی۔

جب ایک بار فتنہ برپا ہو گیا تو اسود عنسی کی موت کے باوجود دب نہ سکا۔ بلکہ اس میں زیادتی ہی ہوتی چلی گئی۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اس نے شدت اختیار کر لی اور سارا عرب اس کی لپیٹ میں آگیا۔

فتنۂ ارتداد اور مستشرقین

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ فتنے کا اصل باعث وہ عظیم تفاوت تھا جو عرب کے مختلف طبقوں اور علاقوں میں طرزِ معاشرت کے بارے میں پایا جاتا تھا اور جس کی نظیر عرب کے سوا دوسرے علاقوں میں کہیں نہیں ملتی۔

بدوی اور شہری طرزِ زندگی میں عظیم تفاوت کے باعث عربوں کو ایک قومیت میں ڈھال دینا آسان کام نہ تھا۔ بدویوں کے لیے حاکم کی اطاعت کا وہ تصور بھی محال تھا جو شہریوں کے ذہنوں میں تھا۔ بدو لوگ شخصی آزادی کے مقابلے میں ہر چیز کو ہیچ سمجھتے اور اس پر کبھی آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ آزادی ان کے نزدیک متاعِ حیات تھی۔ اگر کبھی وہ اسے خطرے میں دیکھتے تھے تو زبردست قربانی دے کر بھی اس کی حفاظت کرنا اپنا فرضِ اوّلین خیال کرتے تھے آزادی کا یہی جذبہ مدتِ دراز تک یمنیوں اور شمالی علاقے کے لوگوں کے لیے وجہ عداوت و خصومت بنا رہا۔

مستشرقین لکھتے ہیں کہ بدوی اور شہری طرزِ معاشرت، بود و باش اور طبائع میں فرق کے باعث رسول اللہؐ کی وفات سے قبل ہی اضطراب پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسلام نے توحید کا عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور بت پرستی کو مٹانا اس کا مقصدِ اولین تھا۔ اسلام کی تعلیم کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ عقیدۂ توحید عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا

لیکن ساتھ ہی عربوں کو یہ خدشہ بھی لاحق ہو گیا کہ عقیدۂ توحید عرب کی سیاسی وحدت پر منتج نہ ہو اور اہلِ بادیہ آزادی کی نعمت سے محروم ہو جائیں۔

یہی خیالات تھے جن کے باعث یمن اور بعض دوسرے علاقے مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر جدوجہد شروع کر دی۔

ارتداد میں اجنبی ہاتھ

مستشرقین کا یہ خیال صحیح ہو یا غلط، بہرحال اِس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربوں کی اس بغاوت اور فتنۂ ارتداد میں اجنبی ہاتھ ضرور تھا۔ ایرانیوں اور رومیوں کو جب رسولؐ اللہ کی طرف سے اسلام کی دعوت پہنچی اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے اسلام کے اثر و نفوذ کو بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ قبل اس کے کہ اسلام کا عظیم الشان سیلاب ان کی طرف رُخ کرے خود عربوں میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر دیے جائیں اور انھیں اِس نئے دین کے خلاف بھڑکا کر خود عربوں کو اپنے ہم قوم مسلمانوں سے بھڑا دیا جائے۔

اِس فتنے کے بانیوں نے رسولؐ اللہ کی زندگی ہی میں حصولِ مقصد کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ آپ کی وفات سے مفسدین کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انھوں نے پوری قوت سے بغاوت کے شعلے بھڑکا کر مسلمانوں کو انتہائی نازک مرحلے سے دوچار کر دیا۔

ابوبکرؓ نے فتنے کا مقابلہ کس طرح کیا، عربوں کا اتحاد دوبارہ کس طرح قائم کیا اور اسلامی سلطنت کی بنیادوں کو دوبارہ استوار کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے؟ ان سب باتوں کا جواب آئندہ صفحات میں ملے گا۔

(۴)

اسامہ کی روانگی

خلیفۂ اوّل کا پہلا حکم

عرب قبائل کی بغاوت کے نتائج و عواقب سے نہ تو ابوبکرؓ بے خبر تھے اور نہ انصار و مہاجرین کا کوئی فرد۔ اب ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ آیا اس موقع پر سب سے پہلے ارتداد کے فتنے کو کچلا جائے یا رسول اللہ کے احکام کی تعمیل میں سرحدوں کی حفاظت کے لیے اسامہ کے لشکر کو شام روانہ کر دیا جائے؟ اگرچہ وہ وقت مسلمانوں کے لیے نازک تھا لیکن ابوبکرؓ نے تمام خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے بیعت کے بعد پہلا حکم یہ صادر فرمایا کہ اسامہ کا لشکر شام روانہ ہو جائے۔

اسامہ کے لشکر میں مہاجرین اور انصار کے معزز ترین افراد شامل تھے اور اسے رسول اللہ نے شام کی سرحد پر رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ جنگ مؤتہ اور غزوۂ تبوک کے بعد آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اسلام اور مسیحیت کے بڑھتے ہوئے اختلاف اور یہود کی فتنہ انگیزی کے باعث اہل روم عرب پر حملہ کر دیں۔ جنگ مؤتہ اور غزوۂ تبوک میں جو واقعات پیش آ چکے تھے ان سے آپ کے ان خدشات کو مزید تقویت پہنچی۔ جنگ مؤتہ میں رسول اللہ کے مقرر کردہ تینوں قائدین: زید بن حارثہؓ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ بالآخر خالد بن ولید نے مسلمانوں کے لشکر کو رومیوں کے نرغے سے نکالا اور انھیں بہ حفاظت مدینہ لے آئے۔ گو انھیں جنگ میں فتح حاصل نہ ہو سکی مگر اتنی قلیل التعداد فوج کو اتنے عظیم الشان لشکر کے محاصرے سے بہ حفاظت نکال لانا بجائے خود نہایت شجاعانہ کارنامہ تھا۔

اس کے بعد آپؐ بہ نفس نفیس مسلمانوں کو ہمراہ لے کر جانبِ تبوک روانہ ہوئے لیکن دشمن کو میدان میں نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے شام کے اندرونی علاقوں میں گھس کر مسلمانوں کے حملے سے محفوظ ہو جانے میں اپنی خیریت سمجھی۔

ان غزوات کے باعث مسلمانوں کے متعلق رومیوں کے ارادے بہت خطرناک ہو گئے اور انھوں نے عرب کی سرحد پر پیش قدمی کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہؐ نے اسامہ کو بطور پیش بندی شام روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔

رسول اللہؐ کی ہدایات

اسامہ بیس برس کے نوجوان تھے۔ رسول اللہؐ نے انھیں اس لیے سردارِ لشکر مقرر فرمایا تھا کہ ایک طرف تو نوجوانوں میں خدمتِ دین کے لیے آگے آنے اور اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا شوق پیدا ہو، دوسری طرف اسامہ اپنے والد زید بن حارثہؓ کا انتقام لے سکیں جنھیں رومیوں نے جنگِ موتہ میں شہید کر دیا تھا۔ آپ نے اسامہ کو حکم دیا کہ وہ فلسطین میں بلقار اور داروم کی حدود میں پہنچ کر دشمن پر حملہ کریں اور اس ہوشیاری سے کام انجام دیں کہ جب تک وہ دشمن کے سر پر نہ پہنچ جائیں اسے مسلمانوں کی آمد کا پتہ نہ لگے۔ انھیں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ فتح کے بعد فوراً مدینہ واپس آ جائیں۔

اسامہؓ سے رسول اللہؐ کی محبت

اسامہؓ زمانۂ طفولیت ہی سے رسول اللہؐ کے منظورِ نظر اور محبوب تھے۔ آپ کو ان کی اس قدر پاس داری تھی کہ صلح حدیبیہ کے اگلے سال جب آپ عمرہ کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو انھیں اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لیا اور اسی حالت میں مکہ میں داخل ہوئے۔ اسامہؓ بھی دلیری اور بہادری میں کسی سے کم نہ تھے اور یہ صفات عہدِ طفلی ہی سے ان میں نمایاں تھیں۔ جنگِ احد کے موقع پر وہ بچے تھے اور بچوں کو لشکر کے ساتھ جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جب اسلامی لشکر مدینہ سے روانہ ہوا تو اسامہ راستے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے لیکن صغر سنی

کی وجہ سے انھیں واپس کر دیا گیا۔ جنگِ حنین میں انھوں نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے اور ثابت قدمی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔

اسامہ کی امارت پر اعتراض

ان اوصاف کے باوجود بعض لوگوں کو اسامہ کی امارت پر اعتراض تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اسامہ سے رسول اللہ کی محبت اور اسامہ کی بہادری مسلم لیکن ایسے لشکر کی امارت جس میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں، ایک بچے کو سپرد کرنا مناسب نہیں۔

ان چہ میگوئیوں کی خبر رسول اللہ کو بھی عین مرض الموت میں مل گئی۔ اس وقت اسامہ کا لشکر مقام جرف میں مقیم تھا اور کوچ کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ آپ نے اپنی ازواج مطہرات کو حکم دیا کہ وہ آپ کو نہلائیں۔ چنانچہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی گئیں۔ جن سے آپ کا بخار اتر گیا۔ اس وقت آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر حمد و ثنا اور اصحاب احد کے لیے دعا کرنے کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! اسامہ کے لشکر کو جانے دو۔ تم نے اس کی امارت پر اعتراض کیا ہے اور اس سے پہلے تم اس کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ اس کے باوجود وہ امارت کے قابل ہے اور اس کا باپ بھی امارت کے لائق تھا۔"

جب رسول اللہ کے مرض میں اضافہ ہو گیا تو اسامہ کا لشکر جرف ہی میں رک گیا۔ اسامہ بیان کرتے ہیں:

> "جب رسول اللہ کی بیماری بڑھ گئی تو میں اور میرے چند ساتھی مدینہ آئے۔ میں آپ کے پاس گیا۔ آپ کو شدید ضعف تھا اور بول نہ سکتے تھے۔ آپ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے اور مجھ پر رکھ دیتے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔"

رسول اللہ کی وفات کے روز علی الصباح اسامہؓ نے آپ سے کوچ کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت دے دی لیکن کچھ ہی دیر بعد آپ کی وفات ہو گئی اور اسامہؓ اپنے لشکر کے ہمراہ جرف

سے مدینہ آ گئے۔

رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں اسامہؓ اہل بیت کے ساتھ شریک رہے۔ وہ اور رسول اللہؐ کے غلام شقران آپ کے جسدِ اطہر پر پانی ڈالتے اور حضرت علیؓ غسل دیتے تھے۔

بیعت کے بعد جب ابوبکرؓ نے اسامہؓ کو کوچ کا حکم دیا تو معترضین کی زبانیں پھر حرکت میں آ گئیں اور وہ کوئی ایسا حیلہ تلاش کرنے لگے جس کے ذریعے سے ابوبکرؓ کو اس لشکر کے روانہ کرنے یا کم از کم اسامہؓ کو امیر بنانے سے باز رکھ سکیں۔ انھوں نے خلافت کے بارے میں مہاجرین اور انصار کے اختلافات اور عرب قبائل کی بغاوت کا سہارا لیا اور ابوبکرؓ سے جا کر عرض کیا کہ موجودہ دور مسلمانوں کے لیے سخت نازک اور پُر خطر ہے، ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں، اس موقع پر لشکر کو شام بھیج کر مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن ابوبکرؓ نے نہایت ثابت قدمی اور اولوالعزمی سے فرمایا:

"مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مجھے یقین ہو کہ جنگل کے درندے مجھے اٹھا کر لے جائیں گے تو بھی میں اسامہ کے اس لشکر کو روانہ ہونے سے نہیں روک سکتا جسے رسول اللہؐ نے روانہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ اگر مدینہ میں میرے سوا کوئی بھی متنفس باقی نہ رہے تو بھی میں اس لشکر کو ضرور روانہ کروں گا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے، جب اسامہؓ نے دیکھا کہ ان کے خلاف چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں تو انھوں نے عمرؓ سے کہا آپ ابوبکرؓ کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ وہ لشکر کی روانگی کا حکم منسوخ کر دیں تاکہ بڑھتے ہوئے فتنوں کے مقابلے میں یہ لشکر ممد و معاون ہو سکے اور مرتدین کو آسانی سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔ ادھر انصار نے عمرؓ سے کہا اگر ابوبکرؓ لشکر کو روانہ کرنے ہی پر مصر ہوں تو ہماری طرف سے ان کی خدمت میں یہ درخواست کریں کہ وہ کسی ایسے آدمی کو لشکر کا سردار مقرر فرمائیں جو عمر میں اسامہؓ سے بڑا ہو۔

عمرؓ نے جا کر سب سے پہلے اسامہؓ کا پیغام دیا۔ ابوبکرؓ نے فرمایا:

"اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں تو بھی

میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔"

ابوبکرؓ کی ناراضی

اس کے بعد عمرؓ نے انصار کا پیغام دیا۔ یہ سنتے ہی ابوبکرؓ نے غضب ناک ہو کر فرمایا:

"اے ابن خطاب! اسامہؓ کو رسول اللہ نے امیر مقرر فرمایا ہے اور تم مجھے کہتے ہو کہ میں اسے اس کے عہدے سے ہٹا دوں۔"

عمرؓ پشیمان ہو کر سر جھکائے واپس چلے آئے۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ ابوبکرؓ نے کیا جواب دیا تو انھوں نے بڑے غصے سے کہا:

"میرے پاس سے فوراً چلے جاؤ۔ محض تمھاری بدولت مجھے خلیفۂ رسول اللہ سے جھڑکیاں کھانی پڑیں۔"

اس واقعے سے اس مسلک کی ایک جھلک ہمارے سامنے آتی ہے جس پر ابوبکرؓ ابتدائے خلافت سے آخر وقت تک گامزن رہے۔ اسی مسلک کا مظاہرہ آپ نے اس وقت کیا جب فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ آپ سے اپنے والد کی میراث کا مطالبہ کرنے آئی تھیں۔ آپ نے انھیں فرمایا:

"واللہ! مجھ پر یہ فرض ہے جو کام میں رسول اللہ کو کرتے دیکھ چکا ہوں خود بھی وہی کروں اور اس سے سر مو انحراف نہ کروں۔"

اور یہی نمونہ آپ نے اسامہؓ کے لشکر کو بھیجتے وقت دکھایا۔

لشکر کو روانگی کا حکم

معترضین کے اعتراضات کو رد فرمانے کے بعد ابوبکرؓ نے اسامہؓ کے لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دیا اور فرمایا کہ مدینہ کا کوئی شخص جو اس لشکر میں شامل تھا، پیچھے نہ رہے بلکہ مدینہ سے نکل کر مقام جرف میں لشکر سے مل جائے۔ آپ نے فرمایا:

"اے لوگو! میں تمھاری مانند ایک انسان ہوں۔ میں نہیں جانتا کیا تم مجھ پر

وہ بوجھ رکھو گے جس کے اٹھانے کی طاقت صرف رسول اللہؐ میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں میں سے رسول اللہؐ کو منتخب فرمایا تھا اور تمام آفات سے آپ کو محفوظ رکھا تھا۔ میں تو صرف آپ کی پیروی کرنے والا ہوں، کوئی نئی چیز تمہارے سامنے پیش کرنے والا نہیں۔ اگر میں سیدھا رہوں تو میری پیروی کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

یہ تھا خلیفۂ اول کا نظریۂ سیاست۔ انھوں نے واقعی اس سے کبھی انحراف نہ کیا اور سب لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کی۔ آپ کی زندگی میں جس قلبی تعلق کا ثبوت ابوبکرؓ نے دیا اس کا حال گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو ایمان انھیں تھا اُسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی متزلزل نہ کر سکتی تھی اور آپ سے جو قلبی و روحانی تعلق تھا اس کی نظیر روئے زمین پر کوئی نہیں پائی جاتی۔

ابوبکرؓ آپ کی اطاعت کامل ایمان اور یقین سے کرتے تھے اور اس ایمان و اخلاص میں انھوں نے جس قدر ترقی کی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی گرد کو نہ عمرؓ پہنچ سکے، نہ علیؓ، نہ کوئی اور شخص۔

روانگیٔ لشکر کی تیاریاں

جرف پہنچ کر جب عمرؓ نے لوگوں کو ابوبکرؓ کے جواب سے مطلع کیا تو انھیں خلیفہ کے احکام کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ابوبکرؓ بھی جرف تشریف لائے اور اپنے سامنے لشکر کو رخصت کیا۔ روانگی کے وقت لوگوں نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ اسامہؓ سوار ہیں اور خلیفۂ رسول اللہؐ ان کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اسامہؓ کی تعظیم و تکریم کا جذبہ پیدا ہو اور وہ آئندہ اپنے سردار کے تمام احکام کی تعمیل بے چون و چرا کیا کریں۔

اسامہؓ کو بڑی شرم آئی کہ وہ تو گھوڑے پر سوار ہیں اور رسول اللہؐ کا سب سے محبوب ساتھی، خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کا سب سے قابلِ تعظیم شخص بڑھاپے کے باوجود پیدل

چل رہا ہے۔ انھوں نے کہا:

"اے خلیفۂ رسولؐ اللہ! یا تو آپ بھی سوار ہو جائیے۔ ورنہ میں اتر پڑتا ہوں۔"

ابوبکرؓ نے جواب دیا:

"واللہ! نہ تم اترو گے نہ میں سوار ہوں گا۔ کیا ہوا اگر میں نے ایک گھڑی اپنے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود کر لیے۔"

جب لشکر کی روانگی کا وقت آیا تو انھوں نے اسامہ سے کہا:

"اگر تم چاہو تو میری مدد کے لیے عمرؓ کو چھوڑتے جاؤ۔"

اسامہ نے بڑی خوشی سے عمرؓ کو ابوبکرؓ کے ساتھ واپس جانے کی اجازت دے دی۔

لشکر کو نصیحتیں

واپسی کے وقت ابوبکرؓ فوج کے سامنے کھڑے ہوئے اور یہ تقریر فرمائی:

"اے لوگو! ٹھہر جاؤ۔ میں تمھیں دس نصیحتیں کرتا ہوں، انھیں یاد رکھو۔ خیانت نہ کرنا۔ بدعہدی نہ کرنا۔ چوری نہ کرنا۔ مقتولوں کے اعضا نہ کاٹنا۔ بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کاٹنا نہ جلانا۔ پھل والے درخت نہ کاٹنا۔ کسی بھیڑ، گائے یا اونٹ کو سوا کھانے کے ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے جنھوں نے اپنے آپ کو گرجاؤں میں عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے اور وہ رات دن انھیں میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے ہیں، تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس پہنچو گے جو تمھارے لیے برتنوں میں مختلف کھانے لائیں گے، جب بھی کھانا شروع کرنا اس پر اللہ کا نام ضرور لے لیا کرنا۔ تم ایسے لوگوں سے ملو گے جنھوں نے سر کا درمیانی حصہ تو منڈا دیا ہوگا لیکن چاروں طرف بڑی بڑی لٹیں لٹکتی ہوں گی، انھیں تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ اپنی حفاظت اللہ کے نام سے کرنا۔ اللہ تمھیں شکست اور وبا سے محفوظ رکھے۔"

اسامہ کو یہ نصیحت کی:

"رسول اللہ نے تمھیں جو کچھ کرنے کا حکم دیا تھا وہ سب کچھ کرنا۔ جنگ کی ابتدا قضاعہ سے کرنا۔ اس کے بعد آبل جانا۔ رسول اللہ کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔

لشکر، بلقاء کی جانب کوچ

یہ نصیحتیں فرما کر ابوبکرؓ تو عمرؓ کے ہمراہ مدینہ واپس آ گئے اور اسامہؓ شام روانہ ہو گئے۔ مئی کا مہینا تھا اور سخت گرمی کے دن تھے۔ لشکر تپتے ہوئے صحراؤں اور جنگلوں کو قطع کرتا ہوا بیس روز بعد بلقاء پہنچ گیا۔ بلقاء کے قریب ہی جنگ مؤتہ ہوئی تھی جس میں اسامہؓ کے والد زید بن حارثہ اور ان کے دونوں ساتھی جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے تھے۔ اسامہ نے اپنے لشکر کو وہیں ٹھہرایا اور فوج کے مختلف دستوں کو آبل اور قبائل قضاعہ پر دھاوا بولنے کے لیے روانہ کیا۔ ان جنگوں میں مسلمانوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ بے شمار رومی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور اس طرح اسامہؓ اپنے والد کا انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے۔

رسول اللہ نے اسامہ کو حملہ کرنے کے متعلق جو ہدایات دی تھیں انھوں نے ان پر پوری طرح عمل کیا۔ جہاں جہاں جانے کے لیے آپ نے ارشاد فرمایا تھا وہاں گئے اور آپ کی ہدایات کے مطابق دشمن پر اس طرح اچانک حملہ کیا کہ جب تک مسلمانوں کے دستے رومیوں کے سروں پر نہ پہنچ گئے انھیں مسلمانوں کی آمد کا مطلق پتا نہ چل سکا۔ اور فتح کے بعد فوراً مدینہ واپس آ گئے۔

اسامہ کی کامیاب واپسی

دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے اسامہ کی شان اور عزت و توقیر میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ وہی مہاجرین اور انصار جنھوں نے اس سے پہلے تقررِ اسامہ کی مخالفت کی تھی، اب خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ بڑے فخر سے اسامہ کے کارنامے بیان کرتے اور رسول اللہ کا یہ قول بار بار دہراتے تھے: "اسامہ امارت کے لائق ہے اور اس کا باپ بھی امارت کے لائق تھا۔"

اسامہ نے اس مہم میں صرف سرحدی جھڑپوں پر اکتفا کی۔ انھوں نے رومیوں کا تعاقب کرنے اور رومی سرحد پر بھرپور حملہ کر کے اندرونی علاقوں میں گھس کر اپنی کامیابی سے مزید فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی کیونکہ ان کا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ عرب کی سرحد رومیوں کے حملے سے محفوظ رہے اور رومی مسلمانوں کو کمزور پاکر مدینہ سے یہودیوں کی جلاوطنی کا انتقام لینے کے بہانے عرب کی سرحدوں میں گھس کر اسے اپنے گھوڑوں کے سموں سے پامال نہ کرنے پائیں۔

لیکن اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ رومی ایک وسیع خطۂ زمین پر قابض ہونے کی وجہ سے زبردست قوت وطاقت کے مالک تھے مسلمانوں کو بھی اس حقیقت کا پوری طرح علم تھا۔ رسول اللہ نے اپنی وفات سے تین سال قبل ۸ھ میں دحیہ کلبی کو تبلیغی خط دے کر ہرقل کی جانب روانہ فرمایا۔ ہرقل کا ستارہ اس وقت عروج پر تھا اور دحیہ کلبی نے روم کے تمام حالات اور رومیوں کی قوت وطاقت کا بہ غور مطالعہ کیا۔ علاوہ بریں اسی سال یہود خیبر، فدک اور تیما میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر فلسطین پہنچے تھے اور ان کے دل جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے فلسطین پہنچ کر رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا اور یہ کہ کر انھیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی کہ جب رومی ایران جیسی زبردست طاقت پر فتح یاب ہو سکتے ہیں تو مسلمانوں پر بھی ہو سکتے ہیں؟

ان حالات میں بہ ظاہر یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ اسامہؓ سرحدی فتوحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی کرتے اور جو کام دو سال بعد شروع ہوا اس کا آغاز اسی مہم سے کر دیتے۔

لشکر کا استقبال

جب اسامہ اپنے مظفر و منصور لشکر کو لے کر مدینہ کے قریب پہنچے تو ابوبکرؓ نے کبار مہاجرین اور انصارؓ کے ہمراہ شہر سے باہر نکل کر بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اس وقت سب مسلمانوں کے چہرے فرحت و انبساط سے کھلے ہوئے تھے۔ مدینہ میں داخل ہوتے ہی اسامہؓ نے مسجد نبوی کا

کا رُخ کیا اور شکرانے کے طور پر نماز دوگانہ ادا کی۔ مدینہ کو ان کی واپسی چالیس دن اور بعض روایات کے مطابق ستر دن بعد ہوئی۔

بعض مستشرقین نے اس مہم کی اہمیت گھٹانے اور اس کا شمار معمولی سرحدی جھڑپوں میں کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ چنانچہ مستشرق 'وفکا' جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسامہؓ کے متعلق مقالہ لکھا ہے، کہتا ہے:

"جنگہائے ارتداد کے دوران میں مسلمانوں کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا انھیں دیکھتے ہوئے اسامہ کی فتح یابی مسلمانوں کی نظروں میں زبردست اہمیت حاصل کر گئی، حالانکہ اسامہ کی کامیابی کو اس کے سوا اور کوئی اہمیت حاصل نہ تھی کہ وہ بعد میں پیش آنے والی شامی لڑائیوں کی ابتدا ثابت ہوئی۔ اس مہم میں اسامہ کا کارنامہ صرف اس حد تک ہے کہ انھوں نے بعض قبائل پر اچانک حملہ کر دیا اور کسی بڑے رومی لشکر سے مٹ بھیڑ ہوئے بغیر مالِ غنیمت لے کر واپس چلے آئے اس کے باوجود مسلمانوں، باغی عربوں اور رومیوں ——— تینوں فریقوں پر اس کا دور رس اثر پڑا۔ جب باغی اور مرتد قبائل نے لشکرِ اسامہؓ کی روانگی کی خبر سنی تو وہ کہنے لگے "اس لشکر کے بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان زبردست قوت وطاقت کے مالک ہیں، اگر ان کے پاس قوت وطاقت نہ ہوتی تو وہ ہرگز ایسے موقع پر اس لشکر کو نہ بھیجتے۔ جب سارا عرب ان کے خلاف متحد ہو چکا ہے۔"

ہرقل کو بھی جب اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ گھبرا گیا اور اس نے ایک بڑی فوج مسلمانوں سے مقابلے کے لیے بلقار روانہ کی۔ یہ واقعات صراحتہً اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس غزوہ کے باعث رومی اور مرتد عرب قبائل، دونوں مسلمانوں کی قوت وطاقت سے مرعوب ہو گئے۔ اسی وجہ سے دومۃ الجندل کے سوا عرب کے شمالی حصے کے رہنے والوں نے مدینہ پر حملہ کرنے میں پس و پیش کیا حالانکہ اس سے قبل ان کا مصمم ارادہ تھا کہ مدینہ پر چڑھائی کر کے مسلمانوں کو رومی سرحدوں پر حملہ کرنے کا مزہ چکھایا جائے۔

پھر بھی شمالی عربوں کے سوا عرب کے دوسرے علاقوں کا یہ حال تھا۔ اس سے قبل تفصیل سے

بتایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ کی زندگی کے آخری دور میں بغاوت کی روح کس طرح عرب قبائل میں سرایت کر گئی تھی اور کئی قبائل میں نبوت کے مدعی پیدا ہو گئے تھے۔ اگر آپ کی غایت درجہ حزم و احتیاط اور مسلمانوں کی جانب سے قوت و طاقت کے مظاہروں کی وجہ سے ان قبائل اور مدعیانِ نبوت کو خوف و خطر لاحق نہ ہوتا تو آپ کی زندگی ہی میں ہر طرف سے بغاوت کے عَلم بلند ہو جاتے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد باغیوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انھوں نے اپنے خطرناک مخفی ارادوں کا اظہار کھلم کھلا شروع کر دیا۔

اس وقت مسلمان قلت تعداد اور کثرت اعداء کی وجہ سے بے حد مضطرب تھے۔ اگر اس نازک موقع پر ابوبکرؓ کی طرف سے بلند پایہ سیاست کا مظاہرہ نہ کیا جاتا اور مضبوط و محکم پالیسی وضع نہ کی جاتی تو مسلمانوں کا خاتمہ عین ممکن تھا۔

(۵)

منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ

اسامہ شام جاتے ہوئے ابھی راستے ہی میں تھے کہ رسولؐ اللہ کی خبرِ وفات سارے عرب میں پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ ان شعلوں کی زد میں سب سے زیادہ یمن کا علاقہ تھا، اگرچہ آگ بھڑکانے والا شخص عنسی قتل ہو چکا تھا۔ بنی حنیفہ میں مسیلمہ اور بنی اسد میں طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے ہزاروں لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا:

"اسد اور غطفان کے حلیف قبیلوں کا نبی ہمیں قریش کے نبی سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ محمد وفات پا چکے ہیں اور طلیحہ زندہ ہے۔"

مدینہ میں بغاوتوں کی خبر

جب ان بغاوتوں کی خبر ابوبکرؓ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا کہ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک ان علاقوں کے عمال اور امراء کی طرف سے تمام واقعات کی مکمل رپورٹیں موصول نہ ہو جائیں۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ امراء کی طرف سے دھڑا دھڑ رپورٹیں پہنچنے لگیں۔ ان رپورٹوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ باغیوں کے ہاتھوں نہ صرف سلطنت کا امن خطرے میں ہے بلکہ ان لوگوں کی جانوں کو بھی سخت خطرہ ہے جنھوں نے ارتداد کی رو میں باغیوں کا ساتھ نہیں دیا اور بدستور اسلام پر قائم ہیں۔ اب ابوبکرؓ کے لیے پوری قوت سے بغاوتوں کا مقابلہ کرنے اور باغیوں کو ہر قیمت پر زیر کر کے صورتِ حال کو قابو میں لانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس ہمہ گیر شورش کے نتیجے میں بعض قبائل نے تو کلیتہً اسلام سے انحراف اختیار کر لیا تھا

لیکن بعض قبائل اسلام پر تو قائم تھے البتہ زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مؤخرالذکر گروہ میں سے بھی بعض لوگ تو ایسے تھے جو دل و جان سے مال و دولت پر فریفتہ تھے، اور اللہ کے راستے میں مالی قربانی کرنا ان کے لیے بے حد دشوار تھا۔ لیکن بعض لوگ اسے تاوان کہتے تھے اور ان کے خیال میں رسول اللہ کی وفات کے بعد اہلِ مدینہ کے مقرر کردہ امیر کو ان سے زکوٰۃ یا بہ الفاظِ دیگر اداۓ تاوان کے مطالبے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ چنانچہ ہر دو فریق نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ نہ وہ ابوبکرؓ کو اپنا امیر تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے احکام کی بجاآوری کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مدینہ کے نواحی قبائل، عبس اور ذبیان، منکرینِ زکوٰۃ میں شامل تھے اور مسلمانوں کے لیے ان قبائل سے عہدہ برآ ہونے کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ان سے لڑائی چھیڑ دینا آسان کام نہ تھا کیونکہ ابوبکرؓ لشکر اسامہؓ کو شام روانہ فرما چکے تھے اور مدینہ میں بہت ہی تھوڑی تعداد میں لڑائی کے قابل افراد رہ گئے تھے۔ اس حالت میں مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ منکرینِ زکوٰۃ کو ادائے زکوٰۃ کے لیے مجبور نہ کیا جائے اور نرمی و ملائمت سے انھیں ساتھ ملا کر ان قبائل کے مقابلے میں آمادۂ پیکار کیا جائے جنھوں نے کھلم کھلا اسلام سے انحراف کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ ان سے جنگ کی جاتی۔ مؤخرالذکر راستہ اختیار کرنے سے مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہو جاتی اور اسلامی لشکر کی غیر موجودگی میں بپھرے ہوئے باغی قبائل سے لڑائی چھیڑ دینا آسان کام بھی نہ تھا۔

صحابہ سے مشورہ

ابوبکرؓ نے کبار صحابہ کو جمع کر کے ان سے منکرینِ زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ عمرؓ بن خطاب اور بیشتر مسلمانوں کی یہ رائے تھی کہ ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والے لوگوں سے ہرگز نہ لڑنا چاہیے بلکہ انھیں ساتھ ملا کر مرتدین کے خلاف مصروفِ پیکار ہونا چاہیے۔ بعض لوگ اس رائے کے مخالف بھی تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

بحث طول پکڑ گئی اور بالآخر ابوبکرؓ کو خود اس میں دخل دینا پڑا۔ وہ اس رائے کے حامی

تھے کہ منکرین زکوٰۃ سے جنگ کرکے بہ زور اداۓ زکوٰۃ پر مجبور کرنا چاہیے ۔ اس امر میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ بحث کرتے ہوئے پر زور الفاظ میں فرمایا:

" واللہ! اگر منکرین زکوٰۃ مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے، تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔"

یہ سن کر عمرؓ بھی —— جن کی رائے میں اس موقع پر منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا —— قدرے تیزی میں آ گئے اور کہا:

" ہم ان لوگوں سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جب رسول اللہؐ نے صاف فرمایا ہے کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ نہ کہہ دیں ۔ جو شخص یہ کلمہ زبان سے ادا کر دے گا اس کی حفاظتِ جان و مال مسلمانوں کے ذمے ہوگی البتہ جو حقوق اس پر واجب ہوں گے ان کی ادائی کا مطالبہ اس سے ضرور کیا جائے گا۔ ہاں اس کی نیت کا حساب اللہ اس سے خود لے گا۔"

لیکن ابوبکرؓ پر عمرؓ کے دلائل کا اثر کچھ نہ ہوا اور انھوں نے فرمایا:

" واللہ! میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمے جو حقوق ہوں گے ان کی ادائی کا مطالبہ ان سے بہ جبر کیا جائے گا۔"

عمرؓ کہا کرتے تھے:

" یہ جواب سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لیے ابوبکرؓ کو شرحِ صدر عطا کیا ہے اور حق وہی ہے جو ابوبکرؓ کہتے ہیں۔"

اس واقعے سے ملتا جلتا ایک واقعہ خود رسول اللہؐ کو بھی پیش آیا تھا ۔ طائف سے قبیلہ ثقیف کا وفد آپ کی خدمت میں قبولِ اسلام کی غرض سے حاضر ہوا لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ انھیں صلوٰۃ معاف کر دی جائے ۔ رسول اللہؐ نے اُن کی درخواست قبول کرنے سے انکار

کر دیا اور فرمایا:

"اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں صلواۃ نہیں۔"

ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض اولیں خیال کرتے تھے، انھوں نے بھی یہی فرمایا:

"واللہ! میں ان لوگوں سے ضرور لڑوں گا جو صلواۃ اور زکواۃ میں فرق کرتے ہیں۔"

دشمن قبائل کے وفود

باغی قبائل عبس، ذبیان، بنو کنانہ، غطفان اور فزارہ نے، جو مدینہ کے گردونواح میں آباد تھے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں اکٹھی کیں اور مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ قبائل دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصہ ربذہ کے قریب مقام ابرق میں خیمہ زن تھا اور دوسرا ذی القصہ میں جو محلہ کے قریب نجد کے راستے میں واقع ہے۔ ان فوجوں کے سرداروں نے پہلے اپنے وفود مدینہ روانہ کیے جنھوں نے وہاں پہنچ کر بعض لوگوں کے ذریعے سے ابوبکرؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہیں البتہ انھیں ادائے زکواۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ لیکن ابوبکرؓ نے وہی جواب دیا جو پہلے عمرؓ کو دے چکے تھے یعنی اگر انھوں نے زکواۃ کی ایک رسی بھی ادا کرنے سے انکار کیا تو میں اس رسی کی خاطر ان سے جنگ کروں گا۔

وفود کی ناکام واپسی

چنانچہ یہ وفود خائب و خاسر ہو کر واپس اپنے اپنے لشکروں میں چلے گئے لیکن قیام مدینہ کے دوران میں انھوں نے وہاں کے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کر لیا تھا اور انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان دنوں اہل مدینہ بہت کمزور ہیں اور شہر کو بیرونی طاقت کے حملے سے بچا نہیں سکتے۔

ابوبکرؓ کی ہدایات

ابوبکرؓ کی دوربین آنکھ نے ان لوگوں کے ارادوں کو بھانپ لیا چنانچہ وفود کے واپس جانے

کے بعد انھوں نے اہل مدینہ کو جمع کر کے فرمایا:

"تمھارے چاروں طرف دشمن ڈیرے ڈالے پڑا ہے اور اسے تمھاری کمزوریوں کا علم ہو گیا ہے۔ نہ معلوم دن اور رات کے کس حصے میں وہ لوگ تم پر چڑھ آئیں۔ وہ تم سے ایک منزل کے فاصلے پر خیمہ زن ہیں۔ ابھی تک وہ اس امید میں تھے کہ شاید تم ان کی شرائط قبول کر لو گے۔ لیکن اب ہم نے ان کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ ضرور تم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو لڑائی کے لیے تیار رکھو۔"

اس کے بعد آپ نے علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ اور عبداللہؓ بن مسعود کو بلایا اور انھیں ایک ایک دستہ دے کر مدینہ کے بیرونی راستوں پر متعین کر دیا۔ دوسرے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مسجدِ نبوی میں پہنچ جائیں اور لڑائی کی تیاری کریں۔

عہدِ صدیقی کا پہلا معرکہ

ابوبکرؓ کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ ابھی تین روز بھی نہ گزرے تھے کہ منکرین زکوٰۃ نے مدینہ پر چڑھائی کر دی اور تہیہ کر لیا کہ خلیفہ سے اپنی بات منوا کر ہی واپس جائیں گے۔

مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے جاسوسوں نے منکرین زکوٰۃ کے ارادوں سے علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ ابنِ مسعود اور دوسرے لوگوں کو مطلع کر دیا۔ انھوں نے ابوبکرؓ کے پاس خبر بھیجی۔ ابوبکرؓ نے انھیں تو ہدایت کی کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر ٹھہر کر شہر کے تمام ناکوں کی حفاظت کریں، اور خود اونٹ پر سوار ہو کر مسجدِ نبوی میں تشریف لائے اور تمام مسلمانوں کو جو وہاں جمع تھے، ساتھ لے کر ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے جو بے خبری میں مسلمانوں پر شب خون مارنا چاہتے تھے۔

ان قبائل کے وہم میں بھی یہ بات نہ آسکی تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی ان کے مقابلے میں آئے گا۔ کیونکہ انھیں اپنے وفود کے ذریعے سے اہل مدینہ کی کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن جب ان کی توقعات کے قطعاً برعکس ابوبکرؓ نے ان پر اچانک حملہ کر دیا تو ان کی سراسیمگی کی انتہا نہ رہی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے ذی حسا تک ان کا تعاقب کیا۔

جب حملہ آور قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تو انھوں نے اس خیال سے کہ مدینہ میں ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی طاقت موجود نہیں اپنے چیدہ بہادروں کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ لیکن جب قبائل شکست کھا کر بھاگے اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کرنا شروع کیا تو وہ لوگ، جنھیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا، موقع کی نزاکت بھانپ کر مسلمانوں کے بالمقابل آگئے اور لڑائی شروع ہوگئی۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی لیکن کسی بھی فریق کے حق میں فیصلہ نہ ہوسکا۔ بالآخر مخالفین نے کمندیں پھینک کر مسلمانوں کے اونٹوں کی گردنوں میں ڈالنی شروع کیں تاکہ مسلمانوں کو گرفتار کرسکیں۔ یہ اونٹ جنگی نہ تھے کہ اس چال کو سمجھ سکتے۔ انھوں نے خوفزدہ ہو کر مدینہ کی طرف الٹے بھاگنا شروع کیا اور اپنے سواروں کو لئے شہر میں داخل ہوگئے۔

عبس، ذبیان اور ان کے مددگار، مسلمانوں کے بھاگ جانے سے بڑے خوش ہوئے اور اسے اپنی فتح مندی اور مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے مقام ذی القصہ کے خیمہ زن لوگوں کو ان تمام واقعات کی اطلاع دی۔ ذی القصہ والے بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور آپس میں صلاح مشورہ ہونے لگا۔ . . . . بالآخر فیصلہ ہوا کہ وہ اس وقت تک واپس نہ جائیں جب تک مسلمانوں کو ناک چنے چبوا کر اپنی پیش کردہ شرائط قبول کرنے پر مجبور نہ کردیں۔

ادھر ابوبکرؓ اور تمام مسلمانوں نے اس رات پلک تک نہ جھپکائی بلکہ دشمن سے لڑائی کی تیاریوں میں مشغول رہے۔ رات کے آخری تہائی حصے میں وہ مسلمانوں کو لے کر دوبارہ دشمن کی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے کی طرح اب بھی انھوں نے اس امر کی کامل احتیاط کی کہ دشمن کو کانوں کان مسلمانوں کے آنے کی خبر نہ ہونے پائے۔ صبح صادق کا ظہور ہوا تو مسلمان اور ان کے دشمن قبائل ایک ہی میدان میں تھے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مسلمان لڑائی کے لیے پوری طرح تیار تھے اور دشمن بڑے اطمینان و آرام سے خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا تھا۔ انھوں نے بے دھڑک اپنی تلواریں دشمن کے سینوں میں پیوست کرنی شروع کردیں۔ وہ لوگ اس اچانک حملے سے ہڑبڑا کر اٹھے اور اسی نیم بیداری کی حالت میں لڑنا شروع کردیا لیکن تا بکے؟ ابوبکرؓ کے ساتھیوں نے اپنی تلواروں کے خوب جوہر دکھائے اور ابھی سورج نے اپنا چہرہ افق عالم پر ظاہر ہی کیا تھا کہ

دشمن کے لشکر نے نہایت بے ترتیبی کی حالت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ابوبکرؓ نے ذی القصہ تک ان کا تعاقب کیا۔ آخر جب یہ دیکھ لیا کہ وہ دوبارہ واپس آنے کی جرأت نہ کریں گے تو ابوبکرؓ اس جگہ واپس آ گئے جہاں تھوڑی دیر قبل میدان کارزار گرم تھا اور نعمان بن مقرنؓ سالار میمنہ، کو تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ اس جگہ چھوڑ کر خود مدینہ تشریف لے آئے۔

جنگ ذی القصہ اور جنگِ بدر میں مشابہت

اس موقع پر ابوبکرؓ نے ایمان و یقین، عزم و ثبات اور حزم و احتیاط کا جو مظاہرہ کیا اس سے مسلمانوں کے دلوں میں عہدِ رسول اللہؐ کے غزوات کی یاد تازہ ہو گئی۔ ابوبکرؓ کے عہد کی یہ پہلی لڑائی بڑی حد تک جنگِ بدر سے مشابہ ہے۔ جنگِ بدر کے روز مسلمان صرف تین سو تیرہ کی قلیل تعداد میں تھے جب مشرکین مکہ کی تعداد ایک ہزار سے زاید تھی۔ اِس موقع پر بھی مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی، اس کے بالمقابل عبس، ذبیان اور غطفان کے قبائل بھاری جمعیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ نے حیرت انگیز ایمان کا مظاہرہ کیا تھا اور اسی لیے اللہ نے انھیں مشرکین پر فتح عطا فرمائی۔ اس موقع پر ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھیوں نے ایمان کامل کا ثبوت دیا اور دشمن پر فتح حاصل کی۔ جس طرح جنگ بدر دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اسی طرح اِس جنگ میں بھی مسلمانوں کی فتح نے اسلام کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔

ابوبکرؓ کا عزم و ثبات

ابوبکرؓ نے عزم و ثبات اور ایمان و ایقان کا جو مظاہرہ کیا وہ چنداں قابل تعجب نہیں کیونکہ انھوں نے آغاز اسلام ہی سے اپنا مقصد اولین یہ قرار دے رکھا تھا کہ وہ ہر کام میں رسول اللہؐ کی پیروی اختیار کریں گے اور ان کی ساری زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ انھوں نے ہر موقع پر اپنے اس عہد کو پوری طرح نباہا اور بڑی سے بڑی روک بھی انھیں ان کے بلند مقصد سے علیحدہ نہ کر سکی۔ اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ دشمنوں سے ایسے معاملے کے متعلق سمجھوتا کر لیتے جو سراسر احکام الٰہی کے خلاف تھا۔ ابوبکرؓ کی نظروں کے سامنے رسول اللہؐ کی زندگی کا ایک ایک ورق

کھلا ہوا موجود تھا۔ جب کبھی کسی جانب سے منشائے الٰہی اور تعلیمات نبوی کے خلاف کوئی کام کرنے کے لیے ان پر زور دیا جاتا تو انھیں رسول اللہؐ کا وہ فقرہ یاد آجاتا جو ابو طالب کی درخواست پر آپ نے کہا تھا:

"واللہ! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لا کھڑا کریں اور یہ چاہیں کہ میں اِس کام کو چھوڑ دوں جو مجھے اللہ کی طرف سے تفویض کیا گیا ہے تو بھی میں اس کام کو نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ یا تو میں دوسروں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لوں یا اپنی کوشش میں ہلاک ہو جاؤں۔"

ابوبکرؓ نے بھی بالکل اسی قسم کا جواب اپنے ساتھیوں کو اس وقت دیا تھا جب انھوں نے اسامہؓ کی روانگی منسوخ کرنے پر زور دیا تھا اور یہی موقف انھوں نے اس وقت اختیار کیا جب لوگوں نے انھیں منکرین زکوٰۃ سے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہی وہ ایمان صادق تھا جس کے مقابلے میں انھوں نے کسی چیز کی، حتیٰ کہ موت کی بھی، پروانہ کی اور یہی ایمانِ صادق جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام آسائشیں ان کی نظروں میں ہیچ تھیں، اس نازک وقت میں اسلام کو تباہی و بربادی سے بچانے میں بھی سب سے بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔

مشورۂ صحابہ کے عدمِ قبول کی وجہ

سوال پیدا ہوتا ہے آخر کیا حرج تھا اگر ابوبکرؓ منکرین زکوٰۃ سے جنگ نہ کرنے کے بارے میں عمرؓ اور دوسرے بڑے بڑے صحابہ کا مشورہ قبول کر لیتے؟ اس کا جواب بہت سہل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عرب کے اکثر قبائل نے بہت تھوڑا عرصہ قبل بت پرستی سے نجات حاصل کی تھی اور جاہلیت کا دور ختم ہوئے نہایت قلیل عرصہ گزرا تھا۔ اگر ابوبکرؓ فرائض دینی کو ترک کر دینے کے متعلق قبائل عرب کا کوئی مطالبہ تسلیم کر کے ان سے سمجھوتا کر لیتے تو طلیحہ، مسیلمہ اور دوسرے خود ساختہ نبی فوراً یہ پروپیگنڈا شروع کر دیتے کہ فرائضِ دینی کی بجا آوری کے متعلق اس سمجھوتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمدؐ نے جو پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ (نعوذ باللہ) اللہ کی طرف سے نہ تھا بلکہ آپ کا خود ساختہ تھا ورنہ ابوبکرؓ اس کے متعلق سمجھوتا کیوں کرتے۔ قبائل عرب

پر اس پروپیگنڈے کا زبردست اثر ہوتا اور اس کے نتیجے میں وہ لوگ مدعیانِ نبوت سے مل جاتے جو ابھی ان پر ایمان نہ لائے تھے اور ان کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ ذی القصہ میں شرمناک شکست کا انتقام لینے کے لیے بنی ذبیان اور بنی عبس کے مشرکین نے ان تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا جو ان کی دسترس میں تھے، لیکن اس کا اثر اُلٹا پڑا اور قبائل کے وہ لوگ جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اپنے عقیدے میں اور پکے ہو گئے اور انھوں نے بے پس و پیش ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر زکوٰۃ پیش کرنی شروع کر دی کیونکہ انھوں نے تمام حالات و واقعات کا مشاہدہ کر کے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ابوبکرؓ اپنی قوتِ ایمانی کی بدولت ان مرتدین پر لامحالہ غالب آ جائیں گے، دینِ حق کا بول بالا ہو گا اور وہ بزدلانہ انتقام جو ہزیمت خوردہ قبائل نے کمزور و بیکس مسلمانوں سے لیا ہے اُن کی ہزیمت کے داغ کو نہ مٹا سکے گا اور ان قبائل کو اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑے گی۔

کسی شک کی گنجائش بھی کہاں تھی؟ صدیقِ اکبرؓ نے عہد کر لیا تھا کہ ان قبائل سے غریب و بے کس مسلمانوں کے قتل کا انتقام لیا جائے گا اور کسی بھی مشرک کو، جس نے مسلمانوں کے قتل میں حصہ لیا ہے، زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ اِس کام کے لیے صرف لشکرِ اسامہ کی واپسی کی دیر تھی۔

بیرونی مسلمانوں کی ادائے زکوٰۃ

ذی القصہ میں مسلمانوں کی فتح پر قبائل کے جو لوگ بہ دستور اسلام پر قائم تھے جوق در جوق زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے مدینہ آنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے جو لوگ آئے وہ بنی تمیم کے رئیس صفوان اور زبرقان اور بنی طیّ کے سردار عدی بن حاتم طائی تھے۔ اہلِ مدینہ نے بڑی گرم جوشی سے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کہیں ان لوگوں کا آنا ہمارے لیے مصیبت کا باعث نہ ہو۔ مگر ابوبکرؓ ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ نہیں یہ لوگ تمھارے لیے مصیبت کا پیغام لے کر نہیں بلکہ خوش خبری لے کر آئے ہیں۔ یہ تمھارے دشمن نہیں، مددگار ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کے حوصلے بلند رکھنا بے حد ضروری تھا کیونکہ ہر جانب خطرات کے بادل منڈلاتے دیکھ کر مسلمانوں کو طبعاً مضبوط سہاروں کی ضرورت تھی۔ عبداللہ بن مسعود اس وقت

کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رسول اللہ کی وفات کے بعد ہم اس مقام پر کھڑے تھے اگر اللہ ابوبکرؓ کے ذریعے سے ہماری مدد نہ فرماتا تو ہماری ہلاکت یقینی تھی۔ ہم سب مسلمانوں کا بالاتفاق یہ خیال تھا کہ ہم زکوٰۃ کے اونٹوں کی خاطر دوسروں سے جنگ نہ کریں گے اور اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جائیں گے یہاں تک کہ ہمیں کاملاً غلبہ حاصل ہو جائے۔ لیکن ابوبکرؓ نے منکرین زکوٰۃ سے لڑنے کا عزم کر لیا۔ انھوں نے منکرین کے سامنے صرف دو باتیں پیش کیں تیسری نہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے لیے ذلت و خواری قبول کر لیں اور اگر یہ منظور نہیں تو جلاوطنی یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اپنے لیے ذلت و خواری کی حالت قبول کرنے کا مطلب یہ تھا، وہ اقرار کریں کہ ان کے مقتول دوزخی اور ہمارے مقتول جنتی ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے مقتولوں کا خون بہا ادا کریں۔ ہم نے ان سے جو مالِ غنیمت وصول کیا ہے اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں لیکن جو مال اُنھوں نے ہم سے لیا ہے وہ ہمیں واپس کر دیں۔ جلاوطنی کی سزا بھگتنے کا مطلب یہ ہے کہ شکست کھانے کے بعد اپنے علاقوں سے نکل جائیں اور دور دراز مقامات میں جا کر زندگی بسر کریں۔"

شام سے اسامہؓ کی واپسی

مختلف قبائل کے مسلمان زکوٰۃ لے کر مدینہ پہنچ ہی رہے تھے کہ اسامہؓ بھی سرزمین روم سے مظفر و منصور واپس آ گئے۔ ابوبکرؓ اور کبار صحابہ نے مقام جرف میں لشکر کا استقبال کیا۔ عامۃ الناس نے بھی بڑے جوش و خروش سے اس فوج کا خیر مقدم کیا۔ جب لشکر مدینہ میں داخل ہوا تو ہر جانب سے خوشی اور مسرت کے گیتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسامہؓ سب سے پہلے مسجد نبوی میں پہنچے وہ عَلم جو رسول اللہ نے دستِ مبارک سے انھیں مرحمت فرمایا تھا، مسجد میں بلند کیا اور نمازِ شکرانہ ادا کی۔

دوبارہ جنگ

ابوبکرؓ نے نہایت دوراندیشی سے فیصلہ کیا کہ دشمن کو تیاری کا موقع نہ دیا جائے بلکہ اس پر پے در پے حملے کر کے اس کی قوت و طاقت توڑ دی جائے۔ انھوں نے اسامہ اور ان کے لشکر کو فی الحال آرام کرنے کا حکم دیا اور خود ان لوگوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے جو اس سے پہلے ذی القصہ کی لڑائی میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ لوگوں نے درخواست کی کہ آپ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں کیونکہ اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی ضرر پہنچ گیا تو اسلامی سلطنت کا نظام تہ و بالا ہو جائے گا، اس لیے آپ اپنی جگہ کسی اور کو لشکر کا سردار مقرر فرما دیں تاکہ اگر وہ میدان میں کام بھی آ جائے تو مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچ سکے لیکن ابوبکرؓ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے تھے تو جب تک اسے پورا نہ کر لیتے پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سن کر فرمایا:

"واللہ! میں ہرگز پیچھے نہ رہوں گا بلکہ تمھارے ساتھ رہ کر تمھاری ہمتوں کو بلند رکھوں گا۔"

مدینہ سے روانہ ہو کر ابوبکرؓ ابرق پہنچے جو ذی القصہ کے قریب واقع ہے۔ وہاں بنی عبس، ذبیان اور بنی بکر سے ان کی مٹ بھیڑ ہوئی۔ جنگ میں موخر الذکر قبائل کو شکست اٹھانی پڑی اور مسلمانوں نے انھیں اس علاقے سے نکال دیا۔ ابرق بنی ذبیان کی ملکیت تھا لیکن جب ابوبکرؓ نے انھیں وہاں سے نکال دیا تو اعلان کیا کہ "اب یہ سرزمین مسلمانوں کی ملکیت ہے، آئندہ بنی ذبیان اس پر قابض نہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ اللہ نے اسے ہمیں غنیمت میں دے دیا ہے۔" چنانچہ اس کے بعد یہ مقامات مسلمانوں ہی کی ملکیت میں رہے اور حالات معمول پر آنے کے بعد بھی بنو ثعلبہ نے اس جگہ دوبارہ آباد ہونا چاہا تو ابوبکرؓ نے اجازت نہ دی۔

اس طرح منکرین زکوٰۃ کی شکست پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مدینہ والے بے حد خوش تھے۔ ایک تو اسامہ کا لشکر پہنچ جانے کی وجہ سے شہر پر کسی حملے کا خطرہ باقی نہ رہا تھا، دوسرے غنیمت اور زکوٰۃ کے اموال متواتر پہنچنے کے باعث مسلمانوں کی غریبی و تنگ دستی بھی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔

شکست خوردہ قبائل کی روش

عبس، ذبیان، غطفان، بنی بکر اور مدینہ کے قریب بسنے والے دوسرے باغی قبائل کے لیے مناسب تھا کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی اور بغاوت سے باز آجاتے، ابوبکرؓ کی کامل اطاعت اور ارکانِ اسلام کی بجا آوری کا اقرار کرتے اور مسلمانوں سے مل کر مرتدین کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی تھا اور واقعات بھی اسی کی تائید کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے ذریعے سے ان کا زور ٹوٹ چکا تھا، روم کی سرحدوں پر حصولِ کامیابی کے باعث اہلِ مدینہ کا رعب قائم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی قوت و طاقت بڑھ چکی تھی اور اب وہ اس کمزوری کے عالم میں نہ تھے جو جنگِ بدر اور ابتدائی غزوات کے ایام میں ان پر طاری تھی۔ اب مکہ بھی ان کے ساتھ تھا اور طائف بھی اور ان دونوں شہروں کی سیادت سارے عرب پر مسلّم تھی۔ پھر خود ان قبائل کے درمیان ایسے مسلمان کثرت سے موجود تھے جنھیں باغی کسی صورت ساتھ نہ ملا سکے تھے اور اس طرح ان کی پوزیشن بے حد کمزور تھی۔

لیکن مسلمانوں کی دشمنی نے اُن کی آنکھیں اندھی کر دی تھیں اور سود و زیاں کا احساس دلوں سے جاتا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑ دیا اور قبیلہ بنی اسد کے متنبی طلیحہ بن خویلد سے جا ملے۔ جو مسلمان ان کے درمیان موجود تھے وہ انھیں ان کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکے۔ ان لوگوں کے پہنچ جانے سے طلیحہ اور مسلیمہ کی قوت و طاقت میں بہت اضافہ ہو گیا اور یمن میں بغاوت کے شعلے زور شور سے بھڑکنے لگے۔ یہ حالات دیکھ کر ابوبکرؓ نے فیصلہ کیا کہ جنگ کا سلسلہ بدستور جاری رکھا جائے اور اس وقت تک دم نہ لیا جائے جب تک یمن کا چپہ چپہ اسلامی حکومت کے زیرِ نگین نہ آجائے۔ اگر یہ قبائل عقل سے کام لیتے تو طلیحہ اور دوسرے مدعیانِ نبوت کو اتنا فروغ حاصل نہ ہوتا اور بہت جلد سارا عرب اسلام کی آغوش میں آجاتا۔ لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ اس نے مخالفین کو مزید مہلت دی کہ وہ اس عرصے میں اپنی جمعیت اور مضبوط کر لیں۔

اسلام سے ان قبائل کے عناد اور نفرت کی اصل وجہ وہی تھی جس کا ذکر ہم ابتدا میں کر آئے ہیں یعنی قبائلی عصبیت اور یہ جذبہ کہ ہم کسی طاقت کا غلبہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ جب ان قبائل کو مدینہ پر حملہ کرنے میں ناکامی ہوئی بلکہ اس کے برعکس انھیں اپنی بعض بستیوں ہی سے نکلنا پڑا تو

بدوی طبائع نے خارجی طاقت کے سامنے سر جھکانا اور اس کی سیادت قبول کرکے اس کے ماتحت زندگی بسر کرنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ وہ اس خیال سے بنی اسد اور طلیحہ سے جاکر مل گئے کہ ممکن ہے ان کا ساتھ دینے سے وہ اپنی عبرت ناک شکست کا داغ دھو سکیں۔

لیکن ابوبکرؓ تمام قبائلی عصبیتوں سے دور تھے۔ ان کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ رسول اللہؐ کا قائم کردہ طریقہ اختیار کیا جائے اور آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جائے۔ انھوں نے اپنی ساری جدوجہد اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی۔ یہی سیاست تھی جس کے نفاذ کا اعلان انھوں نے بیعت کے دن کیا تھا اور اپنے عہد خلافت میں اسی پر نہایت سختی سے کاربند رہے۔

(۶)

مرتدین سے جنگ کی تیاریاں

ابوبکرؓ نے قبائل عبس، ذبیان، بکر اور ان کے مددگاروں کو شکست دے کر جلاوطن کر دیا تھا اور وہ بزاخہ جاکر طلیحہ بن خویلد اسدی سے مل گئے تھے۔ ابوبکرؓ نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ یہ بستیاں چونکہ اللہ نے ہمیں غنیمت میں دی ہیں۔ اس لیے انھیں ان کے مفرور باشندوں کے حوالے نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ابرق اور ربذہ کے آس پاس کی تمام زمینیں اور چراگاہیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیں اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اب اُن کے پیشِ نظر مرتدین کا استیصال تھا جو عرب کے مختلف خطوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکا رہے تھے اور ان کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں کو سخت خطرہ درپیش تھا۔ منکرین زکواۃ کی طرح مرتدین کے متعلق بھی انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ انھیں ہر قیمت پر عبرت ناک شکست دی جائے گی اور ان سے کسی قسم کی مصالحت نہ کی جائے گی۔

جنگ کی تیاری

جب اسامہؓ کا لشکر اچھی طرح آرام کر چکا تو ابوبکرؓ اسے لے کر مدینہ سے نکلے اور ذی القصہ میں قیام فرمایا۔ وہاں انھوں نے گیارہ علم تیار کیے۔ لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصے پر ایک امیر مقرر کیا۔ پھر ان امرا کو حکم دیا کہ وہ مرتدین کے استیصال کے لیے اپنے اپنے مقرر کردہ علاقے کی جانب روانہ ہو جائیں اور راستے میں جن قبیلوں کے پاس سے گزریں وہاں کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے لیں[1]۔

---

[1] مرتدین کے مقابلے میں فوجیں بھیجتے ہوئے ابوبکرؓ نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ مرتدین کی جمعیت اور قوت وطاقت کا لحاظ رکھ کر ان کی طرف فوجیں روانہ کی جائیں۔ اسی لیے انھوں نے خالد بن ولید کو طلیحہ بن خویلد سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

ابوبکرؓ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے جو فوج رکھ چھوڑی تھی وہ باہر جانے والے لشکروں سے بہت کم تھی کیونکہ اب مدینہ کو فوری حملے کا خطرہ نہ تھا۔ منکرین زکواۃ کی سرکوبی کے بعد وہاں کے باشندے بڑے اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے کسی قبیلے کو مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷ :

لڑنے کے لیے بنی اسد کی طرف روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ طلیحہ سے فراغت حاصل ہونے کے بعد بطاح جاکر بنی تمیم کے سردار مالک بن نویرہ سے جنگ کی جائے۔

بنو اسد اور بنو تمیم مدینہ کے قریب ترین مرتد قبائل تھے اس لیے ضروری تھا کہ جنگ کا آغاز انھیں سے کیا جائے تاکہ ان کی شکست کا اثر دوسرے قبائل پر بھی پڑے اور وہ بہ آسانی زیر ہوسکیں۔ خالد بجا طور پر مستحق تھے کہ انھیں ان طاقتور قبائل سے جنگ کرنے والی فوجوں کی کمان سونپی جائے۔

عکرمہ بن ابوجہل کو دوسرا جھنڈا دیا گیا اور انھیں یمامہ جاکر بنی حنیفہ کے سردار مسیلمہ سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔

شرجیل بن حسنہ کو تیسرا جھنڈا سپرد کر کے حکم دیا گیا کہ وہ پہلے مسیلمہ کے خلاف عکرمہ کی مدد کریں اور یہاں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد عمرو بن عاص کی امداد کے لیے قضاعہ کی جانب روانہ ہو جائیں۔

عکرمہ اور شرجیل کو یمامہ میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی بلکہ یہ فخر خالد بن ولید کے حصے میں آیا اور انھوں نے غزوۂ عقربا میں مسیلمہ کو قتل کر کے بنی حنیفہ کی کمر توڑ دی۔

چوتھا جھنڈا مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کے حوالے کر کے حکم دیا گیا کہ وہ یمن جاکر اسود عنسی کے لشکر اور عمرو بن معدی کرب زبیدی، قیس بن مکشوح مرادی اور ان کے مددگاروں سے جنگ کریں۔ یہاں سے فراغت حاصل ہونے کے بعد کندہ اور حضر موت جاکر اشعث بن قیس اور اس کے ساتھی مرتدین سے لڑیں۔

پانچواں جھنڈا سوید بن مقرن اوسی کو عطا کر کے انھیں تہامۂ یمن جانے کا حکم دیا گیا۔

چھٹا جھنڈا علاء بن حضرمی کو مرحمت کر کے انھیں بحرین میں حطم بن ضبیعہ اور بنی قیس بن ثعلبہ کے مرتدین کی سرکوبی کا حکم دیا گیا۔

ساتواں جھنڈا حمیر کے حذیفہ بن محصن غلفانی کو دیا گیا اور انھیں عمان جاکر وہاں کے مدعیٔ نبوت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

بھی کس طرح ہو سکتی تھی جب مسلمانوں کی فتح مندی کی خبریں ہر طرف پھیل چکی تھیں ان کا رعب سارے عرب پر چھا چکا تھا اور ان کی بہادری کا سکہ تمام قبائل پر بیٹھ چکا تھا۔

قیام مدینہ کی وجہ

ان لشکروں کو رخصت کرنے کے بعد ابوبکرؓ مدینہ واپس تشریف لے آئے اور مستقل طور پر یہیں قیام فرمایا۔ مدینہ میں قیام کی وجہ یہ تھی کہ اب یہ شہر مسلمانوں کا جنگی ہیڈ کوارٹر بن چکا تھا اور فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق تمام احکام یہیں سے صادر ہوتے تھے۔ اس لیے خلیفہ کا مستقل طور پر دارالخلافہ میں قیام نہایت ضروری تھا ورنہ فتوحات کا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا اور مسلمانوں کو مخالفین کے مقابلے میں وہ کامیابی ہرگز حاصل نہ ہوتی جو ہوئی۔

سب سے ضروری حکم جو ابوبکرؓ نے لشکروں کے سپہ سالاروں کی روانگی کے وقت دیا، یہ تھا کہ کوئی سپہ سالار مخالف پر فتح پانے کے بعد اس وقت تک کسی دوسری جانب رخ نہ کرے جب تک دربارِ خلافت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لے کیونکہ ابوبکرؓ کے خیال میں سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ دورانِ جنگ میں دارالخلافہ کی انتظامی مشینری اور جنگی قیادت میں کامل اتحاد ہونا چاہیے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸:

ذوالتاج لقیط بن مالک ازدی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔

آٹھواں جھنڈا عرفجہ بن ہرثمہ کو دے کر انھیں مہرہ بھیجا گیا۔

جانب جنوب اتنے کثیر لشکر بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ ارتداد کا فتنہ اسی حصے میں زیادہ پھل پھول رہا تھا اور یہاں کے مرتدین کی سرکوبی کے لیے زیادہ لشکر بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بالمقابل شمالی جانب تین فوجیں بھیجی گئیں۔

پہلی فوج عمرو بن عاص کے زیر سرکردگی قضاعہ سے لڑنے کے لیے روانہ کی گئی۔ دوسری فوج معن بن حاجز سلمی کی قیادت میں بنی سلیم اور بنی ہوازن کے شوریدہ سر قبائل کی سرکوبی کے لیے روانہ کی گئی اور تیسری فوج خالد بن سعید بن عاص کی سالاری میں شام کی سرحدوں پر امن و امان قائم رکھنے کے لیے بھیجی گئی۔

مہاجرین کی قیادت کا سبب

اِس موقع پر انصار کے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ان لشکروں کے سپہ سالار تمام تر مہاجرین ہی ہیں اور انصار میں سے کسی شخص کو قیادت کا علم سپرد نہیں کیا گیا، لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ ابوبکرؓ کا اصل منشا یہ تھا کہ اہلِ مدینہ اپنے شہر کی حفاظت خود کریں کیونکہ وہ یہاں کے تمام حالات کو خوب جانتے تھے اور دوسروں کی نسبت اپنے شہر کی حفاظت اچھی طرح کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال سراسر غلط تھا کہ ابوبکرؓ نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کی روش دیکھتے ہوئے انھیں اِس خیال کے تحت قیادت سے محروم کر دیا کہ مبادا باہر جا کر وہ بغاوت کا علم بلند کر دیں۔

یہ فوجیں مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کی گئی تھیں اور ابوبکرؓ خوب جانتے تھے کہ انصار ایمان باللہ اور شیفتگیٔ رسولؐ میں مہاجرین سے کسی طرح کم نہ تھے اس لیے انھیں انصار سے کسی قسم کا خدشہ کیونکر لاحق ہو سکتا تھا؟

اگر انصار کے متعلق یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اکابر مہاجرین مثلاً علیؓ، طلحہ اور زبیر وغیرہ کے متعلق بھی یہی خیال کیوں درست نہیں ہو سکتا کہ ابوبکرؓ نے انھیں اِس لیے مدینہ سے باہر نہ جانے دیا کہ ان کی طرف سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے ان لوگوں اور عمرؓ کو اِس وجہ سے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا تھا کہ ان سے وقتاً فوقتاً مشورہ لیتے رہیں اور ان کے تدبر اور مشوروں سے فائدہ اٹھا کر مرکزِ قیادت کو مضبوط کر سکیں۔

ابوبکرؓ کی بے تعصّبی

آخر ابوبکرؓ کے لیے ان لوگوں سے ڈرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ انھوں نے خلافت اپنی مرضی اور خواہش سے حاصل نہ کی تھی بلکہ یہ گراں بار ذمہ داری صرف اِس لیے قبول کی تھی کہ مدینہ کے اہل الرائے اصحاب ان کی صلاحیتوں کی بنا پر انہی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور ان کے سوا کسی کی خلافت پر راضی نہ تھے۔ اڑھائی برس کے عرصے میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ ابوبکرؓ نے خلافت محض اللہ کے راستے میں قربانی کرتے ہوئے

قبول کی تھی۔ چنانچہ بیعت لینے کے بعد اُنھوں نے پہلی ہی تقریر میں فرمایا:

"اے لوگو! مجھے خلیفہ تو بنا دیا گیا ہے لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں واللہ!
میری تو دلی خواہش ہے کہ یہ بارِ گراں تم میں سے کوئی اور شخص اٹھائے۔"

اسی طرح ایک بار خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"حکمران دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ بدبخت ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر لوگوں نے حیرانی کا اظہار کیا تو فرمایا:

"لوگو! تمھیں کیا ہوا؟ تم اعتراض کرنے والے اور جلد باز ہو۔ جب کوئی شخص حکمران بنتا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسروں کا مال بھی اُس کے قبضے میں آجائے لیکن اس کی حالت محض سراب کی سی ہوتی ہے۔ وہ ظاہر میں تو خوش وخرم دکھائی دیتا ہے مگر اصل میں حد درجہ غمگین شخص ہوتا ہے۔"

سنح میں ابوبکرؓ کا قیام جس مکان میں تھا وہ بہت معمولی اور دیہاتی طرز کا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو خلافت کے بعد اس کی حالت درست کر سکتے تھے لیکن خلافت کے پورے عہد میں مکان جوں کا توں رہا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔ اسی طرح مدینہ کا مکان بھی بدستور پہلی ہیئت پر قائم رہا۔ خلافت کے بعد چھ مہینے تک وہ روزانہ پیدل سنح سے مدینہ آتے تھے اور شاذونادر ہی کبھی گھوڑا استعمال کرتے تھے۔ خلافت سے پہلے وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلافت کا کام بڑھا اور سلطنت کی ذمہ داریاں زیادہ ہوئیں تو تجارت کے لیے وقت دینا مشکل ہوگیا۔ اس لیے اُنھوں نے لوگوں سے فرمایا کہ انصرامِ سلطنت اور تجارت کا کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ چونکہ رعایا کی دیکھ بھال اور اس کی خبر گیری تجارت سے زیادہ ضروری ہے اس لیے میرے اہل و عیال کے واسطے اتنا وظیفہ مقرر کر دیا جائے جو انھیں معمولی طور پر کافی ہو۔ چنانچہ بیت المال سے ان کا اتنا وظیفہ مقرر کر دیا گیا جس سے اُن کا اور ان کے اہل و عیال کا گزارہ چل سکے لیکن جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُنھوں نے اپنے رشتہ داروں کو حکم دیا، جو وظیفہ میں نے بیت المال سے لیا ہے وہ سارے کا سارا واپس کر دو۔ اس کی ادائی کے لیے میری فلاں زمین بیچ دی جائے اور آج تک میں نے مسلمانوں کا جو مال اپنے اوپر خرچ کیا ہے اس زمین کو فروخت

کر کے وہ پوری کی پوری رقم ادا کر دی جائے۔ چنانچہ جب ان کی وفات کے بعد عمرؓ خلیفہ ہوئے اور وہ رقم ان کے پاس پہنچی تو وہ رو پڑے اور کہا:

"ابوبکرؓ! تم نے اپنے جانشین کے سر پر بہت بھاری بوجھ ڈال دیا ہے۔"

جو شخص ان اعلیٰ صفات اور خصائل کا مالک ہو اسے آخر کس چیز کا ڈر ہو سکتا تھا اور کس شخص کی مجال تھی کہ ان پر زبان طعن دراز کرتا۔ تمام مسلمانوں بلکہ سارے عرب میں ان کی عقل و خرد، اصابت رائے، صدق مقال، ایمان، اخلاص اور قربانی و ایثار کے بے نظیر جذبے کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ان صفات حسنہ سے ان کی زندگی کا کوئی بھی دور خالی نہ رہا لیکن ان کا اظہار جس طرح خلافت کی ذمہ داریاں تفویض ہونے کے بعد ہوا پہلے نہ ہو سکا۔ انھیں باتوں کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص نے ان بلند مقاصد کے بارے میں شک نہ کیا اور کسی بھی جانب سے ان کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا گیا۔

خالد بن ولید

خالدؓ بن ولید کو ابوبکرؓ نے جس لشکر کی کمان سپرد کی تھی وہ تمام لشکروں سے زیادہ مضبوط تھا اور اس میں مہاجرین و انصار کے منتخب آدمی جمع تھے جن کا انتخاب خود خالد نے کیا تھا۔ صفحات آئندہ میں آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں نے جنگ ہائے ارتداد میں بے نظیر کارنامے انجام دیے اور عراق و شام کی جنگوں میں تو انھوں نے وہ معرکے سر کیے جنھیں کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ان فوجوں کی کامیابی کا راز خالد بن ولید کی سپہ سالاری میں مضمر تھا۔ خالد کو جو جنگی مہارت حاصل تھی اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سکندر اعظم، چنگیز خاں، جولیس سیزر، ہنی بال اور نپولین کی شخصیتیں خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ نظر آتی ہوں لیکن حق یہ ہے کہ خالدؓ کی شخصیت کے آگے وہ سب ہیچ ہیں۔ وہ اسلام کے لیے جلیل تھے اور ہر قسم کے خطرات و خدشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دشمنوں کی صفوں میں درانہ گھس جانا ان کا خاص شیوہ تھا۔ فنون جنگ سے گہری واقفیت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دشمن کی ہر چال اور اس کا ہر منصوبہ ان کی نگاہ میں ہوتا تھا

اور مخالفت کی کوئی حرکت اُن سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ تمام مسلمانوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم تھا خود رسول اللہؐ نے انھیں جنگِ مؤتہ میں مسلمانوں کی قلیل التعداد فوج کو ہزار ہا رومیوں کے نرغے سے نکال لانے کی بنا پر سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ زندگی بھر انھوں نے کبھی شکست نہ کھائی، ہمیشہ فتح یاب ہی ہوتے رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

اسلام لانے سے قبل بھی خالد کا شمار قریش کے چوٹی کے بہادروں میں ہوتا تھا جنگِ بدرؓ احد اور خندق میں وہ کفار کے دوش بہ دوش مسلمانوں سے لڑے۔ سرتا پا فوجی ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت میں خشونت تندی اور تیزی آ گئی تھی۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر ان سے مطلق صبر نہ ہو سکتا تھا اور چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اللہ کا فضل ہمیشہ ان کے شاملِ حال رہا ورنہ ممکن تھا کہ اپنی جلد بازی کے باعث انھیں بھاری نقصان سے دوچار ہونا پڑتا۔ دشمن بڑی سے بڑی تعداد اور کثیر اسلحہ کے باوجود کبھی انھیں مرعوب نہ کر سکتا تھا صلح حدیبیہ سے اگلے سال رسول اللہؐ عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو خالد مسلمانوں سے حد درجہ نفرت کے باعث مکہ چھوڑ کر ہی چلے گئے۔ لیکن اچانک اللہ نے ان کے دل پر پڑے ہوئے تاریک پردے ہٹا دیے اور انھیں حق و صداقت سے آگاہی عطا فرمائی۔ رسول اللہؐ کے مدینہ واپس تشریف لے جانے کے بعد خالد مکہ واپس آ گئے اور ایک روز انھوں نے قریش کے مجمع میں علانیہ کہہ دیا "اب ہر ذی عقل انسان پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ محمدؐ نہ جادوگر ہیں نہ شاعر' ان کا کلام یقیناً اللہ کی طرف سے ہے' اب قریش کے لیے آپ کا اتباع اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔

خالدؓ کی زبان سے یہ کلمات سُن کر قریش کو سخت حیرت ہوئی۔ ان کے وہم میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ خالد کا میلان اسلام کی جانب ہو سکتا ہے۔ عکرمہ بن ابوجہل اور خالد کے مابین بحث بھی ہوئی لیکن خلافِ معمول اس نے تیزی اختیار نہ کی۔ ابوسفیان اس اجتماع میں موجود نہ تھا۔ جب اسے اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے انھیں بلا کر پوچھا "کیا تمھارے اسلام لانے کی خبر سچ ہے؟" خالدؓ نے جواب دیا "ہاں میں اسلام لے آیا ہوں اور محمدؐ کی رسالت پر یقین رکھتا ہوں۔" یہ سن کر ابوسفیان کو بہت غصہ آیا اور اس نے کہا لات اور عزیٰ کی قسم!

اگر یہی بات ہے تو میں محمدؐ سے پہلے تم ہی سے نبٹ لیتا ہوں۔" خالد نے جواب دیا: "اسلام بہر حال سچا ہے خواہ کوئی شخص اس بات کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کرے۔"

اسلام لانے کے بعد خالد مدینہ چلے آئے۔ اپنی جنگی قابلیت کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں میں خاص قدر و منزلت حاصل کر لی اور اس امر کے باوجود کہ ان کی ساری عمر اسلام کی مخالفت میں گزری تھی، ہر شخص انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اس عزت و توقیر میں گراں قدر اضافہ اس وقت ہوا جب جنگ مؤتہ کے بعد انھیں دربار نبوی سے 'سیف اللہ' کا خطاب مرحمت ہوا۔ بعد میں انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس خطاب کا پورا پورا مستحق ثابت کیا۔ عراق اور شام کی فتوحات انہی کے ذریعے سے ہوئیں۔ فارس اور روم کی عظیم الشان سلطنتیں، جو اس زمانے میں روئے زمین کی مالک تھیں، انہی کے ہاتھوں نابود ہوئیں۔ ان ہی اوصاف کی بدولت انھیں مرتدین کے مقابلے میں سب سے بڑے لشکر کی سپہ سالاری نصیب ہوئی۔

مرتدین کو آخری پیش کش

لشکروں کی روانگی سے قبل ابوبکرؓ نے مرتدین کو آخری موقع دینے کے لیے انھیں دوبارہ اسلام لانے اور امن سے رہنے کی دعوت دی۔ عرب کے ہر حصے میں انھوں نے متعدد خطوط روانہ کیے جن میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد رسول اللہؐ کی رسالت اور ان کے بشیر و نذیر ہونے کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب وہ کام پورا ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں تشریف لائے تھے تو اللہ نے آپ کو وفات دے دی۔ رسول اللہؐ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ان خطوط میں یہ آیات بھی درج کیں، 'انک میت و انہم میتون' (اے رسول! تمھیں بھی وفات دی جانے والی ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی) 'وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افئن مت فھم الخالدون' (اے رسولؐ! ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کو ہمیشہ کی زندگی سے نہیں نوازا۔ یہ ممکن ہے کہ تو وفات پا جائے اور دوسرے لوگ زندہ رہیں؟) 'وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل، افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم و

من ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین' (محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر دوسرے رسولوں کی طرح محمد بھی وفات پاجائیں یا شہید کردیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو اپنی ایڑیوں کے بل پھرے گا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو جزائے خیر دے گا۔)

مرتدین کے نام خطوط

ان آیات کے درج کرنے سے ابوبکرؓ کا مقصد ان لوگوں کا فتنہ فرو کرنا تھا جو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر محمدؐ سچے ہوتے تو کبھی وفات نہ پاتے۔

ان آیات کے علاوہ آپ نے لکھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ مسلمان ہونے اور اسلام کے احکام پر عمل کرنے کے بعد جہالت اور شیطان کے بہکانے کے باعث دینِ حق سے پھر گئے ہیں۔ میں تمھاری جانب مہاجرین، انصار اور تابعین کا لشکر بھیج رہا ہوں۔ میں نے اسے حکم دے دیا ہے کہ جب تک وہ تمھارے سامنے اسلام کا پیغام نہ پہنچا دے جنگ نہ کرے۔ پس جو شخص یہ دعوت قبول کرے گا، اسلام کا اقرار کر کے تمام مخالفانہ سرگرمیوں سے باز آجائے گا اور نیک کام کرے گا اس کی جان بخشی کر دی جائے گی، لیکن جو شخص انکار کرے گا اور فساد پر آمادہ ہو گا اس سے جنگ کی جائے گی اور وہ اللہ کی تقدیر کو اپنے اوپر نافذ ہونے سے روک نہ سکے گا۔ ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا جائے گا اور بری طرح قتل کیا جائے گا۔ ان کی عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے جائیں گے۔ کسی شخص سے اسلام کے سوا کچھ قبول نہ کیا جائے گا۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد جو شخص ایمان لے آئے گا تو یہ ایمان اس کے لیے بہتر ہو گا لیکن جو شخص بدستور حالت ارتداد پر قائم رہے گا وہ اللہ کو ہرگز عاجز نہ کر سکے گا۔ میں نے قاصد کو حکم دے دیا ہے

کہ وہ میرا یہ خط مجمع عام میں پڑھ کر سنا دے۔ اسلام لانے کی علامت اذان ہوگی"۔

اسی لیے جب مسلمان مرتدین کی بستیوں کے قریب پہنچ کر اذان دیتے اور اس کے جواب میں بستی کی جانب سے بھی اذان کی آواز سنائی دیتی تو مسلمان اُن سے کوئی تعرض نہ کرتے لیکن اگر اذان کی آواز نہ آتی تو ایک بار پھر اتمامِ حجت کرنے کے بعد اُن سے جنگ شروع کر دیتے۔

ہدایت کی کوشش

ابوبکرؓ نے قاصدوں کے ہاتھ یہ خطوط عرب کے گوشے گوشے میں بھیج دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح متردد لوگوں کو غور و فکر کی مہلت مل جائے کیونکہ لوگ محض اس خدشے کے باعث مرتدین کے ساتھ ہو گئے تھے کہ اگر وہ اسلام پر قائم رہے تو انھیں مرتدین کے ہاتھوں سخت مظالم برداشت کرنے پڑیں گے لیکن اب کہ انھوں نے اپنے آپ کو دو قوتوں کے درمیان گھرا ہوا دیکھا تو دوبارہ اسلام لانے کا اعلان کر دیا یا کم از کم مرتدین کے سرداروں کی حمایت سے دست کشی اختیار کر لی۔ اس وجہ سے ان کی جانیں بچ گئیں۔

یہ خطوط سن کر کثیر التعداد مرتدین کی ہمتیں بھی پست ہو گئیں اور انھوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ غرض ابوبکرؓ کی اس پالیسی سے مسلمانوں کو زبردست فائدہ پہنچا پھر بھی اس پالیسی سے کسی کمزوری کا اظہار مطلق نہ ہوتا تھا۔ ابوبکرؓ کا منشا یہ نہ تھا کہ پہلے تو مرتدین کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس پر بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو مصالحت کی کوئی اور راہ اختیار کریں۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے خطوط کا لفظ لفظ نہایت سنجیدگی سے تحریر کیا تھا۔ جو دھمکیاں خطوط میں دی گئی تھیں وہ خالی خولی نہ تھیں بلکہ وہ انھیں لباسِ عمل پہنانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انھوں نے واشگاف الفاظ میں لکھ دیا تھا، امرائے عساکر کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ پہلے مرتد لوگوں کو دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ اسے قبول کر لیں تو ان سے درگزر کریں لیکن انکار کی صورت میں ان سے جنگ کریں اور اس وقت تک جنگ کریں کہ وہ اسلام لانے کا اقرار کر لیں۔ اسلام کا اقرار کر لینے کے بعد انھیں ان حقوق سے آگاہ کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں اور ان حقوق سے بھی باخبر کریں جو حکومت کے ذمے عائد ہوتے ہیں پھر ان سے جو لینا ہو وہ لیں اور انھیں جو دینا ہو وہ دیں۔ انھیں مہلت قطعاً نہ دیں۔ جو شخص یہ دعوت قبول کر لے اس پر کسی شخص کو دست درازی

کرنے کا حق نہیں۔ اگر وہ اپنے دل میں ان باتوں سے مختلف باتیں چھپائے جو اس نے اپنی زبان سے ادا کی ہیں تو اس کا حساب لینا صرف اللہ کا کام ہے۔ لیکن جو شخص قبول دعوت سے انکار کرے تو اس سے، جہاں کہیں وہ ہو، جنگ کی جائے اور اُسے قتل کیا جائے۔ اس سے اسلام کے سوا کوئی چیز قبول نہ کی جائے۔ قتل کرنے کے لیے تلوار اور آگ دونوں استعمال کی جائیں۔

بہترین سیاست کا کرشمہ

ابوبکرؓ نے اس موقع پر جو پالیسی اختیار کی وہ بہترین سیاست کا کرشمہ تھی بعض لوگ اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے نہایت نرم دل ہونے کے باوجود اس قدر سخت رویہ کیوں اختیار کیا؟ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ ابوبکرؓ کو اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو کامل ایمان تھا اس کے باعث انھیں دین کے معاملے میں نرمی برتنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ یہ درست ہے کہ نرم دل لوگ سختی اور تندی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اگر کسی جانب سے ان کے عقائد پر زد پڑے تو ان کی سختی کی انتہا نہیں رہتی۔ انسانی فطرت میں ایک خاص حد تک سختی اور نرمی کا مادہ رکھا گیا ہے مگر بعض اوقات جب معاملات اس مقرر حد سے بڑھ جائیں تو اس کا ردِ عمل بالکل اُلٹ ہوتا ہے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی طبائع پر سختی غالب ہوتی ہے، انھیں دیکھ کر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کبھی نرمی بھی برت سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر نرمی نے پوری طرح قابو پا لیا ہوتا ہے اور انھیں دیکھ کر گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ کبھی سختی پر بھی اُتر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس قسم کے نظارے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ جن لوگوں سے سختی کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ انتہائی سختی پر اُتر آتے ہیں اور جن سے نرمی کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ انتہائی نرمی برتنے لگتے ہیں۔ وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ سختی اور نرمی دونوں کی حدود مقرر ہیں۔ بعض اوقات کے نتیجے میں جب یہ حدود ٹوٹ جاتی ہیں تو ان کا ردِ عمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔

کیا کوئی شخص خیال کر سکتا تھا کہ اسامہ کو شام بھیجتے وقت ابوبکرؓ وہ رویہ اختیار کریں گے جو اکابر مہاجرین اور انصار کی رائے کے بالکل خلاف تھا؟ یا منکرین زکوٰۃ کے مقابلے میں اس قدر سختی برتیں گے کہ اسلامی لشکر کے مدینہ سے غیر حاضر ہونے کے باوجود چند آدمی لے کر ان کے

مقابلے کو نکل آئیں گے؟ انہی واقعات پر بس نہیں بلکہ بعد کے واقعات نے بھی بتا دیا کہ ابوبکرؓ، جن کی سرشت میں نرمی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مخالفین کے مقابلے میں نہایت سخت دل واقع ہوئے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ بیان کی جا چکی ہے، یہی ہے کہ ابوبکرؓ کو اللہ اور اس کے رسول پر کامل ایمان تھا اور انھیں وثوق تھا کہ انھوں نے جو چیز قبول کی ہے وہی حق ہے۔ اس لیے جب بعض لوگ اس چیز کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان سے مطلق صبر نہ ہو سکا اور وہ پورے عزم اور عدیم النظیر ہمت سے دین میں رخنہ اندازی کرنے والے لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ ابوبکرؓ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک خاموش نہ بیٹھیں گے جب تک منکرینِ زکوٰۃ اور مرتدین کو حق کی طرف نہ لے آئیں یا ان کا قلع قمع نہ کر لیں اور اگر اس غرض کے لیے انھیں تنہا بھی لڑنا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

جنگ ہائے ارتداد کی اہمیت

مرتدین سے جو جنگیں پیش آئیں ان کا شمار زمانۂ اسلام کی فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے۔ اگر ان جنگوں میں مسلمان فتح یاب نہ ہوتے تو تھوڑے ہی عرصے میں عرب دوبارہ اسی پرانی جاہلیت کا شکار ہو جاتے جسے فنا کرنے کے لیے رسول اللہؐ اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ لیکن اللہ نے مقدر کر دیا تھا کہ اس کا دین غالب رہے گا۔ اس غرض سے اس نے ابوبکرؓ کو چنا۔ انھوں نے انتہائی پامردی سے تمام دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کر کے انھیں دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہونے پر مجبور کر دیا۔ پوری تاریخ اسلام میں کہیں بھی ایسی نظیر نہیں ملتی جہاں ایسے محکم ایمان کا مظاہرہ کیا گیا ہو جیسا ابوبکرؓ نے کیا اور عزم و استقلال کا ایسا ثبوت دیا گیا ہو جیسا ابوبکرؓ نے دیا۔

(۷)

طُلَیحہ اور جنگِ بزاخہ

قبائل عبس، ذوبیان، بنوبکر اور ان کے وہ مددگار جنھوں نے مدینہ پر چڑھائی میں حصہ لیا تھا داغِ ہزیمت دھونے کے لیے طلیحہ بن خویلد اسدی سے جا کر مل گئے تھے۔ مزید برآں طی، غطفان، سلیم اور دوسرے بدوی قبائل بھی جو مدینہ کے مشرق اور شمال مشرق میں آباد تھے طلیحہ کے حامی بن گئے تھے۔ یہ سب قبائل عیینہ بن حصن فزاری کی طرح کہتے تھے "حلیف قبائل (اسد اور غطفان) کا نبی ہمیں قریش کے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔ محمدؐ وفات پا چکے ہیں لیکن طلیحہ زندہ ہے۔"

ان قبائل کو خوب معلوم تھا کہ ابوبکرؓ ان پر ضرور حملہ کریں گے لیکن انھوں نے مطلق پروا نہ کی اور برابر لڑائی کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ طلیحہ کی مطابعت انھوں نے اس ضد میں اختیار کی تھی کہ وہ اپنے اوپر مدینہ کی حکومت کیوں تسلیم کریں؟ اپنی آزادی ہاتھ سے کیوں جانے دیں اور زکوٰۃ جو ایک قسم کا تاوان ہے، کیوں ادا کریں؟

طلیحہ پہلے سمیرا، میں مقیم تھا۔ وہاں سے بزاخہ آگیا کیونکہ اس کے خیال میں لڑائی کے لیے بزاخہ نسبتاً زیادہ مناسب اور محفوظ جگہ تھی۔

طلیحہ کا دعوائے نبوّت

طلیحہ نے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد نبوّت کا دعویٰ نہ کیا تھا بلکہ وہ اسود عنسی اور مسیلمہ کی طرح آپ کی زندگی کے آخری دنوں ہی میں یہ دعویٰ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کے برعکس عربوں کو دوبارہ بت پرستی اختیار کرنے کی دعوت نہ دی، . . . .
. . . . . ، کیونکہ بت پرستی کو رسول اللہؐ عرب سے بالکل صاف کر چکے تھے اور اب اس کے پنپنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ توحید کی دعوت عرب کے کناروں تک پہنچ چکی تھی اور لوگوں

کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ بت پرستی بذیان کی ایک قسم ہے جس سے ہر شریف انسان کو شرمانا چاہیے۔

مدعیانِ نبوت نے لوگوں میں یہ بات پھیلانی شروع کی کہ ان پر اسی طرح وحی نازل ہوتی ہے جس طرح محمدؐ پر نازل ہوتی ہے اور ان کے پاس بھی اسی طرح آسمان سے فرشتہ آتا ہے جس طرح محمدؐ کے پاس آتا ہے۔ ان میں سے بعض نے آیات قرآنی کے مشابہ کچھ عبارتیں بنانے کی کوشش کی اور جیسی بری بھلی وہ بنیں انھیں لوگوں کے سامنے وحی آسمانی کے طور پر پیش کیا لیکن ان عبارتوں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور حیرت ہوتی ہے ان مدعیانِ نبوت کو کس طرح جرأت ہوئی کہ انھوں نے ایسی بے سروپا باتوں کو وحیٔ آسمانی کا نام دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور وہ لوگ بھی کس عجیب قسم کی ذہنیت کے مالک تھے جنھوں نے اس نامعقول اور بے ہودہ بکواس کو وحیٔ الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا۔ ذیل میں نمونۃً اس 'وحی' کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے جو طلیحہ پر اترا کرتی تھی۔

"والحمام والیمام' والصرد الصوام' قد صمن قبلکم باعوام لیبلغن ملکنا العراق والشام۔"

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کاہن لوگ مسجع و مقفیٰ عبارتیں لوگوں کے سامنے پیش کر کے ان پر رعب بٹھلاتے تھے۔ قریش بھی یہ کہ کر رسول اللہؐ کا انکار کرتے تھے کہ یہ شخص کاہن ہے اور جو کچھ اس پر اترتا ہے وہ اسی قسم کی مسجع و مقفیٰ عبارتیں ہیں جو عموماً کاہن لوگ سنایا کرتے ہیں لیکن بالآخر عربوں اور تمام انسانوں پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ قرآن محمدؐ کا معجزہ ہے اور جن و انس میں سے کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کی نظیر پیش کر سکے۔ طلیحہ اور اسود عنسی وغیرہ بھی کاہن تھے اور دوسرے کاہنوں کی طرح انھوں نے بھی بعض مسجع و مقفیٰ عبارتیں بنا کر انھیں اللہ کی طرف منسوب کر دیا تھا حالانکہ ان عبارتوں کو سننا بھی مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا تھا اور کوئی باذوق ان عبارتوں کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ تعجب ہے کہ یہ خرافات سننے کے بعد لوگ کس طرح ان مدعیانِ نبوت کے پھندوں میں گرفتار ہو گئے اور ان عبارتوں کو کلامِ الٰہی یقین کرنے لگے۔

طلیحہ نے لوگوں کے سامنے جو تعلیم پیش کی وہ بیشتر پردۂ اخفا میں ہے البتہ تاریخ سے

اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو نماز میں رکوع و سجود کرنے سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا، اللہ کا یہ منشا نہیں کہ تم اپنے چہرے زمین پر رگڑو یا نماز میں اپنی پیٹھیں کمان بناؤ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ عیسائیوں کے طریقۂ عبادت سے لیا تھا۔ طلیحہ، مسیلمہ اور ان جیسے دوسرے مدعیانِ نبوت کی پیش کردہ تعلیمات اور باتیں اس لیے پردۂ اخفا میں ہیں کہ اس زمانے کے مسلمانوں نے انھیں مدون کرنے کی کوشش نہ کی۔ بعد میں جو چیزیں مدون ہوئیں وہ بھی صرف ان باتوں پر مشتمل تھیں جن سے دین اسلام کی تائید ہوتی تھی۔

ہر شخص کو علم ہے کہ صدر اول میں قرآن کریم کے سوا، جو ابوبکرؓ کے حکم سے یک جا کیا گیا، کوئی چیز مدون نہیں کی گئی۔ احادیث کی تدوین بھی پہلی صدی ہجری کے بعد عمل میں آئی۔ اس حقیقت کے پیش نظر تعجب نہیں کہ طلیحہ اور دوسرے مدعیانِ نبوت کے متعلق جن روایات کا وجود ملتا ہے وہ بے سروپا ہی ہوں خصوصاً اس صورت میں کہ یہ روایات اس زمانے کے عربی طرز بود و ماند تہذیب، تمدن اور رسوم کے برعکس ہیں اور اُس وقت کے واقعات و حالات سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتیں۔

مرتدین کی سرکوبی اور ضرارؓ کی روانگی

رسول اللہ کی زندگی ہی میں طلیحہ نے بنی اسد میں، اسود عنسی نے یمن میں اور مسیلمہ نے یمامہ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسی لیے آپ نے ضرار بن ازور کو بنی اسد کے مسلمان عمال کے پاس یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ وہ مرتدین کے خلاف سخت کارروائی کریں۔ اس حکم کے مطابق مسلمانوں نے واردات کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور طلیحہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سمیراء کے مقام پر فروکش ہوا۔

مختلف میدان ہائے جنگ میں اپنی فتح یابی کی خبریں سن کر مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی اور مرتدین کی تعداد گھٹتی جاتی تھی۔ بالآخر ضرارؓ نے طلیحہ سے جنگ کرنے کے لیے سمیراء کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک مسلمان، اس خیال سے کہ طلیحہ کو جہنم واصل کرنے کا شرف اس کے حصے میں آئے، فوج سے علیحدہ ہو کر طلیحہ کے کیمپ میں جا پہنچا اور اُس پر تلوار سے وار کیا لیکن تلوار اچٹ گئی اور طلیحہ بچ گیا۔ یہ دیکھ کر طلیحہ کے حاشیہ برداروں نے یہ بات پھیلانی شروع

کر دی کہ ان کے نبی پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔

مسلمان طلیحہ سے جنگ کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہی تھے کہ رسول اللہ کی خبر وفات پہنچ گئی۔ اس پر ان میں اضطراب برپا ہو گیا اور ان کی تعداد گھٹنے لگی بعض لوگ اسلامی لشکر سے بھاگ کر طلیحہ سے جا ملے۔

ابوبکرؓ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد جب عبس اور ذبیان کے قبائل بھی طلیحہ سے مل گئے تو اس کی قوت و طاقت اور تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا اور ظاہر بین آنکھ کو نظر آنے لگا کہ طلیحہ کو مغلوب کرنا آسان کام نہیں۔

عُیَینہ اور مسلیمہ کا الحاق

طلیحہ کی قوت و طاقت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب عبس اور ذبیان کے علاوہ بعض دوسرے قبائل بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بنو اسد غطفان اور طی رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ایک دوسرے کے حلیف تھے لیکن بعض رنجشوں کی بنا پر اسد اور غطفان، قبیلہ طی کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے طی کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ اس واقعے کا اثر اتنا ہی نہ ہوا کہ اسد و غطفان اور طی کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی بلکہ بنی اسد اور غطفان میں دوستی کا جو معاہدہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد عیینہ بن حصن فزاری نے غطفان کو جمع کر کے کہا کہ جب سے ہمارے اور بنی اسد کے درمیان اختلاف برپا ہوا ہے ہمیں برابر نقصان ہی پہنچ رہا ہے میں اب دوستی کے پرانے معاہدے کی تجدید اور طلیحہ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔ واللہ! اپنے حلیف قبیلے کے نبی کی اطاعت کرنا ہمارے لیے قریش کے نبی کی اطاعت کرنے سے بہتر ہے۔ پھر محمدؐ وفات پا چکے ہیں اور طلیحہ زندہ ہے۔

عیینہ کی قوم نے اس کی بات تسلیم کر لی اور طلیحہ کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح مرتدین کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی اور ان قبائل میں جو مسلمان آباد تھے وہ بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے۔

مرتدین کو ابوبکرؓ کی دھمکی

مذکورہ بالا قبائل نے بزاخہ میں جمع ہو کر ارتداد کا اعلان کیا اور مدینہ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ابوبکرؓ نے دوسرے قبائل کی طرح اُن سے بھی جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور انھیں ایک خط بھیج کر یہ دھمکی دی کہ اگر وہ دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوئے تو اُن سے جنگ کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ خالد کو طلیحہ اور اُس کے بعد مالک بن نویرہ سے جنگ کرنے کا حکم ملا تھا چنانچہ وہ ان بستیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں قبیلہ طئی کے ایک سردار عدی بن حاتم زکوٰۃ لے کر مدینہ آئے۔ ابوبکرؓ نے انھیں بلایا اور ہدایت کی کہ وہ اپنے قبیلے میں جائیں اور مرتدین کو ڈرائیں کہ اگر وہ حالتِ ارتداد پر قائم رہے تو ان کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ ادھر خالد نے ذی القصہ پر بزاخہ کا قصد نہ کیا بلکہ اجأ کی طرف مڑ گئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ خیبر کی جانب جا رہے ہیں اور وہاں سے مزید کمک لے کر پھر بزاخہ کی طرف کوچ کریں گے۔

عدیؓ کی سعی و جہد

ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق عدی نے اپنے قبیلے میں پہنچ کر لوگوں کو سمجھایا بجھایا اور انھیں دوبارہ اسلام لانے کی تلقین کی لیکن لوگوں نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا اور کہا:

"ہم ابوالفصیل[1] کی اطاعت کبھی نہ کریں گے۔"

اس پر عدی نے اُن سے کہا:

"تمھاری جانب ایک ایسا لشکر بڑھا چلا آ رہا ہے جو تم پر ہرگز رحم نہ کرے گا اور قتل و غارت کا بازار اس طرح گرم کرے گا کہ کسی بھی شخص کو امان نہ مل سکے گی۔ میں نے تمھیں سمجھا دیا ہے آگے تم جانو تمھارا کام۔"

عدی نے مسلمانوں کی قوت و طاقت اور بہادری کا ذکر تفصیل سے کیا اور انھیں سمجھایا کہ ابوبکرؓ نے اپنے تمام مخالفین کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا تہیہ کر لیا ہے اس لیے تم

---

[1] ابوبکرؓ کے مخالفوں نے ان کی کنیت مذاقاً ابوالفصیل رکھ چھوڑی تھی۔

اصرار سے باز آجاؤ اور اسلام قبول کرلو ورنہ تمھارا انجام بہت برا ہوگا۔

عدی کی باتوں پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ وہ لوگ مشاہدہ کرچکے تھے کہ ابوبکرؓ نے اسلامی لشکر کے مدینہ سے سینکڑوں میل دور سرحد روم پر ہونے کے باوجود عبس، ذبیان اور ان کے مددگار قبائل کو بری طرح شکست دی تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خالدؓ بن ولید بہادری اور تندی و سختی میں ضرب المثل ہیں اور وہ اُن کا مقابلہ کسی صورت بھی نہ کرسکیں گے۔

بنی طئی کا دوبارہ قبولِ اسلام

عدی کی یہ باتیں سن کر بنو طئی نے باہم مشورہ کیا اور بالآخر طے پایا کہ عدی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے اور انھیں دوبارہ اسلام لانے کی دعوت دینے سے اُن کا مقصد ذاتی فائدہ حاصل کرنا نہیں بلکہ محض اپنی قوم کی خیر خواہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے عدی سے کہا:

"ہم آپ کا مشورہ قبول کرتے ہیں۔ آپ خالد بن ولید کے پاس جائیں اور انھیں ہم پر حملہ کرنے سے روک دیں۔ اِس عرصے میں ہم اپنے اُن بھائیوں کو بلانے کی کوشش کریں گے جو بزاخہ میں طلیحہ کے لشکر میں موجود ہیں کیونکہ ہمیں ڈر ہے، اگر ہم نے کھلم کھلا طلیحہ کی مخالفت کی تو وہ ہمارے اُن بھائیوں کو قتل کرادے گا۔"

عدی اپنی قوم کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ وہ فی الفور سنخ پہنچے اور خالدؓ سے جاکر کہا:

"آپ تین روز تک ٹھہر جائیں۔ اس عرصے میں آپ کے پاس پانچ سو بہادر جمع ہو جائیں گے جو دشمن کے مقابلے میں آپ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔ تین روز کا یہ انتظار اس امر سے بہتر ہے کہ آپ انھیں آگ میں دھکیل دیں اور خود ان کے جلنے کا تماشا دیکھیں۔"

خالدؓ بن ولید سے کوئی بات مخفی نہ تھی۔ وہ جنگی حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور جانتے تھے کہ اگر طئی کے آدمی طلیحہ کا ساتھ چھوڑ گئے تو اس کی قوت و طاقت میں معتدبہ کمی واقع ہو جائے گی

اور یہ بات مسلمانوں کے لیے بے حد مفید ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے بنی طئ کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ تین روز کے لیے ملتوی کر دیا۔ عدی دوبارہ اپنے قبیلے میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ قبیلے کے لوگوں نے طلیحہ کے لشکر میں اپنے آدمیوں کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ فوراً واپس آ جائیں کیونکہ مسلمانوں نے طلیحہ کے لشکر پر حملہ کرنے سے پہلے ان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا ہے اس لیے وہ آئیں اور اس حملے کو روکیں۔

یہ پیغام پہنچنے پر طلیحہ کو مطلق شبہ نہ ہوا اور اس نے بنی طئ کے لوگوں کو بڑی خوشی سے اپنے قبیلے کی طرف واپس جانے کی اجازت دے دی۔ قبیلے میں پہنچ کر ان کی بات چیت اپنے آدمیوں سے ہوئی اور بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد انھوں نے بھی عدی کی رائے سے اتفاق کر لیا چنانچہ تمام لوگ دوبارہ اسلام قبول کر کے عدی کے ہمراہ خالدؓ کے پاس پہنچ گئے۔

اب خالدؓ نے انسر کا قصد کیا کیونکہ ان کا ارادہ وہاں جا کر قبیلہ جدیلہ سے جنگ کرنے کا تھا۔ عدی نے پھر مداخلت کی اور کہا:

"قبیلہ طئ ایک پرندے کے مانند ہے اور جدیلہ قبیلہ طئ کا ایک پر ہے۔ آپ مجھے کچھ روز کی مہلت دیں۔ شاید اللہ جدیلہ کو بھی اسی طرح بچا لے جس طرح غوث کو بچایا ہے۔"

خالدؓ نے بڑی خوشی سے عدی کی درخواست منظور کر لی اور انھیں جدیلہ کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔ وہ وہاں گئے اور سمجھا بجھا کر انھیں بھی دوبارہ قبولِ اسلام پر آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ جدیلہ کے ایک ہزار سوار لے کر خالدؓ کے پاس پہنچ گئے۔ مؤرخین عدی کے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قبیلہ طئ نے عدی جیسا مدبر، عقل مند اور بابرکت انسان آج تک پیدا نہیں کیا، وہ اس قبیلے کے بہترین فرد تھے۔

مقابلے کے لیے طلیحہ کا اصرار

طئ اور جدیلہ کے دوبارہ قبولِ اسلام کی خبریں طلیحہ کو بزاخہ میں ملیں۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سن کر اُسے کس قدر گھبراہٹ ہوئی اور کس طرح اس کے سب عزائم پر اوس پڑ گئی۔ لیکن اس کے

باوجود اس نے ہمت نہ ہاری اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ طلیحہ تو شاید اس ارادے سے باز بھی آجاتا لیکن عیینہ بن حصن کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ عیینہ کو جو سات سو فزاریوں کے ساتھ طلیحہ کے لشکر میں موجود تھا، ابوبکرؓ سے سخت دشمنی تھی اور وہ مدینہ کی حکومت پر کاری ضرب لگانا چاہتا تھا۔

عیینہ وہی شخص ہے جو غزوہ احزاب کے موقع پر بنی فزارہ کا سردار تھا۔ اس غزوے کے دوران میں جب کفار کے تین لشکروں نے بنوقریظہ سے مل کر مدینہ پر زبردست حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے ایک لشکر کا سپہ سالار عیینہ تھا۔ غزوۂ احزاب میں کفار کی شکست کے بعد بھی اس نے مدینہ پر حملے کا ارادہ کیا لیکن رسول اللہؐ نے شہر سے نکل کر اس حملے کو روکا اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ غزوۂ ذی قرد کہلاتا ہے۔ گو بعد میں حالات سے مجبور ہو کر اسے اسلام قبول کرنا پڑا لیکن اس کا دل بدستور اسلام کے خلاف بغض و عداوت سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ابوبکرؓ کی حکومت کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے طلیحہ طئی اور جدیلہ کی جماعت اور ایک کثیر فوج سے محروم ہونے کے باوجود، اپنی نبوت سے نہ پھر سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو عیینہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اردگرد کے قبائل کو اس کے خلاف بھڑکا کر اس کی زندگی خطرے میں ڈال دے گا۔ اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بدستور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا رہے اور منتظر رہے کہ آئندہ کیا وقوع میں آتا ہے۔

طلیحہ کے خلاف پیش قدمی

قبیلۂ طئی کی دونوں شاخوں کو ساتھ ملانے کے بعد خالدؓ نے طلیحہ کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی اور عکاشہ بن محصن اور ثابت بن اقرم انصاری کو دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے لشکر سے آگے بھیجا۔ یہ دونوں عرب کے معزز ترین فرد اور بہادری میں ضرب المثل تھے۔ راستے میں ان دونوں کو طلیحہ کا بھائی حبال[1] مل گیا۔ انھوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ جب طلیحہ کو

---

[1] یہ کامل ابن اثیر کی روایت ہے لیکن طبری اور قاموس میں مذکور ہے کہ حبال سلمہ بن خویلد کا بیٹا تھا یعنی طلیحہ کا بھائی نہیں بھتیجا تھا۔

بھائی کے قتل کی خبر پہنچی تو وہ اپنے دوسرے بھائی سلمہ کو ساتھ لے کر ان دونوں کی تلاش میں نکلا۔ اور بالآخر انھیں پکڑ لیا۔ سلمہ نے ثابت کو تو مقابلے کی مہلت ہی نہ دی اور فوراً شہید کر ڈالا لیکن عکاشہؓ نہایت جواں مردی سے طلیحہ کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ طلیحہ کو مجبوراً اپنے بھائی سلمہ سے مدد لینی پڑی۔ ان دونوں نے مل کر عکاشہ کو بھی شہید کر دیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گئے۔

مسلمانوں میں اضطراب

خالد بن ولید لشکر لیے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے کہ لوگوں نے ان دونوں شہیدوں کی لاشیں میدان میں پڑی ہوئی دیکھیں۔ اس سے ان میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔ خالد نے یہی مناسب سمجھا کہ سر دست دشمن کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے ہیجان میں کمی ہو جائے اور وہ اپنی فوج کو بیش از بیش منظم کر کے زیادہ کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ وہ لشکر لے کر بنی طئی کی جانب لوٹ آئے اور عدی کی مدد سے لشکر کی تعداد میں مزید اضافے کی تدابیر شروع کر دیں۔ جب مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ ان کی تعداد اور قوت و طاقت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو وہ دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے چنانچہ خالد انھیں لے کر بزاخہ پہنچے

بنی طئی کا اظہارِ معذرت

قیس اور بنو اسد طلیحہ کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑائی کے لیے جمع تھے۔ بنی طئی کے کچھ لوگوں نے خالد سے درخواست کی کہ ہمیں بنی اسد کے مقابلے سے باز رکھا جائے کیونکہ وہ ہمارے حلیف ہیں البتہ قیس کے مقابلے میں ہم آپ کی ہر طرح امداد کر سکتے ہیں۔ خالد نے فرمایا:

"قیس بھی شان و شوکت اور قوت و طاقت میں بنو اسد سے کم نہیں لیکن میں تمھیں اختیار دیتا ہوں کہ تم کسی قبیلے سے چاہے لڑو چاہے نہ لڑو۔"

مگر عدی نے مومنانہ جذبے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"واللہ! حلیف ہونے کے باوجود مجھے کوئی چیز بنی اسد کا مقابلہ کرنے سے باز نہ رکھ سکے گی۔ جب انھوں نے دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیا تو وہ ہمارے

حلیف بھی نہ رہے۔ واللہ! اگر میرا اپنا خاندان بھی اسلام کی مخالفت کرے گا تو میں اس سے بھی جہاد کروں گا۔"
یہ سن کر خالدؓ نے کہا:
"ایک فریق سے لڑنا بھی جہاد ہی ہے۔ تم اپنے اہلِ قبیلہ کی رائے کی مخالفت نہ کرو بلکہ وہی کرو جس میں تمھارے قبیلے والوں کی خوشی ہو اور اسی قبیلے سے لڑائی کرو جس سے تمھارے قبیلے والے لڑنا چاہیں۔"
چنانچہ بنوطئی قبیلہ قیس سے لڑے اور باقی مسلمان بنو اسد سے۔

آغازِ جنگ اور فرارِ طلیحہ

طلیحہ کے لشکر کی کمان عیینہ بن حصن کر رہا تھا۔ خود طلیحہ خیمے میں کمبل اوڑھے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے وحی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب لڑائی کا بازار خوب گرم ہو گیا اور عیینہ کو خالدؓ اور مسلمانوں کی قوت کا پتا چلا تو وہ طلیحہ کے پاس آیا اور اس سے پوچھا:
"کیا جبریل آپ کے پاس کوئی وحی لائے؟"
اُس نے کہا "ابھی نہیں۔"
یہ سن کر وہ واپس چلا گیا اور لڑنے میں مشغول ہو گیا۔ جب لڑائی نے مزید شدت اختیار کی اور مسلمانوں کا دباؤ مرتدین پر برابر بڑھتا چلا گیا تو وہ پھر طلیحہ کے پاس آیا اور پوچھا:
"اب بھی جبریل کوئی وحی لائے یا نہیں؟"
طلیحہ نے وہی جواب دیا کہ ابھی نہیں۔ عیینہ نے جھنجھلا کر پوچھا:
"آخر کب تک آئے گی؟"
طلیحہ نے کہا:
"میری عرض تو ملاء اعلیٰ تک پہنچ چکی ہے۔ اب دیکھو کیا جواب ملتا ہے۔"
اس پر وہ پھر میدانِ جنگ میں آ گیا اور لڑنا شروع کر دیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ خالدؓ نے اس کے لشکر کا محاصرہ کر لیا ہے اور اب شکست کوئی دم کی بات ہے تو وہ گھبراہٹ کی حالت میں پھر طلیحہ کے

پاس آیا اور پوچھا:

"اب بھی کوئی وحی نازل ہوئی ہے یا نہیں؟"

طلیحہ نے جواب دیا "ہاں۔"

اس نے پوچھا "کیا؟"۔

طلیحہ نے جواب دیا "یہ وحی نازل ہوئی ہے: ان لک رحا کرحاہ وحدیثا لا تنساہ" (تیرے پاس بھی ویسی ہی چکی ہے جیسی مسلمانوں کے پاس ہے اور تیرا ذکر بھی ایسا ہے جسے تو کبھی نہ بھولے گا۔[1])

یہ سن کر عیینہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور چیخ اٹھا:

قد علم اللہ ان سیکون حدیثا لا تنساہ (بے شک اللہ کو معلوم ہے کہ عنقریب ایسے واقعات پیش آئیں گے جنھیں تو کبھی نہ بھولے گا)

اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف آیا اور پکار کر کہا:

"اے بنو فزارہ! طلیحہ کذاب ہے۔ اسے چھوڑ دو اور بھاگ کر جانیں بچاؤ۔"

یہ سن کر بنو فزارہ تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ باقی لشکر طلیحہ کے گرد جمع ہو گیا اور پوچھا کہ اب آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں۔ طلیحہ نے پہلے سے اپنے لیے ایک گھوڑے اور اپنی بیوی نوار کے لیے ایک اونٹ کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب اس نے لوگوں کو اس پریشانی کی حالت میں دیکھا تو وہ کود کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنی بیوی کو بھی سوار کر کے یہ کہتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا:

"جو شخص میری طرح اپنے اہل و عیال کو لے کر بھاگ سکے وہ بھاگ جائے۔"

طلیحہ کا دوبارہ قبولِ اسلام

اس طرح طلیحہ کی طاقت و قوت، جو اس نے ابوبکرؓ کے مقابلے میں جمع کی تھی، ملیامیٹ ہو گئی اور اس کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ بھاگ کر شام پہنچا اور وہاں بنو کلب میں سکونت اختیار کر لی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ان تمام قبائل نے جو اس سے پہلے اس کے حلقۂ اطاعت میں شامل تھے اسلام

[1] اہل عرب جنگ کو چکی سے تعبیر کرتے تھے۔ طلیحہ کا مطلب یہ تھا کہ تمھیں بھی ویسی ہی سخت جنگ در پیش ہے جیسی مسلمانوں کو، اور اس جنگ کے واقعات تمھیں کبھی نہ بھولیں گے۔

قبول کر لیا ہے تو وہ بھی اسلام لے آیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ عمرہ کرنے کے ارادے سے مکہ آیا۔ جب وہ مدینہ کے قریب سے گزرا تو بعض لوگوں نے ابوبکرؓ کو اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا:

"اب میں اس کے خلاف کیا کر سکتا ہوں۔ اس سے تعرض نہ کرو کیونکہ اللہ نے اسے ہدایت دے دی ہے۔"

جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو طلیحہ ان کی بیعت کرنے کے لیے آیا۔ اسے دیکھ کر عمرؓ نے فرمایا:

"تو عکاشہ اور ثابت کا قاتل ہے۔ میرا دل تیری طرف سے کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔"

اس نے جواب دیا:

"امیر المومنین! آپ کو ان دونوں کی طرف سے کیا فکر ہے؟ اللہ نے انھیں میرے ہاتھ سے عزت کے بلند مقام تک پہنچا دیا (شہادت دی) لیکن مجھے بھی ان کے ہاتھوں سے ذلیل نہ کرایا۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کی بیعت لے لی۔ پھر فرمایا:

"اے دغاباز! تیری کہانت کا کیا بنا؟"

اس نے جواب دیا:

"امیر المومنین! وہ ختم ہو گئی۔ ہاں، کبھی کبھی ایک دو پھونکیں مار لیتا ہوں۔"

عمرؓ سے رخصت ہو کر وہ اپنی قوم میں چلا آیا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ عراق کی جنگوں میں اس نے ایرانیوں کے مقابلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

عیینہ بن حصن میدان جنگ سے فرار ہو کر اپنی قوم بنو فزارہ میں پہنچ گیا اور اعلان کر دیا کہ طلیحہ کذاب اور بزدل ہے اور اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی بیوی کے ہمراہ فرار ہو گیا ہے۔

دوسرے مرتد قبائل کا استیصال

خالدؓ نے چشمۂ بناخہ پر کامل ایک مہینا قیام فرمایا۔ اس دوران میں وہ ان بقیہ قبائل کی سرکوبی میں

مصروف رہے جو ابھی تک ارتداد اور سرکشی پر قائم تھے اور ام زمل سے مل کر مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے ایسے لوگوں کو چن چن کر قتل کرادیا جن کے ہاتھ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے آلودہ تھے اور مرتدین کے متعدد سرآوردہ اشخاص کو، جو اسلامی فوجوں کے مقابلے کو نکلے تھے، گرفتار کر کے مدینہ بھجوا دیا۔ ان لوگوں میں سے مشہور شخص یہ تھے! قرہ بن ہبیرہ، فجاءۃ السلمی، ابو شجرہ بن عبدالعزی السلمی وغیرہ۔ یہ لوگ اس وقت تک حالتِ اسیری میں رہے جب تک ابوبکرؓ نے ان کے متعلق فیصلہ نہ سنا دیا۔

بقیہ مرتد قبائل

ام زمل اور طلیحہ کے لشکر کے مفرورین کا حال بیان کرنے سے قبل اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا کیا بنا جو طلیحہ کی قوم، بنی اسد کی طرح دوبارہ اسلام میں داخل نہ ہوئے ؟ کیا ان کی عقل یہ تقاضا نہ کرتی تھی کہ جب طلیحہ کا کذب ان پر ظاہر ہو گیا تھا تو وہ محمد رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لے آتے ؟ بات یہ ہے کہ اگرچہ سارے عرب کو رسول اللہ کے سامنے مجبوراً سرِ تسلیم خم کرنا پڑا لیکن درحقیقت وہ لوگ صدق دل سے آپ پر ایمان نہ لائے تھے۔ ان میں بہت سے لوگوں کو بتوں کی عبادت فضول معلوم ہوئی تو وہ ان کی پرستش چھوڑ کر اللہ کی عبادت کرنے لگے لیکن اس عبادت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ نے ان پر جو دوسرے فرائض عاید کر دیے وہ ان کے لیے بڑے تکلیف دہ تھے اور ان کی آزاد طبائع ان فرائض کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اسی لیے انھوں نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔ جب ابوبکرؓ کا زمانہ آیا تو ان لوگوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کر دیا کیونکہ مال کی محبت ان کے دلوں میں ہر چیز سے زیادہ رچی ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ نماز اور دوسرے فرائض اسلام سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ طلیحہ، مسیلمہ اور دوسرے مدعیانِ نبوت کی پیروی انھوں نے اسی لیے اختیار کی تھی کہ اپنی گردنوں سے وہ طوق اتار کر پھینک سکیں جو فرائض اور ارکانِ اسلام کی شکل میں ان کی گردنوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ چنانچہ طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے پر آمادہ نہ کر سکے اور دوسری جگہ جا کر خالد سے دوبارہ جنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی

کیونکہ ان کا خیال تھا وہ بالآخر ضرور فتح یاب ہوں گے اور ابوبکرؓ کو مجبور کر سکیں گے کہ فرائض اسلام کی بجاآوری میں ان پر اتنی سختی نہ کریں جتنی وہ اب کر رہے ہیں۔

لڑائی کے لیے دوبارہ تیار ہو جانے کا ایک سبب اور بھی تھا اور اس کا تعلق بدوؤں کی نفسیات سے ہے: ان قبائل اور مہاجرین و انصار کے درمیان پرانے جھگڑے چلے آ رہے تھے۔ جب رسول اللہ نے اُن پر غلبہ پا لیا تو انھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور آپ کے احکام کی بجاآوری پر بہ ظاہر رضامند ہو گئے لیکن یہ سب کچھ انھوں نے بہ حالتِ مجبوری اپنی مرضی کے خلاف محض اِس لیے کیا کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو چکے تھے۔ جونہی انھیں کچھ مہلت اور آزادی ملی وہ مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک لمحہ بھی سوچ بچار میں ضائع نہ کیا۔ انھیں جنگِ خندق کا واقعہ یاد تھا جب قریب تھا کہ مدینہ اپنے دروازے کفار کے لیے کھول دیتا اگر ایک سخت آندھی کافروں کے تمام منصوبے تہ و بالا کر کے نہ رکھ دیتی۔

بہ ظاہر مسلمان ہونے کے بعد یہ لوگ چپکے ہو رہے اور دیکھتے رہے کہ کیا ہونے والا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ کی وفات ہو گئی۔ پھر کیا تھا، یہ لوگ مرتد ہو گئے اور انھوں نے سارے ملک میں فساد برپا کر دیا۔ جب تک اسلامی فوجیں ان کی سرکوبی کے لیے پہنچیں انھوں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر اپنی جمعیت کو مضبوط تر کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ قسمت ضرور ان کا ساتھ دے گی اور وہ دوبارہ اُس آزادی و خود مختاری سے بہرہ ور ہو سکیں گے جس سے رسول اللہ کے عہد میں محروم ہو چکے تھے۔ اگر تمام قبائل اپنے اِس موقف پر مضبوطی سے قائم رہتے تو یقیناً خالدؓ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ آسانی سے مرتدین پر فتح نہ پا سکتے لیکن عدی بن حاتم کی کوششوں سے قبیلہ طئی کی دونوں شاخیں طلیحہ سے الگ ہو کر مسلمانوں سے مل گئیں۔ یہ دیکھ کر طلیحہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہی گھبراہٹ اور پریشانی اس کی شکست اور فرار کا موجب بنی۔

طلیحہ کے فرار ہونے کے بعد عیینہ بھی اپنے قبیلے میں جا کر بیٹھ رہا۔ اِس دوران میں بنو عامر جو طلیحہ کے طرف داروں میں سے تھے اور بزاخہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھے، اس انتظار میں رہے کہ دیکھیں کس فریق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے؟ جب خالدؓ نے بنو اسد اور غطفان کو شکست فاش دے دی

تو بنو عامر نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ اب ان کے لیے مسلمان ہو جانا ہی بہتر رہے گا ۔چنانچہ وہ بھی اسد، غطفان اور طئی کی طرح خالدؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔

قاتلوں پر خالدؓ کی سختی

خالدؓ نے غطفان، ہوازن، سلیم اور طئی کے لوگوں کی جان بخشی اس شرط پر کی تھی کہ وہ اُن کو ان کے حوالے کر دیں جنھوں نے ان غریب مسلمانوں کو قتل کیا تھا جو بہ زمانہ ارتداد ان کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ان کے سامنے پیش کیے گئے تو انھوں نے دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے ان کے سرداروں کے سوا باقی سب کو قتل کر دیا اور ان کی لاشیں آگ میں جلا دیں۔ اس کے بعد قرہ بن ہبیرہ، عیینہ بن حصن اور دوسرے سرداروں کو بیڑیاں پہنا کر ابوبکرؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی حسب ذیل مضمون کا ایک خط بھی ارسال کیا:

"بنو عامر ارتداد کے بعد اسلام لے آئے لیکن میں نے ان کی جان بخشی اس وقت تک نہ کی جب تک انھوں نے ان لوگوں کو میرے حوالے نہ کر دیا جنھوں نے غریب و بیکس مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ میں نے ایسے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس خط کے ساتھ قرہ بن ہبیرہ اور اس کے ساتھیوں کو روانہ کر رہا ہوں۔"

خالد کی روش پر ابوبکرؓ کی خوشنودی

خالدؓ نے جن لوگوں کو قتل مسلمانان کی پاداش میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا ان کی طرف سے ابوبکرؓ کے دل میں قطعاً رحم پیدا نہ ہوا بلکہ انھوں نے ان دشمنانِ اسلام اور دشمنان رسولؐ کو اس سزا کا فی الواقع مستحق سمجھا اور خالدؓ کو جواب میں لکھا:

"اللہ تمھیں اپنے انعامات سے بہرہ ور کرتا رہے۔ میری یہ نصیحت ہے کہ تم اپنے معاملات میں ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ تقویٰ کی راہ پر چلو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے اور اس کے بندوں پر احسان

کرتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں بڑھ چڑھ کر کام کرو اور کبھی سستی نہ برتو۔ ہر اس شخص کو جس نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو، قابو پانے کے بعد قتل کر دو۔ دوسرے لوگوں کے متعلق بھی، جنھوں نے اللہ سے دشمنی اور سرکشی اختیار کر کے اس کے احکام کی خلاف ورزی کی اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ ان کا قتل کر دینا مناسب ہے تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔"

ابوبکرؓ کا یہ خط خالدؓ کے پاس پہنچا تو انھوں نے مرتدین کو مرعوب کرنے کی پالیسی پر اور زور شور سے عمل شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک مہینے تک وہ بزاخہ کے چشمے پر مقیم رہ کر مرتدین کا قافیہ تنگ کرتے رہے۔

مرتد قیدیوں کو ابوبکرؓ کی معافی

لیکن خالدؓ کے برعکس ابوبکرؓ نے ان قیدیوں پر سختی نہ کی جو میدان جنگ سے پا بجولاں مدینہ پہنچے تھے۔ عیینہ بن حصن مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا اور طلیحہ کی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں سے جنگ کر چکا تھا۔ وہ قرہ بن ہبیرہ کے ساتھ قید ہو کر مدینہ آیا۔ اس کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ مدینہ کے لڑکے اُسے کھجور کی شاخوں سے مارتے اور کہتے تھے:

"اے اللہ کے دشمن! تو ہی ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا تھا؟"

عیینہ جواب دیتا:

"میں تو کبھی اللہ پر ایمان نہیں لایا۔"

لیکن اس کے باوجود ابوبکرؓ نے اس کی جان بخشی کر دی اور اُسے کچھ نہ کہا۔

قرہ بن ہبیرہ

قرہ بن ہبیرہ بنو عامر سے تعلق رکھتا تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد عمرو بن عاص عمان سے مدینہ آتے ہوئے راستے میں اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ اس وقت بنو عامر ارتداد کے لیے پر تول رہے تھے۔ جب عمرو بن عاص نے وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو قرہ نے علیحدگی میں ان سے مل کر کہا:

"عرب تمھیں تاوان (زکواۃ) دینے پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ اگر تم ان کے اموال انھیں کے پاس رہنے دو اور ان پر زکواۃ عاید نہ کرو تو وہ تمھاری باتیں ماننے اور اطاعت قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے انکار کیا تو پھر وہ ضرور تمھارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔"

یہ سن کر عمروؓ بن عاص نے جواب دیا:

"اے قرہ! کیا تو کافر ہو گیا ہے اور ہمیں عربوں کا خوف دلاتا ہے؟"

جب قرہ اسیر ہو کر مدینہ آیا اور ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو اُس نے کہا:

"اے خلیفہ رسول اللہ! میں تو مسلمان ہوں اور میرے اسلام پر عمروؓ بن عاص گواہ ہیں۔ وہ مدینہ آتے ہوئے ہمارے قبیلے میں سے گزرے تھے۔ میں نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا تھا اور بڑی خاطر تواضع کی تھی۔"

ابوبکرؓ نے عمروؓ بن عاص کو بلایا اور ان سے قرہ کی باتوں کی تصدیق چاہی۔ عمروؓ بن عاص نے سارا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ جب وہ زکواۃ کی بات پر پہنچے تو قرہ کہنے لگا:

"عمروؓ بن عاص! اس بات کو جانے دو۔"

عمروؓ بن عاص نے کہا:

"کیوں؟ واللہ! میں تو سارا حال بیان کروں گا۔"

جب وہ بات ختم کر چکے تو ابوبکرؓ مسکرائے اور قرہ کی جان بخشی کر دی۔

علقمہ بن علاثہ

عفو و درگزر کی یہ پالیسی ابوبکرؓ کی جانب سے کمزوری کی آئینہ دار نہ تھی بلکہ اس سے صرف وہ جوش و خروش اس انداز سے سرد کرنا مقصود تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کا فائدہ ہو۔ لیکن جہاں معاملہ رسول اللہ کی رسالت تک پہنچتا تھا وہاں ابوبکرؓ کسی قسم کی نرمی ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے چند مثالیں کافی ہوں گی۔

بنی کلب کے ایک شخص علقمہ بن علاثہ نے رسول اللہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا

تھا لیکن آپ کی زندگی ہی میں مرتد ہو گیا اور شام چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ اپنے قبیلے میں واپس آیا اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ ابوبکرؓ نے خبر پا کر قعقاع بن عمرو کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا لیکن مقابلے کی نوبت آنے سے پیشتر ہی علقمہ فرار ہو گیا۔ اس کی بیوی، بیٹیاں اور دوسرے ساتھی اسلام لے آئے اور اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بعد میں علقمہ بھی تائب ہو کر ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اس کی توبہ قبول کر لی اور جان بخشی کر دی کیونکہ اس نے نہ مسلمانوں سے جنگ کی تھی اور نہ کسی مسلمان کو قتل کیا تھا۔

فجاءہ ایاس

لیکن اس کے مقابل انھوں نے فجاءہ ایاس بن عبد یالیل کے عذرات قبول نہ کیے اور نہ اس کی جان بخشی ہی کی۔ یہ شخص ابوبکرؓ کے پاس آیا اور ان سے عرض کی کہ آپ مجھے کچھ ہتھیار دیجیے، میں جس مرتد قبیلے سے آپ چاہیں گے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے اسے ہتھیار دے کر ایک قبیلے سے لڑنے کا حکم دیا۔ لیکن فجاءہ نے وہ ہتھیار قبیلہ سلیم، عامر اور ہوازن کے مسلمانوں اور مرتدین دونوں کے خلاف استعمال کیے اور کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ اس پر ابوبکرؓ نے طریفہ بن حاجز کو ایک دستے کے ہمراہ فجاءہ کی جانب بھیجا۔ لڑائی میں فجاءہ گرفتار ہوا اور طریفہ اسے اپنے ہمراہ مدینہ لے آئے۔ ابوبکرؓ نے اسے جلا دینے کا حکم دیا۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فجاءہ مسلمانوں کو قتل نہ کرتا تو اسے اتنی ہولناک سزا نہ دی جاتی جس پر بعد میں ابوبکرؓ کو افسوس بھی ہوا۔

ابو شجرہ

اسی ضمن میں ابو شجرہ بن عبد العزیٰ کا واقعہ بیان کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ واقعہ عیینہ، قرہ اور علقمہ کے واقعات سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ ابو شجرہ، مشہور شاعرہ خنساء کا بیٹا تھا جس نے اپنے بھائی صخر کی یاد میں بڑے دل دوز مرثیے کہے ہیں۔ ابو شجرہ

بھی اپنی والدہ کی طرح شاعر تھا۔ وہ مرتدین سے مل گیا اور ایسے شعر کہنے لگا جن میں اپنے ساتھیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا اور ان سے لڑنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ چنانچہ منجملہ اور اشعار کے اُس کا ایک شعر یہ بھی تھا :

فرویت رمحی من کتیبۃ خالد　　　وانی لارجو بعدھا ان اعمرا

(مَیں نے اپنا نیزہ خالدؓ کے لشکر کے خون سے سیراب کر دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی میں اِسی طرح کرتا رہوں گا۔)

لیکن جب اس نے دیکھا کہ خالد کے خلاف اس کی ترغیب و تحریص بار آور ثابت نہیں ہوتی اور لوگ برابر اسلام قبول کر رہے ہیں تو وہ بھی اسلام لے آیا۔ ابوبکرؓ نے اس کی بھی جان بخشی کر دی اور اسے معاف کر دیا۔

عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ ابو شجرہ ان کے پاس آیا۔ وہ اُس وقت زکوٰۃ کا مال غرباء میں تقسیم کر رہے تھے۔ ابو شجرہ نے کہا :

"امیر المومنین! مجھے بھی کچھ دیجیے کیونکہ میں حاجت مند ہوں۔"

عمرؓ نے پوچھا : "تو کون ہے؟"

جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ ابو شجرہ ہے تو فرمایا :

"اسے اللہ کے دشمن! کیا تو وہی نہیں جس نے کہا تھا :

فرویت رمحی من کتیبۃ خالد　　　وانی لارجو بعدھا ان اعمرا

اس کے بعد انھوں نے اسے دُرّے مارنے کا حکم دیا مگر وہ بھاگ کر اونٹنی پر سوار ہوا اپنی قوم بنو سلیم میں آ گیا۔

اُمِ زمل کا خروج

جب لوگوں میں یہ خبریں مشہور ہوئیں کہ ابوبکرؓ بالعموم ایسے لوگوں کے متعلق عفو و درگزر سے کام لے رہے ہیں جو مرتد ہونے کے بعد اسلام لے آتے ہیں تو ان قبائل کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو گیا جنھوں نے طلیحہ کی مدد کی تھی اور وہ بھی رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن غطفان طی، سلیم اور

ہوازن کے بعض لوگ جنھوں نے بزاخہ میں خالدؓ کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، بھاگ کر ام زمل سلمیٰ بنت مالک کے پاس پہنچے اور وعدہ کیا کہ اس کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور جانیں قربان کر دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے۔ لاریب یہ مفرورین اتنے آتش زیر پا تھے کہ مسلمانوں کے خلاف ان کا جوش و خروش نہ ان کی عبرت ناک شکست ٹھنڈا کر سکی اور نہ ابوبکرؓ کا عفو و درگزر ان پر کچھ اثر کر سکا اور وہ ایک بار پھر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئے۔ اگر مسلمانوں سے ان کی نفرت اور ان کے خلاف سخت غیظ و غضب کا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن نہ ہوتا تو طلیحہ کے بزدلانہ فرار اور اس کے کذب و افترا کا حال ظاہر ہو جانے کے بعد وہ ضرور خالدؓ کی اطاعت قبول کر لیتے۔ ام زمل بھی مسلمانوں سے خار کھائے بیٹھی تھی اور اس کے دل پر ایک ایسا چرکا لگا ہوا تھا جو مرورِ زمانہ کے باوجود مندمل نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے طبعی امر تھا کہ بزاخہ کا شکست خوردہ لشکر ام زمل کے پاس جمع ہوتا اور اپنے مقتولین کا انتقام لینے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا۔

ام زمل ام قرفہ کی بیٹی تھی جو رسول اللہؐ کے زمانے میں قتل کر دی گئی تھی۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ زید بن حارثہؓ بنی فزارہ کی جانب گئے۔ وادی القریٰ میں اُن کا سامنا بنی فزارہ کے چند لوگوں سے ہوا۔ انھوں نے زید کے ساتھیوں کو تو قتل کر دیا اور خود انھیں گہرا زخم پہنچایا۔ وہ اسی حالت میں مدینہ پہنچے۔ ان کے زخم مندمل ہونے پر رسول اللہؐ نے انھیں ایک لشکر کے ہمراہ دوبارہ بنی فزارہ کی جانب روانہ فرمایا۔ اس مرتبہ زید کے لشکر کو کامیابی ہوئی۔ بنی فزارہ کے اکثر آدمی قتل یا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ان قیدیوں میں ام قرفہ فاطمہ بنت بدر بھی تھی۔ چونکہ اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر انھیں مقابلے کے لیے تیار کیا تھا اس لیے اس جرم کی پاداش میں اُسے قتل کر دیا گیا اور اس کی بیٹی ام زمل کو لونڈی بنا لیا گیا۔ یہ عائشہ صدیقہؓ کے حصے میں آئی لیکن انھوں نے اسے آزاد کر دیا۔ کچھ عرصے تک تو یہ عائشہؓ ہی کے پاس رہی پھر اپنے قبیلے میں واپس چلی آئی۔ والدہ کے قتل نے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی چنانچہ وہ اس انتظار میں رہی کہ موقع ملنے پر مسلمانوں سے اس قتل کا بدلہ لے۔ فتنۂ ارتداد نے اس کے لیے یہ موقع جلد بہم پہنچا دیا اور وہ بزاخہ کے ہزیمت

خوردہ لشکر کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے بالمقابل میدان میں نکل آئی۔

اس کی والدہ ام قرفہ اپنی قوم میں بڑی عزت اور شان کی مالک تھی۔ وہ عیینہ بن حصن کی چچی اور مالک بن حذیفہ کی بیوی تھی۔ اس کے بیٹوں کا شمار بھی بنی فزارہ کے معزز ترین افراد میں ہوتا تھا۔ اس کے پاس ایک جنگی اونٹ تھا جس پر سوار ہو کر وہ دوسرے قبائل سے لڑنے کے لیے اپنی قوم کے آگے چلا کرتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ اونٹ ام زمل کے حصے میں آیا۔

عزت و افتخار میں ام زمل بھی اپنی والدہ کی ہم پلہ تھی اور اس کا مرتبہ بھی اپنی قوم میں وہی تھا جو اس کی والدہ کا تھا جب ابوبکرؓ اور خالدؓ کے مقابلے میں شکست کھانے والے مفرورین ام زمل کے گرد جمع ہو لیے تو اس نے ان کی ہمت بندھا کر انھیں ایک بار پھر خالدؓ کی فوج سے ٹکر لینے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہوتے گئے اور اس کی قوت و طاقت میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ جب خالد کو اس کا پتا چلا تو وہ بزاخہ سے اس لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔

ام زمل کی شکست

دونوں فوجیں میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئیں اور لڑائی شروع ہو گئی۔ ام زمل اونٹ پر سوار اشتعال انگیز تقریروں سے برابر فوج کو جوش دلا رہی تھی۔ مرتدین بھی بڑی بہادری سے جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ ام زمل کے اونٹ کے گرد سو اونٹ اور تھے۔ جن پر بڑے بڑے بہادر سوار تھے اور وہ بڑی پامردی سے ام زمل کی حفاظت کر رہے تھے۔

مسلمان شہسواروں نے ام زمل کے پاس پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اس کے محافظوں نے ہر بار انھیں پیچھے ہٹا دیا۔ پورے سو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد مسلمان ام زمل کے اونٹ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور ام زمل کو نیچے گرا کر قتل کر ڈالا۔ اس کے ساتھیوں نے جب اس کے اونٹ کو گرتے اور اسے قتل ہوتے دیکھا تو ان کی ہمت نے جواب دے دیا اور بد حواس ہو کر بے تحاشا میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ اس طرح اس فتنے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی اور جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرقی حصے

میں ارتداد کا خاتمہ ہوگیا۔

جنوبی حصّے کے مرتدین

ابوبکرؓ نے جس اولوالعزمی سے شمال مشرقی عرب کی بغاوتوں کو فرو کیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ باقی حصّے اس سے عبرت حاصل کرتے اور اسلامی حکومت کی مخالفت سے باز آجاتے۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ ابوبکرؓ کے بھیجے ہوئے لشکر انتہائی نامساعد حالات میں بھی دارالخلافہ سے سینکڑوں میل دور جانے اور دشمن کو زیر کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ انھیں خالدؓ بن ولید کی فتح یابی اور طلیحہ کے انجام کی بھی تمام خبریں معلوم ہو چکی تھیں۔ لیکن ان سب امور کے باوجود انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اصل میں ان کا خیال تھا کہ اگر قریش کا ایک شخص نبوّت کا دعویٰ کر کے کامیابی حاصل کر سکتا ہے تو دوسرے قبائل کے لوگ کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن ان قبائل اور مدعیانِ نبوت نے یہ حقیقت فراموش کر دی تھی کہ رسولؐ اللہ کا مقصدِ اولیں اپنی قوم کو توحید کی طرف بلانا تھا، اپنے لیے اقتدار حاصل کرنا اور کسی صلے یا انعام کا مطالبہ کرنا نہ تھا۔ توحید کی تبلیغ کے نتیجے میں تیئیس سال تک آپ کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ مکہ والوں نے آپ سے دشمنی کا برتاؤ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ آپ کو قتل کرنے کے مشورے کیے گئے اور بالآخر آپ کو مکہ سے نکل کر مدینہ کی جانب ہجرت کرنی پڑی۔ وہاں بھی مکہ والوں نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور بار بار مدینہ پر فوج کشی کی۔ انتہائی جدوجہد کے بعد آخرکار رسولؐ اللہ کی مساعی بار آور ہوئیں اور عرب کثرت سے آپ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے لگے لیکن مدعیانِ نبوّت کی نظروں سے یہ تمام حقائق اوجھل ہو گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر محمدؐ اپنی قوم کی سخت مخالفت کے باوجود کامیاب ہو سکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں ہو سکتے جب ان کی قوم پوری طرح ان کے ساتھ ہے۔ مگر انھیں یہ یاد نہ رہا کہ محمدؐ لوگوں کو دینِ حق کی تبلیغ کرتے تھے اور ان مدعیانِ نبوت کا سارا کاروبار ہی کذب و افترا، کی بنیادوں پر قائم تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حالت میں کیونکر کامیاب ہو سکتے تھے؟

شمالی حصّے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ابوبکرؓ نے جنوبی حصے پر توجہ مبذول

کی جہاں کے لوگ بہ دستور حالتِ ارتداد پر قائم تھے اور کسی طرح بھی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے اور انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے ابوبکرؓ نے خالد کو بزاخہ سے بطاح اور وہاں سے یمامہ جانے کا حکم دیا۔

(۸)

سجاح اور مالک بن نویرہ

بنو عامر اور ان کے مسکن

عرب کے جنوبی حصے میں بنی تمیم کے قبائل بنی عامر کے قریب ہی آباد تھے۔ یہ قبائل مدینہ سے جانب شرق خلیج فارس تک پھیلتے چلے گئے تھے اور شمال مشرق میں ان کی حدود دریائے فرات کے دہانے تک تھیں۔ بنو تمیم کو عہد جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں میں قبائل عرب کے درمیان خاص مقام حاصل تھا۔ یہاں کے لوگ شجاعت اور سخاوت میں مشہور تھے اور شاعری اور فصاحت و بلاغت میں بھی یہ دوسرے قبائل سے کسی طرح کم نہ تھے۔ چنانچہ اب تک تاریخ اور ادب کی کتابوں میں اس قبیلے کی شاخوں: بنی حنظلہ، دارم، بنی مالک اور بنی یربوع کے کارناموں کا ذکر محفوظ چلا آتا ہے۔

ادائے زکوٰۃ سے انکار

چونکہ یہ قبائل دریائے فرات اور خلیج فارس تک آباد تھے۔ اس لیے ایرانیوں سے بھی ان کا تعلق تھا۔ یہ لوگ زیادہ قبر پرست تھے اگرچہ ان میں سے بہت سے عیسائی بھی ہو گئے تھے۔ دوسرے قبائل کی طرح یہ بھی مسلمانوں کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسی لیے جب رسول اللہ نے اپنے محصلین کو ان قبائل سے جزیہ وصول کرنے کی غرض سے بھیجا تو سب سے پہلے بنو تمیم نے جزیہ دینے سے انکار کیا اور بنو العنبر تو تلواریں اور نیزے لے کر محصل کا استقبال کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ رسول اللہ نے عیینہ بن حصن کو ان کی طرف بھیجا جنہوں نے ان قبائل کو بزور مطیع کیا اور کئی لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے آئے۔ اس پر ان کا ایک وفد مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا۔ اس وقت رسول اللہ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ ان لوگوں نے بہ آواز

بلند اپنی شرافت، عزّت اور حسب و نسب کا واسطہ دے کر اور جنگ حنین کے واقعات کا ذکر کر کے اپنے قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسول اللہؐ ان کی آوازیں سن کر باہر تشریف لے آئے۔ انھوں نے کہا "ہم آپ سے فخر و مباہات میں مقابلہ کرنے کے لیے آئے ہیں" لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا خطیب ان کے خطیب سے زیادہ فصیح و بلیغ، مسلمانوں کا شاعر ان کے شاعر سے زیادہ سحر بیان اور مسلمانوں کی گفتگو ان کی گفتگو سے زیادہ شیریں ہے تو یہ لوگ اسلام لے آئے۔ رسول اللہؐ نے ان کے قیدی رہا کر دیے اور یہ انھیں اپنے ہمراہ لے کر خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

رسول اللہؐ نے بنی تمیم کی مختلف شاخوں کے لیے مختلف امیر مقرر فرمائے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا جو بنی یربوع کا سردار تھا۔ جب ان عمال نے رسول اللہؐ کی خبر وفات سنی تو ان میں اختلاف پیدا ہوا کہ آیا ابوبکرؓ کی خدمت میں زکوٰۃ بھیجی جائے یا خاموشی اختیار کی جائے۔ اس اختلاف نے یہاں تک شدت اختیار کی کہ آپس ہی میں سخت لڑائی ہونے لگی۔ ایک فریق مدینہ کا تسلط قبول کرنے کو تیار تھا لیکن دوسرے فریق کو اس سے انکار تھا اور وہ ابوبکرؓ کو زکوٰۃ بھیجنے پر آمادہ نہ تھا۔ مالک بن نویرہ مؤخر الذکر فریق سے تعلق رکھتا تھا۔

تمیم میں سجاح کا ورود

ابھی ان عمال میں یہ اختلاف برپا ہی تھا کہ سجاح بنت حارث عراق کے علاقے الجزیرہ سے اپنے قبیلے تغلب کے ہمراہ وہاں پہنچی۔ تغلب کے علاوہ اس کے ساتھ ربیعہ، نمر، ایاد اور شیبان کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر بھی تھا۔ سجاح اصل میں بنی تمیم کی شاخ بنو یربوع سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کی ننھیال عراق کے قبیلہ تغلب میں تھی۔ اس کی شادی بھی بنو تغلب ہی میں ہوئی تھی اور یہ وہیں رہتی تھی۔ یہ بڑی ذکی اور فہیم عورت تھی اور اسے کہانت کا دعویٰ بھی تھا۔ لوگوں کی قیادت اور رہبری کا فن اسے خوب آتا تھا۔ جب اسے رسول اللہؐ کی خبرِ وفات ملی تو اس نے نواحی قبائل کا دورہ کیا اور انھیں مدینہ پر حملہ بولنے کے لیے آمادہ کرنے لگی۔

سجاح کے آنے کی غرض

بعض مؤرخین کہتے ہیں اور اپنے خیال میں وہ درست کہتے ہیں کہ سجاح کسی ذاتی لالچ اور کہانت کا کاروبار وسیع کرنے کے لیے شمالی عراق سے سرزمین عرب میں وارد نہ ہوئی تھی بلکہ اصل میں وہ عراق کے ایرانی عمال کی انگیخت پر یہاں آئی تھی تاکہ فتنہ وفساد پھیلا سکے اور اس شورش سے فائدہ اٹھا کر اہلِ ایران اپنے روبہ انحطاط اقتدار کو سنبھالا دے سکیں جو یمن میں دربارِ ایران کے مقرر کردہ ایک عامل بدہان کے اسلام لانے کے بعد سے گرنا شروع ہو گیا تھا۔

مذکورہ بالا مؤرخین اپنی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سجاح واحد عورت تھی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس جیسی ہوشیار اور ذکی و فہیم عورتیں ہی اکثر اوقات جاسوسی اور لوگوں کو ورغلانے اور پھسلانے کے کام پر مامور کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ عرب میں اس وقت تک ٹھہری رہی جب تک اس کی کوششوں سے فتنہ وفساد اور بغاوت کی آگ پورے زور سے نہ بھڑک اٹھی۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو یہ عراق واپس چلی آئی اور بقیہ عمر سکون واطمینان سے بسر کی۔

ایرانیوں کی سرشت کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے اسے بلادِ عرب میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کے لیے آلۂ کار بنایا ہو اور یہ خیال کیا ہو، بجائے اس کے کہ عرب پر چڑھائی کرنے کے لیے ایرانی فوج روانہ کی جائے، اس ہوشیار عورت کے ذریعے سے خود عربوں کو ایک دوسرے سے بھڑا کر ان کی طاقت ختم کر دی جائے تاکہ کسی محنت ومشقت کے بغیر جزیرہ نما پر دوبارہ تسلط بٹھا سکیں۔

بنی تمیم کا طرزِ عمل

سجاح ان عوامل سے متاثر ہو کر جزیرہ عرب میں داخل ہوئی۔ یہ طبعی امر تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم بنو تمیم میں پہنچی۔ بنی تمیم کا اس وقت جو حال تھا۔ وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ایک گروہ زکوٰۃ ادا کرنے اور خلیفۂ رسول اللہ کی اطاعت کرنے پر آمادہ تھا لیکن دوسرا فریق اس کی سخت مخالفت

کر رہا تھا۔ ایک تیسرا فریق تھا جس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

اس اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ بنو تمیم نے آپس ہی میں لڑنا اور جدال و قتال کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثنار میں ان قبائل نے سجاح کے آنے کی خبر سنی اور انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ سجاح مدینہ پہنچ کر ابوبکرؓ کی فوجوں سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پھر تو اس اختلاف نے مزید وسعت اختیار کر لی۔

سجاح اس ارادے سے بڑھی چلی آ رہی تھی کہ وہ اپنے عظیم الشان لشکر کے ہمراہ اچانک بنو تمیم میں پہنچ جائے گی اور اپنی نبوت کا اعلان کر کے انھیں اپنے آپ پر ایمان لانے کی دعوت دے گی۔ سارا قبیلہ بالاتفاق اس کے ساتھ ہو جائے گا اور عیینہ کی طرح بنو تمیم بھی اس کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ بنو یربوع کی نبیہ، قریش کے نبی سے بہتر ہے کیونکہ محمدؐ وفات پا گئے اور سجاح زندہ ہے۔ اس کے بعد وہ بنو تمیم کو ہمراہ لے کر مدینہ کی طرف کوچ کرے گی اور ابوبکرؓ کے لشکر سے مقابلے کے بعد فتح یاب ہو کر مدینہ پر قابض ہو جائے گی۔

سجاح اور مالک بن نویرہ

سجاح اپنے لشکر کے ہمراہ بنو یربوع کی حدود پر پہنچ کر ٹھہر گئی اور قبیلے کے سردار مالک بن نویرہ کو بلا کر مصالحت کرنے اور مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔۔۔ مالک نے صلح کی دعوت تو قبول کر لی لیکن اسے مدینہ پر چڑھائی کے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ مدینہ پہنچ کر ابوبکرؓ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے قبیلے کے مخالف عنصر کا صفایا کر دیا جائے۔ سجاح کو بھی یہ بات پسند آئی اور اس نے کہا:

"جو تمھاری مرضی۔ میں تو بنی یربوع کی ایک عورت ہوں۔ جو تم کہو گے وہی کروں گی۔"

مالک بن نویرہ کے اوصاف

سجاح اپنے ارادے سے فوراً کس طرح باز آ گئی اور مالک کی رائے کو بے پس و پیش کیونکر قبول

کر لیا؟ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو سجاح کی رائے کی اس فوری تبدیلی کے راز سے پردہ اٹھا سکے۔ البتہ روایات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مالک اپنے قبیلے کا نہایت معزز اور صاحب اثر شخص تھا، اعلیٰ درجے کا شہسوار اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تکبر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی زلفیں لمبی لمبی اور خوبصورت تھیں۔ شیریں مقال نہایت حسین مکھ اور آداب مجالس سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کا بھائی متمم بن نویرہ اگرچہ شعر گوئی میں اس کے ہم پلہ تھا لیکن صورت کے لحاظ سے دونوں بھائیوں میں بعد المشرقین تھا۔ جہاں مالک انتہائی خوش شکل اور وجیہہ تھا وہاں متمم بن نویرہ انتہائی بدصورت اور کانا تھا۔ ایک مرتبہ عرب کے ایک قبیلے نے چھاپا مار کر متمم بن نویرہ کو گرفتار کر لیا اور اپنے قبیلے میں لے جا کر اسے رسیوں سے جکڑ دیا۔ جب مالک کو یہ خبر ملی تو وہ اونٹنی پر سوار ہو کر اس قبیلے میں جا پہنچا اور لوگوں میں گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے اس خوبی سے ان کے دل لبھائے کہ انھوں نے متمم کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا۔ زمانۂ جاہلیت میں بنو تغلب نے بھی متمم کو قید کر لیا تھا۔ مالک اس کا فدیہ ادا کرنے کے لیے وہاں پہنچا۔ وہ لوگ اس کے حسن و جمال کے بے حد متحیر ہوئے۔ وہاں بھی مالک اپنی خوش گفتاری اور شیریں زبانی سے ان کے دل لبھانے میں کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے متمم کا فدیہ لینے سے انکار کر دیا اور اسے فوراً چھوڑ دیا چنانچہ وہ رہا ہو کر اپنے قبیلے میں آ گیا۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ سجاح بھی مالک کی خوش گفتاری اور مردانہ خوبصورتی سے متاثر ہو گئی ہو اور اس کے کہنے سے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ فسخ کر دیا ہو۔

سجاح نے مالک کے علاوہ بنو تمیم کے دوسرے سرداروں کو بھی مصالحت کی دعوت دی۔ لیکن وکیع کے سوا کسی نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ اس پر سجاح نے مالک، وکیع اور اپنے لشکر کے ہمراہ دوسرے سرداروں پر دھاوا بول دیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں جانبین کے کثیر التعداد آدمی قتل ہوئے اور ایک ہی قبیلے کے لوگوں نے ایک دوسرے کو گرفتار کر لیا۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد مالک اور وکیع نے یہ محسوس کیا کہ انھوں نے اس عورت کی اتباع کر کے سخت غلطی کی ہے۔ اس پر انھوں نے دوسرے سرداروں سے مصالحت کر لی اور ایک دوسرے کے قیدی واپس کر دیے۔ اس طرح قبیلہ تمیم میں امن قائم ہو گیا۔

سجاح کی شکست

اب یہاں سجاح کی دال گلنی مشکل تھی۔ اس نے بنو تمیم سے بوریا بستر اٹھایا اور مدینہ کی جانب کوچ کر دیا۔ نباج کی بستی پر پہنچ کر اوس بن خزیمہ سے اس کی مٹ بھیڑ ہوئی جس میں سجاح نے شکست کھائی اور اوس بن خزیمہ نے اِس شرط پر اُسے واپس جانے دیا کہ اس امر کا پختہ اقرار کرے، وہ کبھی مدینہ کی جانب پیش قدمی نہ کرے گی۔

اِس واقعے کے بعد اہلِ جزیرہ کی فوج کے سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور انھوں نے سجاح سے کہا:

"اب آپ ہمیں کیا حکم دیتی ہیں؟ مالک اور وکیع نے اپنی قوم سے صلح کر لی ہے۔ نہ وہ ہمیں مدد دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس بات پر رضامند کہ ہم ان کی سرزمین سے گزر سکیں۔ ان لوگوں سے بھی ہم نے یہ معاہدہ کیا ہے اور مدینہ جانے کے لیے ہماری راہ مسدود ہو گئی ہے۔ اب بتائیے ہم کیا کریں۔"

سجاح نے جواب دیا:

"اگر مدینہ جانے کی راہ مسدود ہو گئی ہے تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں، تم یمامہ چلو۔"

انھوں نے کہا:

"اہلِ یمامہ شان و شوکت میں ہم سے بڑھے ہوئے ہیں اور مسیلمہ کی طاقت و قوت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔"

ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب اس کے لشکر کے سرداروں نے سجاح سے آئندہ اقدام کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا:

علیکم بالیمامہ، ودفوا دفیف الحمامہ، فانہا غزوۃ صرامہ لا یلحقکم بعد ھا ندامہ۔

(یمامہ چلو۔ کبوتر کی طرح تیزی سے ان پر جھپٹو۔ وہاں ایک زبردست جنگ پیش

آئے گی جس کے بعد تمھیں پھر کبھی ندامت نہ اٹھانی پڑے گی۔"

یہ مسجع و مقفیٰ عبارت سننے کے بعد، جسے اس کے لشکر والے وحی خیال کرتے تھے، انھیں اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے کس مقصد کے لیے یمامہ کا قصد کیا جب خود اسے اپنی قوم بنو تمیم میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد مدینہ کی جانب کوچ کرتے ہوئے اوس بن خزیمہ کے ہاتھوں اسے شکست اٹھانی پڑی تھی۔ کیا اس کے لشکر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان ناکامیوں کو دیکھنے کے بعد اسے یمامہ نہ جانے کا مشورہ دیتا؟ یا یہ خیال کیا جائے، اس کی خرافات پر ان لوگوں کو اس درجہ یقین تھا کہ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اس کی باتوں کو وحی خیال کرتے اور نہایت فرماں برداری سے اس کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل میں کوئی دقیقۂ سعی فروگذاشت نہ کرتے تھے؟

سجاح اور مسیلمہ کی شادی

سچ تو یہ ہے کہ سجاح کا سارا قصہ ہی عجائب و غرائب کا مجموعہ ہے۔ مورخین ذکر کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے لشکر کے ہمراہ یمامہ پہنچی تو مسیلمہ کو بڑا فکر پیدا ہوا۔ اس نے سوچا اگر وہ سجاح کی فوجوں سے جنگ میں مشغول ہو گیا تو اس کی طاقت کمزور ہو جائے گی، اسلامی لشکر اس پر چھاوا بول دے گا اور اردگرد کے قبائل بھی اس کی اطاعت کا دم بھرنے سے انکار کر دیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے سجاح سے مصالحت کرنے کی ٹھانی۔ پہلے اسے تحفے تحائف بھیجے پھر کہلا بھیجا کہ وہ خود اس سے ملنا چاہتا ہے۔ سجاح اپنا لشکر لیے پانی کے ایک چشمے پر مقیم تھی، اس نے مسیلمہ کو باریابی کی اجازت دے دی۔ مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس آدمیوں کے ہمراہ اس کے پاس آیا۔

کیمپ میں پہنچ کر خلوت میں اس سے تملق آمیز گفتگو کی اور کہا کہ عرب کی آدھی زمین کے مالک قریش ہیں اور آدھی زمین کی مالک تم ہو۔ اس کے بعد مسیلمہ نے کچھ مسجع و مقفیٰ عبارتیں سجاح کو سنائیں جن سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ سجاح نے بھی جواب میں اسے اسی قسم کی بعض عبارتیں سنائیں۔ یہ ملاقات خاصی دیر تک جاری رہی۔ مسیلمہ نے اپنی خوش کلامی اور چال بازی سے سجاح کا دل

موہ لیا اور سجاح کو اقرار کرتے ہی بن پڑی کہ مسیلمہ اس سے ہر طرح فائق ہے۔

سجاح کو پوری طرح اپنے قبضے میں لینے اور ہم نوا بنانے کے لیے مسیلمہ نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم دونوں اپنی نبوتوں کو یک جا کرلیں اور باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ سجاح نے جو پہلے ہی اس کی خوش کلامی اور محبت آمیز باتوں سے مسحور ہو چکی تھی، نہایت خوشی سے یہ مشورہ قبول کر لیا اور مسیلمہ کے ساتھ اس کے کیمپ میں چلی گئی۔ تین روز تک وہاں رہی، اس کے بعد اپنے لشکر میں واپس آئی اور ساتھیوں سے ذکر کیا کہ اس نے مسیلمہ کو حق پر پایا ہے اس لیے اس سے شادی کر لی ہے۔

سجاح کا مہر

لوگوں نے اس سے پوچھا "آپ نے کچھ مہر بھی مقرر کیا؟" اس نے کہا "مہر تو مقرر نہیں کیا"۔ انھوں نے مشورہ دیا "آپ واپس جائیے اور مہر مقرر کر کے آئیے کیونکہ آپ جیسی شخصیت کے لیے مہر لیے بغیر شادی کرنا زیبا نہیں۔" چنانچہ وہ مسیلمہ کے پاس واپس گئی اور اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ مسیلمہ نے اس کی خاطر عشاء اور فجر کی نمازوں میں تخفیف کر دی۔ مہر کے بارے میں یہ تصفیہ ہوا کہ مسیلمہ یمامہ کی زمینوں کے لگان کی نصف آمدنی سجاح کو بھیجا کرے گا۔ سجاح نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آئندہ سال کی نصف آمدنی میں سے اس کا حصہ پہلے ہی ادا کر دے۔ اس پر مسیلمہ نے نصف سال کی آمدنی کا حصہ اسے دے دیا جسے لے کر وہ جزیرہ واپس چلی گئی۔ بقیہ نصف سال کی آمدنی کے حصول کے لیے اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو بنو حنیفہ ہی میں چھوڑ دیا۔ وہ ابھی وہیں مقیم تھے کہ اسلامی لشکر آ پہنچا اور مسیلمہ سے جنگ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ سجاح بدستور بنو تغلب میں مقیم رہی یہاں تک کہ امیر معاویہ نے 'قحط والے سال' (عام المجاعہ) اسے اس کی قوم کے ساتھ بنو تمیم میں بھیج دیا جہاں وہ وفات تک مسلمان ہونے کی حالت میں مقیم رہی۔

یہ ہے سجاح کا قصہ اور ـــــ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ـــــ بہت ہی عجیب قصہ ہے۔ وہ جزیرہ سے ابوبکرؓ کے مقابلے کو روانہ ہوتی ہے لیکن مالک بن نویرہ سے بات چیت کے بعد اس کی رائے بدل جاتی ہے اور وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے بجائے یمامہ کا رخ کرتی ہے۔ وہاں

مسیلمہ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد وہ اپنے قبیلے میں لوٹ آتی ہے اور بقیہ ساری عمر اس طرح بسر کرتی ہے جیسے کبھی وہ اپنے قبیلے سے باہر نکلی ہی نہ تھی اور اپنے پہلے خاوند کے سوا کسی سے شادی کی ہی نہ تھی۔

مسیلمہ کا معاملہ بھی سجاح کے معاملے سے کم تر نہیں۔ اگر سجاح سے اس کی شادی کا قصہ درست ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسیلمہ اوّل درجے کا سیاست دان اور لوگوں کے دلی جذبات بھانپ لینے والا شخص تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس طرح سجاح سے چھٹکارا حاصل کر لے تاکہ ابوبکرؓ کی بھیجی ہوئی افواج کا مقابلہ دلجمعی سے کیا جا سکے۔ اس نے سجاح کو میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں سے رام کر لیا اور چال بازی سے کام لے کر اسے اس کے قبیلے میں واپس بھیج دیا۔ مالک بن نویرہ اور مسیلمہ کے ساتھ سجاح کے تعلقات جس قسم کے رہے ان پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ سجاح ایک ہوشیار کاہنہ، مسجع مقفیٰ عبارتیں بنانے میں ماہر، بہت نرم طبیعت اور نسوانی خصوصیات کی پوری طرح حامل تھی۔ ادھر مسیلمہ بھی ایک ہوشیار سیاست دان تھا۔ وہ خوبصورت نہ تھا لیکن میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کے دل موہ لیتا تھا۔ عورتوں سے اُسے بہت کم رغبت تھی اور عورت کا حسن و جمال اس پر مطلق اثر نہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنی شریعت میں یہ بات رکھ دی تھی کہ جس شخص کے بیٹا پیدا ہو اس کے لیے اس وقت تک اپنی بیوی کے پاس جانا ناجائز ہے جب تک وہ بیٹا زندہ ہے۔ اگر بیٹا مر جائے تو دوسرے بیٹے کے حصول کے لیے بیوی کے پاس جا سکتا ہے لیکن جس کا بیٹا موجود ہو اس کے لیے عورتیں حرام ہیں۔

مالک کی پریشانی

جس زمانے میں مسیلمہ اور سجاح کے درمیان مندرجہ بالا واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے خالد بزاخہ میں مرتدین کو شکست دے کر اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ ام زمل سے جنگ اور اس کے قتل کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ بطاح میں مالک بن نویرہ تک یہ تمام خبریں پہنچ چکی تھیں۔ جنھیں سن کر اس کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ اس نے زکوٰۃ

کی ادائگی بند کر رکھی تھی اور سجاح سے مل کر بنو تمیم کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے باعث خالد کی نظروں میں مجرم قرار پا چکا تھا۔ اس کے لشکر کی حالت یہ تھی کہ سجاح کے لشکر کی مدد کے باوجود مقابل قبائل کے ہاتھوں اسے شکست ہو چکی تھی۔ وکیع، جو اس کا دستِ راست شمار ہوتا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے مل گیا تھا اور زکواۃ ادا کر دی تھی۔ ان حالات کی موجودگی میں مالک سخت پریشان تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ آیا مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور پہلے کی طرح ابوبکرؓ کو زکواۃ دینے کا اقرار کرے یا اپنے ارادے پر قائم رہ کر انتظار کرے کہ آئندہ واقعات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔

خالدؓ کا کوچ

خالدؓ اسد، غطفان اور اس علاقے میں بسنے والے دیگر قبائل کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور ان تمام قبائل نے اسلام قبول کرنا اور مدینہ کی حکومت کو تسلیم کرنا منظور کر لیا تھا چونکہ اب ان قبائل کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا اس لیے انھوں نے بطاح جا کر مالک بن نویرہ اور دوسرے قبائل سے، جو ابھی تک تردد و تذبذب کی حالت میں تھے، لڑنے کا ارادہ کیا۔ جب انصار کو آپ کے اس ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے کچھ تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"خلیفۃ المسلمین نے ہمیں بنی تمیم کی طرف جانے کا حکم دیا تھا۔ انھوں نے ہمیں یہ ہدایت کی تھی کہ جب ہم طلیحہ کی سرکوبی سے فارغ ہو جائیں اور اس علاقے کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیں تو دوسرا حکم آنے تک یہیں مقیم رہیں۔"

لیکن خالدؓ نے ان کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

"تم سے ابوبکرؓ نے خواہ کچھ ہی عہد لیا ہو لیکن مجھے پیش قدمی جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ میں تمھارا امیر ہوں اور تمام خبریں مجھ تک پہنچتی ہیں۔ اگر دربارِ خلافت سے میرے پاس کوئی حکم نہ بھی پہنچے لیکن میں دیکھوں کہ دشمن پر قابو پانے کے بعض مواقع مجھے فراہم ہیں تو میں ان سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اسی طرح اگر میں دیکھوں کہ ہمیں مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو گو ان سے نبٹنے کے لیے

خلیفۃ المسلمین کی جانب سے کوئی ہدایت میرے پاس نہ بھی ہو پھر بھی میں جو قدم مناسب سمجھوں گا اٹھاؤں گا۔ مالک بن نویرہ کی شرارتیں روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہیں اس لیے میں اس کے مقابلے کو ضرور جاؤں گا۔ میں تمھیں ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کرتا۔ اگر تم جانا نہیں چاہتے تو نہ جاؤ، میں مہاجرین اور تابعین کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

چنانچہ انھوں نے انصار کو بزاخہ ہی میں چھوڑا اور خود بطاح کی جانب روانہ ہو گئے۔

بعد میں انصار نے باہم مشورہ کیا اور طے پایا کہ ان کے لیے پیچھے رہنا مناسب نہیں۔ انھیں بھی اپنے ساتھیوں سے مل جانا چاہیے کیونکہ اگر خالدؓ نے مالک بن نویرہ پر قابو پا لیا تو وہ اس فتح کے فوائد سے محروم رہ جائیں گے اور اگر خدانخواستہ خالدؓ کے لشکر پر کوئی مصیبت پڑی تو لوگ یہ کہہ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے کہ انھوں نے ایسے نازک موقع پر اپنے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک قاصد کے ہاتھ خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ وہ بھی آ رہے ہیں اس لیے اپنا کوچ ملتوی کر دیں چنانچہ خالد انصار کے انتظار میں تھوڑی دیر ٹھہر گئے۔

مالک کا اپنی قوم کو مشورہ

جب خالدؓ لشکر کے ہمراہ بطاح پہنچے تو انھوں نے میدان خالی پایا کیونکہ مالک بن نویرہ نے اپنی قوم کو گرد و نواح میں منتشر کر دیا اور کہا تھا:

"اے بنو یربوع! ہم نے اپنے امراء کا کہا نہ مانا جنھوں نے ہمیں ابوبکرؓ کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا لیکن میں دیکھتا ہوں، ہماری حالت ایسی نہیں کہ ہم مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں اس لیے میں تمھیں صلاح دیتا ہوں کہ تم دوبارہ اسلام قبول کر لو اور منتشر ہو جاؤ تاکہ کسی کو یہ شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے کہ تم مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہو۔"

اپنی قوم کو منتشر کرنے کے بعد وہ خود بھی روپوش ہو گیا۔

بطاح پہنچ کر جب خالدؓ نے میدان خالی پایا تو انھوں نے اپنے لشکر کو مختلف دستوں میں منقسم کر کے ارد گرد کے علاقے میں روانہ کر دیا، اور حکم دے دیا کہ اگر مالک کے قبیلے کا کوئی

شخص کہیں مل جائے تو پہلے اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکاری ہو تو اسے ان کے سامنے حاضر کیا جائے، اور جو شخص آنے سے انکار کرے اسے فی الفور قتل کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ابوبکرؓ کی ہدایت اپنے امرا، کو یہ تھی کہ جب مسلمان کسی جگہ پڑاؤ ڈالیں تو اذان دیں۔ اگر اس کے جواب میں قریبی بستیوں سے اذان کی آواز آئے تو انھیں چھوڑ دیں لیکن اگر نہ آئے تو ان کا مقابلہ کریں۔ بعد میں بھی اگر وہ اسلام کا اقرار کریں تو انھیں چھوڑ دیں اور ان سے زکواۃ کے متعلق دریافت کریں۔ اگر وہ زکواۃ دینے کا اقرار کریں، فبہا ورنہ انھیں قتل کر دیں۔

مالک بن نویرہ کی گرفتاری

خالدؓ بن ولید نے جو دستے نواحی علاقوں میں بھیجے تھے ان میں سے ایک دستہ مالک بن نویرہ کو بنو یربوع کے چند آدمیوں کے ساتھ گرفتار کر کے لے آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق اگر مالک اور اس کے ساتھی اسلام کا اقرار کر لیتے تو خالد انھیں چھوڑ دیتے لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے مالک کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔

مالک کے قتل نے مدینہ میں سخت ہیجان برپا کر دیا اور جو جوش و خروش اس موقع پر برپا ہوا وہ عرصے تک ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ عمرؓ کی خلافت کے دوران میں عمرؓ اور خالدؓ کے درمیان جو معاملات پیش آئے ان میں مالک بن نویرہ کے قتل کو بھی بہت دخل تھا۔

قتل مالک پر مختلف روائتیں

مالک بن نویرہ کے قتل کے متعلق روایات میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ خود ان لوگوں میں، جو مالک اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لائے تھے، باہم اختلاف تھا کہ آیا مالک اور اس کے ساتھیوں نے اسلام کا اقرار کر لیا تھا اور اذان کی آواز کا جواب دیا تھا یا نہیں؟ طبری میں ابوقتادہ انصاری (جو خود بھی مالک کو گرفتار کرنے والوں میں شامل تھے) کی زبانی یہ روایت آتی ہے: "ہم نے رات کے وقت ان لوگوں پر چھاپا مارا تو انھوں نے ہتھیار

اٹھا لیے۔ ہم نے کہا 'ہم مسلمان ہیں'۔ انھوں نے جواب دیا 'ہم بھی مسلمان ہیں'۔ ہم نے پوچھا 'اگر تم مسلمان ہو تو ہتھیار کیوں اٹھائے ہوئے ہو؟' انھوں نے کہا 'یہ ہتھیار تمھارے مقابلے کے لیے نہیں'۔ ہم نے کہا 'اگر تم واقعی مسلمان ہو تو ہتھیار رکھ دو'۔ چنانچہ انھوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ اس کے بعد ہم نے نماز پڑھی اور انھوں نے بھی ہمارے ساتھ نماز ادا کی۔"

یہاں تک تو سب لوگ متفق تھے۔ اختلاف آگے چل کر شروع ہوا۔ ابوقتادہ کہتے تھے کہ ان لوگوں نے ادائے زکوٰۃ کا اقرار بھی کر لیا تھا لیکن دوسرے لوگ کہتے تھے نہیں! انھوں نے زکوٰۃ دینے کا اقرار نہیں کیا اور زکوٰۃ نہ دینے پر اصرار کیا۔ گواہوں کے درمیان اختلاف کی موجودگی میں خالدؓ کے لیے کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق انھوں نے فی الحال مالک اور اس کے ساتھیوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ رات سخت ٹھنڈی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ خالدؓ نے قیدیوں پر ترس کھاتے ہوئے یہ اعلان کرا دیا "دافئوا اسراکم" (اپنے قیدیوں کو گرمی پہنچاؤ) لیکن کنانہ کی زبان میں مدافأۃ کا لفظ قتل کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جن لوگوں کی تحویل میں یہ قیدی تھے وہ کنانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب انھوں نے منادی کرنے والوں کی آواز سنی تو خیال کیا کہ خالدؓ نے ان قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے تلواروں سے ان کا کام تمام کر دیا۔ جب خالدؓ نے چیخ و پکار سنی تو وہ اپنے خیمے سے باہر آئے لیکن اس وقت تک تمام قیدیوں کا کام تمام ہو چکا تھا۔ انھوں نے واقعہ سن کر فرمایا:

"جب اللہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے۔"

لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ خالدؓ نے مالک کو اپنے پاس بلا کر باتیں کرنی شروع کیں تاکہ معلوم کریں کہ دونوں گواہیوں میں سے کون سی درست ہے' اس کے اسلام لانے کی یا ارتداد اور ادائے زکوٰۃ سے انکار کرنے کی۔ جب ادائے زکوٰۃ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی تو مالک نے کہا:

"میرا تو خیال نہیں کہ تمھارے 'صاحب' نے تمھیں ایسا حکم دیا ہوگا۔"

خالدؓ کو یقین ہو گیا کہ وہ ادائے زکوٰۃ سے انکاری ہے۔ انھوں نے جھنجلا کر کہا:

"کیا تو انھیں اپنا صاحب خیال نہیں کرتا؟"
یہ کہہ کر انھوں نے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی گردنیں مارنے کا حکم دے دیا۔
ابوالفرج اپنی کتاب 'الاغانی' میں اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"ابن سلام کی روایت ہے، خالد کو غلطی پر سمجھنے والے کہتے ہیں کہ گفتگو کے دوران میں مالک نے خالدؓ سے کہا:
"کیا تمھارے صاحب (رسول اللہ) نے تمھیں اسی بات کا حکم دیا ہے؟"
اصل میں اس کی مراد یہ نہ تھی کہ وہ ادائے زکوٰۃ کا منکر ہے بلکہ یہ تھی، کیا رسول اللہؐ نے تمھیں حکم دیا ہے کہ جو لوگ ادائے زکوٰۃ کے منکر ہوں ان پر چڑھائی کر دو؟ لیکن جو لوگ اس معاملے میں خالدؓ کو بے قصور سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس نے واقعی اسلام سے انکار کیا تھا۔ دلیل میں مالک کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں:

وقلت خذوا اموالکم غیر خائف ولا ناظر فیما یجیئ من الغد
فان قام بالامر المخوف قائم منعنا وقلنا: الدین دین محمد

(میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے اموال کو بے دھڑک قبضے میں رکھو اور نہ دیکھو کہ کل کیا وقوع میں آتا ہے۔ پھر اگر خوفناک امر (اسلامی حکومت) کو کوئی قائم کرے تو ہم اس کی مخالفت کریں گے اور کہہ دیں گے کہ دین وہی ہے جو محمد لائے تھے)
یعنی اس نے اپنی قوم کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی صورت بھی زکوٰۃ ادا نہ کرے اور ادائے زکوٰۃ پر اصرار کیا جائے تو یہ کہہ دیا جائے کہ ہم تو محمدؐ پر ایمان لائے ہیں، ابوبکرؓ کے دین پر نہیں۔"
ابن خلکان یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ جب خالدؓ نے مالک کو گفتگو کے لیے بلایا تو اس نے کہا:
"میں نماز پڑھنے کا اقرار کرتا ہوں لیکن زکوٰۃ دینے سے انکاری ہوں۔"
خالدؓ نے فرمایا:
"کیا تجھے معلوم نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ایک ساتھ قبول ہوتی ہیں۔ نماز کے

بغیر زکوٰۃ اور زکوٰۃ کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی؟"

مالک نے کہا:

"کیا آپ کے صاحب بھی یہی کہتے تھے؟"

خالدؓ نے جواب دیا:

"کیا تو انھیں اپنا صاحب خیال نہیں کرتا؟ اللہ کی قسم! میں نے تیری گردن اڑانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔"

اس کے بعد بحث طول پکڑ گئی اور گفتگو میں تیزی آتی گئی۔ آخر خالدؓ نے کہا:

"میں تو تجھے قتل کر کے رہوں گا۔"

اس نے کہا

"کیا تمھارے صاحب نے تمھیں یہی حکم دیا تھا؟"

خالدؓ نے کہا:

"اب تو میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔"

یہ کہ کر آپ نے اپنے آدمیوں کو اس کی گردن مارنے کا حکم دے دیا۔

بعض لوگ مؤخر الذکر روایت کو پہلی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ روایت ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ قصہ قرہ بن ہبیرہ، فجارۃ السلمی، ابو شجرہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا لیکن خالدؓ بن ولید نے مالک بن نویرہ کی طرح انھیں قتل نہ کیا بلکہ ابوبکرؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا کہ وہ ان سے جو سلوک مناسب سمجھیں کریں۔ مالک بن نویرہ کا جرم ان لوگوں سے کسی طرح بھی بڑھ کر نہ تھا پھر انھوں نے اسے کیوں قتل کرا دیا۔ اور خلیفۃ المسلمین کے پاس نہ بھیجا؟ حالانکہ بنو تمیم میں اُسے جو درجہ اور رسوخ حاصل تھا وہ ان لوگوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھا اور خالدؓ اس سے خوب واقف تھے۔

ان لوگوں کی رائے میں اس روایت کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ خالدؓ نے مالک کی بیوی سے عین اس وقت شادی کر لی تھی جب مالک کا خون بھی زمین میں جذب نہ ہوا تھا۔ ان لوگوں کے خیال میں یہ شادی ہی مالک کے قتل کا اصل سبب تھی۔

شیعہ مؤرخ یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"مالک بن نویرہ خالدؓ سے بات چیت کرنے ان کے خیمے میں آیا تو اس کی بیوی بھی ساتھ ہی آئی۔ اس کی خوبصورتی نے خالدؓ کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے مالک سے کہا 'میں تو تجھے ضرور قتل کروں گا'۔ چنانچہ انھوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی بیوی سے شادی کر لی۔"

ابوالفرج اصبہانی 'کتاب الاغانی' میں لکھتے ہیں:

"جب سجاح نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مالک نے اس کی پیروی اختیار کر لی لیکن پھر یہ ظاہر کیا کہ وہ اسلام لے آیا ہے۔ خالدؓ نے جب اُسے قتل کیا تو صحابہؓ کی ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا کیونکہ انھوں نے مالک کے قتل کے بعد اس کی بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خالدؓ اسے جاہلیت کے زمانے ہی سے پسند کرتے تھے اس لیے ان پر یہ تہمت لگائی گئی، انھوں نے ایک مسلمان کو اس لیے قتل کر دیا کہ اس کے بعد اس کی بیوی سے شادی کر سکیں۔"

ہمارے خیال میں اس قسم کی روایات تاریخی واقعات کے بجائے افسانوی روایات کے زمرے میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب مالک بن نویرہ خالدؓ سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی بیوی لیلیٰ اس کے ساتھ تھی۔ جب اُس نے خالدؓ کو یہ کہتے سنا کہ میں تجھے قتل کرنے والا ہوں اور ضرور قتل کر کے رہوں گا تو وہ ان کے قدموں میں گر پڑی اور اُن سے اپنے خاوند کے لیے عفو و رحم کی طلب گار ہوئی۔ اس کے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اور آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے جاری تھی۔ اس حال میں اس کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی جس نے خالدؓ کو مسحور کر لیا۔ جب مالک نے یہ دیکھا تو اُس نے کہا،

"افسوس میری بیوی ہی میرے قتل کا باعث بنی۔"

خالدؓ نے کہا: "تیری بیوی تیرے قتل کا باعث نہیں بنی بلکہ تیرے اعمال اس کا باعث بنے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا۔

خالدؓ سے ابوقتادہ کی ناراضی

ابوقتادہ انصاری خالدؓ کے اس فعل سے اتنے ناراض ہوئے کہ وہ یہ قسم کھاکر کہ آئندہ کبھی خالدؓ کے جھنڈے تلے نہ لڑیں گے انھیں چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

اس واقعے کے متعلق روایات میں یہ مذکور ہے کہ خالدؓ کے دافئوا اسراکم کا حکم دینے کے بعد جب لوگوں نے مالک اور اس کے ساتھی قیدیوں کو قتل کر دیا تو خالدؓ بہت ناراض ہوئے پھر بھی یہ فرمایا:

"جب اللہ کسی بات کے کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے۔"

تو ابوقتادہ نے یہ سمجھا کہ یہ خالدؓ کا محض ایک بہانہ ہے ورنہ اصل میں ان کا منشا بھی یہی تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ وہ خالدؓ کے پاس گئے اور کہا کہ یہ سب کچھ آپ کا کیا دھرا ہے۔ اس پر خالدؓ نے انھیں ڈانٹا اور وہ ناراض ہو کر مدینہ چلے گئے۔

اس کے بالمقابل دوسری روایات میں یہ مذکور ہے کہ ابوقتادہ خالدؓ کے ام تمیم سے نکاح کرنے کے بعد مدینہ گئے اور ان کے ساتھ مالک کا بھائی متمم بن نویرہ بھی تھا جب مدینہ پہنچے تو ابوقتادہ سیدھے ابوبکرؓ کے پاس گئے اور انھیں مالک کے قتل اور لیلیٰ سے نکاح کا واقعہ سنایا اور یہ بھی کہا انھوں نے قسم کھالی ہے کہ آئندہ کبھی خالدؓ کے ساتھ ہو کر نہ لڑیں گے لیکن ابوبکرؓ خالدؓ کے کارناموں اور فتوحات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے ابوقتادہ کی بات پر کوئی توجہ نہ کی اور کہا کہ انھیں ایسے شخص کے متعلق ایسی بات نہ کہنی چاہیے جسے رسول اللہؐ نے سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا ہو۔

اس پر بھی ابوقتادہ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ عمرؓ بن خطاب کے پاس گئے اور ان سے سارا قصہ بیان کیا۔ انھوں نے خالدؓ کو ایسے شخص کی شکل میں پیش کیا جس کی نفسانی خواہشات اس کے فرائض پر غالب آجاتی ہیں اور وہ تسکینِ نفس کی خاطر اللہ کے احکام نظرانداز کر دیتا ہے۔ عمرؓ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ ابوقتادہ کو لے کر ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس جرم کی پاداش میں خالدؓ کو معزول کر دیں۔ انھوں نے کہا خالدؓ کی تلوار

اب ظلم کرنے پر اتر آئی ہے اس لیے آپ انھیں معزول کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ قید بھی کر دیں لیکن ابوبکرؓ کو اپنے عمال سے ایسا برتاؤ سخت ناپسند تھا۔ جب عمرؓ نے ان کی معزولی پر اصرار کیا تو انھوں نے فرمایا:

"عمرؓ بس کرو۔ خالدؓ نے تاویل کی۔ یہ بات اور ہے کہ تاویل کرنے میں اُن سے غلطی ہوئی۔"

لیکن عمرؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکے اور برابر اپنے مطالبے پر قائم رہے۔ جب ابوبکرؓ بہت تنگ ہوئے تو انھوں نے فرمایا:

"عمرؓ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس تلوار کو نیام میں نہیں ڈال سکتا جسے اللہ نے کافروں پر مسلط کیا ہو۔"

مدینہ میں خالدؓ کی طلبی

پھر بھی عمرؓ، خالدؓ کے اس فعل کو ناراضی ہی کی نظر سے دیکھتے رہے اور ان کا دل اُن سے صاف نہ ہو سکا۔ خالدؓ سے جواب طلبی کرنے کے متعلق ان کا اصرار برابر جاری رہا۔ آخر ابوبکرؓ بھی مجبور ہو گئے اور انھوں نے خالدؓ کو جواب دہی کے لیے مدینہ طلب فرمالیا۔ خالدؓ میدانِ جنگ سے مدینہ پہنچے اور سیدھے مسجدِ نبوی میں آئے۔ وہ ایک زنگاری قبا پہنے ہوئے تھے۔ اور اپنے عمامے میں تیر لگا رہے تھے۔ جب عمرؓ نے انھیں مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو ان کے عمامے سے تیر جھپٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور کہا:

"تم نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور اُس کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ واللہ! میں تمھیں سنگسار کر دوں گا۔"

خالدؓ بالکل خاموش رہے اور ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا کیونکہ انھیں خیال تھا کہ ان کے متعلق ابوبکرؓ کی بھی رائے وہی ہو گی جو عمرؓ کی ہے۔ آخر وہ ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مالک کا سارا واقعہ انھیں سنایا کہ کس طرح اُس نے سجاح کی مدد کی اور جب انھوں نے اس پر قابو پا لیا تو کس طرح اس نے زکوٰۃ ادا کرنے میں تردد کیا۔ انھوں نے

اس کے قتل کے متعلق معذرت پیش کی جو ابوبکرؓ نے قبول فرمالی اور جنگ میں ان سے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان سے درگزر کی لیکن مالک کی بیوی سے شادی کر لینے پر ناراضی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ عرب ایک تو عورتوں کو میدان جنگ میں لانے ہی کو ناپسند کرتے تھے دوسرے عین لڑائی کے وقت ان سے صحبت کرنے کو عار خیال کرتے تھے۔

مالک بن نویرہ کے معاملے میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان جو اختلاف رونما ہوا اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ درحقیقت دونوں اپنے اپنے خیال میں سچے تھے اور دونوں کے مدنظر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی ہی تھی۔ اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ اختلاف انفرادی نوعیت کا سمجھا جائے جس کا محور صرف خالدؓ کی ذات اور ان کا فعل تھا یا یہ کیر سیاسی نوعیت کا ؟

خالدؓ کے بارے میں عمرؓ کا موقف

میرے نزدیک اس اختلاف کی نوعیت سیاسی تھی۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ دونوں کے پیش نظر الگ الگ سیاسی راہ تھی جسے وہ ٹھیک سمجھتے تھے اور جس پر انھیں عمل کرنا چاہیے تھا۔

عمرؓ جو عدل و انصاف کی مجسم تصویر تھے، یہ چاہتے تھے کہ خالدؓ نے چونکہ ایک مسلمان پر زیادتی کی ہے اور اس کی بیوی کے ایام عدت گزرنے سے پہلے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ اس لیے انھیں لشکر کی قیادت پر قائم رکھنا ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی نیک شہرت کو دھبا لگے گا اور عرب میں انھیں اس وقت جو قدر و منزلت حاصل ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ ان کے خیال میں صرف خالدؓ کی معزولی ہی کافی نہ تھی بلکہ لیلیٰ سے نکاح کرنے کے جرم میں انھیں قرار واقعی سزا بھی ملنی چاہیے تھی۔ عمرؓ کہتے تھے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خالدؓ سے مالک کے معاملے میں اجتہادی غلطی صادر ہوئی تھی (گو اس کا امکان نہیں) تو بھی اس کی بیوی سے نکاح کا معاملہ ایسا ہے جس کے باعث خالدؓ پر حد قائم کرنی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان کی صفائی میں یہ عذر پیش نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہؐ نے انھیں سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا اور وہ ایسے سپہ سالار ہیں کہ فتح و نصرت ہر دم ان کے قدم چومتی ہے۔ اگر خالد جیسی حیثیت رکھنے والے اشخاص سے اس قسم کی چشم پوشی برتی گئی تو یہ امر دین میں خلل اندازی کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔ مسلمان

کتاب اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالنے میں دلیر ہو جائیں گے اور احکام الٰہی کا احترام ان کے دلوں میں باقی نہ رہے گا۔

انھیں خیالات کے باعث عمرؓ برابر ابوبکرؓ پر زور دیتے رہے کہ خالدؓ کو ضرور سزا دینی چاہیے جس پر آخر ابوبکرؓ نے انھیں میدانِ جنگ سے واپس بلایا اور ان کے فعل پر انھیں سرزنش کی۔

خالدؓ کے بارے میں ابوبکرؓ کا موقف

عمرؓ کے بالمقابل ابوبکرؓ کا خیال یہ تھا کہ ایسے وقت میں، جب مسلمانوں پر چاروں طرف سے خطرات کے مہیب بادل منڈلا رہے ہیں اور سارے عرب میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ زور شور سے بھڑک رہی ہے، کوئی سپہ سالار کسی فرد واحد یا جماعت کو غلطی سے قتل کرا دیتا ہے تو اس کا زیادہ خیال نہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسے نازک وقت میں کسی سپہ سالار کو سخت سزا دینا اور اس کے الزام کی تشہیر کرنا مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ کسی مفتوحہ قوم کی کسی عورت سے شادی کر لینا اور وہ بھی اس حالت میں کہ ابھی اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوئے ہوں عربوں کے رسوم و رواج کے خلاف نہیں کیونکہ اس صورت میں مفتوحہ قوم کی عورتیں لونڈیاں شمار ہوں گی جن پر ان کے مالکوں کو ہر قسم کا اختیار ہوتا ہے۔

ابوبکرؓ کہتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کو خالدؓ کی تلوار کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس ہزار طاقتور اشخاص کے ساتھ بطاح کے قریب یمامہ میں مقیم تھا اور مسلمانوں کے خلاف اس کی بغاوت نے انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ عکرمہ بن ابوجہل جنھیں فوج دے کر اس طرف بھیجا گیا تھا، اس کے مقابلے میں شکست کھا چکے تھے۔ مسلمانوں کی نظریں خالدؓ کی طرف اٹھتی تھیں۔ مالک بن نویرہ کے قتل اور اس کی بیوی لیلیٰ سے نکاح کر لینے کے باوجود خالدؓ کو معزول نہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں مسیلمہ کو اسلامی فوجوں پر بے پناہ غلبہ حاصل ہو جاتا اور دینِ اسلام کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ خالدؓ اللہ کی تلوار اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے اس لیے ابوبکرؓ نے انھیں طلب فرما کر صرف زبانی سرزنش پر اکتفا کی اور انھیں یمامہ جا کر مسیلمہ کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

یمامہ پر خالدؓ کی چڑھائی

یہ ہے میرے خیال میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے اختلاف کی صحیح تصویر، ابوبکرؓ نے انھیں بلا کر مسیلمہ پر چڑھائی کرنے کا حکم بھی اس لیے دیا کہ اہلِ مدینہ خصوصاً عمرؓ جیسی رائے رکھنے والے اشخاص کو دکھا سکیں کہ اس نازک وقت میں خالدؓ ہی کی شخصیت ایسی ہے جو میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو تباہی کے خطرات سے بچا سکتی ہے۔ خالدؓ کو میدانِ جنگ سے بلا کر سرزنش کرنا اور لیلیٰ کو طلاق دینے کا حکم ہی ان کے لیے کافی سزا سمجھی گئی۔

خالدؓ نے یمامہ میں بھی اسی طرح ایک عورت سے شادی کی تھی جس طرح بنو تمیم میں لیلیٰ سے کی تھی۔ ابوبکرؓ نے اس پر سختی سے خالدؓ کو سرزنش کی۔

مؤرخین نے ان واقعات پر عجیب و غریب گوہر افشانیاں کی ہیں اور انھیں پیش کر کے خالدؓ کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان مؤرخین اور مصنفین کی حالت، جو ان واقعات کو پیش کر کے خالدؓ کے چہرے کو سیاہ داغوں سے چھپانا چاہتے ہیں، ان لوگوں سے زیادہ تعجب خیز ہے جو خالدؓ کو ان الزامات سے بالکل بری قرار دیتے اور ان کے لیے عذرات تلاش کرتے ہیں۔ مالک کا قتل اور لیلیٰ اور بنت مجاعہ سے نکاح کے واقعات ان کارناموں کے مقابلے میں قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو مرتدین کی جنگوں میں خالدؓ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئے اور جنھوں نے انھیں 'سیف اللہ' کے خطاب کا قرار واقعی مستحق ٹھہرایا۔

مسیلمہ کے مقابلے میں روانہ ہوتے کا حکم ملنے کے بعد خالدؓ مدینہ سے بطاح واپس آگئے اور وہاں اس کمک کا انتظار کرنے لگے جسے ابوبکرؓ نے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس امداد کے پہنچنے کے بعد وہ لشکر لے کر مسیلمہ کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے جو جھوٹے مدعیانِ نبوت میں سب سے زیادہ طاقتور تھا جس کی بغاوت جزیرہ نمائے عرب کے مرتدین کی تمام بغاوتوں سے زیادہ مہیب تھی اور جس کی طرف سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق تھا۔

(۹)

جنگِ یمامہ

مسیلمہ کے خلاف خالدؓ کی چڑھائی

بطاح سے خالد بن ولید اپنے لشکر اور ابوبکرؓ کی بھیجی ہوئی کمک لے کر بنی حنیفہ کے متنبی مسیلمہ بن حبیب سے جنگ کرنے کے لیے یمامہ روانہ ہوئے۔ جو کمک ابوبکرؓ نے بھیجی تھی وہ تعداد اور قوت میں خالدؓ کے اصل لشکر سے کم نہ تھی۔ اس میں ان مہاجرین اور انصار کے علاوہ جنھوں نے رسول اللہ کے زمانے میں کفار سے لڑائیاں کی تھیں، ان قبائل کے لوگ بھی شامل تھے جن کا شمار عرب کے طاقتور اور جنگجو قبیلوں میں ہوتا تھا۔ انصار ثابت بن قیس اور براء بن مالک کے زیر سرکردگی تھے اور مہاجرین ابوحذیفہ بن عتبہ اور زید بن خطاب کے ماتحت۔ دوسرے قبائل میں سے ہر قبیلے کا سردار علحدہ علحدہ تھا جسے ابوبکرؓ نے اس کی حسن کارکردگی کے باعث اس عہدے پر مقرر فرمایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ کے وقت چالیس ہزار بنوحنیفہ مسیلمہ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں گے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اس لیے اس وقت مدینہ کی جانب سے بھی بہترین آدمیوں کو، جو قیادت اور جنگ کا کامل تجربہ رکھتے ہوں، محاذ جنگ پر نہ بھیجا گیا تو ان مرتدین کا مقابلہ بے حد دشوار ہو جائے گا۔

ان لوگوں میں، جنھیں ابوبکرؓ نے خالدؓ کی امداد کے لیے روانہ کیا تھا، قرآن مجید کے حافظوں اور قاریوں کی بھی بھاری تعداد شامل تھی۔ اسی طرح ایک خاص دستہ ان صحابہ کا تھا جنھوں نے جنگِ بدر میں حصہ لیا تھا۔ ایسا کرنا ابوبکرؓ کی اس پالیسی کے خلاف تھا جو انھوں نے اہلِ بدر کے متعلق وضع کی تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جنگوں میں اہلِ بدر کو استعمال نہ کروں گا یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر ہو جائیں لیکن

اس موقع پر نازک صورت حال کے پیش نظر انھوں نے اپنی پالیسی تبدیل کرتے ہوئے اہلِ بدر اور دوسرے صحابہ کو جنھوں نے رسول اللہ کے زمانے کی جنگوں میں حصہ لیا تھا، خالدؓ کی مدد کے لیے روانہ فرمایا کیونکہ یمامہ میں مسیلمہ کو خوب فروغ ہو چلا تھا اور وہ آسانی سے زیر ہونے والا نہ تھا۔

مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی

حقیقت یہ ہے کہ یمامہ میں مسلمانوں کی کامیابی خالدؓ کا معمولی کارنامہ نہیں۔ یمامہ کی حالت دوسرے قبائل سے بالکل مختلف تھی۔ مدینہ کے قریبی قبائل میں سے جنھوں نے ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ کا محاصرہ کرنا چاہا تھا، کوئی شخص نبوت کا مدعی نہ تھا اور زکواۃ کی معافی کے سوا انھیں اور کوئی خواہش نہ تھی۔ مزید برآں عدی بن حاتم اپنے قبیلے کو طلیحہ اسدی کی امداد سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے اس کے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور وہ جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کے لشکر کے مفرورین ام زمل کے پاس جا کر اکٹھے ہوئے لیکن ایک ہزیمت خوردہ فوج سے مقابلے کی توقع عبث تھی اس لیے ام زمل کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

رہ گئے بنو تمیم تو ان میں خود تفرقہ پڑا ہوا تھا مسلمانوں سے کیا مقابلہ کر سکتے تھے!

سجاح کے عزم اور ہمت کو مالک بن نویرہ نے متزلزل کر دیا اور اس نے مدینہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔ مالک بن نویرہ مسلمانوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ خالدؓ کے مقابلے میں آنے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔

ان لوگوں کے بالمقابل مسیلمہ اور یمامہ میں اس کے پیروؤں کو اصلاً اس بات ہی سے انکار تھا کہ محمد رسول اللہ ان کی طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش کی طرح نبوت و رسالت پر ان کا بھی حق ہے۔ انھیں بھی عرب میں وہی درجہ حاصل ہے جو قریش کو ہے۔ ان کا لشکر قریش کے لشکر سے کئی گنا بڑا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کامل اتحاد پایا جاتا ہے۔ آپس کی مخالفت اور شکر رنجی بالکل مفقود ہے۔ عقیدے اور قبیلے کا اختلاف ان میں

بالکل نہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ وہ ابوبکرؓ کی فوجوں سے بڑی کامیاب ٹکر لے سکتے ہیں۔

عکرمہ کی ہزیمت

ابوبکرؓ کی نظر میں یہ تمام باتیں پہلے ہی سے موجود تھیں اِس لیے انھوں نے پوری کوشش کی کہ، یمامہ کی جانب جو لشکر بھیجے جائیں وہ طاقت ور ہوں۔ مرتدین سے لڑنے کے لیے انھوں نے گیارہ لشکر تیار کیے تھے اور ہر لشکر کو علیٰحدہ علیٰحدہ قبیلے کی طرف بھیجا تھا لیکن مسیلمہ کے بارے میں ایسا نہ ہُوا بلکہ اس کی جانب انھوں نے عکرمہ بن ابوجہل کو بھیجا اور ان کے پیچھے پیچھے شرحبیل بن حسنہ کو ایک لشکر دے کر ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا۔ عکرمہ یمامہ کی جانب بڑھتے چلے گئے اور شرحبیل کے پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسیلمہ پر فتح یاب ہونے کا فخر تنہا انھیں کے حِصّے میں آئے۔ عکرمہ ایک تجربہ کار ماہرِ جنگ اور دشمن کو خاطر میں نہ لانے والے شہسوار تھے۔ ان کی فوج میں بڑے بڑے بہادر شامل تھے جو پچھلی جنگوں میں لوگوں پر اپنے کارناموں کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسیلمہ کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور بنوحنیفہ نے انھیں شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ عکرمہ نے اپنی ہزیمت کا سارا حال ابوبکرؓ کو لکھ بھیجا جسے پڑھ کر ان کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے عکرمہ کو لکھا:

"اے ابن ام عکرمہ! (عکرمہ کی ماں کے بیٹے) میں تمھاری صورت دیکھنے کا مطلق روادار نہیں۔ تم واپس آکر لوگوں میں بددلی پھیلانے کا باعث نہ بنو بلکہ حذیفہ اور عرفجہ کے پاس جا کر اہلِ عُمان اور مہرہ سے لڑو۔ اس کے بعد یمن اور حضرموت جا کر مہاجر بن ابی امیہ سے مل جاؤ اور ان کے دوش بدوش مرتدین سے جنگ میں حصّہ لو۔"

اس خط میں جو غیظ و غضب پنہاں ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابن ام عکرمہ کا خطاب ہی اِس غیظ و غضب کی صحیح کیفیت ظاہر کر رہا ہے۔

مسیلمہ کی قوت کا سبب

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مسیلمہ نے اتنی قوت کس طرح حاصل کرلی؟ مسیلمہ رسولؐ اللہ کے آخری ایام میں بنی حنیفہ کے ایک وفد کے ہمراہ مدینہ آیا۔ وفد کے باقی ارکان تو رسولؐ اللہ کے پاس چلے گئے اور قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا لیکن مسیلمہ نہ جا سکا کیونکہ وہ لوگ اسے سامان کی حفاظت کے لیے ڈیرے ہی پر چھوڑ گئے تھے۔ رسولؐ اللہ نے حسبِ عادت انھیں کچھ مال و منال عطا فرمایا جس پر انھوں نے مسیلمہ کا حصہ مانگا۔ آپ نے اس کے حصے کا مال بھی ان لوگوں کو دیا اور فرمایا:

"وہ مرتبے میں تم سے کم تر نہیں۔"

مطلب یہ تھا کہ اس کی حیثیت اتنی کم تر نہیں کہ تم اسے مال کی حفاظت کے لیے ڈیرے پر چھوڑ آئے ہو۔

مسیلمہ محض یہ بات پیش کر کے نبوت کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا اس لیے شروع میں بہت ہی تھوڑے لوگوں نے اس کی باتوں پر کان دھرا۔ نہ دو سال میں ہزاروں آدمیوں کا اپنے گرد جمع کر لینا ہی کوئی معجزہ قرار پا سکتا ہے۔ یہ تو محض ایک شعبدہ بازی تھی۔

حقیقی امر جس نے مسیلمہ کی طاقت بڑھائی، وہ تھا 'نہار الرجال' کا اس سے مل جانا۔ یہ شخص، جس کا نام 'نہارؔ الرجال' یا 'نہار الرجال بن عنفوہ' تھا، اسی علاقے کا رہنے والا تھا اور ہجرت کر کے رسولؐ اللہ کے پاس مدینہ آگیا تھا۔ یہاں اس نے قرآنِ کریم پڑھا اور دینی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بہت ذہین شخص تھا اس لیے رسولؐ اللہ نے اسے اہلِ یمامہ کو دینِ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنے اور لوگوں کو مسیلمہ کی متابعت سے روکنے کے لیے بھیجا۔ لیکن نہار مسیلمہ سے بھی زیادہ فتنہ پرور ثابت ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ مسیلمہ کی اطاعت قبول کرتے جا رہے ہیں تو وہ ان لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو سرخرو کرنے کے لیے ان سے مل گیا اور مسیلمہ کی نبوت کا اقرار کرنے کے ساتھ رسولؐ اللہ کی جانب یہ جھوٹا قول بھی منسوب کیا کہ مسیلمہ ان کے ساتھ نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ اہلِ یمامہ کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص مسیلمہ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور وہ شخص معمولی آدمی نہیں بلکہ عالم، فاضل اور

فقیہ بھی ہے۔ ان کے سامنے قرآن پڑھتا اور اس کی تعلیمات سے انھیں آگاہ کرتا ہے۔ انھیں دین کا علم سکھاتا ہے۔ اب کہ وہ خود نبوتِ مسیلمہ کی گواہی دے رہا تھا تو مسیلمہ کی نبوت سے انکار کی گنجائش ہی کہاں رہی تھی چنانچہ بے وقوف لوگ جوق در جوق مسیلمہ کے پاس آنے اور بنی حنیفہ کے رسولؐ کی حیثیت سے اس کی بیعت کرنے لگے۔ اس طرح چند ہی دنوں میں اس کی طاقت کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

مسیلمہ نے اس کے صلے میں نہار الرجال کو اپنا خاص معتمد علیہ بنا لیا اور اس کے مشورے سے نبوت کا کاروبار انجام دینے لگا۔ اس کے بدلے نہار الرجال کو دنیا بھر کی نعمتیں میسر آگئیں۔ اور وہ ان سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے لگا۔ جب علماء اور فقہاء ہی دنیا کی نعمتوں کے حصول پر تل جائیں اور اپنی غرض کے لیے ذلیل خوشامد اور جھوٹی گواہی سے بھی دریغ نہ کریں تو عوام جو بھی کریں تھوڑا ہے۔

جہاں تک مسیلمہ کے معجزات دکھانے کا تعلق ہے تاریخ سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ لوگوں نے اس کا کوئی معجزہ دیکھ کر اسے قبول کیا اور نہ اس کی خود ساختہ وحی سے متاثر ہو کر اس پر ایمان لائے۔ مسیلمہ کا کاروبار چمکنے کے صرف وہی سبب تھے جن کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے۔

مسیلمہ کی اطاعت کیوں قبول کی گئی ؟

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ عوام تو خیر جاہل ہوتے ہیں انھیں حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی لیکن دانشورانِ قوم کی عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے تھے کہ انھوں نے آنکھیں بند کر کے مسیلمہ کی اطاعت قبول کر لی تو بات یہ ہے کہ اس کی تہ میں عربوں کی قومی عصبیت اور قبائلی خود مختاری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ طلیحہ نمری یمامہ آیا اور لوگوں سے پوچھا:

"مسیلمہ کہاں ہے ؟"

لوگوں نے کہا:

"تم اس کا نام اس قدر بے ادبی سے لیتے ہو حالانکہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

اس نے کہا:

"میں تو اس وقت تک اسے رسول ماننے کے لیے تیار نہیں جب تک اس سے مل نہ لوں۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

مسیلمہ کے پاس پہنچ کر طلیحہ نے اس سے پوچھا:

"تمھارے پاس کون آتا ہے؟"

"رحمان" مسیلمہ نے جواب دیا۔

"روشنی میں یا اندھیرے میں؟"

"اندھیرے میں۔"

اس پر طلیحہ بولا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ تم کذّاب ہو اور محمدؐ سچے ہیں لیکن اپنا کذّاب ہمیں دوسروں کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔"

چنانچہ اُس نے مسیلمہ کی اطاعت قبول کر لی اور اسی کے ہمراہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

مسیلمہ کی قوت و طاقت بڑھ جانے اور اس کے مقابلے میں عکرمہ کے شکست کھانے کے باعث ابوبکرؓ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ خالدؓ بن ولید کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے شرجیل بن حسنہ کو لکھا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں، جب تک خالدؓ ان کے پاس نہ پہنچ جائیں، مسیلمہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ (شرجیل) عمرو بن عاص کے پاس چلے جائیں اور شمالی حصے میں قضاعہ کے خلاف جنگ میں ان کی مدد کریں۔

شرجیل کی شکست

ابھی خالدؓ یمامہ کے رستے ہی پر تھے کہ مسیلمہ کی فوجوں نے شرجیل کی فوج سے ٹکر لی اور اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ شرجیل نے بھی وہی کیا جو اس سے پہلے عکرمہ کر چکے تھے یعنی وہ مسیلمہ پر فتح یابی کا فخر خود حاصل کرنے کے شوق میں آگے بڑھے۔ لیکن انھیں بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر بھی میرے خیال میں واقعہ اس طرح نہیں بلکہ خود یمامہ کے لشکر نے اِس

خیال سے کہ کہیں شرجبیل خالد سے مل کر انھیں نقصان نہ پہنچائیں، آگے بڑھ کر لشکر پر حملہ کر دیا اور شکست دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ دونوں میں سے کوئی بات ہوتی ہو مگر واقعہ یہی ہوا کہ شرجبیل اپنا لشکر لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ جب خالدؓ ان کے پاس پہنچے اور انھیں تمام واقعات کا علم ہوا تو انھوں نے شرجبیل کو بہت برا بھلا کہا۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر دشمن سے ٹکر لینے کی طاقت نہ ہو تو بے شک اس وقت تک اس کے مقابلے سے گریز کیا جائے جب تک مطلوبہ طاقت حاصل نہ ہو جائے بہ نسبت اس امر کے کہ طاقت نہ ہونے کے باوجود دشمن سے لڑائی چھیڑ دی جائے جس کے نتیجے میں شکست کھانی پڑے۔

خالدؓ سے مجاعہ کی مڈ بھیڑ

اب خالدؓ نے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر یمامہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ مسیلمہ کو بھی ان کی نقل و حرکت کی تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اسی دوران میں یہ واقعہ ہوا کہ بنی حنیفہ کا ایک شخص مجاعہ بن مرارہ، بنی عامر اور بنی تمیم کے چند اشخاص سے اپنے کسی رشتہ دار کے قتل کا انتقام لینے کے لیے چند لوگوں کے ہمراہ نکلا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر مسلمانوں سے جنگ شروع ہو گئی تو انتقام لینے کا موقع نہ مل سکے گا۔ چنانچہ اس نے ان قبائل میں پہنچ کر اپنا قصاص لیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چل پڑا۔ جب یہ لوگ 'ثنیۃ الیمامہ' پہنچے تو تھکاوٹ کی وجہ سے بے خبر پڑ کر سو گئے۔ دریں اثنا خالدؓ کا لشکر وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت یہ ہڑ بڑا کر اٹھے۔ خالدؓ کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے، اس خیال سے کہ ان سے لڑنے کے لیے نکلے ہیں، انھیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ انھوں نے کہا ہم آپ سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بنو تمیم سے انتقام لینے کے لیے نکلے تھے۔ اس پر خالدؓ نے پوچھا "اسلام کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

انھوں نے کہا:

"ایک نبی ہم میں ہے اور ایک نبی تم میں۔"

اس پر خالدؓ نے انھیں قتل کرا دیا۔

اس موقع پر ایک آدمی (ساریہ بن عامر) نے، عین اس وقت جب تلوار اس کا گلا کاٹنے

کے لیے تیار تھی، مجاعہ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اگر تم اپنی بھلائی چاہتے ہو تو اس آدمی کو چھوڑ دو۔"

خالدؓ نے بھی مجاعہ کو قتل نہ کرایا بلکہ بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لیا کیونکہ وہ بنی حنیفہ کے سرداروں میں سے تھا اور وہ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ خالدؓ کا خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے آگے چل کر اس کے ذریعے سے کوئی کام نکل سکے۔ انھوں نے اسے لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر اپنے خیمے میں ڈال دیا اور اپنی نئی بیوی لیلیٰ ام تمیم کو اس کی نگرانی کا کام سونپ دیا۔

خالدؓ اور مسیلمہ میں جنگ

مسیلمہ نے اپنا لشکر یمامہ کی ایک جانب عقربا میں جمع کیا تھا اور سارا مال اسباب لشکر کے پیچھے رکھا تھا۔ اس کا لشکر بعض روایات کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایتوں کے رو سے ستر ہزار تھا۔ ایسے عظیم الشان لشکر کا ذکر عربوں نے اس سے پہلے بہت ہی کم سنا تھا۔

خالدؓ اسی روز جب انھوں نے مجاعہ کو قید کیا تھا مسیلمہ کی فوج کے مقابلے میں آ گئے۔ دونوں لشکر میدانِ جنگ میں کھڑے آخری اعلان کے منتظر تھے۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ فتح مندی و کامرانی اسی کے حصے میں آئے گی اور وہ دوسرے لشکر کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگِ یمامہ کا دن اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں ایک منفرد دن ہے۔ کیونکہ اس روز اسلام اور نبوت کاذبہ کا آخری مقابلہ ہونے والا تھا۔

مسیلمہ کی طرف یمن، عمان، مہرہ، بحرین، حضرموت اور عرب کی جنوبی جانب، مکہ اور طائف سے خلیج عدن تک، کے تمام علاقوں کے لوگوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ ایرانی بھی بڑی بے صبری سے اس جنگ کے نتیجے کے منتظر تھے۔ مسیلمہ کا لشکر اس پر کامل ایمان رکھتا تھا اور اس کی راہ میں کٹ مرنے کے لیے تیار تھا۔ علاوہ بریں حجاز اور عرب کے جنوبی علاقوں کی دیرینہ دشمنی بھی مسلمانوں کے خلاف بنی حنیفہ کے اس جوش و خروش میں مزید اضافے کا موجب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا لشکر بھی اپنی ہیبت کے لحاظ سے کچھ کم طاقت ور نہ تھا۔ اس کے سپہ سالار خالدؓ بن ولید تھے جو بلاشبہ اپنے زمانے کے سالارِ اعظم تھے۔ لشکر میں کلام اللہ کے حافظوں اور قاریوں کی بھی کمی

رکھی۔ یہ تمام لوگ اس جذبے سے میدانِ جنگ میں آئے تھے کہ اللہ کے راستے میں جہاد اور اس کے دین کی مدافعت مومن کا فرضِ اوّلین ہے اور علم و بصیرت رکھنے والے کے لیے تو یہ فرض عین ہے۔ اس جذبے نے ان کے ولولوں اور امنگوں کو بہت بڑھا دیا تھا اور وہ تعداد میں مرتدین سے بہت کم ہونے کے باوجود عزم و ہمت میں اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔

ابنِ مسیلمہ کی آتش بیانی

لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسیلمہ کا لڑکا بنی حنیفہ کی صفوں میں پھر کر اپنے آتشیں الفاظ سے ان کی غیرت و حمیت کی آگ بھڑکاتے ہوئے یہ کہتا پھر رہا تھا:

"اے بنو حنیفہ! آج تمھاری غیرت کا امتحان ہے۔ اگر تم شکست کھا گئے تو تمھارے پیچھے تمھاری عورتیں لونڈیاں بنالی جائیں گی اور ان کے نکاح زبردستی دوسرے لوگوں سے کر دیے جائیں گے۔ اس لیے اپنے حسب و نسب کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کرو اور اپنی عورتوں کی عزت بچاؤ۔"

ادھر بدقسمتی سے مہاجرین و انصار اور بدویوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ دونوں فریقوں میں کون بہادر ہے۔ مہاجرین اور انصار کہتے تھے:

"ہم لوگ تم بدویوں سے زیادہ جنگ کے ماہر ہیں۔"

اس کے مقابلے میں اہلِ بادیہ کہتے تھے:

"مکہ اور مدینہ کے لوگ ہرگز اچھی طرح جنگ نہیں کر سکتے بلکہ انھیں تو یہ معلوم نہیں کہ جنگ کیسے کہتے ہیں۔"

مسلمانوں پر بنی حنیفہ کا دباؤ

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ شروع ہونے پر مسلمان بنی حنیفہ کے مقابلے میں ثابت قدم نہ رہ سکے اور پیچھے ہٹنے لگے یہاں تک کہ بنو حنیفہ خالدؓ کے خیمے تک پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے مجاعہ کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا اور ام متمیم کو اس کی نگرانی کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک آدمی نے لیلیٰ کو قتل

کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن مجاعہ چیخ اٹھا:

"ٹھہر جاؤ، میں اسے امان دیتا ہوں۔ تم اسے چھوڑ دو اور مردوں سے جا کر لڑو۔"

لشکر کے سپاہیوں نے خیمے کی رسیاں کاٹ ڈالیں اور خیمے کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ لیکن انھوں نے مجاعہ کو آزاد نہ کیا بلکہ اس امید میں کہ وہ ابھی مسلمانوں پر فتح یاب ہو کر واپس آ جائیں گے، اسے بیڑیوں میں جکڑا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

نہار الرجال کا قتل

مسلمانوں نے پیچھے ہٹنے کے باوجود پہلے ہی ہلّے میں بنی حنیفہ کے سینکڑوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ان قتل ہونے والوں میں سب سے پہلا شخص نہار الرجال تھا جو بنی حنیفہ کے 'مقدمہ' پر مقرر تھا۔ اسے حضرت عمرؓ کے بھائی زیدؓ بن خطاب نے قتل کیا تھا۔ اس کے قتل سے فتنۂ مسیلمہ کے سب سے بڑے سرغنے کا خاتمہ ہو گیا۔

خالدؓ کی حکمت عملی

لشکرِ اسلام کے پیچھے ہٹنے کے باوجود خالدؓ کے عزم و ثبات میں مطلق کمی نہ آئی اور انھیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی شکست کا خیال پیدا نہ ہوا۔ انھوں نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ لشکر کے پیچھے ہٹنے کا سبب فخر و مباہات کا وہ جذبہ تھا جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں پیدا ہو گیا تھا اور جس کے باعث ان میں کمزوری راہ پا گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے پکار کر اپنے لشکر سے کہا:

"اے لوگو! علیحدہ علیحدہ ہو جاؤ اور اسی حالت میں دشمن سے لڑو تاکہ ہم دیکھ سکیں، کس قبیلے نے لڑائی میں بہادری کا سب سے اچھا مظاہرہ کیا۔"

مجاہدین اسلام کا عزم و ثبات

خالدؓ کے اس حکم کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہر قبیلے نے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے

کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے دشمن کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ آخر مسلمانوں کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے فخر و مباہات اور تعلّی کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ نامناسب تھا۔ چنانچہ انصار کے ایک سردار ثابت بن قیس نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے مسلمانو! تم نے بہت بری مثال قائم کی ہے۔"

پھر اہلِ یمامہ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اے اللہ! جس کی یہ عبادت کرتے ہیں میں اس سے برارت کا اظہار کرتا ہوں۔"

اور مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے میں اس سے بھی بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ تلوار سونت کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بڑی بہادری سے لڑنے لگے۔ وہ لڑتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"میری تلوار کا مزہ چکھو۔ میں تمھیں صبر و استقلال کا حقیقی نمونہ دکھاؤں گا۔"

وہ اسی طرح بے جگری سے لڑتے رہے۔ ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں زخم نہ لگے ہوں۔ آخر اسی طرح لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

براء بن مالک ان صنادید عرب میں سے تھے جو پیٹھ دکھانا جانتے ہی نہ تھے۔ جب انھوں نے مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ تیزی سے کود کر ان کے سامنے آ گئے اور کہا:

"اے مسلمانو! میں براء بن مالک ہوں۔ میری پیروی کرو۔"

مسلمان ان کی بہادری اور شجاعت سے خوب واقف تھے۔ ان کی ایک جماعت براء کے ساتھ ہو لی۔ وہ اسے لے کر دشمن کے مقابلے میں آ گئے اور اس بہادری سے لڑے کہ دشمن کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑی۔

عین لڑائی کے دوران میں یہ اتفاق ہوا کہ سخت آندھی آ گئی اور ریت اڑ اڑ کر مسلمانوں کے چہروں پر پڑنے لگی۔ چند لوگوں نے اس پریشانی کا ذکر زیدؓ بن خطاب سے کیا اور پوچھا کہ اب کیا

کریں۔ انھوں نے جواب میں کہا:

"واللہ! میں آج کے دن اس وقت تک کسی سے بات نہ کروں گا جب تک دشمن کو شکست نہ دے لوں یا اللہ مجھے شہادت عطا نہ فرمائے۔ اے لوگو! آندھی سے بچاؤ کی خاطر اپنی نظریں نیچی کرلو اور ثابت قدم رہ کر لڑو۔"

یہ کہہ کر تلوار سونت لی اور دشمن کی صفوں میں گھس کر بے جگری سے لڑنے لگے۔ ان کا دستہ بھی ان کے پیچھے ثابت قدمی سے لڑ رہا تھا آخر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پورے ہو گئے اور انھوں نے اسی طرح لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کیا۔

ابوحذیفہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے:

"اے اہلِ قرآن! اپنے اعمال کے ذریعے سے قرآن کو عزت بخشو۔"

پھر خود بھی دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد جھنڈا ان کے غلام سالم نے اٹھایا اور کہا:

"اگر آج ثابت قدم نہ رہوں تو میں بدترین حاملِ قرآن ہوں گا۔"

چنانچہ وہ بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ان آوازوں نے جو ایمان و یقین سے بھرپور قلوب سے نکل رہی تھیں مسلمانوں کے لشکر میں بہادری کی ایک نئی روح پھونک دی۔ زندگی ان کی نظروں میں حقیر بن کر رہ گئی اور شہادت کی تمنا ہر دل میں چٹکیاں لینے لگی چنانچہ وہ بے جگری سے لڑے اور تھوڑی دیر میں مسیلمہ کے لشکر کو اس کی پہلی جگہ پر لا کھڑا کیا۔

جہاں مسلمان دینِ حق کی حفاظت اور حصولِ جنت کی خاطر لڑ رہے تھے وہاں مسیلمہ کا لشکر اپنے وطن، حسب و نسب اور ایسے کمزور عقیدے کی خاطر لڑ رہا تھا جو ان کے نزدیک وطن اور حسب و نسب سے بھی بہت کم درجے کا تھا۔ اسی لیے مسلمانوں نے بنو حنیفہ سے زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور انتہائی بے جگری سے لڑے۔

خالدؓ قتلِ مسیلمہ کے درپے

خالدؓ نے جب مسلمانوں کی جوش دلانے والی آوازیں سنیں تو انھیں بھی یقین ہو گیا کہ بنی حنیفہ

کی سخت مدافعت کے باوجود انجام کار فتح انھیں کے حصے میں آئے گی لیکن وہ چاہتے تھے کہ فتح کا حصول حتی الامکان جلد ہو جائے اس لیے بہت غور سے ایک بار میدان کا جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ بنو حنیفہ مسیلمہ کے گرد کٹ کٹ کر گر رہے ہیں اور مسیلمہ کی حفاظت میں موت کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ دیکھ کر انھیں یقین ہو گیا کہ فتح کے جلد از جلد حصول کا طریق یہ ہے کہ کسی طرح مسیلمہ کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے آدمی لے کر آگے بڑھے اور مسیلمہ کے آدمیوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس کے بعد کوشش کی کہ کسی طرح مسیلمہ ان کے سامنے آجائے تاکہ اس کا کام تمام کیا جا سکے لیکن قبل اس کے کہ مسیلمہ ان کے سامنے آتا، اس کے آدمیوں نے بڑھ چڑھ کر خالدؓ پر حملے کرنے شروع کیے۔ خالدؓ تو ان کے بس میں کیا آتے البتہ جو شخص ان کے مقابلے میں آتا زندہ واپس نہ جاتا۔ اس طرح بے شمار آدمی قتل ہو گئے۔

مسیلمہ کا تردد و اضطراب

جب مسیلمہ نے دیکھا کہ اس کے حامیوں کی تعداد بہ سرعت کم ہوتی جا رہی ہے تو اس نے خود خالدؓ کے مقابلے پر آنے کا ارادہ کیا لیکن اس خیال سے رک گیا کہ اگر وہ بھی خالدؓ کے مقابلے کے لیے نکلا تو لامحالہ مارا جائے گا۔ اب اس کے تردد اور اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ اس کے جاں نثار کٹ کٹ کر گر رہے تھے اور اسے خود بھی اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ وہ اس اضطراب کی حالت میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ یکایک خالدؓ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس کے محافظین پر ایک بھرپور حملہ کر کے تلوار کے جوہر دکھانے شروع کیے۔

یہ دیکھ کر مسیلمہ کے ساتھیوں نے اس سے پکار کر پوچھا:

"آپ کے وہ وعدے، جو اپنی فتح کے متعلق آپ نے ہم سے کیے تھے، کہاں گئے؟"

مسیلمہ کا فرار

اس وقت مسیلمہ کے حوصلے ختم ہو چکے تھے اور اس نے میدانِ جنگ سے بھاگنے کا عزم ارادہ

کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پیٹھ پھیرتے ہوئے جواب دیا:

"اپنے حسب و نسب کی خاطر لڑتے رہو۔"

لیکن اب وہ کیا لڑتے جب ان کا سردار انھیں مسلمانوں کی تلواروں کے سپرد کر کے انتہائی بزدلی کا مظاہر کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔

بنی حنیفہ کے ایک سردار محکم بن طفیل نے جب لوگوں کو بھاگتے اور مسلمانوں کو ان کا پیچھا کرتے دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگا:

"اے بنو حنیفہ! باغ میں داخل ہو جاؤ۔"

یہ باغ، جسے حدیقۃ الرحمٰن کہا جاتا تھا میدانِ جنگ سے قریب ہی تھا اور مسیلمہ کی ملکیت میں تھا۔ یہ بہت طویل و عریض تھا اور قلعے کی طرح اس کے چاروں طرف بلند دیواریں کھڑی تھیں۔ محکم بن طفیل کی آواز سن کر لوگوں نے اس باغ کی طرف بھاگنا شروع کیا (جس میں مسیلمہ پہلے ہی داخل ہو چکا تھا) لیکن محکم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مسلمانوں کو بنی حنیفہ کے تعاقب سے روکنے کے لیے میدانِ جنگ ہی میں رہ گیا تھا۔ اس نے بہت بہادری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور آخر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ایک تیر سے، جو اس کے سینے میں لگا، اس کا کام تمام ہو گیا۔

باغ کا محاصرہ

مسیلمہ اور اس کی قوم باغ میں پناہ گزین ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے لیے باغ کا محاصرہ کر لینے اور کامل فتح کے حصول تک وہاں سے نہ ٹلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ باغ کے چاروں طرف مسلمانوں نے پڑاؤ ڈال دیا اور کسی ایسی کمزور جگہ کی تلاش کرنے لگے جہاں سے باغ میں گھس کر اس کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو سکیں لیکن انتہائی تلاش کے باوجود انھیں ایسی کوئی جگہ نہ ملی۔

آخر براء بن مالک نے کہا:

"مسلمانو! اب صرف یہ راستہ ہے کہ تم مجھے اٹھا کر باغ میں پھینک دو۔ میں

اندر جاکر دروازہ کھول دوں گا۔"

لیکن مسلمان یہ کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ ان کا ایک بلند مرتبت ساتھی ہزاروں دشمنوں میں گھر کر اپنی جان گنوا دے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا لیکن براء نے اصرار کرنا شروع کیا اور کہا:

"میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مجھے باغ کے اندر پھینک دو۔"

آخر مجبور ہو کر مسلمانوں نے انھیں باغ کی دیوار پر چڑھا دیا۔ دیوار پر چڑھ کر جب براء نے دشمن کی زبردست جمعیت کی جانب نظر دوڑائی تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے لیکن پھر اللہ کا نام لے کر باغ کے دروازے کے سامنے کود پڑے اور دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرتے' دائیں بائیں لوگوں کو قتل کرتے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ آخر بیسیوں آدمیوں کے قتل کے بعد وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور آگے بڑھ کر بڑی پھرتی سے اسے کھول دیا۔

بنی حنیفہ کا قتل

مسلمان' باہر دروازہ کھلنے کے منتظر تھے ہی۔ جونہی دروازہ کھلا وہ باغ میں داخل ہو گئے اور تلواریں سونت کر دشمنوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے۔ بنو حنیفہ مسلمانوں کے سامنے سے بھاگنے لگے لیکن باغ سے باہر وہ کس طرح نکل سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اس وقت باغ اس مذبح کی صورت پیش کر رہا تھا جہاں بھیڑ اور بکریاں قصاب کو چھری ہاتھ میں لیے انھیں ذبح کرنے کے لیے اپنی طرف آتا دیکھتی ہوں لیکن بے بسی کی حالت میں کچھ نہ کر سکتی ہوں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف براء نے نہیں بلکہ اور بھی کئی مسلمانوں نے دیواریں پھاند کر دروازے کا رخ کیا تھا۔ چونکہ براء نے دروازے کے بالکل قریب دیوار پھاندی تھی۔ اس لیے دروازے پر سب سے پہلے وہی پہنچے اور لڑتے بھڑتے دروازہ کھول دیا۔ بنو حنیفہ نے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن دیوار پر جو مسلمان متعین تھے انھوں نے تیر مار مار کر انھیں مسلمانوں سے دور رکھا۔

مسیلمہ کا قتل

مسلمانوں نے اگرچہ باغ میں گھس کر بنو حنیفہ کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا تھا مگر بنو حنیفہ نے بھی بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ طرفین کے کثیر آدمی اس معرکے میں قتل ہوئے لیکن بنی حنیفہ کے مقتولوں کی تعداد مسلمانوں سے بیسیوں گنا تھی۔ حبشی غلام وحشی، جس نے جنگِ احد میں حمزہ بن عبدالمطلب کو شہید کیا تھا اور جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا، اس موقع پر موجود تھا۔ اس نے مسیلمہ کو باغ میں دیکھا اور اپنا چھوٹا سا نیزہ تاک کر مسیلمہ کے مارا جو سیدھا اُسے جا کر لگا۔ اسی وقت ایک انصاری نے بھی مسیلمہ پر تلوار کا وار کیا۔ وحشی کہا کرتا تھا "اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم میں سے کس نے اُسے قتل کیا لیکن مسیلمہ اگر مرنے کے بعد زندہ ہوتا تو ہمیشہ یہی کہتا کہ اسے اِس سیاہ فام غلام نے قتل کیا ہے"۔

جب بنو حنیفہ نے مسیلمہ کی خبر موت سنی تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ مسلمانوں نے انھیں بے تحاشا قتل کرنا شروع کیا۔ عرب میں اس وقت تک جتنی جنگیں ہوئی تھیں یمامہ سے بڑھ کر کسی بھی جنگ میں اتنی خونریزی نہ ہوئی تھی۔ اِس لیے حدیقۃ الرحمٰن کا نام حدیقۃ الموت پڑ گیا اور آج تک تاریخ کی کتابوں میں یہی نام چلا آتا ہے۔

جب باغ کا معرکہ ختم ہو چکا تو خالدؓ اپنے خیمے سے مجاعہ کو لے کر آئے اور اس سے کہا کہ وہ مقتولین کو دیکھ کر بتائے ان میں مسیلمہ کون سا ہے۔ مسلمان خود بھی مقتولین کی شناخت کے لیے باغ میں پھرنے لگے۔ جب وہ محکم الیمامہ کے پاس سے گزرے تو خالدؓ نے پوچھا:

"کیا یہ ہے تمھارا صاحب؟"

مجاعہ نے جواب دیا نہیں، یہ تو محکم الیمامہ ہے جو مسیلمہ سے بہت بہتر اور نیک انسان تھا۔ آخر پھرتے پھرتے وہ ایک زرد رو ٹھنگنے قد کے لاشے پر پہنچے مجاعہ نے کہا کہ یہ مسیلمہ ہے جسے تم نے قتل کر دیا ہے۔ خالدؓ نے کہا:

"یہ وہی شخص ہے جس نے تمھیں گمراہ کر کے ایک عظیم فتنہ برپا کر دیا تھا۔"

مفرورین کا تعاقب اور محاصرہ

اگرچہ مسیلمہ کا فتنہ ختم ہو چکا تھا اور وہ خود میدانِ جنگ میں اپنے ہزاروں آدمیوں کے ہمراہ مارا جا چکا تھا لیکن خالدؓ ابھی مطمئن نہ تھے۔ جنگوں میں آپ کا طریق کار یہ تھا کہ اس وقت تک دشمن کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے جب تک اس کی مخالفانہ سرگرمیاں دوبارہ شروع ہونے کا معمولی سا خدشہ بھی باقی رہتا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے طلیحہ کے مفرور ہو جانے کے باوجود اس وقت تک بنو اسد سے جنگ بند نہ کی جب تک ام زمل اور اس کے لشکر کا خاتمہ نہ کر دیا۔ پھر بنی تمیم کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے والے ایک ایک شخص کا تیا پانچا نہ کر دیا۔ یہی کام آپ نے اس موقع پر بھی کیا۔

جب خالدؓ حدیقۃ الموت کے معرکے سے فارغ ہو چکے تو عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے اُن سے کہا کہ اب لشکر کو کوچ کا حکم دیجیے اور چل کر بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر لیجیے کیونکہ بقیہ لوگ فرار ہو کر ان قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ خالدؓ نے جواب دیا فی الحال تو میں دستوں کو ان لوگوں کی تلاش میں روانہ کر رہا ہوں جو قلعوں میں نہیں گئے بلکہ ارد گرد کے علاقوں میں پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ اُنھوں نے چاروں طرف دستے روانہ کیے جو ارد گرد سے مالِ غنیمت اور عورتوں، بچوں کو لے آئے۔ خالدؓ نے انھیں قید کرنے کا حکم دیا اور فوج کو ہدایت کی کہ اب وہ چل کر بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر لے تاکہ اِن لوگوں میں جو دم خم باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

صلح کی بات چیت

لیلیٰ ام تمیم کو بنی حنیفہ کے ہاتھوں سے بچانے اور مسیلمہ کے بارے میں سچی باتیں کہنے کے باعث خالدؓ کو مجاعہ پر پورا بھروسا ہو گیا تھا۔ جب مسلمان بنی حنیفہ کے قلعوں کا محاصرہ کر چکے تو وہ خالدؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے بنو حنیفہ پر فتح حاصل کر لی ہے۔ یمامہ کے قلعوں میں ہمارے جنگجوؤں کی ایک بھاری تعداد اسلحہ سے لیس ابھی تک موجود ہے۔ وہ

لوگ بہت سختی سے آپ کا مقابلہ کریں گے۔ اگر آپ لڑائی سے بچنا چاہتے ہیں تو مجھے کچھ دیر کے لیے شہر میں جانے کی اجازت دیجیے۔ میں انھیں صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

خالدؓ کو معلوم تھا کہ لشکر کے لوگ لڑائی سے تنگ آچکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بنو حنیفہ پر جو فتح انھوں نے حاصل کی تھی اسی پر اکتفا کریں اور مزید جنگ و جدل سے پرہیز کریں۔ انھوں نے سوچا کہ مجاعہ کی بات مان لینی چاہیے۔ چنانچہ اسے جانے کی اجازت تو مرحمت فرمادی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ صلح میں بنو حنیفہ کو غلام نہ بنانے کی شرط شامل نہ ہوگی۔

مجاعہ کی چال بازی

مجاعہ نے شہر میں جاکر دیکھا کہ وہاں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس نے انھیں زرہ بکتر پہنائے اور سکھایا کہ وہ سب قلعے کی فصیل پر جمع ہوجائیں تاکہ مسلمان انھیں دیکھ کر ان کی کثرت تعداد سے دھوکا کھاجائیں اور ہماری پیش کردہ شرائط پر صلح کرلیں۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا اور زرہ بکتر پہن کر اور تلواریں اور نیزے ہاتھ میں لے کر فصیل پر پہنچ گئے۔ جب باہر سے خالدؓ اور مسلمانوں نے یہ نظارہ دیکھا تو انھیں یقین ہوگیا کہ مجاعہ نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ واقعی ابھی بنو حنیفہ میں دم خم باقی ہے اور وہ ابھی مزید لڑنے کی تاب رکھتے ہیں۔

خالدؓ اور بنو حنیفہ میں صلح

تھوڑی دیر میں مجاعہ بھی پہنچ گیا اور کہا: میری قوم آپ کی شرائط پر صلح کرنا نہیں چاہتی اور میں نے آپ سے جو عہد و پیمان کیے تھے وہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ خالدؓ دوبارہ لڑائی چھیڑنا نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے مجاعہ سے کہا: ہم نصف مال اسباب، نصف مزروعہ باغات اور نصف قیدیوں کو بنی حنیفہ کے لیے چھوڑ دیں گے، تم انھیں جاکر سمجھاؤ کہ وہ اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالیں اور صلح کرلیں۔ مجاعہ دوبارہ شہر میں گیا اور واپس آکر کہا: وہ لوگ ان شرائط پر بھی صلح کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ چوتھائی مال اسباب لینے پر رضامند ہوجائیں۔ خالدؓ راضی ہوگئے اور صلح نامہ لکھا گیا۔ صلح کے بعد جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کسی

جوان مرد کا نام ونشان بھی نہیں۔ انھوں نے مجاعہ سے پوچھا کہ تم نے مجھ سے دھوکا کیوں کیا؟ اُس نے کہا "میری قوم تباہ ہو جاتی۔ میرا فرض تھا کہ ان کی جانیں بچاؤں۔ اِس لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی۔" خالدؓ نے اس کا عذر قبول کر لیا اور صلح نامہ برقرار رکھا یہ روایت بھی آئی ہے کہ صلح نامہ لکھے جانے سے پہلے جب مجاعہ شہر میں گیا اور لوگوں سے صلح کی بات چیت کی تو ایک شخص سلمہ بن عمیر الحنفی نے کہا "واللہ! ہم تمھاری بات کبھی نہ مانیں گے کیونکہ ہمارے قلعے مضبوط ہیں، سامان خوراک وافر مقدار میں ہمارے پاس موجود ہے، سردی کا موسم بھی شروع ہو چکا ہے، مسلمان سخت سردی کی تاب نہ لا کر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

مجاعہ نے جواب دیا:

> "یہ محض تمھاری خوش فہمی ہے۔ تمھارا خیال ہے کہ میں تمھیں صلح پر آمادہ کر کے تم لوگوں سے دھوکا کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ یہ بات نہیں تمھیں معلوم ہے کہ ابن مسیلمہ نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے کہا تھا: اے لوگو! قبل اس کے کہ تمھاری عورتیں قیدی بنا لی جائیں اور بغیر حگیہ ان کے نکاح کر دیے جائیں، تم مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دو، میں بھی تمھیں اسی خطرے سے بچانے کے لیے آیا ہوں تم صلح کر لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو۔"

جب لوگوں نے مجاعہ کی باتیں سنیں تو وہ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے اور سلمہ بن عمیر کی بات کو ناقابل عمل سمجھ کر ترک کر دیا۔

بنی حنیفہ ابوبکرؓ کی خدمت میں

دریں اثنا ابوبکرؓ کا قاصد خالدؓ کے پاس یہ حکم لے کر آیا کہ اس شخص کو، جو لڑائی کے قابل ہو قتل کر دیا جائے۔ لیکن خالدؓ ان سے صلح کر چکے تھے۔ انھوں نے صلح توڑنا اور بدعہدی کرنا نہ چاہا۔ اس کے بعد بنو حنیفہ بیعت کرنے اور مسیلمہ کی نبوت سے برادت کا اظہار کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ یہ تمام لوگ خالدؓ کے پاس لائے گئے جہاں انھوں نے بیعت کی اور اپنے دوبارہ اسلام لانے کا اعلان کیا۔ خالدؓ نے ان کا ایک وفد ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ فرمایا۔ جب وہ لوگ

ابوبکرؓ کے پاس پہنچے تو انھوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"آخر تم لوگ مسیلمہ کے پھندے میں پھنس کر کس طرح گمراہ ہو گئے؟"

انھوں نے جواب دیا:

"اے خلیفۂ رسول اللہ! ہمارا سارا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے مسیلمہ نہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکا اور نہ اس کے رشتہ داروں اور قوم کو اس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکا۔"

مجاعہ کا فریب اور خالدؓ کی مصالحت

اس موقع پر شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ آخر خالدؓ مجاعہ کی فریب دہی کے باوجود کس طرح مصالحت پر تیار ہو گئے حالانکہ ان کی سختی ضرب المثل بن چکی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہونے کے علاوہ بنی حنیفہ کی جنگوں میں اس قدر خونریزی ہو چکی تھی کہ خالدؓ نے آخر ان سے درگزر کرنا اور رعایات سے بہرہ ور کرنا ہی مناسب خیال کیا۔

بنی حنیفہ کے مقتولین کی تعداد

روایات سے پتا چلتا ہے کہ حدیقۃ الموت کی لڑائی میں سات ہزار بنی حنیفہ قتل ہوئے تھے میدانِ جنگ میں بھی ان کے مقتولین کی تعداد سات ہزار تھی۔ اس کے بعد جب خالدؓ نے اپنے دستوں کو مفرورین کے تعاقب میں روانہ کیا تو بھی سات ہزار آدمی قتل ہوئے۔ جو صلح مجاعہ کے ذریعے سے پایۂ تکمیل کو پہنچی اس کی رو سے سارا مالِ غنیمت جو سونے چاندی اور ہتھیاروں پر مشتمل تھا مسلمانوں کی ملکیت ٹھہرا۔ اس کے علاوہ چوتھائی قیدی بھی ان کے حصے میں آئے۔ بنی حنیفہ کی بستیوں اور علاقے میں جو باغات اور مزروعہ زمینیں تھیں ان پر بھی خالدؓ کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ مجاعہ نے اپنی قوم کے بقیۃ السیف لوگوں کو قتل ہونے سے بچا لیا تھا لیکن یہ تمام لوگ دوبارہ اسلام قبول کر کے ابوبکرؓ کی حکومت تسلیم کر چکے تھے۔ اس لیے اب خالدؓ کے واسطے کوئی وجہ ایسی باقی نہ رہی تھی جس سے وہ مجاعہ پر ناراض ہوتے یا اس سے

انتقام لیتے۔

مسلمان شہدار کی تعداد

اِس جنگ میں جہاں بنی حنیفہ کے مقتولین کی تعداد پچھلی تمام جنگوں سے زیادہ تھی وہاں مسلمان شہدار کی تعداد بھی پچھلی تمام جنگوں کو مات کر گئی تھی۔ اِس جنگ میں مسلمان شہدار کی تعداد بارہ سو تھی۔ تین سو ستر مہاجرین، تین سو انصار اور باقی دیگر قبائل کے لوگ ان شہدار میں تین سو ستر صحابہؓ کبار اور قرآن کے حافظ بھی تھے جن کا مقام اور درجہ مسلمانوں میں بے حد بلند تھا۔ اگرچہ ان حافظوں کی شہادت سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا لیکن بعض اوقات ایک نقصان ڈہ چیز بھی آخر فائدے کا موجب بن جاتی ہے چنانچہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ابوبکرؓ نے اِس ڈر سے کہ کہیں آئندہ جنگوں میں بقیہ حافظوں سے بھی مسلمانوں کو ہاتھ نہ دھونے پڑیں قرآن جمع کرنے کا حکم دے دیا اور اِس طرح پہلی مرتبہ قرآن کریم ایک جلد میں مدوّن ہو گیا۔

مسلمانوں کا حزن والم

مسلمانوں کی بھاری تعداد کے شہید ہو جانے سے ان کے رشتہ داروں کو جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا اس کی تلافی صرف یہ چیز کر سکتی تھی کہ گو مسلمانوں کو کئی قیمتی جانوں کا نقصان اُٹھانا پڑا پھر بھی فتح کا شرف انھیں کے حصے میں آیا۔ عمرؓ بن خطاب کے صاحبزادے عبداللہ جنگِ یمامہ میں بہادری کے عظیم کارنامے انجام دینے کے بعد مدینہ واپس آئے تو ان کے والد نے کہا:

"جب تمھارے چچا زید شہید ہو گئے تھے تو تم واپس کیوں آ گئے اور کیوں نہ اپنا چہرہ مجھ سے چھپا لیا؟"

صرف عمرؓ ہی کا یہ حال نہ تھا بلکہ مکہ اور مدینہ کے سیکڑوں گھرانے اپنے بہادروں اور سپوتوں کی شہادت پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

بنت مجاعہ سے خالدؓ کی شادی

کیا خالدؓ بھی غم اور حزن سے اسی طرح بے تاب تھے جس طرح دوسرے مسلمان؟ اور کیا انسانی

خون کے مہیب و دہشت ناک سیلاب اور لاشوں کی کثرت نے ان کے دل میں گھبراہٹ کا کوئی جذبہ پیدا کیا تھا ؟ ہرگز نہیں اگر خالدؓ کی بھی یہ حالت ہوتی تو وہ آئندہ کبھی سپہ سالاری کے قابل نہ رہتے اور انھیں عراق و شام کے فاتح بننے کا فخر کبھی حاصل نہ ہوتا۔ اسی لیے نہ خالدؓ کو اس دوران میں کسی قسم کا خوف لاحق ہؤا اور نہ انھوں نے کبھی گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار کیا۔

جونہی وہ صلح نامے کی تکمیل سے فارغ ہوئے انھوں نے مجاعہ کو بلا بھیجا اور کہا اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ مجاعہ نے لیلیٰ ام تمیم کا واقعہ، دار الحکومت میں خالدؓ کی طلبی اور ابوبکرؓ کی ناراضی کا حال سنا ہؤا تھا اس لیے اُس نے جرأت کر کے کہا " مجھے اس سے معاف کیجیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ میری کمر توڑ دینے کا موجب بنیں گے اور خود بھی ابوبکرؓ کے عتاب سے نہ بچ سکیں گے۔"

لیکن خالدؓ نے اُس کی ایک نہ سنی اور کہا،

" تمھیں اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنی پڑے گی۔"

اِس پر مجبوراً مجاعہ کو اپنی بیٹی کی شادی خالدؓ سے کرنی پڑی۔

اِس شادی پر ابوبکرؓ کی ناراضی

جب خالدؓ کے اس فعل کی اطلاع ابوبکرؓ کو ہوئی تو انھیں شدید غصہ آیا۔ ام تمیم کے واقعے پر تو انھوں نے یہ کہ کر خالدؓ کی مدافعت کی تھی کہ انھوں نے مالک کی بیوی سے شادی کرنے کے لیے اسے قتل نہ کیا تھا بلکہ یہ محض غلط فہمی کی بنا پر ہؤا تھا۔ پھر اس موقع پر کسی ایک بھی مسلمان کی جان ضائع نہ ہوئی تھی لیکن مجاعہ کی بیٹی سے شادی تو اس حال میں ہوئی کہ بارہ سو مسلمانوں کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں میدانِ جنگ میں پڑی تھیں اور تمام قبائلِ عرب میں ایک ماتم برپا تھا۔ وہ بے حد حلیم الطبع ہونے کے باوجود اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے اور خالدؓ کو ایک سخت خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے طبری کے قول کے مطابق خون ٹپکتا تھا۔ انھوں نے تحریر فرمایا:

" اے خالدؓ بن ولید! تمھیں کیا ہؤا ؟ تم عورتوں سے نکاح کرتے پھرتے ہو حالانکہ

تمھارے خیمے کے سامنے بارہ سو مسلمانوں کا خون زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے خشک ہونے کی بھی نوبت نہیں آئی۔"

خالدؓ کو ابوبکرؓ کے خط سے بہت رنج ہوا۔ انھوں نے سر ہلا کر کہا "ہو نہ ہو یہ سب کچھ عمرؓ بن خطاب کی کارستانی ہے۔" لیکن یہ معاملہ ابوبکرؓ کے خط اور اس پر خالدؓ کے اظہار افسوس سے آگے نہ بڑھا۔

یمامہ کی جنگ میں خالدؓ نے مرتدین کی کمر توڑ ڈالی تھی اور اب ان کے لیے خاموشی سے ابوبکرؓ کی اطاعت اور دوبارہ اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا۔ مہرہ، عمان اور یمن کی جنگیں، جو جنگ یمامہ کے بعد وقوع پذیر ہوئیں، جنگ یمامہ سے زیادہ خطرناک نہ تھیں اس لیے ابوبکرؓ کو قدرے اطمینان کا سانس لینے اور خالدؓ کو تھوڑا آرام کرنے کا موقع مل گیا۔ خالدؓ مجاعہ کی بیٹی اور ام تمیم کو لے کر یمامہ کی ایک وادی 'وبر' میں مقیم ہو گئے تا آنکہ انھیں ابوبکرؓ کی جانب سے عراق جا کر ایرانیوں سے لڑنے کا حکم ملا۔

(۱۰)

بقیہ محاربات ارتداد

بحرین، عمان، مہرہ، یمن، کندہ اور حضر موت

شمالی عرب کے منکرین زکوٰۃ اور مرتد قبائل خالدؓ بن ولید کی فوج کشی کے نتیجے میں خلیفۂ رسول اللہ کی اطاعت قبول کر کے دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان قبائل کی حدود عرب کے شمال مشرقی حصے سے شروع ہو کر انتہائی مشرق میں خلیج فارس تک اور وہاں سے نیچے اتر کر مکہ کے جنوب مشرق تک پھیلی ہوئی تھیں حالانکہ جب ابوبکرؓ نے زمام خلافت سنبھالی تھی تو ان کا دائرۂ اقتدار مدینہ، مکہ اور طائف کے درمیان ایک چھوٹے سے مثلث نما خطے تک محدود تھا۔

مدینہ کے شمالی علاقے کے قبائل کی بغاوت نے بنی اسد اور بنی حنیفہ کی طرح خطرناک رنگ اختیار نہ کیا اور دومۃ الجندل کے سوا باقی تمام علاقوں نے کسی خاص قسم کی جدوجہد کے بغیر آسانی سے ابوبکرؓ کی اطاعت قبول کر لی۔

دومۃ الجندل کا حاکم اس زمانے میں اکیدر کندی تھا۔ وہ بدستور اسلامی حکومت کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ آخر عراق کی فتوحات کے دوران میں خالدؓ بن ولید نے اسے زیر کیا۔

جنوبی قبائل کا اصرار بغاوت

جہاں تک جنوبی علاقے کا تعلق ہے وہاں کے قبائل نے شمالی علاقے کے واقعات سے مطلق نصیحت حاصل نہ کی اور بدستور ابوبکرؓ کے خلاف بغاوت پر آمادہ اور ارتداد پر جمے رہے۔ اسی سبب سے جنوبی قبائل اور مسلمانوں کے درمیان مدت دراز تک جدال و قتال کا سلسلہ جاری رہا۔

جنوبی علاقہ، جو نصف عرب پر مشتمل ہے، خلیج فارس سے یمن کے شمال میں بحیرۂ احمر تک

پھیلا ہوا ہے اور اس میں بحرین، عمان، مہرہ، حضرموت، کندہ اور یمن کے صوبے واقع ہیں۔ مشرقی علاقوں سے مغربی علاقوں تک اور مغربی علاقوں سے مشرقی علاقوں تک آنے جانے کے لیے مذکورہ بالا تمام صوبوں سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ تمام صوبے خلیج فارس، خلیج عدن اور بحیرۂ احمر کے ساحلی علاقوں پر واقع ہیں اور یمن کے سوا باقی تمام کی چوڑائی بہت کم ہے ــــ اتنی کم کہ ان کی حدود اور ساحل بحر کا فاصلہ چند میل کا ہے۔ عرب کا سارا جنوبی علاقہ، جو ان صوبوں کو گھیرے ہوئے ہے، ایک خوفناک لق و دق صحرا پر مشتمل ہے جسے عبور کرنا کسی صورت ممکن نہیں۔ اس صحرا کو دیکھ کر آج بھی اسی طرح دہشت طاری ہو جاتی ہے جس طرح پہلے زمانوں میں ہوتی تھی۔ اسے 'ربع الخالی' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جنوبی عرب میں ایرانی اثر و نفوذ

ان صوبوں کے محل وقوع پر ایک نظر ڈالنے سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ ان میں ایرانی اثر و نفوذ بہت آسانی سے راہ پا سکتا تھا۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ بے حد دشوار تھا کیونکہ درمیان کے ہولناک اور ویران صحرا کو قطع کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ حجاز سے عمان و بحرین تک پہنچنے اور عمان و بحرین سے حجاز تک جانے کے لیے طول طویل ساحلی علاقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اس لحاظ سے بحرین، عمان، حضرموت اور یمن کے مشرقی و جنوبی صوبے حجاز کے شمالی علاقے سے تقریباً کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایرانی شہنشاہی نے ان علاقوں پر توجہ مبذول کی اور یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ یمن 'بدھان' کے اسلام قبول کرنے تک ایرانی عمل داری میں شامل رہا۔ 'بدھان' ابتدا میں کسریٰ کی جانب سے اس علاقے کا عامل تھا۔ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ نے اسے بدستور یہاں کا حاکم مقرر کیے رکھا۔ بحرین اور عمان بھی ایرانی عمل داری میں شامل تھے اور کثیر التعداد ایرانیوں نے بحرین اور عمان میں سکونت اختیار کر کے انھیں اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس وجہ سے ایرانی اقتدار میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ جب کبھی سلطنت ایران کو عربوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ ہوتا اور عرب ان کے اثر و اقتدار کو زائل کرنے کی کوشش کرتے

تو وہ ان ایرانی نژاد لوگوں سے کام لے کر اس بغاوت کو فرو کر دیتی اور آزادی کی جدوجہد کو ناکام بنا دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کے عہد میں عرب کے جن علاقوں کو سب سے آخر میں اسلام لانے کی توفیق ملی وہ عمان اور بحرین کے علاقے تھے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد انھیں نے سب سے اوّل ارتداد اختیار کیا مگر جب سخت جنگوں کے بعد فتنہ ارتداد پاش پاش ہو گیا اور اہل عرب دوبارہ ایک دینی اور سیاسی وحدت پر جمع ہو گئے تو یہی لوگ تھے جو سخت مجبور ہو کر سب سے آخر میں اسلام لائے۔

ان علاقوں میں جنگہائے ارتداد کے زمانۂ وقوع کے متعلق مؤرخین میں خاصا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں یہ جنگیں ۱۱ھ میں وقوع پذیر ہوئیں اور بعض کہتے ہیں ۱۲ھ میں۔ پھر بھی یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ یہ جنگیں ابوبکرؓ کی خلافت کے اوائل سے شروع ہوئیں اور اس وقت تک ختم نہ ہوئیں جب تک سارے عرب نے کاملاً ان کی اطاعت قبول نہ کر لی۔ ابتداً شمالی عرب سے ہوئی اور وہاں کے مرتدین کا قلع قمع ہونے کے بعد جنگوں کا رُخ جنوبی علاقے کی طرف پھر گیا۔

جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ جنوبی علاقوں میں سرگرمیوں کی ابتداء یا تو بحرین سے کرتے اور عمان، مہرہ، حضرموت کے علاقوں کو زیر کرتے ہوئے یمن تک پہنچ جاتے یا اپنی کارروائیاں یمن سے شروع کرتے اور حضرموت، مہرہ اور عمان کے لوگوں کی سرکوبی کرتے ہوئے ان کارروائیوں کا اختتام بحرین پر کرتے۔

جنگی کارروائی کا آغاز

تمام حالات کے پیش نظر مسلمانوں نے بحرین سے جنگی کارروائی کا آغاز کرنا مناسب خیال کیا۔ کیونکہ اوّل تو بحرین یمامہ سے بالکل نزدیک تھا اور یمامہ میں عقربا کے مقام پر وہ ابھی بنی حنیفہ کے مقابلے میں عظیم الشان فتح حاصل کر چکے تھے جس کی وجہ سے ان کی دھاک تمام قبائل عرب پر بیٹھ چکی تھی۔ دوسرے یمن کے مقابلے میں یہاں سے کارروائی کا آغاز کرنا نسبتاً سہل بھی تھا۔ اگر یہاں کامیابی حاصل ہو جاتی تو اس کا اثر دوسرے قبائل پر پڑنا لازم تھا۔

پھر بھی اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بحرین پر مسلمانوں کا تسلّط کسی خاص کوشش کے بغیر ہو گیا تھا۔ بحرین اصل میں ہجر سے ملحق ایک تنگ ساحلی پٹی ہے جو خلیج فارس کے کنارے قطیف سے عمان تک پھیلی ہوئی ہے بعض جگہوں پر قوصحرا اس پٹی کو قطع کرتا ہوا خلیج تک پہنچ گیا ہے۔ شمال مغربی جانب وہ یمامہ سے ملحق ہے۔ یمامہ اور بحرین کے درمیان اونچے نیچے ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہے جسے عبور کرنا چنداں دشوار نہیں۔ ربیعہ کے قبائل: بنی بکر اور بنی عبد القیس کا قیام بحرین اور ہجر کے علاقوں میں تھا۔ ان علاقوں میں تاجروں کی ایک جماعت بھی مقیم تھی جو ہندوستان اور ایران سے آئے تھے اور دریائے فرات کے دہانے سے عدن کے ساحلی علاقے تک کے درمیانی خطے میں آباد ہو گئے تھے۔ ان تاجروں نے یہاں کے مقامی باشندوں سے سلسلۂ ازدواج بھی قائم کر لیا تھا اور ان سے جو نسل پیدا ہوئی تھی اُسے 'الابناء' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بحرین کے علاقے کا بادشاہ ایک عیسائی، منذر بن ساوی العبدی تھا۔ ۹ھ میں جب رسول اللہ نے اپنے قاصد علاء بن حضرمی کو اس کے پاس بھیجا تو یہ اسلام لے آیا جس پر رسول اللہ نے اسے بدستور بحرین کا حاکم مقرر کیے رکھا۔ اسلام لانے کے بعد اُس نے اپنی قوم کو بھی دینِ حق کی دعوت دینی شروع کی اور جارود بن معلی کو دینی تربیت حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جارود نے مدینہ پہنچ کر اسلامی تعلیمات اور احکام سے واقفیت حاصل کی اور اپنی قوم میں واپس جا کر لوگوں کو دین کی تبلیغ کرنے اور اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا کام شروع کر دیا۔

بحرین میں ارتداد کا آغاز

جس مہینے رسول اللہ نے وفات پائی اسی مہینے منذر بن ساوی کا بھی انتقال ہوا اور عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح بحرین والے بھی سب کے سب مرتد ہو گئے۔ رسول اللہ کے ایلچی علاء حضرمی کو بحرین سے نکلنا پڑا لیکن جارود بن معلی عبدی بدستور اسلام پر قائم رہے۔ انھوں نے اپنی قوم بنو عبد القیس سے ارتداد کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا:

"اگر محمدؐ نبی ہوتے تو کبھی وفات نہ پاتے۔"

جارود نے پوچھا:

"تم جانتے ہو محمدؐ سے پہلے بھی اللہ اپنے انبیاء کو مبعوث فرماتا رہا وہ سب کے سب کہاں گئے؟"

انھوں نے جواب دیا:

"فوت ہو گئے۔"

جارود نے کہا:

"جس طرح دیگر انبیاء فوت ہو گئے اسی طرح محمد رسول اللہ بھی فوت ہو گئے۔ اگر دوسرے انبیاء کے فوت ہونے سے ان کی نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑا تو رسول اللہ کے فوت ہونے سے آپ کی نبوت کس طرح زائل ہو سکتی ہے؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔"

جارود کی باتوں کا ان کی قوم پر بہت اثر ہوا اور وہ لوگ دوبارہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ بنو عبد القیس تو اسلام لے آئے لیکن بحرین کے دوسرے قبائل حطم بن ضبیعہ کے زیر کمان بدستور حالتِ ارتداد پر قائم رہے اور انھوں نے بادشاہی کو دوبارہ آل منذر میں منتقل کر کے منذر بن نعمان کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ سب سے پہلے انھوں نے جارود اور قبیلہ بنی عبد القیس کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں اس کوشش میں یکسر ناکامی ہوئی۔ اس پر حطم بن ضبیعہ نے طاقت کے زور سے انھیں زیر کرنا چاہا۔ اس نے قطیف اور ہجر میں مقیم غیر ملکی تاجروں اور ان لوگوں کو، جنھوں نے اس سے قبل اسلام قبول نہ کیا تھا، اپنے ساتھ ملا لیا اور قصبہ جواثی کے قریب جارود اور ان کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ نہایت سخت تھا۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے بنو عبد القیس جاں بلب ہو چکے تھے لیکن انھوں نے انتہائی ثابت قدمی دکھائی اور دوبارہ ارتداد اختیار کرنا قبول نہ کیا۔

علاء بن حضرمی کی روانگی

بحرین سے ارتداد کی خبریں موصول ہونے پر ابوبکرؓ نے علاء بن حضرمی کو مرتدین کے مقابلے کے لیے روانہ فرمایا۔ دریں اثنا خالدؓ بن ولید، مسیلمہ اور اس کے پیروؤں کو عقربا میں عبرت ناک شکست دے

چکے تھے۔ اِس لیے جب علاء یمامہ سے گزرے تو بنی حنیفہ کی ایک کثیر جمعیت ثمامہ بن آثال اور قیس بن عاصم منقری کے زیرِ سرکردگی ان کے ساتھ ہولی۔ اہلِ یمن اور بعض دیگر قبائل کے لوگ بھی کثیر تعداد میں ان کے لشکر میں شامل تھے جنھیں یقین تھا کہ مسلمان آخر سارے عرب پر قابض ہو جائیں گے اور ان کی مخالف طاقتوں کو لامحالہ زیر ہونا پڑے گا۔

ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا ہے کہ لوگ قوت و طاقت ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ چنانچہ قیس بن عاصم جو اپنے قبیلے بنو تمیم کو لے کر علاء کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، اِس سے پہلے منکرین زکواۃ کی صفِ اوّل میں شامل تھے۔ قبیلے کی زکواۃ انھوں نے مدینہ بھیجنی بالکل بند کر دی تھی اور زکواۃ کا جمع شدہ مال لوگوں کو واپس کر دیا تھا لیکن جب خالدؓ نے بنو حنیفہ کو زیر کر لیا اور ان کے سب کس بل نکال دیے تو قیس کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ خاموشی سے مسلمانوں کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیں۔ چنانچہ جب علاء بن حضرمی یمامہ سے گزرے تو موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے انھوں نے قبیلے سے زکواۃ دوبارہ اکٹھی کی اور اسے لے کر علاء سے مل گئے اور ان کے ساتھ ہی اہلِ بحرین سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

مرتدینِ بحرین کی شکست

علاء بن حضرمی لشکر لے کر بحرین پہنچے اور حطم کے قریب خیمہ زن ہو گئے۔ وہاں سے انھوں نے جارُود کو، جو بنی عبد القیس کے ساتھ قلعہ بند تھے، پیغام بھیجا کہ اسلامی لشکر آ پہنچا اس لیے گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔ خود انھوں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ محاذِ جنگ اور دشمنوں کا جائزہ لینے سے انھیں معلوم ہوا کہ مرتدین اس قدر بھاری تعداد میں ان کے مقابلے کے لیے موجود ہیں کہ بے سوچے سمجھے ان پر حملہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے لشکر کے اردگرد خندق کھدوائی اور اس کے پیچھے لشکر لے کر پڑاؤ ڈال دیا۔ کبھی کبھی وہ خندق عبور کر کے مرتدین پر حملہ کرتے اور تھوڑی دیر کی لڑائی کے بعد پھر خندق کے پیچھے ہٹ آتے۔ اسی طرح ایک مہینا گزر گیا۔ کسی فریق کو معلوم نہ تھا کہ لڑائی کا انجام کیا ہو گا۔ آخر ایک رات مسلمانوں کو مرتدین پر بھرپور حملہ کرنے کا موقع مل ہی گیا جس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے دشمن کو تہس نہس کر ڈالا۔

واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک رات لشکر گاہ مشرکین کی طرف سے سخت شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ علاء بن حضرمی نے اپنے جاسوسوں کو خبر لانے کے لیے دشمنوں کے کیمپ میں روانہ کیا۔ انھوں نے آکر خبر دی کہ مشرکین کا لشکر شراب میں دھت ہے اور واہی تباہی بک رہا ہے۔ علاء نے موقع غنیمت جان کر فوج کو ہمراہ لیا اور خندق عبور کر کے دشمن کے لشکر میں داخل ہوتے ہی اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

دشمن نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ سیکڑوں لوگ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے خندق میں گر پڑے۔ بیسیوں لوگوں کو گھبراہٹ اور دہشت کی وجہ سے کہیں جائے فرار نہ ملتی تھی اور وہ اسی حالت میں قتل کر دیے گئے۔ ہزاروں لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ اسی ہنگامے کے دوران میں قیس بن عاصم نے حطم کو زمین پر گرا ہوا پایا۔ اس نے جھٹ تلوار نکال آن کی آن میں اس کا کام تمام کر دیا۔ عفیف بن منذر الغرور کو مسلمانوں نے زندہ گرفتار کر لیا۔ جب وہ علاء کے سامنے پیش کیا گیا تو علاء نے کہا:

"تمھیں نے تھے جنھوں نے ان لوگوں کو دھوکا دیا تھا؟"

غرور نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیا اور کہا:

"میں دھوکا دینے والا نہیں البتہ اپنی طاقت پر ناز ضرور تھا۔"

یہ سن کر علاء نے اسے معاف کر دیا۔

دارین میں مفرورین کی پناہ

جو لوگ قتل اور قید ہونے سے بچ گئے تھے انھوں نے کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرۂ دارین میں پناہ لی۔ علاء نے فی الحال ان سے تعرض نہ کیا بلکہ اپنی توجہ بحرین کے دوسرے علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے پر مبذول کی۔ جب سارے علاقے میں امن قائم ہو گیا، قبائل نے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی اور علاء کے لشکر میں بھی معتد بہ اضافہ ہو گیا تو انھوں نے لشکر کو دارین پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ کسی مرتد کے لیے کوئی جائے فرار اور جائے پناہ باقی نہ رہے۔

دارین کی فتح

دارین خلیج فارس کا ایک جزیرہ ہے جو بحرین کے بالمقابل چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں بعض عیسائی خاندان آباد تھے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ علاء نے جب مسلمانوں کو اس جزیرے پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو ان کے پاس کشتیاں نہ تھیں جن پر سوار ہو کر وہ جزیرے تک پہنچتے۔ یہ دیکھ کر علاء کھڑے ہوئے اور کہا:

"اے لوگو! تمھیں اللہ نے خشکی میں اپنے نشانات دکھائے ہیں۔ کیا وہ سمندر میں اپنے نشانات نہیں دکھا سکتا؟ اس نے خشکی میں نشانات اسی لیے دکھائے ہیں کہ سمندر کی مہموں میں بھی تمھارے حوصلے قائم رہیں۔ اس لیے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور بے دھڑک سمندر میں کود پڑو، اللہ تمھارا حافظ و ناصر ہوگا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے تمام مرتدین کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور تم آسانی سے ان پر غلبہ حاصل کر سکتے ہو۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور کمر ہمت کس کر سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

لشکر نے یک زبان ہو کر جواب دیا:

"اے ہمارے سردار! ہم ہر وقت آپ کا حکم بجا لانے کے لیے تیار ہیں۔ جب ہولناک صحرا ہمیں مرعوب نہ کر سکے تو سمندر ہمارے آگے کیا چیز ہے۔"

چنانچہ لشکر نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ساحل بحر پر پہنچ کر وہ گھوڑوں، گدھوں، خچروں، اونٹوں پر سوار ہوئے اور اللہ کا نام لے کر انھیں سمندر میں ڈال دیا لیکن اللہ کی قدرت سے انھیں مطلق نقصان نہ پہنچا۔ ان کی سواریاں سمندر میں اس طرح جا رہی تھیں جیسے خشکی پر سفر کر رہی ہوں۔ سمندر کا پانی اونٹوں کے صرف پاؤں تک تھا۔

ممکن ہے کہ اس وقت خلیج فارس میں جزر آیا ہوا ہو یا روایات میں مبالغہ ہو اور درحقیقت مسلمانوں کو مقامی باشندوں کے ذریعے سے کشتیاں دستیاب ہو گئی ہوں جن پر سوار ہو کر انھوں نے سمندر عبور کیا ہو (اگرچہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں) پھر بھی اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان دارین تک

پہنچ ہی گئے اور مفرورین کا سخت مقابلہ کر کے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔ اس جنگ میں انھیں کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی کثرت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سوار کے حصّے میں چھ ہزار درہم اور پیدل کے حصّے میں دو ہزار درہم آئے[1]

بحرین کو علاء کی واپسی

دارین سے فراغت حاصل کر کے علاء بن حضرمی بحرین واپس پہنچے لشکر کے چند لوگوں نے دارین ہی میں رہنا پسند کیا، باقی علاء کے ساتھ آ گئے۔ بحرین پہنچ کر انھوں نے ابوبکرؓ کی خدمت میں فتح کی خوش خبری بھیجی اور خود مزید احکام ملنے تک بحرین میں مقیم رہے۔ اب اگر انھیں خطرہ تھا تو بعض ان بدوی قبائل کی طرف سے جن کا پیشہ ہی لوٹ مار اور غارت گری تھا، یا ایرانیوں کی فریب کاریوں کا جن کے اثر و نفوذ کو مسلمانوں کی پیش قدمی کے نتیجے میں سخت دھچکا لگا تھا۔ پھر بھی وہ اس طرف سے بڑی حد تک مطمئن تھے کیونکہ دارین جانے سے پہلے ہی بحرین کے متعدد قبائل اور ابناء نے سچے دل سے ان کی اطاعت قبول کر کے اپنے آپ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں پیش پیش عتیبہ بن نہاس اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے شکست خوردہ قبائل اور فسادی عنصر کو دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

عراق کی جانب پیش قدمی

مثنیٰ بن حارثہ نے تو ایرانی فریب کاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ جد و جہد شروع کر دی اور اس غرض کے لیے خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر کے دریائے فرات کے دہانے تک پہنچ گئے۔ مثنیٰ کا عراق کی سرحد پر پہنچ کر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنا اور اس علاقے میں تبلیغ اسلام کی جد و جہد کرنا عراق کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

---

[1] ایک روایت میں مذکور ہے کہ علاء نے اس موقع پر یہ جنگ نہیں کی اور یہ جزیرہ بدستور اسلامی سلطنت سے الگ تھلگ رہا اور عمرؓ بن خطاب کے زمانے میں اس کی فتح عمل میں آئی۔

عمان میں جنگ وجدل

بحرین کے واقعات کے بعد اب ہم عمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں ارتداد کا فتنہ دوسرے علاقوں کے فتنوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

عمان رسولؐ اللہ کے عہد میں ایرانیوں کی عمل داری میں شامل تھا۔ ایرانیوں کی جانب سے یہاں جیفر نامی ایک شخص عامل مقرر تھا۔ رسولؐ اللہ نے اسلام کا پیغام اس تک پہنچانے کے لیے عمرو بن عاص کو اس کے پاس بھیجا۔ جیفر نے کہا مجھے اسلام لانے میں تو کوئی عذر نہیں لیکن یہ ڈر ضرور ہے کہ اگر میں نے یہاں سے زکواۃ اکٹھی کر کے مدینہ بھیجی تو میری قوم مجھ سے بگڑ جائے گی۔ اس پر عمرو بن عاص نے اسے پیش کش کی کہ اس علاقے سے زکواۃ کا جو مال وصول ہو گا وہ اسی علاقے کے غربا پر خرچ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جیفر اسلام لے آیا۔ عمرو بن عاص نے بھی یہیں سکونت اختیار کر لی۔ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد جب اہلِ عمان نے بھی ارتداد اختیار کیا تو عمرو بن عاص تو مدینہ چلے آئے اور جیفر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔

عمان میں فتنۂ ارتداد کا بانی

عمان میں فتنۂ ارتداد کا بانی ذوالتاج لقیط بن مالک ازدی تھا جس نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ ابوبکرؓ نے حمیر کے ایک شخص حذیفہ بن محصن غلفانی کو عمان اور قبیلہ ازد کے ایک شخص عرفجہ بن ہرثمہ البارقی کو مہرہ بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کریں اور جنگوں کا آغاز عمان سے کریں۔ جب عمان میں جنگ ہو تو حذیفہ قائد ہوں گے اور جب مہرہ میں جنگ پیش آئے تو عرفجہ سپہ سالاری کے فرائض انجام دیں گے۔

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ابوبکرؓ نے عکرمہ بن ابوجہل کو یمامہ میں فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا تھا اور شرجیل بن حسنہ کو ان کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ لیکن عکرمہ نے شرجیل کا انتظار کیے بغیر مسیلمہ کی فوجوں پر حملہ کر دیا تاکہ فتح کا فخر تنہا ان ہی کے حصے میں آئے۔ لیکن مسیلمہ نے انھیں شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ ابوبکرؓ نے ان کی جلد بازی پر ملامت کرتے

ہوئے انھیں مدینہ آنے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ عمان جا کر باغیوں کے مقابلے میں حذیفہ اور عرفجہ کی مدد کریں۔ ابوبکرؓ نے ان دونوں سرداروں کو بھی اس کی اطلاع دے دی اور حکم دیا کہ وہ کوئی کام عکرمہ سے مشورہ کیے بغیر نہ کریں۔ عکرمہ ان دونوں سرداروں کے پہنچنے سے پہلے ہی عمان پہنچ گئے۔ جب یہ تینوں قائد اکٹھے ہوئے تو باہم صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ جیفر اور اس کے بھائی عیاذ[1] کو، جو پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں، لکھا جائے کہ وہ آ کر اسلامی لشکر سے مل جائیں۔

مسلمانوں کی کامیابی

جب لقیط کو مسلمانوں کے آنے کا پتا چلا تو وہ لشکر لے کر دبا میں خیمہ زن ہو گیا۔ ادھر جیفر اور عباد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں سے نکل کر پہلے صحار پہنچے اور وہاں سے چل کر اسلامی فوج سے آ کر مل گئے۔ دبا کے میدان کارزار میں دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ابتدا میں لقیط کا پلہ بھاری تھا۔ مسلمان شدید اضطراب کی حالت میں تھے اور ان کی صفوں میں انتشار کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ قریب تھا کہ انھیں شکست ہو جاتی کہ اللہ کی نصرت بنو عبد القیس اور بحرین کے دوسرے قبائل کی جانب سے بھاری کمک کی صورت میں نمودار ہوئی جس سے جنگ کا پانسا بالکل پلٹ گیا۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی قوت و طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور وہ بڑھ چڑھ کر لقیط کی فوج پر حملے کرنے لگے۔ اس جنگ میں انھوں نے دشمن کے دس ہزار آدمی قتل کیے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا اور کثیر مال غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح عمان میں بھی ارتداد کے فتنے کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کی حکومت پائیدار بنیادوں پر قائم ہو گئی۔

جنگ کے بعد حذیفہ نے عمان ہی میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے حالات کی درستی اور امن و امان قائم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عرفجہ ابوبکرؓ کی خدمت میں خمس پیش کرنے کے لیے مدینہ چلے گئے اور عکرمہ اپنا لشکر لے کر مہرہ کی بغاوت فرو کرنے اور اسلام کا علم دوبارہ بلند

[1] کامل ابن اثیر میں جیفر کے بھائی کا نام عباد کے بجائے عیاذ لکھا ہے۔

کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

مہرہ میں جنگ

عکرمہ نے حذیفہ کو جنوبی عرب کے انتہائی مشرقی علاقے عمان میں چھوڑا تھا اور خود مہرہ کی بغاوت فرو کرنے اور ارتداد کا فتنہ مٹانے کی غرض سے بہ جانب غرب روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے ہمراہ مسلمانوں کی بھاری جمعیت تھی جو زیادہ تر ان قبائل کے لوگوں پر مشتمل تھی جو ارتداد سے تائب ہو کر دوبارہ اسلام کی آغوش میں آ چکے تھے۔ مہرہ پہنچ کر انھیں دو جماعتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ ہر جماعت چاہتی تھی کہ ملک کا اقتدار اسی کے ہاتھ میں رہے اور دوسری جماعت اس کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرے۔ یہ صورت حال دیکھ کر عکرمہ نے مناسب سمجھا کہ وہ کمزور جماعت کو ساتھ ملا کر اس کی مدد سے طاقت ور جماعت پر غلبہ حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور کمزور جماعت کے ساتھ گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر کے اسے اسلام لانے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

عکرمہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے اپنی فوج اور اہل مہرہ کے نو مسلم لوگوں کو لے کر طاقت ور جماعت کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس موقع پر دبا سے بھی زیادہ گھمسان کا رن پڑا جس میں انجام کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور انھیں کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔

عکرمہ نے فتح کی خوش خبری اور خمس ارسال کرنے کے علاوہ حلیف جماعت کے سردار کو بھی ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کیا اور خود امن و امان بحال کرنے کی غرض سے کچھ عرصے کے لیے مہرہ ہی میں ٹھہر گئے۔ جب یہاں کے حالات کے متعلق انھیں کامل اطمینان ہو گیا تو خلیفۃ المسلمین کے احکام کے مطابق بھاری فوج کے ہمراہ جس میں دیگر قبائل کے علاوہ اہل مہرہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ مہاجر بن ابی امیہ کی مدد کے لیے یمن کی جانب روانہ ہو گئے۔

یمن میں قیام امن کی مساعی

عکرمہ ساحل کے ساتھ ساتھ مہرہ سے حضر موت اور کندہ کی جانب بڑھے۔ اس سفر میں انھیں کسی

خاص دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ حضرموت مہرہ سے ملحق ہے۔ البتہ مہاجر بن ابی امیہ کو وہاں تک پہنچنے میں سخت مشکلات پیش آئیں کیونکہ انھیں شمالی جانب سے یمن پہنچنا تھا۔ عکرمہ مہاجر سے ملنے کی خاطر تیزی سے سفر کرتے یمن پہنچے۔ یمن کی بغاوت کو مدت دراز گزر چکی تھی اور فتنے کے جراثیم نے سارا علاقہ سخت مسموم کر رکھا تھا۔ اس لیے اب کہ دوسرے علاقوں سے بغاوت اور فتنہ و فساد کے شعلے سرد کیے جا چکے تھے، ضروری تھا کہ یمن میں بھی امن و امان قائم کرنے کی سعی بلیغ کی جاتی تاکہ نہ صرف اس علاقے کی جانب سے سلطنت اسلامیہ کو اطمینان نصیب ہوتا بلکہ کندہ اور حضرموت کے بقیہ مرتدین کے استیصال میں بھی آسانی پیدا کی جا سکتی۔

یمن میں بغاوت کے اسباب

صفحات ماقبل میں اسود عنسی کی بغاوت کا حال بالتفصیل بیان کیا گیا تھا کہ کس طرح اس نے نبوت کا دعویٰ کر کے صنعاء کی طرف کوچ کیا، کس طرح انتہائی سرعت سے مکّہ اور طائف تک اس کا اثر جا پہنچا، اور کس طرح اس کی بیوی آزاد کی سازش سے، جو قبل ازیں صنعاء کے بادشاہ شہر بن بازان کی زوجیت میں تھی، عنسی کیفر کردار کو پہنچا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عنسی کے قتل کی خبر مدینہ میں عین اس روز پہنچی جس روز رسول اللہ کا وصال ہوا تھا۔ ابوبکرؓ نے فیروز کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا لیکن رسول اللہ کی خبرِ وفات سن کر بغاوت کے شعلے ایک بار پھر زور و شور سے بھڑک اٹھے۔ مزید برآں کئی عوامل اس قسم کے پیدا ہو گئے جنھوں نے اس آگ کو بھڑکانے میں اور زیادہ مدد دی۔

شورشِ یمن کا پہلا سبب

بغاوت کی آگ کو زیادہ بھڑکانے کا پہلا سبب یہ بنا کہ اس علاقے میں ایک متحدہ حکومت قائم کرنے کے بجائے اسے مختلف عمال کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ بازان کی وفات کے بعد یمن کی حکومت میں اس کے بیٹے شہر کے علاوہ دیگر عمال کو بھی شریک کر لیا گیا۔ شہر کو صنعاء کی ولایت سپرد کی گئی۔ اور دیگر عمال کو نجران اور ہمدان وغیرہ کی۔ اس صورتِ حال نے اسود عنسی کو بغاوت کرنے پر مزید جرأت

دلائی۔ صرف یمن ہی کا یہ حال نہ تھا بلکہ یمن کے شمالی علاقے میں بھی جو مکہ اور طائف تک پھیلتا چلا گیا تھا، سلطنت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے اسے مختلف عمال کے زیرِ حکومت دے دیا گیا، چنانچہ تہامہ کا وہ علاقہ جو ساحل بحر کے متوازی واقع تھا ایک حاکم کے ماتحت تھا اور اندرونی علاقہ دوسرے عمال کے ماتحت۔ اسود عنسی کا فتنہ فرو ہو جانے کے بعد ان عمال میں سے ہر ایک نے یہی چاہا کہ وہ اپنی جگہ واپس جا کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالے اور اگر اس مقصد کے لیے لڑنا بھی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔

دوسری طرف اسودِ عنسی کے مددگاروں کو یہ صورتِ حال گوارا نہ تھی کہ جو علاقہ عنسی نے سخت کوشش اور جدوجہد کے بعد قبضے میں کیا تھا وہ دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے۔ اس لیے انھوں نے بھی مسلمان حکام کو دوبارہ اپنے اپنے علاقوں پر مسلّط ہونے سے روکنے اور اسودِ عنسی کی جگہ لینے کے لیے کارروائی شروع کر دی۔

تیسری جانب رسول اللہ کی وفات کے بعد عرب میں ارتداد کا فتنہ وبا کی طرح پھوٹ پڑا تھا اور ہر قبیلے کی یہ کوشش تھی کہ وہ مسلمانوں کی اطاعت سے آزاد ہو کر اور اسلامی حکومت کا جوا گردن سے اتار کر خود مختاری حاصل کرلے۔

ان تمام اسباب نے مل کر یمن اور اس کے ملحقہ علاقے میں، جو اسودِ عنسی اور اس کے مددگاروں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا، شدید ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا۔

اسود کے بعد مددگاروں کی سرگرمیاں

اسودِ عنسی کی موت کے بعد بھی اس کے مددگاروں کا جوش و خروش ٹھنڈا نہ ہو سکا تھا اور انھوں نے نجران اور صنعاء کے علاقے میں سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دی تھیں۔ عمرو بن معدی کرب نے جو شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا بہادر بھی تھا، جس کی شجاعت اور جواں مردی کی دھاک سارے عرب پر بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے عنسی سے مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا، یہ موقع غنیمت جان کر مسلمانوں کے خلاف علمِ شورش بلند کر دیا اور قیس بن عبد یغوث کو ساتھ ملا کر فیروز کو یمن سے نکال دیا، ساتھ ہی داذویہ کو بھی ملک بدر کر دیا۔ اس طرح یمن میں دوبارہ فتنہ برپا ہو گیا اور اس

علاقے میں امن کی راہیں مسدود ہوگئیں۔

اِس صورتِ حال سے عہدہ بر آہونے کے لیے سب سے ضروری امر یہ تھا کہ مدینہ اور یمن کے درمیانی راستے میں امن وامان قائم کیا جائے۔ اِس راستے پر، جو ساحل بحر کے ساتھ ساتھ چلا گیا تھا، عک اور اشعر یین کے بعض قبائل آباد تھے۔ انھوں نے شورش پسندوں سے مل کر مسلمانوں کے لیے یہ راستہ مسدود کر دیا۔ طائف اِس راستے کے بالکل قریب واقع تھا۔ وہاں کے حاکم طاہر بن ابی ہالہ نے تمام واقعات سے ابوبکرؓ کو اطلاع دی اور خود ایک لشکرِ جرار لے کر ان لوگوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوگیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں مفسدین کو شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ اُن کے بے شمار آدمی قتل ہوئے۔ مؤرخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کی لاشوں سے سارا راستہ پٹ گیا اور آمدورفت معطل ہوکر رہ گئی۔ ابوبکرؓ فتح کی خوش خبری پہنچنے سے پہلے ہی طاہر کو خط لکھ چکے تھے جس میں اسے ڈھارس دیتے ہوئے ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کی تلقین اور ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک اس راستے میں، جس پر خبیث لوگ قابض ہیں، امن وامان قائم نہ ہو جائے اُس وقت تک وہ اعلاب[1] میں مقیم رہے۔ اس روز سے قبیلہ عک کی فوجوں کا نام 'جموع الاخابث' اور اس راستے کا نام 'طریق الاخابث' پڑ گیا۔ بعد میں لمبے عرصے تک یہ نام عربوں میں رائج رہے۔

شورش و اضطراب کا دوسرا سبب

یمن میں فتنے کے بھڑکنے اور اس میں شدت پیدا ہونے کا دوسرا بڑا سبب قومیت کا اختلاف تھا۔ شہر کے قتل ہونے کے بعد ابوبکرؓ نے صنعا میں فیروز کو حاکم مقرر فرمایا تھا۔ اسود کے قتل کی سازش میں فیروز کے ساتھ شہر کے دو وزیر، داذویہ اور جشنس اور سپہ سالار قیس بن عبد یغوث شریک تھے۔ فیروز، داذویہ اور جشنس فارسی الاصل تھے لیکن قیس عربی النسل اور یمن کے قبیلہ حمیر میں سے تھا۔ اِس لیے جب ابوبکرؓ نے فیروز کو حاکم مقرر کیا تو قیس کو یہ بات بری لگی اور اس نے فیروز کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا۔

---

[1] اعلاب: مکہ اور ساحل بحر کے درمیان ایک مقام ہے جہاں بنو عک بن عدنان آباد تھے۔

قیس کی فتنہ انگیزی

لیکن جب قیس نے گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ فیروز کا قتل آسان کام نہیں کیونکہ اس صورت میں تمام ’ابنار‘ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ ’ابنار‘ ان ایرانی النسل لوگوں کو کہا جاتا تھا جنھوں نے سلطنت ایران کے دورِ اقتدار میں یمن کو وطن بنالیا تھا۔ یہاں انھوں نے بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا حتیٰ کہ حکومت میں بھی ان کا عمل دخل ہو گیا۔

ابنار کی طاقت و قوت کے پیشِ نظر قیس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یمن کے تمام عربی قبائل کو ساتھ ملا کر وہاں کے ایرانی النسل باشندوں کا پوری طرح قلع قمع کرنے کی کوشش کرتا ورنہ اسے بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہونا پڑتا جس سے اسود کو ہونا پڑا اور اسے بھی اپنی جان اسی طرح کھونی پڑتی جس طرح اسود کی جان گئی۔

چنانچہ اس نے ذوالکلاع حمیری اور یمن کے دوسرے عربی النسل سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کو لکھا کہ ابنار نے زبردستی تمھارے علاقے پر تسلط جما لیا ہے اور ناجائز طور پر ایران سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اگر تم نے ان کی طرف سے بے پروائی برتی تو عنقریب تم پر پورے طور سے غالب آجائیں گے میری رائے ہے کہ ان کے سرداروں کو قتل کر کے انھیں ملک سے نکال دیا جائے۔ تم اس کام میں میری مدد کرو۔

قیس کے جواب میں ذوالکلاع اور اس کے ساتھیوں نے غیر جانب داری کی پالیسی اختیار کیے رکھی، نہ قیس سے مل کر ابنار کے خلاف کارروائی کی اور نہ ابنار کی مدد کر کے قیس کو زک پہنچانی چاہی۔ قیس کو انھوں نے کہلا بھیجا کہ ”ہم اس معاملے میں دخل دینے سے معذور ہیں۔ تم اپنے ساتھیوں سے مل کر جو مناسب سمجھو کرو۔“ انھیں ابنار کے خلاف قیس کی مدد کرنے میں غالباً کوئی عذر نہ بھی ہوتا لیکن انھیں معلوم تھا کہ اس صورت میں ابوبکرؓ یقیناً ابنار کی مدد کریں گے کیونکہ ابنار بدستور اسلام پر قائم اور مدینہ کی حکومت کے کامل فرمانبردار تھے۔ اس صورت میں ان کے خلاف محاذ قائم کرنا اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں پھنسا لینے کے مترادف تھا جس کے متعلق کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، خصوصاً اس صورت میں کہ ارتداد کی وبا پھیل جانے کے باعث یمن

اسلامی فوجوں کی آماجگاہ بننے والا تھا اور اس سے پہلے مسلمان ہر میدان میں فتح یاب ہو چکے تھے۔

معاویہ بن عنسی سے قیس کی استمداد

ذوالکلاع اور اس کے ساتھیوں کے انکار کے باوجود قیس شکستہ خاطر نہ ہوا بلکہ اب اس نے خفیہ طور پر ان گروہوں سے خط و کتابت کرنی شروع کی جنھوں نے اسود عنسی کے خروج کے زمانے میں اُس کی (عنسی کی) مدد کی تھی اور ابنار کو یمن سے نکالنے میں ان کی مدد کا طالب ہوا۔ وہ لوگ پہلے ہی سے چاہتے تھے کہ انھیں اس غیر ملکی عنصر سے نجات ملے۔ انھوں نے بڑی خوشی سے قیس کا ساتھ دینا منظور کر لیا اور اسے لکھ دیا کہ ہم تمھاری مدد کے لیے جلد از جلد پہنچ رہے ہیں مطمئن رہو۔

چونکہ یہ خط و کتابت انتہائی خفیہ تھی اور فوجوں کی نقل و حرکت میں بھی نہایت رازداری برتی گئی تھی اس لیے اہل صنعار کو ان فوجوں کی اطلاع اس وقت تک نہ مل سکی جب تک وہ شہر کے بالکل قریب نہ پہنچ گئیں۔

جب ان فوجوں کے آنے کی خبر شہر میں پھیلی تو قیس فوراً فیروز کے پاس پہنچا اور اس پر یہ ظاہر کیا کہ اُسے بھی یہ خبر ابھی ابھی اچانک ملی ہے۔ چہرے پر بھی اُس نے گھبراہٹ اور سراسیمگی کی علامات پیدا کر لیں اور انتہائی مکاری سے کام لیتے ہوئے اُس نے فیروز اور داذویہ سے موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ مزید صلاح مشورے کے لیے اس نے فیروز، داذویہ اور جشنس کو اگلے روز صبح اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔

داذویہ کا قتل

داذویہ حسب قرارداد اگلے روز قیس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی فیروز اور جشنس ابھی تک نہ آئے تھے۔ جوں ہی داذویہ نے گھر میں قدم رکھا قیس نے تلوار کا ہاتھ مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز بھی آ پہنچا مگر دروازے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سنا کہ اس کے ساتھیوں

کے قتل کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ بھاگا۔ راستے میں اسے جشنس ملا۔ یہ ماجرا معلوم ہونے پر وہ بھی اس کے ساتھ ہولیا اور انھوں نے کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کی جہاں وہ دونوں پناہ لے سکیں۔ قیس کے آدمیوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کا پیچھا کیا لیکن وہ انھیں نہ پا سکے اور ناکام واپس آ گئے۔ فیروز اور جشنس جبلِ خولان پہنچے جہاں فیروز کی ننھیال تھی لیکن انھیں اب تک یقین نہ تھا کہ وہ ہلاکت سے بچ گئے ہیں۔

صنعاء پر قیس کا تسلط

قیس صنعاء پر قابض ہو گیا اور بڑے اطمینان سے وہاں حکومت کرنی شروع کر دی۔ اُسے یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ اب کوئی شخص اس کے اقتدار کو چیلنج اور اسے حکومت سے محروم کر سکتا ہے اسے معلوم ہوا کہ فیروز ابوبکرؓ سے مدد طلب کرنے اور بنو خولان کو ساتھ ملا کر اس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ سن کر اس نے ازراہ تمسخر کہا:

"خولان کو دیکھو اور فیروز کو دیکھو۔ اس احمق کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ خولان کی قوت و طاقت کتنی ہے جس کے بل بوتے پر وہ مجھ سے مقابلہ کرنے کا خواہش مند ہے۔"

قبیلہ حمیر کے عوام بھی قیس کے ساتھ مل گئے البتہ قبیلہ کے سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور گوشۂ عزلت میں مقیم ہو گئے۔

ابناء سے قیس کا سلوک

جب قیس کو اپنی قوت و طاقت کا پوری طرح اندازہ ہو گیا تو اُس نے ابناء پر توجہ مبذول کی اور انھیں تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ سلوک روا رکھا۔ جن لوگوں نے قیس کی اطاعت قبول کر لی اور فیروز کی طرف میلان ظاہر نہ کیا انھیں اس نے کچھ نہ کہا اور وہ اور ان کے اہل و عیال بدستور اپنی اپنی جگہ مقیم رہے۔ لیکن جو لوگ بھاگ کر فیروز کے پاس چلے گئے ان کے اہل و عیال کو اس نے دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ کو عدن بھیج دیا تاکہ وہ جہاز دں

میں سوار ہو کر اپنے وطن چلے جائیں اور دوسرے گروہ کو خشکی کے راستے خلیج فارس کی جانب روانہ کر دیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے شہروں کو چلے جائیں اور ان میں سے کوئی یمن میں نہ رہے۔

قیس کی شکست

فیروز کے اہلِ وطن پر جو کچھ بیتی اسے اس کا سارا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ان قبائل کو ابھارنا شروع کیا جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اور اس طرح مذہبی عصبیت کے ذریعے سے وطنی عصبیت کا سدِباب کرنا چاہا۔ بنو عقیل بن ربیعہ اور بنو عک نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ایک فوج مرتب کر کے قیس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ صنعا سے کچھ دور قیس کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں قیس کو شکست ہوئی۔ فیروز نے دوبارہ صنعا پر قبضہ کر لیا اور خلیفۃ المسلمین کی طرف سے دوبارہ وہاں کی امارت سنبھال لی۔

قیس اپنے ہزیمت خوردہ لشکر کے ساتھ بھاگ کر اسی جگہ جا پہنچا جہاں وہ اسود عنسی کے وقت موجود تھا۔ اس کی شکست سے اس قومی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا جس کے بل بوتے پر اس نے اپنی دعوت کی بنیاد رکھی تھی۔

فیروز کی فتح اور تختِ امارت پر اس کے دوبارہ متمکن ہونے سے بھی یمن میں متوقع امن قائم نہ ہو سکا۔ صنعا میں تو بے شک فیروز کی حکومت قائم ہو گئی لیکن باقی یمن بہ دستور بغاوت کی آگ میں جل رہا تھا اور وہاں کے مرتدین مسلمانوں کے مقابلہ میں جمے ہوئے تھے۔

یمن اور حجاز کی دیرینہ دشمنی

اس جگہ ایک تیسرے سبب کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہے جس نے اس علاقے میں بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں مدد دی اور وہ تھا یمن اور حجاز کا دیرینہ جذبۂ عناد و مخاصمت۔ رسول اللہ کے عہد میں حجازیوں کے ہاتھوں یمن کے بنی حمیر کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تھا۔ ابوبکرؓ کے عہد میں اگرچہ خالدؓ اور عکرمہؓ کی فتوحات نے اہلِ یمن کے دلوں پر اثر ضرور کیا تھا اور وہ مسلمانوں سے دہشت زدہ ہو گئے تھے پھر بھی ان میں ابھی ایک بہادر شخص ایسا موجود تھا جس کی ہیبت سے بڑے بڑے بہادر

کا پیشہ تھے اور وہ تھا عرب کا مشہور شہسوار اور بطلِ جلیل عمرو بن معدی کرب۔ یہ شخص قبیلہ بنو زبید سے تعلق رکھتا تھا اور اس پر اہلِ یمن کو بجا طور پر فخر تھا۔ بعد میں یہ شخص مسلمان ہوگیا۔ عمرؓ کے عہد کی فتوحات کے دوران میں اس نے مسلمانوں کی جانب سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کا ذکر آج تک کتبِ تاریخ میں محفوظ چلا آتا ہے۔ باوجود پیرانہ سالی کے اس کی بہادری میں مطلق کمی نہ آئی۔ جنگِ قادسیہ کے وقت اس کی عمر سو سال سے بھی متجاوز تھی لیکن اُس نے اس معرکے میں جوانوں سے بڑھ کر شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

عمرو بن معدی کرب کی بغاوت

عمرو بن معدی کرب نے اپنی بہادری کے زعم میں اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور قیس بن عبد لیغوث کو بھی ساتھ ملالیا۔ یہ دونوں ہر قبیلے میں جاتے اور انھیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوا نجران کے عیسائی باشندوں کے، جنھوں نے رسول اللہؐ سے عہد مودت باندھا تھا اور ابو بکرؓ کے عہد میں بھی اپنے اسی معاہدے پر بدستور قائم رہے، باقی تمام قبائل نے عمرو بن معدی کرب کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

عکرمہ اور مہاجر یمن میں

مسلمان اس صورتِ حال سے مطلق نہ گھبرائے۔ ایک طرف عکرمہ بن ابو جہل مہرہ سے یمن پہنچے اور اپنے لشکر کے ہمراہ مقام ابین میں فروکش ہوئے۔ دوسری جانب سے مہاجر بن ابی امیہ ابو بکرؓ کے عطا کردہ علم کے ہمراہ مکہ اور طائف سے گزرتے ہوئے جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ بیماری کے باعث ان کی روانگی یمن میں چند ماہ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ مکہ، طائف اور نجران سے سیکڑوں آزمودہ کار اور جنگی لیاقت رکھنے والے اشخاص آپ کے ساتھ ہوگئے۔ جب اہلِ یمن کو ان سپہ سالاروں کے آنے کی اطلاع ہوئی اور انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاجر بن ابی امیہ نے راستے میں اپنے ایک مدِ مقابل قبیلے کو کلیۃً تہ تیغ کر دیا ہے تو انھیں یقین ہوگیا کہ ان کی یہ بغاوت خود انھیں کے لیے

وبال جان بن جائے گی۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تو ہرگز تاب مقاومت نہ لاسکیں گے سیکڑوں لوگ قتل ہو جائیں گے اور بقیۃ السیف کو مسلمان غلام بنا کر ساتھ لے جائیں گے۔

قیس اور عمرو میں پھوٹ

ابھی اہل یمن اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ ان کے سرداروں قیس اور عمرو بن معدی کرب، میں پھوٹ پڑ گئی اور اس امر کے باوجود کہ دونوں نے مہاجر سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا تھا دونوں درپردہ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

قیس اور عمرو کی گرفتاری

آخر عمرو بن معدی کرب نے مسلمانوں سے مل جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات اُس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ قیس کی فرودگاہ پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر کے مہاجر کے سامنے لے جا کر پیش کر دیا۔ مہاجر نے قیس ہی کو گرفتار کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ساتھ ہی عمرو بن معدی کرب کو بھی گرفتار کر کے ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا کہ وہ ان کے متعلق جو چاہیں فیصلہ صادر فرمائیں۔

ابوبکرؓ کی جانب سے معافی

ابوبکرؓ نے داذویہ کے قصاص میں قیس کو قتل کرنا چاہا اور اس سے کہا:

"اے قیس! تو اللہ کے بندوں اور بے گناہ لوگوں کو ناحق قتل کرتا ہے اور مومنین کو چھوڑ کر مرتدین و مشرکین کی پناہ و امداد کا سہارا ڈھونڈتا ہے"

قیس نے داذویہ کے قتل سے انکار کیا۔ چونکہ اس کے خلاف واضح شہادت مہیا نہ ہو سکی۔ (کیونکہ یہ قتل انتہائی رازداری سے اور لوگوں کی نظروں سے چھپا کر کیا گیا تھا) اس لئے ابوبکرؓ نے اسے معاف کر دیا اور قصاص میں قتل نہ کیا۔

اس کے بعد ابوبکرؓ نے عمرو بن معدی کرب کی طرف توجہ فرمائی اور کہا:

"تجھے شرم نہیں آتی۔ تجھے روزانہ ذلتیں دیکھنی پڑتی ہیں لیکن اس کے باوجود تو اپنے

کرتوت سے باز نہیں آتا۔ اگر تو دین اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی مساعی صرف کرتا تو اللہ بھی تجھے سربلند کر دیتا اور عزت بخشتا۔"

عمرو بن معدی کرب نے جواب دیا:

"بے شک مجھ سے قصور ہوا۔ میں آپ سے اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ مجھ سے اس قسم کی حرکات سرزد نہ ہوں گی اور میں مملکت اسلامیہ کا نیک شہری بن کر زندگی بسر کروں گا۔"

اس پر ابوبکرؓ نے اسے بھی معاف کر دیا اور ان دونوں کو ان کے قبیلوں میں واپس بھجوا دیا۔

یمن میں امن وامان کا قیام

ادھر مہاجر نجران سے چل کر صنعا پہنچے اور اپنے لشکر کو ان سرکش گروہوں کی سرکوبی کا حکم دیا جو اسود عنسی کے زمانے سے اس خطۂ ملک میں فتنہ و فساد برپا کر کے ملک کے امن وامان کو غارت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے لوگوں کو یہ ہدایت بھی دی کہ ان لوگوں میں سے وہ جس پر بھی قابو پائیں اسے بے دریغ قتل کر ڈالیں تاکہ فتنے کی جڑ کٹ سکے اور لوگوں میں دوبارہ فساد کے جراثیم نہ پھیل سکیں۔

عکرمہ نے اپنا قیام جنوبی یمن ہی میں رکھا اور وہاں قبائل نخع اور حمیر کی سرکوبی میں مصروف رہے۔ شمالی یمن کی طرف بڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

ان دونوں سرداروں کی پیہم مساعی سے سارے یمن میں کاملاً امن وامان قائم ہو گیا اور یہاں کے باشندوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ اب سارے جزیرہ عرب میں حضرموت اور کندہ کے سوا کسی جگہ مرتدین کا نام ونشان نہ رہا۔

ایرانیوں کی حمایت کا سبب

یہاں ہم بعض ان لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ آخر

ابوبکرؓ نے یمن کے عربوں کے مقابلے میں ایرانیوں کی حمایت کیوں کی اور فیروز اور اس کے ساتھیوں نے کس مصلحت کے پیش نظر قیس کے مقابلے میں ابوبکرؓ کی مدد کی؟ اس شبہہ کا جواب بہت آسان ہے۔

ساری دنیا کو معلوم ہے کہ اسلام عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک بڑائی کا معیار صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ یمن میں ایرانی النسل لوگ سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور اسلام میں سبقت حاصل کرنے کی وجہ سے ابوبکرؓ کی نظر میں ان کی قدر و منزلت تھی۔ لیکن ان کے بالمقابل اس علاقے کے عرب باشندوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ زور شور سے بھڑکا رکھی تھی۔ رسول اللہؐ کے عہد میں یہاں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اسود کے بعد اس کے مددگاروں اور حامیوں نے بھی فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے میں اسود سے کچھ کم حصّہ نہ لیا۔ عمرو بن معدی کرب اور قیس بن عبد یغوث اس آگ کو ہوا دینے میں پیش پیش تھے۔ لیکن باذان، شہر، فیروز اور دوسرے ایرانی النسل باشندے صرف بدستور اسلام پر قائم رہے بلکہ اس خطہ زمین میں صرف وہی لوگ ایسے تھے کہ جب سارا عرب بغاوت اور ارتداد کی آگ سے جل رہا تھا اور مرتدین اور باغیوں کی جرار فوجیں اسلامی فوجوں کے مقابلے میں آ رہی تھیں تو انھوں نے کامل وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہر طرح ابوبکرؓ کی مدد کی اور اس فتنے کو فرو کرنے میں اسلامی فوجوں کے دوش بدوش حصّہ لیا۔ اس صورت میں اگر ابوبکرؓ نے اپنی فوجوں اور سپہ سالاروں کے ذریعے سے فیروز کی مدد کی اور باغیوں پر فتح یاب ہونے کے بعد اسے دوبارہ صنعاء کا امیر مقرر فرما دیا تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے؟ خود رسول اللہؐ اس سے قبل شہر بن باذان کو سارے یمن کا حاکم مقرر فرما چکے تھے۔

کندہ اور حضر موت میں جدال و قتال

ان حوادث و واقعات کے ذکر کے بعد اب ہمیں کندہ اور حضر موت کے حالات کا جائزہ لینا ہے جہاں کے باشندے بھی ارتداد اختیار کر چکے تھے اور جہاں مہاجر بن ابی امیہ اور عکرمہ کے

زیر قیادت مرتدین سے آخری جنگیں پیش آئیں۔

رسول اللہ نے اپنی وفات سے قبل زیاد بن لبید کو حضر موت، عکاشہ بن محصن کو سکاک اور سکون اور مہاجر بن ابی امیہ کو کندہ کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ مہاجر بیماری کے باعث زمام کار سنبھالنے کے لیے کندہ روانہ نہ ہو سکے۔ ان کی غیر موجودگی میں زیاد بن لبید وہاں کے امور کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

مہاجر کی امارتِ کندہ کا واقعہ

مہاجر کی امارت کندہ کا واقعہ بھی اک گونہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مہاجر ام المومنین ام سلمہ کے بھائی تھے اور جنگ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس پر رسول اللہ ان سے ناراض ہو گئے ام سلمہ کو بہت رنج ہوا۔ ایک دن وہ آپ کا سر دھو رہی تھیں کہ باتوں باتوں میں انھوں نے آپ سے رقت آمیز لہجے میں اپنے بھائی کی سفارش کرتے ہوئے ناراضی دور کرنے کی درخواست کی۔ رسول اللہ نے مہاجر کا قصور معاف کر کے انھیں کندہ کا امیر مقرر فرما دیا۔ ان کے وہاں پہنچنے تک زیاد بن لبید ان کی قائم مقامی کرتے رہے۔

اہلِ کندہ کا ارتداد

کندہ یمن کے متصل واقع تھا۔ اسی لیے جونہی اسودِ عنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا اہل کندہ نے بھی اہلِ یمن کی طرح اس کی دعوت پر لبیک کہنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ نے حکم دیا کہ کندہ کے بعض صدقات اور اموالِ زکوٰۃ حضر موت میں اور حضر موت کے بعض صدقات اور اموالِ زکوٰۃ کندہ میں تقسیم کیے جائیں۔

زیاد نے زکوٰۃ کے حصول میں کچھ سختی برتی جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں میں ان کے خلاف جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ زیاد نے 'سکون' کے ان لوگوں کے ذریعے سے، جو بدستور اسلام پر قائم تھے، کندہ کے شوریدہ سر عناصر کو مغلوب کرنا چاہا لیکن 'سکون' کے کسی بھی شخص نے ان کا ساتھ نہ دیا اور کوئی بھی شخص اہلِ کندہ کے مقابلے کے لیے نہ اٹھا۔

مسلمانوں سے اشعث کی جنگ

رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا فتنہ پھیلا اور اس کے شعلے حضرموت اور کندہ تک بھی پہنچنے لگے تو زیاد نے اس فتنے کے جڑ پکڑنے سے پہلے ہی اس کی بیخ کنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ انھوں نے ان قبائل کو اپنے ساتھ ملایا جو بہ دستور اسلام پر قائم تھے اور غفلت کی حالت میں بنو عمرو بن معاویہ پر حملہ کر کے ان کے مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں کو غلام بنا لیا۔ قیدی عورتیں اور مال غنیمت لے کر وہ اس راستے سے واپس ہوئے جو اشعث بن قیس رئیس کندہ کے قبیلے کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ ان عورتوں میں بعض نہایت معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب یہ قافلہ اشعث کے قبیلے کے پاس سے گزرا تو انھوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا:

"اے اشعث! تیری خالاؤں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔ تیرا فرض ہے کہ انھیں ذلت و رسوائی سے بچائے۔"

یہ فریاد سن کر اشعث کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے قسم کھائی کہ یا تو وہ ان عورتوں کو مسلمانوں کے پنجے سے چھڑائے گا یا خود لڑ کر جان دے دے گا۔

اشعث بن قیس اپنی قوم کا محبوب اور بلند مرتبہ سردار تھا۔ رسولؐ کی زندگی کے آخری زمانے میں وہ آپ کی خدمت میں بنی کندہ کے ۸۰ آدمیوں کے ہمراہ مدینہ آیا جو سب کے سب قیمتی ریشمی لباس پہنے ہوئے تھے۔ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اشعث نے اسلام قبول کیا اور ابوبکرؓ کی بیٹی ام فروہ کے لیے شادی کا پیغام دیا۔ ابوبکرؓ نے یہ پیغام قبول کر لیا اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔

عورتوں کی فریاد سن کر اشعث نے زبردست اثر و رسوخ سے فوراً ساری قوم کو اکٹھا کر لیا۔ وہ سب مسلمانوں سے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور اپنی عورتوں کو مسلمانوں کی قید سے چھڑا کر ہی دم لیا۔

کندہ کو عکرمہ و مہاجر کی روانگی

اس دن سے اشعث نے کندہ اور حضر موت میں بغاوت کی آگ بھڑکانی شروع کی اور بیشتر قبائل کو ساتھ ملالیا۔ یہ حال دیکھ کر زیاد بہت گھبرائے اور انھوں نے مہاجر بن ابی امیہ کو فوراً کندہ پہنچنے کے لیے لکھا۔ مہاجر اور عکرمہ اس وقت یمن کی بغاوت فرو کر چکے تھے اس لیے وہ دونوں فوراً زیادؓ کی مدد کو روانہ ہو گئے۔ مہاجر صنعا سے روانہ ہوئے اور عکرمہ عدن سے۔ مأرب میں دونوں قائد مل گئے اور 'صہید' کا ریگستان قطع کرتے ہوئے کندہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ مہاجر کو زیاد کی حالت کا بہ خوبی علم تھا۔ انھوں نے عکرمہ کو تو لشکر کے ساتھ چھوڑا اور خود ایک مختصر دستہ لے کر تیزی سے سفر کرتے ہوئے بہت قلیل عرصے میں زیاد کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی اشعث کی فوجوں پر حملہ کر کے اسے شکست فاش دی۔ اشعث بھاگ گیا اور اس نے اپنے لشکر کے دیگر مفرورین کے ہمراہ قلعہ نجیر میں پناہ لی۔

قلعۂ نجیر کا محاصرہ

نجیر ایک مضبوط قلعہ تھا اور اس پر حملہ کرنا آسان نہ تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے تین راستے تھے۔ ایک راستے پر تو زیاد نے قبضہ کر لیا۔ دوسرے راستے کی ناکا بندی مہاجر نے کی۔ تیسرا راستہ کھلا تھا۔ اس کے ذریعے سے قلعے والوں کو سامان رسد اور فوجی مدد برابر پہنچتی رہتی تھی۔

آخر عکرمہ بھی اپنی فوج کے ہمراہ آپہنچے اور انھوں نے اس تیسرے راستے پر قبضہ کر لیا جس سے قلعے والوں تک مدد پہنچنی بند ہو گئی اور وہ مکمل طور پر محصور ہو کر رہ گئے۔ عکرمہ نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے شہسواروں کو کندہ سے ساحل بحر تک پھیلا دیا اور حکم دے دیا کہ انھیں جو بھی باغی ملے اسے بے دریغ قتل کر ڈالیں۔ نجیر میں محصور لوگوں نے اپنی قوم کی تباہی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ اب خود ان کے سامنے بھی موت گردش کر رہی تھی۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا:

"تمھاری موجودہ حالت سے موت بہر حال بہتر ہے۔ تم اپنی پیشانیوں کے بال کاٹ

ڈالو اور اِس طرح یہ ظاہر کر دو کہ تم نے اپنی جانوں کو اللہ کے حضور پیش کر دیا ہے۔
شاید اِس طرح اللہ تمھاری مدد کرے اور تمھیں اِس مصیبت سے نجات دے۔"
چنانچہ تمام لوگوں نے اپنی پیشانیوں کے بال کاٹ ڈالے اور عہد کیا کہ کوئی بھی شخص اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار نہ کرے گا۔

اپنے قبیلے سے اشعث کی بدعہدی

صبح ہونے پر وہ لوگ تینوں راستوں سے باہر نکلے اور مسلمانوں سے جنگ شروع کر دی۔ ان لوگوں کی تعداد صرف چھ سو تھی۔ اس کے بالمقابل مہاجر اور عکرمہ کے لشکر کا شمار ہی نہ تھا۔ جب اہلِ نجیر نے دیکھا کہ مسلمان بھاری تعداد میں ان کے مقابلے کے لیے موجود ہیں تو انھیں یقین ہو گیا کہ وہ کسی صورت فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ مایوسی نے ان پر غلبہ پا لیا اور وہ زندگی سے بالکل ناامید ہو گئے۔ اس وقت ان کے سرداروں کو اپنی جانیں بچانے کی سوجھی۔ اشعث عکرمہ کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مہاجر سے کہ کر اس کی اور اس کے نو ساتھیوں کی جان بخشی کرا دیں۔ اس کے بدلے وہ قلعے کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دے گا۔

مہاجر نے اشعث کی درخواست منظور کر لی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ان لوگوں کے نام' جن کی وہ جان بخشی کرانا چاہتا ہے' ایک کاغذ پر لکھ کر ان کے حوالے کر دے۔ اشعث نے اپنے اہل و عیال اور بھائیوں کے نام تو لکھ دیے لیکن اپنا نام لکھنا بھول گیا اور اسی طرح وہ کاغذ مہر لگا کر مہاجر کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ان نو آدمیوں کو قلعہ سے نکال لیا اور اس کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیے۔ مسلمانوں نے قلعے میں داخل ہو کر ہر اس شخص کو قتل کر دیا جس نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ اور ان کی عورتوں کو' جن کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی' قیدی بنا لیا۔ پھر اشعث کو ان پر نگران مقرر کر کے اموالِ خمس کے ساتھ ابوبکرؓ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

زمانہ کے تصرفات بھی کس قدر عجیب ہوتے ہیں۔ اشعث جو محض اپنی جان بچانے کی خاطر بدترین بدعہدی اور خیانت کا مرتکب ہوا تھا اور جس نے اپنی قوم کو تلواروں کی دھاروں اور

ایک ہزار عورتوں کو لونڈیاں بننے کے لیے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا، وہی اشعث تھا جو بنی عمرو بن معاویہ کی عورتوں کی اس فریاد کی تاب نہ لا سکا تھا کہ اے اشعث! تیری خالاؤں کی عزتیں خطرے میں ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی اس کا خون کھول اٹھا اور اس نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک ان میں سے ایک ایک عورت کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑا نہ لیا۔ پھر یہی اشعث تھا کہ جب وہ رسول اللہ کی خدمت میں پہنچا تو اس کی وجاہت اور اپنی قوم میں ہردلعزیزی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کیا تھا۔ لیکن جب اس سے یہ شرمناک فعل صادر ہوا تو مسلمان تو علیحدہ رہے خود اس کی قیدی عورتوں نے اس پر لعنت بھیجی اور اس کا نام عرف النار رکھ دیا جس کے معنی یمنی زبان میں غدار کے ہیں۔ لیکن جب موت کا خوف کسی شخص کو لاحق ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کی غرض سے ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور محض اپنی جان کی سلامتی کی خاطر ذلیل سے ذلیل ہتھکنڈے اختیار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

اشعث کی روانگی مدینہ

مہاجر نے ان لوگوں کو جن کے نام اشعث نے کاغذ پر لکھے تھے، بلایا، اور انھیں رہا کر دیا لیکن اشعث کا اپنا نام چونکہ اس فہرست میں نہ تھا جو خود اس نے مہر لگا کر مہاجر کے حوالے کی تھی اس لیے مہاجر نے اُسے قتل کرنا چاہا اور کہا:

"اللہ کا شکر ہے جس نے تیرے دل پر پردے ڈال دیے اور تو اپنا نام فہرست میں لکھوانا بھول گیا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اللہ تجھے ذلیل کرے۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

لیکن عکرمہ نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا:

"آپ اسے قتل نہ کریں بلکہ ابوبکرؓ کے پاس بھیج دیں۔ وہ اس کے متعلق جو فیصلہ چاہیں گے صادر فرمائیں گے۔ اگر یہ شخص اپنا نام لکھنا بھول گیا ہے تو اسے اپنا عذر خلیفہ کے سامنے پیش کرنے دیں۔"

مہاجر کو یہ بات ناگوار تو بہت گزری پھر بھی انھوں نے عکرمہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے دوسرے قیدیوں کے ہمراہ ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ لیکن اشعث کا جینا مرنے سے بدتر تھا کیونکہ راستہ بھر اس کی قوم کے قیدی اور مسلمان محافظ اس پر پھٹکار ڈالتے رہے۔

ابوبکرؓ کی جانب سے اشعث کو معافی

مدینہ پہنچنے پر اشعث کو ابوبکرؓ کے حضور پیش کیا گیا۔ ابوبکرؓ نے اشعث سے پوچھا:

"تیرا کیا خیال ہے میں تجھ سے کیا برتاؤ کروں گا؟"

اشعث نے جواب دیا:

"مجھے آپ کے ارادے کا علم کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں معافی کا خواستگار اور رحم کا امیدوار ہوں۔"

ابوبکرؓ نے فرمایا:

"میرا ارادہ تو تجھے قتل کرنے کا ہے۔"

اشعث نے کہا:

"میں ہی ہوں جس نے قلعے کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھولے تھے۔ کیا اس کے باوجود مجھے قتل کر دیا جائے گا؟"

بات طول پکڑ گئی۔ آخر اشعث نے محسوس کیا کہ واقعی ابوبکرؓ کا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہے۔ اس پر اُس نے ان سے کہا:

"میں آپ سے عاجزانہ التماس کرتا ہوں کہ مجھ پر رحم فرمائیں۔ میری قوم کی قیدی عورتوں کو چھوڑ دیں۔ میری لغزش سے درگزر فرمائیں۔ میرا اسلام قبول فرمائیں اور مجھ سے وہی سلوک کریں جو مجھ جیسی حیثیت رکھنے والے اشخاص سے آپ کرتے ہیں۔ میری بیوی بھی، جو آپ کی صاحبزادی ہیں، مجھے واپس دے دیں۔"

ابوبکرؓ نے درخواست کو منظور کرنے میں کچھ تردد کیا۔ اس پر اشعث نے پھر عاجزانہ التجا

کرتے ہوئے کہا

"آپ مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں آئندہ سچے دل سے اسلام پر قائم رہوں گا اور آپ مجھے بہترین مسلمان پائیں گے۔"

بہت کچھ غور و فکر کے بعد ابوبکرؓ نے اس کی جان بخشی کرنے کا فیصلہ کیا، اپنی بیٹی کو دوبارہ اس کے عقد میں دے دیا اور فرمایا:

"اپنے قبیلے میں واپس چلے جاؤ۔ امید ہے کہ آئندہ مجھے تمھارے متعلق کوئی شکایت موصول نہ ہوگی۔"

لیکن اپنی قوم سے بدعہدی کرنے کے باعث اشعث اپنے قبیلے میں واپس جانے کی جرأت نہ کرسکا اور قید سے چھوٹنے کے بعد ام فروہ کے ساتھ مدینہ ہی میں قیام پذیر رہا۔ عمرؓ کے عہد میں جب عراق اور شام کی جنگیں پیش آئیں، تو وہ بھی اسلامی فوجوں کے ہمراہ ایرانیوں اور رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے باہر نکلا اور کارہائے نمایاں انجام دیے جس کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کا وقار پھر بلند ہوگیا اور اس کی گم گشتہ عزت اسے پھر واپس مل گئی۔

حضرموت اور کندہ میں امن

مہاجر اور عکرمہ اس وقت تک حضرموت اور کندہ میں مقیم رہے جب تک وہاں پوری طرح امن و امان قائم نہ ہوگیا اور اسلامی حکومت کی بنیادیں مستحکم نہ ہوگئیں۔

مرتدین کے ساتھ یہ آخری جنگیں تھیں۔ ان کے بعد عرب سے بغاوت کا خاتمہ ہوگیا اور تمام قبائل کامل طور پر اسلامی حکومت کے زیرنگیں آگئے۔

مہاجر نے اس علاقے میں امن و امان قائم رکھنے اور بغاوت و سرکشی کے اسباب کو پوری طرح مٹانے کے لیے اسی سختی سے کام لیا جس سختی سے وہ یمن میں کام لے چکے تھے۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعے کا ذکر کرنا کافی ہے۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ مہاجر باغیوں اور مسلمانوں کے مخالفوں کے ساتھ کیسی سختی سے پیش آتے تھے۔

کندہ میں دو گانے والیاں تھیں۔ ایک مغنیہ اپنے اشعار میں رسول اللہ کو گالیاں دیا کرتی تھی، اور دوسری مغنیہ مسلمانوں کی ہجو کرتی تھی۔ مہاجر نے دونوں گانے والیوں کے ہاتھ کاٹ دیے

اور اگلے دانت نکلوا دیے۔ جب ابوبکرؓ کو اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے مہاجر کو خط لکھا جس میں اُن کی غلطیاں واضح کیں۔ انھوں نے لکھا کہ جو مغنیہ رسول اللہؐ کو گالیاں دیا کرتی تھی اسے قتل کرنا مناسب تھا کیونکہ شتمِ انبیاء کی سزا دوسری سزاؤں سے مشابہ نہیں ہو سکتی۔ دوسری مغنیہ جو مسلمانوں کی ہجو کیا کرتی تھی، اگر وہ ذمی تھی تو اس سے درگزر کرنا مناسب تھا۔ آدمیوں کا مثلہ کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ سخت گناہ ہے اور قصاص کے سوا کسی صورت میں جائز نہیں۔

ان دو گانے والیوں سے مہاجر نے جو برتاؤ کیا اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے سرکش اور باغی لوگوں سے انھوں نے کس قسم کا سلوک کیا ہوگا اور کس سختی سے اُن کے ساتھ پیش آئے ہوں گے۔

مہاجر کی امارتِ یمن

ابوبکرؓ نے مہاجر کو اختیار دے دیا تھا کہ حضرموت اور یمن کی امارت میں سے جسے چاہیں اختیار کر لیں۔ انھوں نے یمن کی امارت پسند کی اور صنعاء چلے گئے جہاں فیروز سے مل کر کاروبارِ حکومت چلانا شروع کر دیا۔ زیاد بن لبید بدستور حضرموت کے حاکم رہے۔

بنتِ نعمان سے عکرمہ کی شادی

عکرمہ نے مدینہ لوٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن ان کے ہمراہ نعمان بن الجون کی بیٹی بھی تھی جس سے انھوں نے میدانِ جنگ میں شادی کر لی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ ام تمیم اور مجاعہ کی بیٹی سے شادی کر لینے کے باعث ابوبکرؓ، خالدؓ بن ولید پر سخت ناراض ہوئے تھے لیکن انھوں نے مطلق پروا نہ کی اور بنتِ نعمان سے شادی کر ہی لی۔ اس واقعے سے ناراض ہو کر عکرمہ کی فوج کے بعض لوگوں نے ان سے علٰحدگی اختیار کر لی۔

یہ معاملہ مہاجر کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور تمام حالات ابوبکرؓ کی خدمت میں لکھ کر ان کی رائے دریافت کی۔ ابوبکرؓ نے لکھ بھیجا کہ ان کی رائے میں عکرمہ نے شادی کر کے کوئی نامناسب کام نہیں کیا۔

اصل میں واقعہ یہ تھا کہ نعمان بن الجون نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی تھی کہ آپ اس کی بیٹی کو اپنے عقد زوجیت میں لے لیں لیکن آپ نے انکار فرما دیا اور اس کی بیٹی کو اس کے والد کے ساتھ عدن واپس روانہ کر دیا۔ چونکہ رسول اللہؐ اس لڑکی کو رد فرما چکے تھے۔ اس لیے عکرمہ کی فوج کے ایک حصے کا خیال تھا کہ آپ کے اسوۂ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے عکرمہ کو بھی اس سے شادی نہ کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ابوبکرؓ نے یہ استدلال تسلیم نہ کیا اور عکرمہ کی شادی کو جائز قرار دیا۔ عکرمہ اپنی بیوی کے ہمراہ مدینہ آ گئے اور لشکر کا وہ حصہ بھی، جو اس شادی کی وجہ سے ناراض ہو کر ان سے علیحدہ ہو گیا تھا، دوبارہ ان سے آملا۔

عرب کی بغاوتوں کا اختتام

اب عرب کی تمام بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں۔ مرتدین کا قلع قمع کیا جا چکا تھا۔ اللہ نے اپنے دین کو عزت دے کر اسے غلبہ عطا فرما دیا تھا اور اسلامی حکومت کی بنیادیں اقصائے عرب میں مضبوطی سے قائم ہو چکی تھیں۔ ابوبکرؓ کو اسلام کے غلبے سے بے حد مسرت تھی لیکن اس مسرت میں غرور اور فخر و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی سے ہوا۔ ان کی یہ طاقت نہ تھی کہ وہ گنے چنے مسلمانوں کے ذریعے سے سارے عرب کے مرتدین کی جرار فوجوں کا مقابلہ کر سکتے اور انھیں شکست دے کر اسلام کا علم نہایت شان سے دوبارہ بلند کر سکتے۔

آئندہ اقدام

اب ابوبکرؓ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ دین کی وحدت کو تقویت دینے اور اسلام کو عروج تک پہنچانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ ابوبکرؓ کی سیاست کا محور صرف اعلاء کلمۃ الحق تھا۔ یہی خواہش تھی جو ہر آن ان کے دماغ میں گردش کرتی رہتی تھی۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود مرتدین کے عظیم الشان لشکروں سے جنگیں لڑیں اور یہی جذبہ تھا جو عراق اور شام کی لڑائیوں میں کارفرما رہا۔

(۱۱)

اسلامی فتوحات کی ابتدار

عرب کی شمالی حدود

جزیرۂ عرب کا وہ حصہ جو ایک طرف خلیج عقبہ اور دوسری طرف خلیج فارس سے شروع ہو کر بہ جانب شمال پھیلتا چلا جاتا ہے، اہل عرب کے لیے ہمیشہ ہی سے پرکشش بنا رہا ہے۔ خلیج عقبہ کا شمال مشرقی حصہ شام سے اور خلیج فارس کا شمال مغربی حصہ عراق سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دونوں خلیجوں کے درمیانی علاقے میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ واقع ہے جو صحرائے نفود[1] اور دشت شام کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ جوف کے علاقے میں دومۃ الجندل وہ مقام ہے جہاں قدیم زمانے میں شام، عراق اور عرب کی سرحدیں ملتی تھیں۔

اہل شام نسلاً فینیقی تھے اور عراق کے قدیم باشندے اشوری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ شام اور عراق کے درمیان دشت شام واقع تھا جس نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا۔ خوفناک صحراؤں کو عبور کر کے دوسرے علاقوں میں جانا شہری باشندوں کے نزدیک جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ وہ ان گوناگوں خطرات میں پڑنا نہ چاہتے تھے جو صحراؤں میں بالعموم پیش آتے رہتے ہیں۔ علاوہ بریں صحراؤں میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو ان کے لیے کسی قسم کی کشش کا باعث ہو۔ آج بھی جب ذرائع رسل و رسائل میں بے حد ترقی ہو چکی ہے وہاں کے لوگ موٹر میں بیٹھ کر بھی اس صحرا کو عبور کرنے سے گھبراتے ہیں اور عراق و شام کے درمیان ہوائی جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

---

[1] صحرائے سماوہ کا جدید نام

صحرائے شام کی جانب نقل مکان

اس صحرا نے، جس کی طرف قدیم زمانے میں نہ شام کے فینیقی باشندے متوجہ ہو سکے اور نہ عراق کے اشوری، عرب کے بادیہ نشین لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کیونکہ صحراؤں اور میدانوں میں عمریں گزارنے کے باعث ان کی سرشت ہی اسی قسم کی ہو گئی تھی کہ دنیا بھر کی خوب صورتی اور دل کشی انھیں صحرا میں نظر آتی تھی۔ شہری زندگی کو اس کے تمام لوازم کے باوصف وہ قید تصور کرتے تھے۔ مورخین ذکر کرتے ہیں کہ شمالی جانب عربوں کی نقل و حرکت سب سے پہلے اس وقت شروع ہوئی جب یمن میں واقع مشہور سدِ مارب کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ بعد میں جب اس خدشے نے یقین کی صورت اختیار کر لی تو ازدی قبائل نے یمن سے نقل وطن شروع کر دیا اور بہ جانب شمال حجاز اور شام میں جا کر آباد ہو گئے۔

عربوں کی شمالی جانب منتقل ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ رومیوں نے تجارت کے لیے خشکی کا راستہ ترک کر کے سمندری راستہ اختیار کر لیا تھا جس کے باعث جنوبی عرب میں رہنے والے لوگوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی بہتر طریق پر زندگی گزارنے کے لیے یمن سے حجاز اور شام چلے گئے۔ مورخین کے نزدیک ترکِ وطن کا یہ سلسلہ دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اگر یہ خیال درست سمجھ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ عرب قبائل نے مدت دراز سے صحرائے شام میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور وہ نہ صرف باقاعدہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں سکونت پذیر ہونے لگے تھے بلکہ لوٹ مار اور تجارت کی غرض سے عربوں کے جو قافلے شام اور عراق جاتے تھے ان میں سے بھی اکثر لوگ وطن واپس جانے کے بجائے وہیں آباد ہو جاتے تھے۔

شام اور عراق میں جا کر بسنے والے عربوں کا قیام گو شہروں کے بجائے صحرائی علاقوں میں تھا پھر بھی انھوں نے سکونت کے لیے جن خطوں کو پسند کیا تھا وہ شہری آبادی کے قریب واقع تھے۔ اس کی وجہ محض جذباتی تھی نہ یہ کہ ملکی حالات انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ بدوی ہونے کے باعث فطرتاً صحرائی زندگی کے دل دادہ تھے اور اسے کسی طرح چھوڑ نہ سکتے تھے۔ دوسری طرف ضروریاتِ زندگی انھیں مجبور کرتی تھیں کہ وہ شہری آبادی

کے قریب رہیں تاکہ آسانی سے انھیں حاصل کر سکیں۔ ہر زمانے میں بدوی لوگوں کا یہی حال رہا ہے۔ آج بھی مصر، شام اور عراق میں بسنے والے بدو شہروں اور صحراؤں کے درمیان ایسی جگہوں پر آباد ہیں جہاں وہ صحرا کے قدرتی اور دل کش نظاروں سے بھی لطف اندوز ہو سکیں اور روزی کے وسائل تلاش کرنے کے لیے شہروں تک پہنچنے میں بھی انھیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

قبائل عرب کی شمالی حدود میں جوق در جوق جا کر آباد ہونے سے شام بھی گویا عرب کا ایک حصہ بن گیا۔ ان قبائل میں سب سے طاقت ور قبیلہ غسانیوں کا تھا۔ اس قبیلے نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر شام کی سرحد پر ایک سلطنت قائم کر لی۔ بنی غسان کی طرح لخمیوں نے بھی دریائے فرات کے ساحل پر مملکت حیرہ کے نام سے حکومت قائم کر رکھی تھی۔

صحرائے عرب میں بسنے والے ان کے ہم وطنوں کے ابتدا سے جو عادات و اطوار چلے آ رہے تھے، شام اور عراق میں بسنے والے عربوں نے ان میں مطلق کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ عربوں کا یہ خاصّہ تھا کہ جس ملک میں اقامت پذیر ہوتے تھے وہاں کے باشندوں سے تمام معاملات میں گہرے اشتراک سے کام لیتے تھے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے شام میں رومی حکومت اور عراق میں ایرانی سلطنت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ چونکہ اطاعت و فرمانبرداری کا یہ جذبہ محض تعاون کی پالیسی کے تحت تھا اور اس میں کسی حاکم کے تسلّط کا سوال نہ تھا اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا عرب ایک غیر قوم کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے بھی شخصی آزادی اور خود مختاری پر حرف نہ آنے دیتے تھے، اور اگر کسی جگہ ان کی شخصی آزادی کو ذرا سا بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا تو وہ بڑی شدّت سے اس کی مدافعت کرتے تھے۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ بدوی لوگ صحرائی زندگی کے عادی ہونے اور دشت نوردی میں مشغول ہونے کے باوجود شہری زندگی کے بھی بے حد دلدادہ تھے، چنانچہ جب وہ صحرا سے دور ہوتے تھے تو دن رات اس کی تعریف و توصیف کے گیت گایا کرتے تھے، لیکن شہری زندگی میں جو سہولتیں اور راحت و آرام کے جو وافر اسباب میسّر تھے انھیں بھی وہ ہمیشہ رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شام کے دل کش مرغزاروں اور پر فضا باغات، نخلستانوں اور وہاں کی حسین جمیل عورتوں کے تذکرے مکہ و مدینہ اور سارے حجاز میں بکثرت لوگوں کی زبانوں پر رہتے تھے جب کبھی

کوئی قافلہ شام کے تجارتی سفر سے واپس آتا تو اہلِ سفر اپنے ہم جلیسوں، دوستوں، رشتہ داروں اور واقف کاروں سے وہاں کے حالات بالتفصیل بیان کرتے۔ بعد میں مختلف راویوں کے ذریعے سے یہ باتیں دور دراز کے قبائل تک پہنچ جاتیں۔ جب کبھی وہاں کے مرغزاروں اور حسین و جمیل وادیوں کا ذکر آتا تو تعجب کے مارے سامعین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگتے جو ان سے یہ حالات بیان کر رہا ہوتا تھا اور بے اختیار ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش انھیں بھی اپنے ملک میں یہ آسائشیں اور نعمتیں میسر ہوتیں اور وہ بھی ان دل کش مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے۔

عربی طرزِ معیشت سے وابستگی

عراق اور شام میں آباد ہونے والے عربی قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ انھیں مرفہ الحالی اور شہری آسائشوں سے حصۂ وافر ملا ہوا تھا پھر بھی وہ سب کے سب عربی بود و باش کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ عربی النسل ہونے کے علاوہ جزیرۂ عرب سے اُن کے صدیوں کے تعلقات قائم تھے۔

ان حالات کے بیان کرنے سے میری غرض عراق اور شام کے عربوں کے متعلق کوئی تفصیلی مقالہ لکھنا نہیں بلکہ بعض ان اسرار و رموز کو آشکارا کرنا ہے جو لخمیوں اور غسانیوں کے ذریعے سے عربی فتوحات اور ابوبکرؓ کے عہد میں اسلامی سلطنت کی تشکیل کا باعث بنے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جنوب سے شمال کی جانب عربوں کا نقل مکان سد مآرب کے انہدام اور رومی تجارتی راستوں کا رُخ خشکی کے بجائے سمندر کی طرف تبدیل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان ہر دو واقعات کو عربوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے پھر بھی نقل مکان کا یہ سلسلہ ان واقعات سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ عربوں کے اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ قدیم زمانے سے گہرے تعلقات قائم تھے کیونکہ مشرقِ اقصیٰ کی تجارت ساری انھیں کے ہاتھوں میں تھی اور وہ تجارت کے سلسلے میں اکثر شام، مصر اور روم وغیرہ ممالک میں جاتے رہتے تھے حضر موت سے تجارتی قافلے دو راستوں سے شام جایا کرتے تھے۔ ایک راستہ بحرین اور خلیج فارس سے ہوتے ہوئے شام جاتا تھا۔ دوسرا راستہ یمن اور حجاز سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔

مکہ مؤخرالذکر راستے کے وسط میں پڑتا تھا۔

اس تجارتی سلسلے کا آغاز سب سے پہلے عرب کے جنوبی علاقوں یعنی حضر موت، یمن، عمان اور بحرین کے لوگوں نے کیا کیونکہ وہ سرسبز و شاداب علاقوں کے مالک ہونے اور ایرانیوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے شمالی علاقوں کی نسبت زیادہ مہذب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عراق اور شام کی طرف جن لوگوں نے نقل مکان کیا اور وہاں جاکر آباد ہوئے ان میں زیادہ تر جنوبی قبائل کے لوگ تھے۔ غسانی جنھوں نے مشرقی شام میں اپنی مملکت قائم کر رکھی تھی، عمان کے ایک قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح قضاعہ، تنوخ اور کلب کے قبائل جو شام کی حدود پر آباد تھے یمن کے مشہور قبیلے حمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی حال عراق میں بھی تھا۔ عراق کی سرحد پر جو عربی قبائل آباد تھے وہ زیادہ تر حضر موت سے آئے ہوئے تھے۔

ان قبائل نے ابتدائی زمانوں میں صحرائے شام کی طرف نقل وطن کیا تھا اور عراق و شام کی سرحدوں پر اپنی نیم مختار سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ سد مآرب کے ٹوٹنے اور تجارت کے صحرائی اور سمندری راستوں میں منقسم ہونے کے باعث جنوبی علاقوں کے بعض قبائل حجاز میں جاکر آباد ہو گئے۔ پھر ان قبائل میں سے بھی بعض نے روزی کے بہتر وسیلے تلاش کرنے اور صحرائی زندگی سے اکتا کر شہری زندگی کا لطف اٹھانے کی خاطر شام کا رخ کیا۔

ایرانیوں اور رومیوں سے تعلقات کی نوعیت

عراق اور شام اس زمانے میں ایرانی اور رومی سلطنتوں کے درمیان پس رہے تھے۔ کبھی ایرانی شام پر چڑھائی کر کے اسے رومیوں سے چھین لیتے اور عراق سے ملحق کر کے اسے اپنے ماتحت کر لیتے اور کبھی رومی عراق کو ایرانیوں سے چھین کر شام میں ملا لیتے۔ اور وہاں اپنی حکومت قائم کر دیتے۔

صحرائے شام میں آباد ہونے والے عربوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ طبیعتوں کی افتاد کے باعث کبھی ایرانی لشکر سے مل جاتے کبھی رومیوں کی افواج سے ملحق ہو جاتے اور لوٹ مار میں خوب حصہ لیتے۔

آخر ان دونوں سلطنتوں نے ارادہ کیا کہ اپنی حفاظت کے لیے صحرا نشین لوگوں کو بطور ڈھال کے استعمال کیا جائے تاکہ کوئی سلطنت دوسری سلطنت پر حملہ نہ کر سکے اور شام کلی طور پر رومیوں کے لیے اور عراق خاص طور پر ایرانیوں کے لیے وقف ہو جائے۔

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی پالیسی کے تحت شامی حدود کے قریب بسنے والے عرب قبائل کو رومیوں نے اپنے ساتھ اور عراق کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بسنے والے قبائل کو ایرانیوں نے اپنے ساتھ ملا لیا اور ان قبائل نے بھی اندرونی خود مختاری، بدوی معیشت اور عربی معاشرت برقرار رکھتے ہوئے اپنی ہمسایہ سلطنتوں کی بالادستی تسلیم کر لی۔

شام میں مقیم عربی قبائل اپنے قومی خصائص برقرار رکھنے کے باوجود رومی تہذیب و تمدن اور سیاسی اثرات قبول کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ مگر انھوں نے جہاں ایک طرف رومی تہذیب و تمدن کو اپنایا وہاں دوسری طرف رومیوں پر بھی اثر ڈالنے اور مملکت میں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ مشہور رومی شہنشاہ فلپ دراصل عربی النسل اور قبیلہ ضجعم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے کے متعلق تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے اسی نے عرب سے شام کی طرف نقل مکان کیا۔ تخت شاہی پر متمکن ہونے سے پہلے فلپ اپنی قوم کا سردار تھا اس کی وجہ سے شام میں مقیم عربوں کو بے حد عزت و قوت حاصل ہو گئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے صحرا کو چھوڑنا اور رومیوں میں مدغم ہو جانا پسند نہ کیا۔

شامی عربوں کے برعکس عراق کی سرحدوں پر آباد ہونے والے عربوں نے صحرا کو چھوڑنے اور عراقی حدود میں داخل ہونے سے پرہیز کیا۔ کیونکہ اس طرح انھیں کلیۃً ایرانیوں کا مطیع و فرمانبردار ہو کر رہنا پڑتا تھا جسے ان کی آزاد منش طبیعت کسی طرح گوارا نہ کر سکتی تھی لیکن بعد میں جب ایرانی سلطنت میں طوائف الملوکی اور خانہ جنگی پھیل گئی اور مختلف قبائل کے سردار اپنے اپنے علاقے میں خود مختار حاکم بن بیٹھے تو ان عربوں نے عراقی حدود میں داخل ہونے اور وہاں آباد ہونے میں کوئی مضایقہ نہ سمجھا کیونکہ اب ان کے دلوں سے ایرانی سلطنت کی غلامی کا خوف کافور ہو چکا تھا۔ انھوں نے عراق کی حدود میں داخل ہو کر دریائے فرات کے کنارے انبار کا شہر اور اس سے کچھ ہٹ کر حیرہ کا شہر آباد کیا اور یہاں سکونت پذیر ہو گئے۔

اِس روایت کے برعکس بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے فرات کے ساحل پر بسنے والے عرب قبائل اصل میں وہ قیدی تھے جنھیں ایرانیوں نے عرب کے جنوبی علاقوں سے تاخت و تاراج کے دوران میں پکڑا تھا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ شہنشاہ بخت نصر دوم نے عرب پر حملے کے دوران میں جن لوگوں کو قیدی بنایا تھا انھیں وہ ساتھ لے گیا اور عراق پہنچ کر انھیں دریائے فرات کے کنارے مقام انبار میں آباد کیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد انھیں انبار سے جانب جنوب منتقل کر دیا۔ وہاں ان عربوں نے شہر حیرہ کی بنیاد رکھی اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

عربوں نے عراق میں اپنا اثر و رسوخ اسی وقت سے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ۲۱۵ء اور ۲۶۵ء کے درمیانی عرصے میں جب عراقی عربوں کی قیادت جذیمۃ الابرش یا جذیمۃ الوضاح کے ہاتھ میں آئی تو اس نے کمال ہوشیاری سے عراق کی حدود میں بسنے والے عربوں کو ساتھ ملا کر حیرہ سے انبار اور عین التمر تک کا علاقہ قبضے میں کر لیا اور فرات کے مغرب میں صحرائے شام تک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اُس نے اسی پر بس نہ کی بلکہ صحرائے شام میں بسنے والے ایک عرب قبیلے مضر پر حملہ کر کے وہاں کے عرب باشندوں پر بھی تسلط بٹھا لیا۔ مضر کا ایک شخص عدی بن ربیعہ جذیمہ سے مل گیا تھا جس کی جذیمہ نے بڑی خاطرداری کی اور اسے اعزاز و اکرام سے نوازا۔

عدی نے جذیمہ کی بہن رقاش سے شادی کر لی تھی۔ عربی کتب ادبیات میں دونوں کے متعلق بڑے پرلطف قصے درج ہیں۔ رقاش کے بطن سے عمرو بن عدی پیدا ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جس زمانے میں جذیمۃ الوضاح نے عراق میں عربوں کے بادشاہ کی سی حیثیت حاصل کر رکھی تھی اسی زمانے میں اذینہ بن سمیذع شام میں مقیم عربوں کی قیادت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایران کی شہنشاہی سابور کے ہاتھ میں تھی اور روم کی بادشاہی فلپ کے قبضے میں۔ فلپ بہت سنگدل بادشاہ تھا اور رعایا پر بے حد ظلم و ستم توڑتا رہتا تھا۔ ان مظالم سے تنگ آ کر اہل شام نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ سابور نے موقع کو غنیمت جانا اور شام پر چڑھائی کر کے رومی فوج کو شکست دے دی۔ اذینہ بھی رومی سلطنت سے دوستی کا عہد توڑ

کر ایرانیوں سے جاملا۔ اصل میں اس کی خواہش یہ تھی کہ سابور کے زیر سایہ وہ بھی عراق میں وہی رتبہ حاصل کرے جو جذیمہ کو حاصل تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کیونکہ اسی زمانے میں قالریان نے فلپ کو تخت شاہی سے اتار کر اس کی جگہ بادشاہی سنبھال لی بادشاہ بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوج لے کر خود شام کی طرف روانہ ہوا اور سابور کو شکست دے کر اسے ایران کی جانب بھگا دیا۔ اذینہ نے بھی حیثیت بدل لی اور دوبارہ رومیوں کا حلیف بن گیا لیکن قالریان کی بادشاہی بھی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اور بہت جلد اسے تخت و تاج سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس وقت اذینہ نے دوبارہ سابور سے مل جانا چاہا لیکن سابور نے اس کی ابن الوقتی کے پیش نظر اسے اپنا حلیف بنانے اور اس کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ اذینہ کو اپنی قیادت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ وہ شامی عربوں کو ساتھ ملا کر ایرانیوں سے اعلان جنگ کر دے۔ اس مرتبہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے ایرانیوں کو شکست دے کر مدائن کی طرف بھگا دیا۔ اس کارنامے سے رومیوں کے دلوں میں بھی اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور وہ سمجھنے لگے کہ ایرانیوں کے مقابلے میں انھیں ایک طاقت ور شخص کی خدمات میسر آگئی ہیں۔

اذینہ کے بعد اس کی اولاد حاکم بنی۔ انھیں میں اس کی نہایت حسین و جمیل لڑکی زبا بھی تھی۔ زبا نے جذیمہ کو جال میں پھنسا کر اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے کی دعوت دی جو اس نے بڑی خوشی سے قبول کر لی لیکن شادی کے بعد زبا نے موقع پا کر جذیمہ کو قتل کرا دیا۔ جذیمہ کے لڑکے عمرو بن عدی کے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھی اور اس نے قیصر بن عمرو کو ساتھ لے کر زبا کا محاصرہ کر لیا۔ جب زبا نے دیکھا کہ اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا اور اسے لامحالہ عمرو بن عدی کے ہاتھ سے قتل ہونا پڑے گا تو اس ذلت سے بچنے کے لیے اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی وفات سے شام میں بنی سمیذع کی قیادت کا دور ختم ہو گیا اور ان کی جگہ غسانیوں نے لے لی۔ کچھ عرصے بعد بنی نصر کی ایک جماعت نے جو عراق میں برسرِ اقتدار تھی، شام کے عربوں پر تسلط جمانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔

اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ

ان واقعات کا مطالعہ کرنے سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ لوگ جنھیں ابتدا میں قیدی بنا کر سرزمین

عرب سے لایا گیا تھا، انھوں نے آہستہ آہستہ اتنی طاقت حاصل کرلی کہ رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں ان کی مدد کی محتاج ہوگئیں اور ان کی پوری کوشش ان کی دوستی اور تائید کے حصول میں صرف ہونے لگی۔ شجاعت اور فنونِ جنگ میں مہارت کی بدولت دونوں سلطنتیں انھیں اندرونی اور ذاتی خودمختاری دینے پر مجبور ہوگئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایران اور روم کے زیرِ سایہ بسنے والے قبائل عرب، یمن اور حضرموت کے قبائل سے نہ صرف یہ کہ کسی طرح کم نہ تھے بلکہ انھیں ان قبائل سے زیادہ آزادی اور خودمختاری حاصل تھی۔ اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے میں عرب کی حدود جنوب میں خلیجِ فارس اور خلیجِ عدن سے لے کر شمال میں موصل اور آرمینیہ تک پھیلی ہوئی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ اسی طرح یہ دعویٰ بھی غلط نہ ہوگا کہ عراق اور شام کی حدود میں بسنے والے ان عرب قبائل نے آئندہ ہونے والی اسلامی فتوحات کے لیے مقدمۃ الجیش کا کام دیا اور ان علاقوں میں اسلامی سلطنت کے قیام کی غرض سے زمین ہموار کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے دماغوں میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا دھندلا سا نقشہ بھی نہ تھا اور کسی کو سرزمینِ عرب میں ایک عظیم الشان نبی کی بعثت اور اس کے ذریعے سے عرب قوم کی سربلندی کا خیال بھی پیدا نہ ہوسکتا تھا لیکن دریائے فرات اور شام کی وادیوں کے درمیان ان قبائل کی سکونت، ان کی طرف سے عربی رسوم و رواج اور عادات و خصائل کی شدت سے محافظت اور ایران و شام اور عرب قبائل سے مساوی بنیادوں پر ان کے تعلقات۔ یہ تمام عوامل اس عربی سلطنت کی بنیاد بنے جس نے کامل چار صدی بعد ایرانی اور رومی سلطنت کی جگہ لی۔

اس جملہ معترضہ کو ختم کر کے ہم واقعات کو اسی جگہ سے شروع کرتے ہیں جہاں سے ہم نے انھیں چھوڑا تھا۔

جذیمہ الابرش کے قتل کے بعد سابور کی جانب سے عمرو بن عدی کو عراق کے عربوں کا سردار اور بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس نے حیرہ کو دارالحکومت بنالیا اور اس کے بعد حیرہ اس وقت تک لخمیوں کا دارالحکومت رہا جب تک حکومت ان کے ہاتھوں سے نہ چھن گئی۔

شاہانِ حیرہ

عراق میں بسنے والے عرب ایرانی شہنشاہی کے برائے نام محکوم تھے، اقتدار حاکم حیرہ ہی کے ہاتھ میں

ہوتا تھا۔ ان عربوں کے فرائض صرف یہ تھے کہ اگر عرب یا شام کی طرف سے ایران پر حملہ ہو تو اسے روکیں اور ان تجارتی راستوں کی حفاظت کریں جو فارس سے شام اور عرب کو جاتے تھے

لیکن اس کے باوجود سرزمین ایران پر عربوں کے حملے نہ رک سکے۔ خلیج فارس کا قرب ان حملوں کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔ وہ نہ صرف خشکی کی راہ سے حملہ کرتے تھے بلکہ بسا اوقات سمندری راستے سے بھی دھاوا بول دیتے تھے۔ ایرانیوں نے بارہا ان کے حملوں کو روکا۔ آخر ذوالاکتاف کو اپنی حدود میں ایک خندق کھدوانی پڑی تاکہ ان حملوں کی شدت کم ہو جائے اور ایرانیوں کو آئے دن کے دردِ سر سے نجات ملے۔

بنی نصر کے بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت حیرہ پر متمکن ہوتے رہے آخر چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں شہنشاہ یزدجرد کی طرف سے نعمان اکبر تخت پر بیٹھا۔ یہ شخص تھا جس نے دو مشہور محل خورنق اور سدیر تعمیر کرائے تھے۔

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ عراق میں عیسائیت کا نفوذ نعمان ہی کے عہد سے شروع ہوا اور اس کی وجہ نعمان کی اس مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ پادریوں نے جب اس کا میلان عیسائیت کی طرف دیکھا تو اس کی اجازت سے ملک کے طول و عرض میں کئی گرجے تعمیر کر لیے۔ بعض مؤرخین تو یہاں تک ذکر کرتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف دلچسپی تک محدود نہ تھا بلکہ نعمان عیسائیت کا پرجوش رکن بن گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ شہنشاہ یزدجرد عیسائیوں کا سخت مخالف ہے اور عیسائیت قبول کرنے والوں کو شدید سزائیں دیتا ہے تو وہ اپنے بیٹے منذر اکبر کے حق میں بادشاہی سے دست بردار ہو گیا اور خود رہبانیت اختیار کر لی۔

شہنشاہ یزدجرد نے اپنے لڑکے بہرام گور کو بچپن ہی میں حیرہ بھیج دیا تھا تاکہ وہ وہاں پرورش پائے۔ حیرہ میں پرورش پانے کی وجہ سے بہرام کو عربی اور یونانی میں بڑی دسترس حاصل ہو گئی تھی اور عربوں اور رومیوں کے معاشی اور سیاسی حالات سے وہ پوری طرح واقف ہو گیا تھا۔ یزدجرد کی وفات کے بعد ایرانی سرداروں نے کسریٰ بن اردشیر بن سابور ذوالاکتاف کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی پرورش ایران میں ہوئی تھی اور وہ اس کے عادات و خصائل سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن بہرام ان کے نزدیک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔

بہرام نے اپنا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے منذر سے مدد حاصل کی۔ جب وہ اپنی چھینی ہوئی میراث حاصل کرنے میں کام یاب ہو گیا تو منذر نے اُسے نصیحت کی کہ وہ اپنے دشمنوں سے عفو و درگزر سے کام لے۔ بہرام نے اس نصیحت پر عمل کیا اور اِس طرح نہ صرف اپنے مخالف سرداروں اور امرا کو اپنا گرویدہ کر لیا بلکہ انعام و اکرام دے کر اور ٹیکسوں کا بوجھ کم کر کے رعایا میں بھی ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔

عیسائیت

بہرام گور اپنے باپ کی طرح عیسائیوں کا شدید دشمن تھا۔ اسی لیے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عیسائیت کے استیصال کی مساعی شروع کر دیں جس کے نتیجے میں ایران اور روم کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اِس جنگ میں منذر نے بہرام کی مدد کی۔ پھر بھی یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا اور آخر فریقین میں صلح ہو گئی جو مدت دراز تک برقرار رہی۔

شام میں بنی غسان کے عرب سردار اور حاکم ایرانیوں سے جنگ کے دوران میں رومیوں کی مدد کیا کرتے تھے اور لخمی ایرانیوں کے حلیف بن کر رومیوں کے مقابلے میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ ان جنگوں نے، جو ان عظیم سلطنتوں کے درمیان رونما ہوئیں، فریقین کے مذہبی جذبات کو ابھارنے میں بے حد مدد دی۔ چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں، جب قسطنطین نے رومی سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی۔ اس وقت مسیحیت نے ترقی کرنی شروع کی۔ رومی بادشاہوں نے اپنے مقبوضات میں اسے ترویج دینے کی کوشش کی اور عیسائی مناّدوں نے قریہ بہ قریہ پھر کر حضرت عیسٰی کا پیغام دنیا کو سنانا شروع کیا۔ ان مبلغین نے اپنا دائرہ عمل صرف شام تک محدود نہ رکھا بلکہ عراق اور بلادِ فارس میں بھی عیسائیت کی ترویج کے لیے مساعی شروع کر دیں۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کی ان مذہبی جنگوں کے دوران میں عراق اور شام کے عربی قبائل کا طرزِ عمل کیا تھا۔ آیا انھوں نے بھی اپنے آقاؤں کے ادیان کا اثر قبول کر کے مجوسی اور مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا یا وہ بہ دستور اپنے آبائی مذہب بت پرستی پر قائم رہے؟

اگلی بحث شروع کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس سے عربوں کی ذہنی استعداد کا اچھی طرح پتا چل جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا اس ذہنی افتاد نے اسلامی فتوحات کے لیے کس حد تک راستہ ہموار کیا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ عربوں نے عراق میں ایرانیوں کی اور شام میں رومیوں کی تہذیب و تمدن کا اثر بڑی حد تک قبول کر لیا تھا۔ عراق میں رہنے والے بعض عربوں نے فارسی میں اچھی دسترس حاصل کر لی تھی اور ایرانی علوم و فنون، ادب اور ادیان سے خوب واقف ہو گئے تھے اور انھوں نے مانی، زردشت اور مزدک کی تعلیمات اور عقائد سے بھی گہری واقفیت حاصل کر لی تھی[1]۔

یہی حال شام میں مقیم عربوں کا تھا۔ انھوں نے نہ صرف رومیوں کی ثقافت، ادب اور ادیان کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا بلکہ عقلی و ذہنی طور پر وہ حیرہ کے عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے کیونکہ یونانی ثقافت اور رومی تہذیب و تمدن سے ان کا بہت قریبی تعلق تھا۔

عراقی عربوں نے ایرانیوں سے گہرے تعلقات اور میل ملاپ کے باوجود مجوسیت کو کبھی قبول نہ کیا۔ اسی طرح شامی عربوں نے رومی اور یونانی دیوتاؤں کی کبھی پرستش نہ کی۔ اس کے باوجود جب رومی سلطنت میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا تو صرف شامی عربوں ہی نے نہیں بلکہ عراقی عربوں نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہا اور کثرت سے اس نئے دین میں داخل ہونے لگے۔ طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عربوں نے اپنے آقاؤں کے پہلے ادیان کو قبول نہ کیا تو وہ عیسائیت کی طرف کس طرح مائل ہو گئے؟

مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ بنوغسان میں سب سے پہلے عیسائی بادشاہ نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ شہنشاہ روم اپنی مملکت میں کسی جگہ بھی کسی غیر عیسائی کو حاکم مقرر کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں میں عیسائیت پھیل گئی پھر بھی ہمارا سوال برقرار رہتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ رومی شہنشاہ کے دباؤ کے ماتحت غسانی امراء عیسائی ہو گئے تھے تو بھی عوام کے عیسائیت قبول کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم کی ضرب المثل کے تحت شامی قبائل اپنے سرداروں کی وجہ سے عیسائی ہو گئے تھے

---

[1] فجر الاسلام از احمد امین صفحہ ۳۲ منقول از الاعلاق النفیسہ لابن رستہ

تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عراقی قبائل میں سے بیشتر لوگوں نے عیسائیت کیوں قبول کر لی تھی حالانکہ یہی لوگ ایرانیوں کی تائید میں رومیوں سے لڑا کرتے تھے۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ عراق اور شام کے قبائل میں عیسائیت پھیلنے کی کچھ نہ کچھ وجوہ ایسی تھیں جن کا تعلق عربوں کی ذہنی افتاد اور میلانات سے تھا اور جو ان وجوہ سے سراسر مختلف تھیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

عربوں کی سرشت میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہ وہ پر پیچ باتیں کرتے اور نہ ایسی باتیں پسند کرتے تھے۔ مزدک اور مانی نے لوگوں کے سامنے جو عجیب و غریب نظریات پیش کیے تھے، اسی طرح یونانی فلسفے کی بنیاد جن دقیق اور پُر پیچ باتوں پر تھی عربوں کی عقلیں انھیں سمجھنے سے قطعاً قاصر تھیں۔ اس کے بالمقابل عیسائیت چونکہ اپنے اندر بڑی حد تک سادگی لیے ہوئے تھی اس لیے عربوں نے اُسے آسانی سے قبول کر لیا اور بہت ہی کم لوگ مجوسیت کی طرف مائل ہو سکے۔

چونکہ عیسائیت کا آغاز خدا کے ایک نہایت پاک باز بندے کے ذریعے سے ہوا تھا اسے قبول کرنے والے اہل کتاب میں شمار ہوتے تھے اور اسلام کے ظہور کے وقت متعدد نیک دل عیسائیوں نے رسول اللہ کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ عراق اور شام میں بسنے والے عرب باشندوں کا قبول عیسائیت عربی فتوحات اور اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے بنیاد ثابت ہوا ہو۔

تبدیلیٔ مذہب سے ان عربوں کی سرشت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ نہ عیسائیت کے پیچھے انھوں نے اپنی شخصی اور قومی آزادی کو چھوڑا اور نہ وہ بدویانہ طرزِ زندگی ترک کیا جو وہ صدیوں سے قائم رکھے ہوئے تھے۔

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں ایک عورت ماویہ بنت ارقم بن حارث ثانی کو شام میں عربوں کی حکومت تفویض ہوئی۔ رومیوں نے اسے کمزور جانتے ہوئے اس سے بادشاہی چھیننی چاہی لیکن اس نے عورت ذات ہوتے ہوئے بڑی بہادری سے رومیوں کا مقابلہ کیا اور انھیں مصالحت پر مجبور کر دیا۔ لیکن بعد میں جب رومیوں کے خلاف کچھ لوگوں نے بغاوت کر دی تو

ماویہ نے پچھلے واقعات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے متعدد بہترین شہسوار رومیوں کی مدد کے لیے بھیجے جنھوں نے قسطنطنیہ جاکر پامردی سے باغیوں کا مقابلہ کیا۔

پھر بھی نہ تو آزادی کا وہ جذبہ، جو عراق اور شامی عربوں میں یکساں جاری و ساری تھا، انھیں متحد کر سکا اور نہ فریقین کا عیسائیت کی طرف گہرا میلان ہی ان کی باہمی عداوتوں کو مٹانے میں کامیاب ہو سکا۔ اس کے برعکس لخمی اور غسانی ایرانیوں اور رومیوں سے مل کر ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کا کوئی دقیقہ کبھی فروگزاشت نہ کرتے تھے۔

لخمی اور غسانی اوجِ کمال پر

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں عراق میں لخمی اور شام میں غسانی ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے میں لخمیوں کی قیادت منذر ثالث کر رہا تھا اور غسانیوں کی حکومت حارث بن جبلہ کے ہاتھ میں تھی۔ منذر ثالث بن ماء السماء شاہ حیرہ کا دورِ حکومت ۵۱۲ء تا ۵۶۲ء تھا۔ اسی زمانے میں ایران کے تخت پر قباذ اور کسریٰ انوشیروان یکے بعد دیگرے متمکن ہوئے۔ حارث بن جبلہ (جو ماویہ بنت ارقم ذات القرطین کا خاوند تھا) شاہ غسانیہ نے ۵۲۹ء سے ۵۶۹ء تک حکومت کی۔ یہ عہد جسٹنیان اور جسٹین ثانی شاہان روم کا تھا۔ حارث بن جبلہ کو حارث الاعرج اور حارث الوہاب کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں حسب سابق ایرانیوں کی طرف سے منذر اور رومیوں کی طرف سے حارث شریک ہوئے۔ منذر نے جنگ کے دوران میں بہادری کے بے نظیر کارنامے انجام دیے اور بالآخر رومیوں کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ رومیوں نے منذر کو تاوان کے طور پر سالانہ خراج دینا بھی منظور کر لیا مگر یہ صلح زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہی۔ رومیوں نے صلح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگی تیاریاں تیز کر دی تھیں جس سے کسریٰ کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے منذر کو حارث پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں حارث کو ایک بار پھر شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ۵۶۲ء میں رومیوں اور ایرانیوں

میں وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔

اس ساری مدت میں منذر ایرانیوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لیتا رہا اور رومی سرحد کو پامال کرتا ہوا مصر کی حدود تک پہنچ گیا۔

منذر کے اس قدر طاقت حاصل کرنے کے باوجود رومیوں کی نظروں سے حارث کی وقعت کم نہ ہوئی۔ وہ اب بھی یہی سمجھتے رہے کہ ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور عراقی عربوں کے جارحانہ حملوں کے مقابلے میں شامی عرب ایک ڈھال ثابت ہوں گے اسی لیے شہنشاہ جسٹینین نے حارث کو ۵۲۹ء میں شام کے تمام عرب قبائل کا بادشاہ بنا دیا اور اسے 'فیلارک دبطریق' (Phylorge et patrice) کا خطاب دیا۔ یہی لقب شام میں متعین رومی حاکم کو دیا جاتا تھا۔

حارث نے منذر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ چونکہ وہ مرد میدان نہ تھا اس لیے اس نے فریب کاری سے کام لینا چاہا۔ ایک دفعہ جب فریقین کے درمیان زور شور کی جنگ جاری تھی تو حارث نے سو آدمیوں کی ایک جمعیت شاہ حیرہ کے پاس بھیجی جس نے جا کر اس سے کہا کہ حارث اس کی اطاعت کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ یہ سُن کر منذر بہت خوش ہوا اور اس وفد کی خوب خاطر تواضع کی۔ مگر وفد کے ایک شخص نے موقع پا کر منذر کو قتل کر ڈالا۔ اس خبر سے لشکر عراق میں افراتفری پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر حارث نے زور شور سے حملہ کیا اور عراقیوں کی جمعیت منتشر کر دی۔ اہل عرب اس دن کو یوم حلیمہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ ان سو آدمیوں کو حارث کی بیٹی حلیمہ نے عطر لگا کر منذر کے پاس بھیجا تھا۔

اس فتح سے شامی عربوں کے حوصلے بڑھ گئے اور ان کی عزت و توقیر میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جاہلی ادب نے بھی اس زمانے میں خاصی ترقی کی۔

منذر ہی نے یوم نعیم اور یوم بؤس کی بنیاد رکھی تھی اور عرب کے مشہور شاعر عبید الابرص کو بھی یوم بؤس کے موقع پر اسی نے قتل کرایا تھا۔[1] عرب کے مشہور شعراء نابغہ ذبیانی اور علقمۃ الفحل حارث وہاب کے ہم عصر تھے۔

---

[1] یوم نعیم اور یوم بؤس کو جاہلی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر شعراء نے اشعار میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳ پر)

سلطنت حیرہ کے آخری دن

منذر ثالث بن ماء السماء کے بعد اس کا بیٹا عمرو بن ہند عراق کا بادشاہ بنا۔ اس کی بادشاہی کے نویں سال رسول اللہؐ کی ولادت ہوئی۔ عمرو بن ہند کے بعد حیرہ کے تخت پر یکے بعد دیگرے بنو منذر متمکن رہے یہاں تک کہ ابو قابوس نعمان بن منذر رابع (۵۸۳ء تا ۶۰۵ء) سریر آرائے سلطنت ہوا۔ مشہور شاعر اعشیٰ میمون بن قیس اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔ نعمان کے عہد میں عراقی عربوں کی سلطنت دریائے دجلہ کے کناروں تک پھیل گئی تھی۔ اس کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے کسریٰ کے دارالحکومت مدائن سے بالکل قریب شہر نعمانیہ کی بنیاد رکھی تھی ــــ اگرچہ نعمان انتہائی بدشکل تھا لیکن دنیوی نعمتوں اور آسائش حیات سے اسے حصۂ وافر ملا تھا۔ اس نے اپنی سوتیلی والدہ متجردہ سے شادی کر لی تھی جو بے حد حسین و جمیل تھی۔ وہ منخل یشکری سے محبت کرتی تھی۔ اِس بناء پر نعمان نے منخل کو قتل کرا دیا[1]۔ نعمان نے اپنے دورِ حکومت میں کئی شاندار باغات بنوائے تھے اور دنیا کے مختلف حصّوں سے قسم قسم کے خوبصورت پھولوں کے پودے منگوا کر ان باغوں میں لگائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گلِ لالہ کا نام نعمان کی طرف منسوب ہو کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۲) ان دنوں کی بنیاد اس طرح پڑی کہ منذر ثالث بن ماء السماء نے اپنے دو ندیموں خالد بن مضلل اور عمر بن مسعود کو ایک دن شراب کے نشے میں زندہ دفن کرا دیا۔ دوسرے روز جب اس کا نشہ اُترا اور اسے اپنی حرکت کا علم ہوا تو بہت پچھتایا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس حادثے کی تلافی کی صورت اس نے یہ نکالی کہ اس نے ان کی قبروں پر دو چھوٹے چھوٹے ستون بنا دیے اور ان کا نام غریان رکھا۔ سال میں دو دن وہاں جاتا تھا۔ ایک دن کا نام یومِ نعیم تھا۔ اس روز جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے آتا تھا اُسے سو سیاہ اونٹ انعام میں دیتا تھا۔ دوسرا دن یومِ بؤس کہلاتا تھا اُس دن جو شخص اسے سب سے پہلے نظر آتا تھا اُسے قتل کروا دیتا تھا۔ کئی سال تک یہ ہولناک رسم جاری رہی اور کئی بدقسمت اشخاص اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ (مترجم)

[1] بعض عربی روایات سے پتا چلتا ہے کہ منخل نعمان کے ڈر سے روپوش ہو گیا تھا اور اس کا سراغ ہی نہ مل سکا۔ چنانچہ عربی میں ایک ضرب المثل بھی ہے لا فعلہ حتی یؤب المنخل (میں اس وقت تک یہ کام نہ کروں گا جب تک منخل واپس نہ آ جائے) (مترجم)

شقائق النعمان پڑگیا۔

کسریٰ پرویز کو نعمان کی شان و شوکت اور اس کی سلطنت کی وسعت ایک آنکھ نہ بھائی اس نے اسے اپنے دربار میں طلب کر کے قتل کرا دیا۔ نعمان کے قتل سے لخمیوں کی بادشاہی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ کسریٰ پرویز نے نعمان کی جگہ ایاس بن قبیصۃ الطائی کو حیرہ کا بادشاہ مقرر کیا اور ایک ایرانی شخص بہرجان کو مرزبان مقرر کر کے عراق بھجوا دیا تاکہ شاہ حیرہ اپنے آپ کو خود مختار نہ سمجھے اور ایک ایرانی حاکم کا وجود اسے ہر وقت اس امر کی یاد دہانی کراتا رہے کہ وہ ایرانی حکومت کے تابع ہے۔ رسول اللہ کی بعثت ایاس ہی کے عہد میں ہوئی۔ اسی کے زمانے میں ذو قار کی مشہور لڑائی ہوئی۔

ذو قار کی لڑائی کو عربوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جنگ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کسریٰ کی ناراضی کا حال معلوم ہونے کے بعد نعمان بن منذر نے اپنے اموال اور ہتھیار ہانیٔ بن قبیصہ کے پاس بطور امانت رکھوا دیے تھے۔ نعمان کے قتل کے بعد کسریٰ نے ہانیٔ سے نعمان کی چیزیں طلب کیں لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس اثنا میں بنو بکر بن وائل نے نعمان کے قتل سے طیش میں آ کر سواد عراق پر حملہ کر دیا اور بہت سا علاقہ ایرانیوں سے چھین لیا۔ کسریٰ نے اس صورت کا مداوا کرنے کے لیے عربوں کے مقابلے پر ایرانی فوج روانہ کی۔ کوفہ کے قریب ذو قار کے مقام پر ایرانیوں اور عربوں کا مقابلہ ہوا جس میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ روایت ہے کہ اس دن رسول اللہ نے صحابہ سے فرمایا:

> "یہ پہلا روز ہے جب عربوں کو عجمیوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے اور انھیں یہ فتح صرف میری وجہ سے نصیب ہوئی ہے[1]۔"

یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ کی بعثت جنگ ذو قار والے سال ہوئی تھی۔

نعمان کے بعد تخت حیرہ پر تین بادشاہ اور متمکن ہوئے تا آخری بادشاہ منذر مغرور تھا۔ اس کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد عراق میں شاہان حیرہ کی حکومت کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور کسریٰ کی طرف سے دادویہ ایرانی کو حکومت کے مکمل اختیارات دے کر عراق بھیج دیا گیا۔

---

[1] مروج الذہب، مسعودی، جز اول، صفحہ ۲۳۶، مطبوعہ بغداد

غسانی سلطنت کے آخری دن

لخمیوں کے ذکر کے بعد اب ہم غسانیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لخمیوں کی طرح غسانی امراء بھی یکے بعد دیگرے تختِ امارت پر متمکن ہوتے رہے۔ شام کا آخری عرب حاکم جبلہ بن ایہم تھا جس کی حکومت کا خاتمہ حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی افواج کے ذریعے سے ہوا۔ ۵۸۰ء میں عمروؒ الاصغر غسانی شامی عربوں کا حاکم مقرر ہوا تھا مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے نعمان بن منذر حاکم حیرہؒ کے ڈر سے عمرو الاصغر ہی کے پاس پناہ لی تھی۔ عمرو الاصغر کے بعد ابو کرب النعمان الساوس بن حارث الاصغر برسرِ اقتدار آیا۔ نابغہ نے اس کی مدح میں جو شاندار قصائد تصنیف کیے انھیں عربی شاعری میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ نعمان سادس کے بعد غسانیوں میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور ہر علاقے میں علٰحدہ علٰحدہ حاکموں نے تسلّط بٹھالیا۔ آخر ایہم ثانی کے بیٹے جبلہ بن ایہم پر غسانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

غسانی امراء میں طوائف الملوکی حقیقت میں رومی حکومت کی ایک چال تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایک متحدہ عرب حکومت رومی سلطنت کے لیے پریشانی اور دردِ سر کا باعث نہ ہو جائے اس لیے اس نے حکمتِ عملی سے کام لے کر ہر علاقے میں علٰحدہ علٰحدہ حاکم مقرر کر دیے تاکہ عرب متحد نہ ہو سکیں اور رومی سلطنت کو کوئی نقصان و ضعف نہ پہنچ سکے۔

عراق میں لخمیوں کا صرف ایک دارالحکومت تھا اور وہ تھا حیرہ لیکن اس کے بالمقابل شام میں غسانیوں کے متعدد دارالحکومت تھے۔ جابیہ بھی دارالحکومت تھا۔ تدمر بھی دارالحکومت تھا۔ جولان بھی دارالحکومت تھا۔ دمشق کے قریب جلق بھی ایک دارالحکومت تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں عراق میں لخمیوں کی خود مختاری کا دائرہ بے حد وسیع تھا وہاں غسانیوں کی یہ حالت نہ تھی۔ انھیں اندرونی خود مختاری ضرور حاصل تھی لیکن عراقی عربوں سے بہت کم۔

اندرونی خود مختاری اور خالص عربی طرزِ زندگی اختیار کرنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ عراقی اور شامی عربوں کی زبان بہ دستور عربی ہی رہی۔ نہ عراق میں فارسی اس کی جگہ لے سکی اور نہ شام میں یونانی

اور لاطینی زبانیں عربی کی قائم مقام بن سکیں۔ اسی طرح ایک فائدہ یہ پہنچا کہ شاہان حیرہ اور امرائے بنی غسان کے تعلقات اپنے ہم وطن عربوں سے بہت گہرے اور مخلصانہ رہے۔ ان تعلقات کی استواری میں عرب کے ان شعراء نے بے حد مدد دی جنھیں حیرہ اور غسان کے بادشاہوں کی طرف سے گراں قدر انعام ملا کرتے تھے۔ کتب ادب اور شعراء کے دیوان ان بادشاہوں کے اذکار سے بھرے پڑے ہیں نابغہ ذبیانی، اعشیٰ قیس اور علقمۃ الفحل وغیرہ کثیر شعراء نے ان بادشاہوں کی مدح سرائی میں زور بیان صرف کیا تھا۔ اسی طرح دربارِ نبوی کے شاعر حسان بن ثابت کے اسلام لانے سے قبل جبلہ بن ایہم سے گہرے تعلقات تھے۔

ان تمام امور نے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اسلامی فتوحات کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب عربوں نے ان علاقوں میں پیش قدمی شروع کی تو یہاں بسنے والے عربوں نے بسا اوقات ان کی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر اپنے رومی اور ایرانی حلیفوں سے جنگ کی۔

رومیوں اور ایرانیوں کے حملے

اس زمانے میں رومی سلطنت میں بھی ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی اور ساری مملکت فساد اور شورش کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ شہنشاہ روم فوکاس (فوکس) کے خلاف ہرقل کی بغاوت زور شور سے جاری تھی۔ ایرانیوں نے موقع کو غنیمت جان کر شام پر حملہ کر دیا۔ پہلے انطاکیہ پر قبضہ کیا۔ وہاں سے بیت مقدس کا رخ کیا۔ کہاں تو ہرقل شہنشاہ روم کے خلاف برسرپیکار تھا کہاں اب اسے جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ایرانی بیت مقدس کی طرف بڑھنے سے رک جائیں لیکن اس کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ انھیں روکنے اور مسیحی و یہودی آثار مقدسہ کی بے حرمتی سے باز رکھنے میں مطلق کامیاب نہ ہو سکا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہود بھی مجوسیوں سے مل گئے اور انھوں نے عیسائیوں کے خلاف ان کی مدد کی۔ جب شام پر ایرانیوں کا کامل تسلط ہو گیا تو انھوں نے مصر کا رخ کیا اور رومیوں کی جگہ وہاں بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔

ایرانیوں کی ان پیہم کامیابیوں کے دوران میں رسول اللہؐ پر یہ آیت نازل ہوئی:

الم۔ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون
فی بضع سنین۔ للہ الامر من قبل ومن بعد۔ ویومئذ یفرح المومنون
بنصر اللہ۔

(اگرچہ رومی سرزمین شام میں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن عنقریب چند ہی سال میں وہ اپنی مغلوبیت کے بعد غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس روز اللہ کی مدد کی وجہ سے مومن خوش ہوں گے۔)

اللہ کا وعدہ حرف بحرف پورا ہوا۔ چند ہی سال میں ہرقل نے دوبارہ طاقت پکڑ لی اور ایرانیوں سے نبرد آزما ہو کر انھیں مصر اور شام سے نکال دیا۔ صلیب اعظم ان سے واپس چھین لی۔ اور اسے بیت مقدس میں اس کی اصلی جگہ آویزاں کر دیا۔ ان مسلسل لڑائیوں میں جہاں ایرانیوں کے غلبہ و اقتدار میں نمایاں فرق آگیا وہاں رومیوں کی قوت و طاقت میں بھی بہت حد تک کمی آگئی۔ دیگر امور کے علاوہ یہ امر بھی عربوں کی سلطنت کے قیام اور فتوحات اسلامیہ کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا۔

ابوبکرؓ کا موقف

رومیوں اور ایرانیوں پر جو کچھ گزر رہی تھی مکہ اور مدینہ والے اس سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح عراق اور شام کی حدود میں بسنے والے عربوں کا حال بھی ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ ان حوادث و واقعات کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے دلوں میں ایرانیوں اور رومیوں کا جو رعب و دبدبہ قائم تھا وہ جاتا رہا اور ان کی نظروں سے ان سلطنتوں کی وقعت کم ہو گئی۔ رسول اللہؐ کی بعثت اور متحدہ طور پر سارے عرب کے اسلامی جھنڈے تلے جمع ہو جانے سے اس رجحان کو مزید تقویت پہنچی۔ پھر بھی اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عربوں کی نظروں میں ان سلطنتوں کی وقعت اس درجہ کم ہو گئی تھی کہ وہ ان پر حملہ کرنے اور ان کی حدود کو پامال کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکتے تھے۔ عربوں میں بیداری ضرور پیدا ہوئی مگر اس کا دائرہ جزیرۂ عرب کو ان سلطنتوں کے اثر و نفوذ سے پاک کرنے کی کوششوں تک محدود تھا۔ چنانچہ یمن اور عرب کے تمام جنوبی علاقوں نے ایرانیوں کی اطاعت کا جوا سر سے اتار پھینکا۔ رسول اللہؐ نے اپنے عہد مبارک میں ایرانیوں کی طرف خاص نگاہ رکھی

اور اس غرض کے لیے بعض اقدامات بھی کیے۔ لیکن آپ کی غرض بھی یہی تھی کہ عرب کی شمالی سرحدوں کو قیصر کی فوجوں کے تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جائے۔ شام پر چڑھائی کرنا نہ آپ کا مقصد تھا اور نہ مسلمانوں نے ہرقل کے نام رسول اللہ کے تبلیغی خط کو شام پر چڑھائی کرنے کا بہانہ بنایا۔ پھر بھی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمانوں کے لیے ایران اور شام پر چڑھائی کرنا ضروری ہو گیا۔

جس وقت یمامہ میں خالد بن ولید اور یمن اور اس کے نواح میں مہاجر بن ابی امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل مرتدین کی سرکوبی میں مصروف عمل تھے اسی وقت سب لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب جزیرہ عرب میں حضرت خلیفۂ رسول اللہ کی فرمانروائی ہو گی اور آئندہ کسی فتنہ پرداز شخص کو شورش اور بغاوت کی آگ بھڑکانے کی جرأت نہ ہو سکے گی مگر عام لوگوں کے برعکس حضرت ابوبکرؓ نے خوش فہمی سے کام نہ لیا۔ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ فساد کے شعلے ایک بار دب جانے کے بعد دوبارہ پھر بھڑک اٹھتے اور ایک بار پھر جزیرہ عرب میں انتشار پیدا کر دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ تمام حالات کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہے اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ عرب قبائل کی شورش انگیزی کے خطرے سے بچنے کے لیے کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ان کی توجہات ایران اور شام کی طرف منعطف کر دیا جائے تاکہ انھیں حکومت کے خلاف سر اٹھانے اور فساد برپا کرنے کا کوئی موقع ہی نہ مل سکے۔ اس غرض کے لیے اللہ پہلے ہی سے سامان کر چکا تھا صحرائے شام میں عرب قبائل کثرت سے آباد تھے اور ان سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ بھی دین اسلام کو اسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیں گے جس طرح ان کے ہم قوم اور ہم اصل لوگوں نے قبول کر لیا تھا اور وہ بھی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی میں شریک ہو جائیں گے۔

یہ خیالات اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے غرض ہر دم حضرت ابوبکرؓ کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ پھر بھی اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھیں نعوذ باللہ وسعت سلطنت کی ہوس تھی اور ایک وسیع علاقے پر اقتدار قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہو، وہ بے روک ٹوک احکام دین پر عمل کر سکیں اور اسلام کی تبلیغ کے راستے میں انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ لوگوں کو اطمینان اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب حکومت کی بنیاد

عدل و انصاف پر ہو اور اس میں ہوا و ہوس کا بالکل دخل نہ ہو۔ عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ حاکمِ اعلیٰ ہر قسم کی نفسانی خواہشات سے یکسر پاک ہو اور اس میں خود غرضی و نفس پرستی کا شائبہ تک نہ ہو۔ مزید برآں وہ رعایا پر حد درجہ شفیق اور مہربان ہو۔

حضرت ابوبکرؓ اس معیار پر سو فی صد پورے اترتے تھے۔ وہ اپنے واسطے کسی عہدے اور مرتبے کے خواہش مند نہ تھے۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں انھوں نے کبھی اپنی ذات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ کی۔ رعایا پر وہ جس درجہ شفیق اور مہربان تھے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ عدل و انصاف کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے اور اس کے قیام میں اپنی جان اور اہل و عیال تک کو فراموش کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سلطنت کے تمام امور کی نگہداشت انتہائی حزم و احتیاط سے کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا پہلا سال زیادہ تر مرتدین کی شورش کا مقابلہ کرنے میں گزرا۔ مسلمان ہمہ تن اس فتنے کو فرو کرنے میں مصروف تھے اور جوق در جوق اسلامی لشکروں میں شامل ہو کر جہاد کے لیے اطراف ملک میں جا رہے تھے۔ لیکن اس نازک ترین موقع پر بھی حضرت ابوبکرؓ انتظامی اور ملکی امور میں غافل نہ رہے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو مدینہ کا قاضی مقرر فرمایا گو انھیں اس سلسلے میں کوئی کام کرنا نہ پڑا۔ وہ سال بھر تک قضا کے عہدے پر متمکن رہے لیکن کوئی مقدمہ فیصلے کے لیے ان کے سامنے پیش نہ ہوا۔ ابوعبیدہ بن جراح کے سپرد بیت المال کا انتظام تھا۔ زکوٰۃ اور صدقات کا جو مال اکٹھا ہوتا تھا وہ اس کی تقسیم کے لیے مامور تھے حضرت عثمانؓ بن عفان اور زیدؓ بن ثابت کے سپرد کتابت تھی۔ فرامین اور مراسلے یہی حضرات لکھا کرتے تھے۔ ان کے مقرر کردہ عمال اور قائدین بھی اطراف مملکت میں اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں مشغول تھے۔ ان تمام لوگوں کا حضرت صدیقؓ سے گہرا رابطہ قائم تھا اور اہم ملکی امور میں کوئی شخص ان سے مشورہ لیے بغیر قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے جنگہائے ارتداد کے دوران میں ان کے اور ان کے عمال و قائدین کے درمیان کثرت سے خط و کتابت ہوئی جو تاریخوں میں محفوظ ہے۔ جنگہائے ارتداد کے باعث چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا پہلا سال سخت مصروفیت کا گزرا۔ اس لیے انھوں نے حج کے موقع پر اپنی جگہ عتاب بن اُسید کو امیر الحج بنا کر بھیج دیا۔

جب تک مرتدین سے جنگیں جاری رہیں حضرت ابوبکرؓ کے لیے کسی اور جانب توجہ منعطف کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ جب مرتدین کا مکمل قلع قمع ہو چکا اور چپے چپے پر اسلامی حکومت کی عملداری قائم ہو چکی تو حضرت ابوبکرؓ کی توجہ اِس ضروری مسئلے پر مبذول ہوئی کہ اعلاء کلمۃ الحق اور دینِ حقہ کی اشاعت کے لیے مسلمانوں کو آئندہ کیا قدم اٹھانا اور اپنی جدوجہد کو کس شکل میں مرتکز کرنا چاہیے۔

اِس غرض کی انجام دہی کے لیے ایک شکل یہ تھی کہ رومیوں پر حملہ کیا جائے اور ان جنگوں کو جن کا آغاز رسول اللہؐ غزوۂ تبوک کے ذریعے سے فرما چکے تھے، پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ عربوں کی توجہ کلیۃً رومیوں کی طرف پھیر دینے سے نہ صرف آئندہ کے لیے عرب سے بغاوت اور فتنہ و فساد کا خطرہ دور ہو جاتا بلکہ مملکت روما کے طول و عرض میں اشاعتِ اسلام کے لیے بھی راستہ صاف ہو جاتا۔

لیکن اِس سلسلے کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جس پر نظر رکھنا بے حد ضروری تھا۔ وہ یہ کہ اگر مسلمان رومیوں پر فتح یاب نہ ہو سکتے تو پورے جزیرۂ عرب کو زبردست خطرہ لاحق ہو جاتا جو مرتدین کے فتنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا۔ رومی اپنے علاقے میں مسلمانوں کو شکست دے کر انھیں اپنے علاقے سے نکال دینے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ انھیں حملے کا مزہ چکھانے کے لیے جزیرہ عرب پر بھی حملہ کر دیتے۔ عرب پر رومیوں کی چڑھائی معمولی بات نہ تھی، اس صورت میں اسلام کا کلیۃً قلع قمع ہو جاتا۔

مرتدین کے مقابلے میں مسلمانوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے آکر عرب سے بت پرستی کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا اور تمام عرب عقیدۂ توحید کی لڑی میں منسلک ہو چکے تھے۔ یہ ایک زبردست قوت تھی جو اسلام کو حاصل تھی۔ مدعیانِ نبوت نے قبائلی عصبیت کی بنا پر سادہ لوح انسانوں کو چند روز کے لیے تو اپنے پیچھے لگا لیا لیکن محض بے بنیاد عقیدوں اور مضحکہ خیز تعلیمات کی بنا پر زیادہ عرصے کے لیے انھیں اپنے ساتھ لگائے رکھنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی ان لوگوں کا کذب و افترا ان کے پیرووں پر ظاہر ہونے لگا وہ ان کا ساتھ چھوڑنے لگے لیکن رومیوں کی بات علیحدہ تھی۔ وہ عیسائی تھے اور اس دین کے پیرو جو ایک شاندار ماضی کا حامل تھا۔ مسلمانوں کی طرح وہ اہلِ کتاب تھے، اس کے علاوہ زبردست قوت و طاقت کے

کے مالک بھی۔

یہ درست ہے کہ ان کے اور ایرانیوں کے درمیان سالہا سال سے جنگ و جدل کا سلسلہ جاری تھا۔ ابتدا میں ایرانی ان پر غالب آ گئے۔ لیکن بعد میں رومیوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ جدال و قتال کے اس غیر مختتم سلسلے نے دونوں سلطنتوں کی قوت و طاقت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ پھر بھی ابھی ان کا رعب و داب ہمسایہ اقوام پر بدستور قائم تھا۔ آپس میں تو وہ جنگ و جدل میں مصروف اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے میں مشغول تھے لیکن کسی دوسری سلطنت کی مجال نہ تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتی۔ خصوصاً عرب جیسی حقیر قوم کی جس کی قوت و طاقت ایرانیوں اور رومیوں کے پاسنگ بھی نہ تھی اور جو ان سلطنتوں سے جنگ چھیڑنا اپنی موت کو اپنے ہاتھ سے دعوت دینے کے مترادف سمجھتی تھی۔

دوسرے عربوں کی طرح حضرت ابوبکرؓ کے دل میں بھی ایرانیوں سے جنگ کرنے کا خیال نہ آسکتا تھا۔ حجاز فارس کے متصل نہ تھا۔ اور عرب کے جو علاقے ایران سے ملے ہوئے تھے۔ ان میں قبل ازیں ارتداد کا فتنہ زور شور سے بھڑک چکا تھا اور کسی جنگ کی صورت میں اس علاقے کے لوگوں پر قطعاً اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے واسطے یہی صورت مناسب تھی کہ وہ فتنۂ ارتداد فرو کرنے کے بعد تمام تر توجہ سلطنت کے اندرونی استحکام اور قیام امن پر مبذول کرتے تاکہ عرب ایک وحدت میں منسلک ہو کر اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیتے اور ان کی قوت و طاقت میں شاندار اضافہ ہو جاتا۔

مثنیٰ ابن حارثہ اور عراق

حضرت ابوبکرؓ آئندہ اقدامات کے متعلق غور و فکر ہی میں مشغول تھے کہ خبر ملی' ایک شخص مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ایک قلیل فوج کے ساتھ پیش قدمی کر کے بحرین کے شمال میں دجلہ اور فرات کے دہانے تک پہنچ چکا ہے۔ وہ ایرانی حکام جنھوں نے بغاوت کی آگ بھڑکانے میں بحرین کے مرتدین کی مدد کی تھی' اس کے آگے بے بس ہو گئے ہیں اور تاب مقاومت نہ لا کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو اب تک مثنیٰ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ان خبروں کے پہنچنے کے بعد تحقیقات

کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بحرین کے قبیلہ بکر بن وائل سے تعلق رکھتا ہے اور علاء بن حضرمی کے ساتھ مل کر مرتدین سے جنگ کر چکا ہے۔ بحرین اور اس کے نواح میں جو لوگ بہ دستور اسلام پر قائم رہے تھے اور جنھوں نے اسلامی فوجوں کے ساتھ مل کر مرتدین کی جنگوں میں حصہ لیا تھا مثنیٰ ان کا سردار تھا۔ ارتداد کا فتنہ ختم ہونے کے بعد بھی وہ چین سے نہ بیٹھا اور اپنے لوگوں کو ہمراہ لے کر خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ، بجانب شمال، عراق کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ آخر وہ ان عربی قبائل میں پہنچا جو دجلہ اور فرات کے ڈیلٹائی علاقے میں آباد تھے۔ اس نے گفت و شنید کر کے انھیں ایرانی سلطنت کا جؤا سر سے اتار دینے اور اسلامی حکومت کی حمایت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ان امور کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مثنیٰ معمولی شخص نہیں بلکہ اپنے قبیلے کا ایک معزز فرد اور انتہائی قابلِ اعتماد شخص ہے۔ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر قیس بن عاصم المنقری نے کہا:

"یہ شخص گم نام، مجہول النسب اور فریب کار نہیں۔ یہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ہے جو اعلیٰ حسب نسب اور شہرت و عزت کا مالک ہے۔"

اس صورتِ حال نے حضرت ابوبکرؓ کے لیے غور و فکر کی نئی راہیں کھول دیں۔ اب ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کیا اس موقع پر مسلمانوں کو عرب کی حدود سے باہر بھیجنا مناسب ہوگا اور کیا مثنیٰ میں اتنی طاقت ہے کہ وہ عراق میں گھس کر ایرانی سلطنت کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھولنے میں کامیاب ہو سکے گا؟

عراق کی صورتِ حال یقیناً مسلمانوں کے لیے قابلِ توجہ تھی اور وہ اِس طرف سے غافل نہ ہو سکتے تھے۔ عراق میں بنو لخم، تغلب، ایاد، نمر اور بنو شیبان متعدد عربی قبائل آباد تھے۔ گو یہ قبائل ایرانیوں کے محکوم اور ان کے مطیع و منقاد تھے۔ پھر بھی جزیرۂ عرب سے ان کا جو قدرتی رشتہ تھا، اُسے بھی وہ کسی صورت میں فراموش نہ کر سکتے تھے۔ عرب میں جو بھی تحریک اُٹھتی اُن کے لیے اس کا بہ نظر غائر جائزہ لینا ضروری تھا۔ ادھر سجاح نے بھی عراق ہی سے نکل کر نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس کی تمام امیدیں بھی ان مذکورۂ بالا قبائل ہی سے وابستہ تھیں۔

اِس ضمن میں حضرت ابوبکرؓ کے لیے سب سے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ عراق میں ایرانی اقتدار

ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ رسول اللہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل ہرقل شہنشاہ روم نینوا اور دستجرد میں ایرانی افواج کو شکستِ فاش دے چکا تھا۔ اس کی فوجیں ایرانی دارالسلطنت مدائن کے دروازوں تک پہنچ گئی تھیں۔

ہرقل کی فوج کشی کے بعد بعض اور علاقے بھی ایرانی عملداری سے نکلنے اور آزاد ہونے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے یمن نے ایرانی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کیا اور وہاں کے عامل باذان نے اسلام قبول کر کے اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کر لی۔ بعدازاں بحرین اور خلیج فارس و خلیج عدن کے تمام علاقوں نے بھی ایرانیوں کی غلامی کو خیرباد کہا اور وہاں بھی اسلامی حکومت کا دور دورہ ہو گیا سلطنتِ ایران نے ان علاقوں کی بازیابی کے لیے کوئی کوشش نہ کی اور اس کے مقرر کردہ حاکم اپنی اپنی جگہ بیٹھے اطمینان سے مقبوضہ علاقوں پر غیر قوم کو قابض ہوتے دیکھتے رہے۔

اس موقع پر وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ خود سلطنت اندرونی انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔ تختِ ایران پر قبضہ کرنے کی خاطر ایرانی امرا میں جنگ و جدل برپا تھا۔ چار سال میں نو بادشاہ تخت نشین ہو چکے تھے اور ہر بادشاہ نے بے دریغ اپنے مخالفین کا قتلِ عام کرایا تھا۔ کسی بادشاہ کو چین سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور تخت پر متمکن ہونے کے چند ہی روز بعد اسے اپنے دشمنوں کی سازش کا نشانہ بننا پڑا۔

حضرت ابوبکرؓ آئندہ اقدام کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ کرنے نہ پائے تھے کہ مثنیٰ خود مدینہ میں آموجود ہوئے اور تمام حالات خلیفہ کے گوش گزار کر دیے۔ انھیں اطمینان دلایا کہ شام کے برعکس عراق کی فتح سہل الحصول ہے اور عراق کے میدانوں میں عربوں کو ان مہیب خطرات سے بالعموم دوچار ہونا نہ پڑے گا جن خطرات سے شام پر فوج کشی کی صورت میں ہونا پڑتا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ زرخیزی اور حسین قدرتی مناظر کے لحاظ سے شام سے کسی طرح کم نہیں۔ اہلِ حجاز کو چونکہ عراق کی نسبت شام کا سفر اختیار کرنے میں زیادہ آسانیاں میسر ہیں اس لیے قدرتاً ان کی نظریں شام ہی کی طرف اٹھتی ہیں لیکن اگر وہ عراق کے دل فریب مناظر دیکھیں تو یقیناً شام کی طرح یہ علاقہ بھی ان کے لیے پرکشش ثابت ہو۔

مثنیٰ نے یہ بھی بتایا کہ جو عرب قبائل دجلہ اور فرات کے ڈیلٹائی علاقے میں آباد ہیں وہ

وہاں کے مقامی باشندوں کے ہاتھوں سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ عرب زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو ایرانی زمیندار آتے اور سارا غلہ سمیٹ کر لے جاتے ہیں لیکن وہ غریب مزارع جنھوں نے رات دن سخت محنت و مشقت برداشت کرتے ہوئے خون پسینہ ایک کر کے فصل تیار کی تھی، بالکل محروم رہ جاتے ہیں اور ان کے حصے میں ان چند ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں آتا جو زمینوں کے مالک ازراہِ رحم بخشش کے طور پر انھیں دے جاتے ہیں۔ اس ذلیل برتاؤ کے باعث عربوں کے دل ایرانی امرا اور زمینداروں کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں اور اگر جزیرۂ عرب کو ایرانی دسیسہ کاریوں، سازشوں اور مخالفانہ کارروائیوں سے بچانے کے لیے عراق پر فوج کشی کی جائے تو ایرانیوں سے دلی نفرت کے باعث وہاں کے عرب قبائل ضرور اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور ہر طرح اُن کی امداد کریں گے۔ اس لیے یہ نادر موقع ہاتھ سے نہ کھونا چاہیے اور سرزمینِ عراق میں اسلامی فوجیں روانہ کر دینی چاہئیں۔

عراق کا ڈیلٹائی علاقہ ہی اپنی خوب صورتی اور زرخیزی کے باعث عدیم المثال نہ تھا بلکہ دجلہ اور فرات کا علاقہ بھی، جو تقریباً تین سو میل لمبا تھا، سارے کا سارا قدرتی نظاروں سے معمور تھا۔ زمین کی زرخیزی اور شادابی کے علاوہ یہ علاقہ تاریخی لحاظ سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے چپے چپے پر آثارِ قدیمہ بکھرے پڑے تھے اور زبانِ حال سے پرہیبت بادشاہتوں اور پرشکوہ سلطنتوں کی داستانیں ہر آنے جانے والے کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ شہر اُور، جس کے آثار ہمارے زمانے میں دریافت ہوئے ہیں اور جس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شہر اس زمانے میں تعمیر ہوا تھا جب فراعنہ مصر پر حکمران تھے، اسی منطقے میں واقع تھا۔ شمالی جانب تھوڑا سا اور آگے بڑھنے پر قدیم شہر بابل کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ دریائے فرات کے کنارے بابل کا بُرج اب تک کھڑا اشوریین کی عظمت و شوکت کی داستان بیان کر رہا ہے۔ اسی دریائے فرات کے ساحل پر ساسانی جاہ و جلال کا مظہر اور ایرانی سلطنت کا دارالحکومت مدائن آباد تھا جس کی ثروت اور شان و شوکت کا شہرہ اقصائے عالم تک پھیلا ہوا تھا۔

باغات کی کثرت، غلے کی فراوانی اور دلفریب قدرتی مناظر کے باعث یہ علاقہ جنت ارضی

کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی لیے جب مثنیٰ شیبانی نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ساری صورتِ حال واضح کی تو وہ اس علاقے میں اسلامی فوجیں بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ مثنیٰ کا منشا یہ تھا کہ عراق کے ڈیلٹائی علاقے میں اسلامی فوجیں بھیج کر عرب قبائل کو ظلم و ستم کے اس لامتناہی چکر سے نجات دلائی جائے جو ایرانی حکام کی طرف سے ان پر روا رکھا جا رہا تھا اور اس طرح انھیں ممنونِ احسان بنا کر اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ اگر ایرانی حکام لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کریں فبہا ورنہ حکومتِ ایران سے باقاعدہ ٹکر لے کر حریتِ ضمیر اور مذہبی آزادی کے لیے راستہ صاف کیا جائے اور دلائل و براہین کے ذریعے سے دینِ حقہ کی اشاعت کے سامان فراہم کیے جائیں۔

کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کے اہل الرائے اصحاب سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھیں بلایا اور عراق کے تمام حالات سنا کر مثنیٰ کی یہ درخواست ان کے سامنے پیش کی کہ انھیں ان کی قوم کا سردار بنا کر ایرانیوں سے نبرد آزما ہونے اور اس طرح ایک ایسا فرض ادا کرنے کا موقع دیا جائے جس کی بجا آوری درحقیقت اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

چونکہ اہلِ مدینہ عراق کے حالات سے بالکل ناواقف تھے اور انھیں ڈر تھا کہ سلطنتِ ایران پر چڑھائی کر کے اسلامی افواج کہیں الٹی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ خالدؓ بن ولید کو بلا کر یہ سارا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جائے اور جو رائے وہ دیں اس پر عمل کیا جائے۔ خالدؓ بن ولید اس زمانے میں غزوۂ عقربا سے فارغ ہو کر اپنی دونوں بیویوں، ام تمیم اور بنت مجاعہ، کے ہمراہ یمامہ ہی میں مقیم تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں فوراً مدینہ طلب فرمایا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے عراق پر فوج کشی کے متعلق مثنیٰ کی تجاویز ان کے سامنے رکھیں تو انھوں نے بلا پس و پیش ان پر صاد کر دیا۔

خالدؓ نے خداداد فراست کی بنا پر بھانپ لیا تھا کہ مثنیٰ نے حدودِ عراق میں ایرانیوں کے خلاف جو کارروائی شروع کی ہے اگر خدانخواستہ وہ ناکام ہو گئی اور مثنیٰ کی فوج کو عرب کی جانب پسپا ہونا پڑا تو ایرانی حکام دلیر ہو جائیں گے۔ وہ صرف مثنیٰ کی فوج کو عراق کی حدود سے باہر نکالنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ بحرین اور اس کے ملحقہ علاقوں پر دوبارہ اثر و رسوخ قائم کرنے

اور تسلط بڑھانے کی کوشش بھی کریں گے اور اس طرح اسلامی حکومت کو سخت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ دربارِ خلافت سے مثنیٰ کو فی الواقعی امداد مہیا کی جائے اور ایرانیوں کو عرب کی حدود میں اثر و رسوخ جمانے کے بجائے مزید پسپائی پر مجبور کیا جائے تاکہ ان کی جانب سے آئندہ کبھی عرب کو کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔

خالدؓ بن ولید کی یہ رائے سن کر دیگر اصحاب نے بھی مثنیٰ کی تجاویز قبول کر لیں اور حضرت ابوبکرؓ سے عرض کر دیا کہ انھیں مثنیٰ کی امارت پر کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ کو ان کی خواہش کے پیش نظر ان لوگوں کا سردار مقرر کر دیا جنھیں ہمراہ لے کر انھوں نے عراقی حدود میں پیش قدمی کی تھی اور حکم دیا کہ فی الحال وہاں کے عرب قبائل کو ساتھ ملانے اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کریں۔ جلد ہی مدینہ سے ایک لشکر بھی ان کی امداد کے لیے روانہ کیا جائے گا جس کی مدد سے وہ مزید پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے۔

یہ ہے وہ روایت جسے ہمارے خیال میں دوسری روایات پر ترجیح حاصل ہے، لیکن بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ نہ مثنیٰ امداد کی درخواست کرنے کے لیے مدینہ گئے اور نہ حضرت ابوبکرؓ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ ڈیلٹائی علاقے میں پیش قدمی کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ آگے جا کر انھیں ایرانی سپہ سالار ہرمز کی افواج کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی ہرمز اور مثنیٰ کے درمیان جنگ جاری تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی ان واقعات کی خبر ہوگئی۔ وہ اس وقت تک مثنیٰ کے نام سے بالکل بے خبر تھے۔ ان خبروں کے پہنچنے پر جب انھوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ مثنیٰ نے جنگہائے ارتداد کے دوران میں بحرین کے اندر متعدد کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ انھوں نے خالدؓ بن ولید کو حکم دیا کہ وہ ایک لشکر کے ہمراہ مثنیٰ کی مدد کے لیے عراق جائیں اور ہرمز پر فتح یاب ہو کر لخمی عربوں کے دارالحکومت حیرہ کی جانب کوچ کریں۔ ساتھ ہی عیاض بن غنم کو حکم دیا کہ وہ دومۃ الجندل جائیں اور وہاں کے مرتد اور مرتد باشندوں کو مطیع کر کے حیرہ پہنچیں۔ دونوں قائدوں میں سے جو پہلے حیرہ پہنچ جائے اسی کو اس علاقے میں جنگی کارروائی کرنے والی فوجوں کی قیادت حاصل ہوگی۔

پہلی روایت کے مقابلے میں دوسری روایت ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح نہیں لیکن اس کا

کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے سرے سے صحیح ہی نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق ہمارے پاس جو روایات پہنچی ہیں ان میں بے حد اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ ابتدائی مؤرخین طبری اور ابن اثیر وغیرہ بھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کس روایت کو ترجیح دیں اور کسے نہ دیں۔

بعد میں آنے والے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ خالدؓ اپنی فوجوں کے ہمراہ جب عراق کے ڈیلٹائی علاقے میں پہنچے تو ان کے سامنے کوئی معین مقصد اور پہلے سے تیار شدہ منصوبہ نہ تھا۔ وہ صرف مثنیٰ کی مدد اور انھیں ایرانیوں کے لشکر سے نجات دلانے کے لیے آئے تھے لیکن جب ابتدائی جنگوں میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی تو انھوں نے بطورِ خود پیش قدمی کا ایک منصوبہ بنا کر حضرت ابوبکرؓ کی اجازت حاصل کیے بغیر حیرہ اور شمالی عراق کی جانب بڑھنا شروع کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں صرف خمس بھیجنے اور انھیں جنگی صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر اکتفا کیا۔

لیکن یہ روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مقرر کردہ قائدین کو واضح طور پر یہ احکام بھیج رکھے تھے کہ وہ کسی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد اگلا قدم اس وقت تک نہ اٹھائیں جب تک ان سے اجازت حاصل نہ کر لیں۔ جنگ ہائے ارتداد اور بعد میں عراق و شام کی فتوحات کے دوران میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام قائدین نے حضرت ابوبکرؓ کی اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا۔ اس لیے ممکن نہیں کہ خالدؓ عراق میں پیش قدمی کرتے وقت یہ واضح و ضروری ہدایت نظر انداز کر دیتے اور بطورِ خود ایک منصوبہ بنا کر خلیفہ کی اجازت حاصل کیے بغیر اس پر عمل شروع کر دیتے۔

(۱۲)

فتحِ عراق

خالدؓ کی روانگیٔ عراق

حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ ابن حارثہ شیبانی کی درخواست پر انھیں ایرانیوں پر حملہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی تھی چنانچہ مثنیٰ نے اپنا قبیلہ ہمراہ لے کر ایک نئے عزم و ولولہ سے عراق پر حملہ بول دیا اور دریائے دجلہ و فرات کے ڈیلٹائی علاقے میں پے در پے فتوحات حاصل کرنی شروع کیں۔ جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں تو حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰ کو کمک بھیجنا مناسب خیال کیا تاکہ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ انھوں نے خالدؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ عراق چلے جائیں اور لشکر کی کمان فی الحال اپنے ہاتھ میں سنبھال لیں۔ عیاض بن غنم کو حکم دیا کہ وہ پہلے دومۃ الجندل جاکر وہاں کے سرکش لوگوں کو مطیع کریں اور وہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بہ جانب شرق حیرہ پہنچیں۔ اگر وہ خالدؓ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں تو ایرانیوں سے جنگ کرنے والے لشکر کے سپہ سالار وہ ہوں گے اور خالدؓ ان کے ماتحت افسر ہو کر کام کریں گے، اور اگر خالد پہلے پہنچ جائیں تو سپہ سالاری کے فرائض خالدؓ انجام دیں گے اور عیاض ان کے ماتحت ہوں گے۔

عرب عراق کی زمینوں میں بہ طور کاشت کار کام کرتے تھے فصل تیار ہونے پر انھیں بٹائی کا بہت تھوڑا حصہ ملتا تھا۔ اکثر حصہ ان ایرانی زمینداروں کے پاس چلا جاتا تھا جو ان زمینوں کے مالک تھے۔ یہ زمیندار غریب عربوں پر بے حد ظلم توڑتے تھے اور ان کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے سالاروں کو حکم دے دیا تھا کہ جنگ کے دوران میں ان عرب کاشت کاروں سے نیک سلوک کیا جائے۔ نہ انھیں قتل کیا جائے نہ قیدی بنایا جائے۔

غرض ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہ کی جائے کیونکہ وہ عرب ہیں اور ایرانیوں کے ظلم وجور کی چکی میں پس رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ ان کی مظلومانہ زندگی کے دن ختم ہوئے اور اب وہ اپنے ہم قوم لوگوں کی بدولت حقیقی عدل وانصاف اور جائز آزادی ومساوات سے بہرہ ور ہوسکیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی اس حکمتِ عملی نے مسلمانوں کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ ان کی فتوحات کے راستے میں آسانیاں پیدا ہوگئیں اور انھیں یہ خدشہ نہ رہا کہ پیش قدمی کرتے وقت کہیں پیچھے سے حملہ ہوکر ان کا راستہ مسدود نہ ہو جائے۔

حضرت خالدؓ کے لشکر کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ ایک تو اس کا بہت سا حصہ جنگ یمامہ میں کام آچکا تھا، دوسرے حضرت ابوبکرؓ نے انھیں ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی شخص عراق نہ جانا چاہے تو اس پر زبردستی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی سابق مرتد کو اس وقت تک اسلامی لشکر میں شامل نہ کیا جائے جب تک خلیفہ سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کرلی جائے۔

خالدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مزید کمک بھیجنے کے لیے لکھا تو انھوں نے صرف قعقاع بن عمرو التمیمی کو ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور انھوں نے عرض کیا:

"آپ خالدؓ کی مدد کے لیے صرف ایک شخص کو روانہ کر رہے ہیں حالانکہ لشکر کا بیشتر حصہ اب ان سے الگ ہو چکا ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:

"جس لشکر میں قعقاع جیسا شخص شامل ہو وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔"

صرف قعقاع سے یہ بات خاص نہ تھی۔ ایک بار عیاض بن غنم نے بھی ان سے مدد مانگی تھی تو انھوں نے عبد بن عوف الحمیری کو ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا تھا اور لوگوں کے استفسار پر وہی جواب دیا تھا جو قعقاع کے بھیجنے پر دیا۔

پھر بھی قعقاع کے ہاتھ آپ نے خالدؓ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے لشکر میں شامل ہونے کی ترغیب دیں جو رسول اللہ کے بعد بدستور اسلام پر قائم رہے اور جنھوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا[1]۔ یہ خط موصول ہونے پر خالدؓ نے اپنے لشکر کو ترتیب دینا

---

[1] ازدی نے خالدؓ کے نام حضرت ابوبکرؓ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے خالدؓ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰ پر)

شروع کیا۔ دو ہزار سپاہ ان کے پاس موجود تھی۔ قبائل مضر اور ربیعہ سے انھوں نے آٹھ ہزار افراد مہیا کیے اور دس ہزار کی جمعیت کے ہمراہ عراق روانہ ہو گئے۔ خالد سے پہلے جو امرا عراق میں موجود تھے اور جن کی سرکردگی مثنیٰ کر رہے تھے اُن کے پاس آٹھ ہزار فوج موجود تھی۔ اِس طرح عراق میں لڑنے والی اسلامی فوجوں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہو گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو ہدایت کی تھی کہ وہ عراق میں جنگ کا آغاز ابلہ سے کریں جو خلیج فارس پر ایک سرحدی مقام تھا۔ ہندوستان اور سندھ کو جو تجارتی قافلے جاتے تھے وہ یہاں سے سفر شروع کرتے تھے اور ان دونوں ملکوں سے جو تجارتی قافلے عراق آتے تھے سب سے پہلے ابلہ میں قیام کرتے تھے۔ ابلہ کی فتح کے متعلق دو روائتیں مذکور ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں نے ابلہ کو سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں فتح کیا لیکن بعد میں یہ دوبارہ ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا اور حضرت عمرؓ بن خطاب کے زمانے میں مسلمان اس پر پوری طرح قابض ہوئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس کی فتح حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی، البتہ مؤرخین اِس امر پر متفق ہیں کہ عراق میں سب سے پہلی جنگ حفیر کے مقام پر لڑی گئی[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹) کے لشکریوں کو نصائح فرمائی تھیں۔ حمد وثنا کے بعد انھوں نے لکھا تھا:

"میں نے خالدؓ بن ولید کو عراق جانے کا حکم دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ اِس وقت تک وہاں جنگوں میں مشغول رہیں جب تک میری طرف سے انھیں واپس آنے کا حکم نہ دیا جائے۔ تم بھی ان کے ساتھ جاؤ اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ثبوت نہ دو۔ اچھی طرح جان لو کہ تم نے اپنے لیے جو راستہ چنا ہے اگر حسن نیت سے اس میں قدم اٹھاؤ گے تو اللہ کی طرف سے ثواب عظیم کے مستحق ٹھہرو گے۔ جب تم عراق جاؤ تو اس وقت تک وہیں مقیم رہو جب تک واپس آنے کے متعلق میرے احکام تمھیں نہ پہنچیں۔ اللہ دنیا اور آخرت میں ہمارے اور تمھارے ساتھ ہو اور سب کام اس کی رضا سے انجام پائیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

طبری، ابن خلدون اور ابن اثیر نے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔

[1] طبری اور ابن اثیر دونوں میں ابلہ کے متعلق مذکورہ اختلاف کا ذکر ہے۔ ازدی لکھتے ہیں کہ اہل ابلہ سے جنگ کا آغاز سوید بن قطبہ ذہلی نے کیا تھا لیکن ابلہ والوں کی بہادری کے سامنے ان کی پیش نہ جا سکی جب حضرت خالدؓ عراق پہنچ کر سوید سے ملے تو دونوں میں مشورہ پایا۔ دشمنوں پر یہ ظاہر کیا جائے کہ خالدؓ سوید کو چھوڑ کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱ پر)

ہرمز سے مقابلہ

ہرمز کی بستی خلیج فارس اور کاظمہ کے سرحدی شہر کے قریب صحرا کے کنارے واقع ہے۔ ایرانیوں کی طرف سے ہرمز اس علاقے کا حاکم تھا جو حسب و نسب اور شرف و عزت میں اکثر امرائے ایران سے بڑھا ہوا تھا۔ ایرانی معززین کی عادت تھی کہ وہ معمولی ٹوپیوں کے بجائے قیمتی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ حسب و نسب اور شرف و عزت میں جو شخص جس مرتبے کا ہوتا تھا اسی مناسبت سے قیمتی ٹوپی پہنتا تھا۔ سب سے بیش قیمت ٹوپی ایک لاکھ درہم کی ہوتی تھی جسے وہی شخص پہن سکتا تھا جس کی بزرگی مسلم الثبوت ہو اور جو شرف و عزت اور توقیر و وجاہت میں کمال درجے کو پہنچا ہوا ہو۔ ہرمز کے مرتبے کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کی ٹوپی کی قیمت بھی ایک لاکھ درہم تھی جسے کوئی کم درجے کا امیر ہرگز نہ پہن سکتا تھا۔ ایرانیوں کے نزدیک تو اس کی وجاہت مسلم الثبوت تھی لیکن عراق کی حدود میں بسنے والے عرب اسے انتہائی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ان عربوں پر تمام سرحدی امراء سے زیادہ سختی اور ظلم کرتا تھا۔ عربوں کی اس سے نفرت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ کسی شخص کی خباثت کا ذکر کرتے ہوئے ہرمز کا نام بطور ضرب المثل لینے لگے تھے چنانچہ کہتے تھے:

"فلاں شخص تو ہرمز سے بھی زیادہ خبیث ہے۔"

"فلاں شخص ہرمز سے بھی زیادہ بدفطرت اور بدطینت ہے۔"

"فلاں شخص ہرمز سے بھی زیادہ احسان فراموش ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ جزیرہ عرب کی حدود میں بسنے والے عرب اپنے بھائیوں پر مظالم کی داستانیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) مثنیٰؓ کے پاس چلے گئے ہیں لیکن رات گئے وہ فوج لے کر لشکر گاہ میں پہنچ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ابلہ میں مقیم ایرانی لشکر نے خالدؓ کے لشکر کو واپس جاتے دیکھا تو خیال کیا کہ یہ اچھا موقع ہاتھ آیا ہے سوید کی فوج ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لیے یک بارگی بھرپور حملہ کر کے اس کی طاقت ختم کر دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے اگلے روز صبح سویرے سوید کی فوج پر حملہ کر دیا لیکن رات کے اندھیرے میں خالدؓ کی فوج سوید سے آ کر مل چکی تھی نتیجۃً ایرانیوں کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اسی قسم کی روایت فتوح البلدان بلاذری میں بھی موجود ہے۔

سن کر صبر نہ کر سکتے تھے اور وقتاً فوقتاً ہرمز کے علاقے پر چھاپے مار کر اس کا آرام و سکون برباد کیے رکھتے تھے۔ ہرمز ایک طرف عربوں کے پے در پے چھاپوں اور غارت گری سے عاجز رہتا تھا، دوسری طرف ہندوستان کے بحری قزاق اسے چین سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ وہ کشتیوں میں سوار ہو کر آتے اور اس کے علاقے میں غارت گری کر کے واپس چلے جاتے۔

خالدؓ یمامہ سے دس ہزار کی جمعیت لے کر عراق روانہ ہوئے تھے۔ عراق کی سرحد پر انھوں نے مثنیٰ کو دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ انھوں نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر حصۂ فوج کو ہدایت کی کہ وہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا حفیر پہنچ جائے۔ پہلا لشکر، جس کے سردار مثنیٰ بن حارثہ تھے، خالدؓ کے کوچ سے دو روز پہلے روانہ ہو گیا۔ دوسرا لشکر جس کی قیادت عدی بن حاتم کر رہے تھے، اگلے روز روانہ ہوا۔ تیسرے روز خالدؓ بھی لشکر لے کر روانہ ہو گئے۔ ان لشکروں کی روانگی سے قبل خالدؓ نے ہرمز کو ایک خط بھی بھیجا تھا جس میں لکھا تھا:

”تم اسلام لے آؤ، امن میں رہو گے۔ اگر یہ بات منظور نہیں تو ذمی بن کر ہماری سلطنت میں شامل ہونا اور جزیہ دینا قبول کرو۔ اگر یہ پیش کش بھی تمھیں منظور نہیں تو بعد میں پچھتانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں تم اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرنا کیونکہ ہم اپنے ساتھ ایک ایسی قوم لا رہے ہیں جو موت کی اتنی ہی عاشق ہے جتنے تم لوگ زندگی کے شائق ہو۔“

جب ہرمز کو یہ خط ملا تو اس نے شہنشاہ اردشیر کو پیش آمدہ حالات کی اطلاع دی اور خود لشکر جمع کر کے خالدؓ کے مقابلے کے لیے ’کاظمہ‘ روانہ ہو گیا۔ راستے میں اسے معلوم ہوا کہ خالدؓ نے اپنے لشکروں کو ’حفیر‘ میں جمع ہونے کی ہدایت کی ہے چنانچہ اس نے ’حفیر‘ کا رخ کیا اور تیزی سے سفر کرتا ہوا خالدؓ سے پہلے وہاں پہنچ کر پانی پر ڈیرے ڈال دیے۔ جب خالدؓ وہاں پہنچے تو انھیں ایسی جگہ اترنا پڑا جہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگوں نے ان سے اس مشکل کا ذکر کیا تو فرمایا:

”فکر کی کوئی بات نہیں۔ اسی جگہ پڑاؤ ڈالو اور دشمن کے ساتھ بے جگری سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ پانی پر آخر اسی فریق کا قبضہ ہوگا جو لڑائی میں استقلال اور صبر و استقامت کا ثبوت دے گا۔“

ہرمز نے میمنہ اور میسرہ پر شاہی خاندان کے دو آدمیوں قباذ اور انوشجان کو متعین کر رکھا تھا لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہرمز اپنی صفوں سے باہر نکلا اور خالدؓ کو دعوت مبارزت دی۔ اسے خالدؓ کی بہادری، شجاعت، جوانمردی اور عظیم مرتبے کا خوب علم تھا اور جانتا تھا کہ اگر اس نے خالدؓ پر قابو پا کر انھیں قتل کر دیا تو ایرانیوں کو اگر کامل فتح نہیں تو کم از کم آدھی فتح ضرور حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ خالدؓ کو قتل کرنا اور ان پر قابو پانا آسان نہیں اس لیے اس نے فریب دہی سے کام لیا اور اپنے چند سواروں کو اس کام پر مامور کر دیا کہ جونہی وہ خالدؓ کو آتا دیکھیں فوراً ان پر جھپٹ پڑیں اور قتل کر دیں۔

ادھر جب خالدؓ نے ہرمز کی آواز سنی تو وہ گھوڑے سے اتر کر پیدل ہی اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ قریب پہنچ کر تلوار کھینچی اور ہرمز پر حملہ آور ہوئے۔ اس اثنا میں ہرمز کے مقرر کردہ سواروں نے کمین گاہوں سے نکل کر خالدؓ کو قتل کرنا اور ہرمز کو ان کے ہاتھ سے چھڑانا چاہا۔ لیکن مسلمان بھی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ قعقاع بن عمرو نے، جو بہت غور سے دشمن کی حرکات و سکنات جانچ رہے تھے، جونہی ایرانی سواروں کو کمین گاہوں سے نکلتے دیکھا، فوراً اپنے دستے کے ہمراہ ادھر کا رخ کیا اور خالد کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی انھیں تلواروں کی باڑوں پر رکھ لیا۔ اس دوران میں خالدؓ نے ایک دو واروں کے بعد ہرمز کی گردن اڑا دی اور اپنی صفوں میں واپس چلے آئے۔

اب دونوں فوجوں میں دست بہ دست جنگ شروع ہو چکی تھی لیکن اپنے سپہ سالار کے مارے جانے کی وجہ سے ایرانیوں کی کمر ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور شکست کھا کر بھاگنے لگے۔

مسلمانوں نے رات کے اندھیرے میں ان کا تعاقب کیا اور دریائے فرات کے بڑے پل (جسر اعظم) تک، جہاں آج کل بصرہ آباد ہے، انھیں قتل کرتے چلے گئے۔ ان مفرورین میں قباذ اور انوشجان بھی شامل تھے جنھیں ہرمز نے میمنہ اور میسرہ کا سردار مقرر کر رکھا تھا۔

دشمنوں پر پوری طرح قابو پانے کے بعد خالدؓ نے معقل بن مقرن المزنی کو ابلہ جا کر مال غنیمت اور قیدیوں کو اکٹھا کرنے کا حکم دیا اور مثنیٰ بن حارثہ کو شکست خوردہ مفرور لشکر کا پیچھا کرنے کی

ہدایت کی۔ چنانچہ معقل نے ابلہ کا رُخ کیا[1] اور مثنیٰ ہزیمت خوردہ لشکر کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔

اثنائے تعاقب میں مثنیٰ کا گزر ایک قلعے کی جانب ہؤا جس میں ایک ایرانی شہزادی رہتی تھی۔ اسی مناسبت سے مؤرخین عرب اسے "حصن المرأۃ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس قلعے کے کچھ فاصلے پر اس کے خاوند کا بھی ایک قلعہ تھا۔ مثنیٰ نے اپنے بھائی معنیٰ بن حارثہ کو تو شہزادی کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا اور خود اس کے خاوند کے قلعے کا محاصرہ کر کے اسے شکست فاش دی۔ اس کے بعد بدستور ہزیمت خوردہ لشکر کا پیچھا شروع کر دیا۔ جب شہزادی کو اپنے خاوند کی شکست کا حال معلوم ہؤا تو اس نے معنیٰ سے مصالحت کر کے اس سے شادی کر لی۔

عراق کی اس سب سے پہلی لڑائی کو "غزوہ ذات السلاسل" کا بھی نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس جنگ میں ایرانیوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ لیا تھا تاکہ کوئی بھی شخص میدانِ جنگ سے فرار نہ ہو سکے لیکن بعض لوگ اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے "جنگ کاظمہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ یہ جنگ کاظمہ کے قریب لڑی گئی تھی۔

جنگ کاظمہ دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ اس لڑائی نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے دیکھ لیا کہ وہ ایرانی، جن کی سطوت و صولت کا شہرہ ایک عرصے سے سننے میں آ رہا تھا، اپنی پوری طاقت کے باوجود ان کی معمولی فوج کے مقابلے میں بھی نہ ٹھہر سکے۔ ان کا سردار ہرمز خالدؓ کے ہاتھ سے مارا گیا اور ہزاروں سپاہیوں کو میدان جنگ میں کٹوا کر آخر انھیں فرار ہوتے ہی بن پڑی۔ اس جنگ میں مال غنیمت کی جو مقدار ان کے ہاتھ لگی اس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہتھیاروں کے علاوہ ہر سوار کے حصے میں ایک ہزار درہم آئے تھے۔

---

[1] بعض مؤرخین معقل کے ابلہ جانے کا واقعہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ـــ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں ـــ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابلہ کو حضرت عمرؓ بن خطاب کے عہد میں فتح کیا۔ اس کے برعکس بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ معقل نے ابلہ فتح کر لیا تھا لیکن بعد ازاں اسے ایرانیوں سے واپس لے لیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں عرب دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔ مؤخر الذکر روایت اور سوید بن قطبہ کے ہاتھوں ابلہ کی تسخیر کی روایت میں (جو ہم پہلے درج کر چکے ہیں) تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ سوید بن قطبہ نے خالد کی اعانت سے ابلہ فتح کیا ہو اور معقل نے جنگ کاظمہ کے بعد خالدؓ کے حکم کے مطابق صرف مال غنیمت جمع کرنے اور قیدی اکٹھے کرنے پر اکتفا کیا ہو۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح کی ایک بڑی وجہ حضرت ابوبکرؓ کی وہ پالیسی بھی تھی جو انھوں نے عراق کے کاشت کاروں کے بارے میں وضع کی تھی اور جسے خالدؓ نے سختی سے عملی جامہ پہنایا تھا۔ اس پالیسی کے تحت انھوں نے کاشت کاروں سے مطلق تعرض نہ کیا۔ جہاں جہاں وہ آباد تھے انھیں وہیں رہنے دیا اور جزیے کی معمولی رقم کے سوا اور کسی قسم کا تاوان یا ٹیکس ان سے وصول نہ کیا۔

خالدؓ نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ اس کے ساتھ ہرمز کی بیش قیمت ٹوپی اور ایک ہاتھی بھی جسے مسلمانوں نے لڑائی کے دوران میں پکڑا تھا، بھیج دیا۔ اہلِ مدینہ کو اس سے قبل ہاتھی دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مدینہ والوں کا تو ذکر ہی کیا عرب کے کسی اور باشندے نے بھی ابرہہ کے ہاتھی کے سوا آج تک ہاتھی کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اس لیے جب عراق سے آئے ہوئے ہاتھی کے مہاوت نے اسے مدینہ کی گلیوں میں پھرایا تو اس عجیب و غریب جانور کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مخلوق کس قسم کی ہے۔ بعض عورتیں حیران ہو کر پوچھتی تھیں کہ کیا یہ جانور واقعی اللہ کی مخلوقات میں سے ہے۔ بعض عورتوں کا خیال تھا کہ ایرانیوں کا بنایا ہوا عجوبہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کو ہاتھی کے مدینہ میں رکھنے سے کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ اس لیے انھوں نے اسے اس کے مہاوت کے ہمراہ عراق واپس بھیج دیا۔

اس فتح یابی نے مسلمانوں کی ہمتوں کو دو چند کر دیا تھا اور ان میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ مثنیٰ شیبانی تیزی سے شکست خوردہ مفرور ایرانیوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کے مدائن پہنچنے سے پہلے پہلے ان کا مکمل طور پر صفایا کر دیا جائے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ انھیں مدائن سے خالدؓ اور ان کے لشکر کے مقابلے کے لیے ایرانیوں کے ایک عظیم الشان لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی۔ یہ لشکر شہنشاہ اردشیر نے اصل میں ہرمز کا حفظ ملنے پر ترتیب دیا تھا اور اپنے ایک سالار قارن بن قریانس کو اس کا سردار مقرر کیا تھا۔ قارن لشکر لے کر مدائن سے روانہ ہو چکا تھا کہ راستے میں اُسے قباذ اور انوشجان ملے جو ہرمز کے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ اس نے ان کی ہمت بندھائی اور اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔

کچھ دور آگے بڑھ کر اس لشکر نے "مذار" میں پڑاؤ ڈالا جو ایک ندی کے کنارے واقع ہے جو دجلہ اور فرات کو آپس میں ملاتی ہے۔

جنگِ مذار

جب مثنیٰ کو قارن کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو انھیں خیال پیدا ہوا کہ اتنے عظیم الشان لشکر سے اکیلے مقابلہ کرنا اپنی شکست کو دعوت دینے اور سخت خطرہ مول لینے کے مترادف ہوگا۔ انھوں نے اپنے لشکر کے ہمراہ مذار کے قریب ہی ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور خالدؓ کو ایک خط لکھ کر تمام حالات سے مطلع کیا۔ خالدؓ نے اس اندیشے کے تحت کہ کہیں قارن مثنیٰ کی قلیل فوج پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد نہ کر دے، اپنی فوج کو فوری تیاری کا حکم دیا اور تیزی سے سفر کرتے ہوئے مذار پہنچ گئے۔

خالدؓ کا اندیشہ صحیح تھا۔ قارن اس دوران میں برابر مثنیٰ کے لشکر پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہا لیکن خالدؓ کے اچانک مذار پہنچ جانے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اصل میں ہرمز کے لشکر کی شکست نے ایرانیوں کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی اور ہر شخص مسلمانوں سے انتقام لینے کے درپے تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مثنیٰ کے کمزور لشکر کو شکست دے کر جذبۂ انتقام کو تسکین دے سکیں گے۔ خالدؓ کے مذار پہنچ جانے سے ایرانیوں کو تشویش ضرور ہوئی لیکن ان کے جذبۂ انتقام میں کوئی کمزوری نہ آئی۔ قباذ اور انوشجان نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذلت و رسوائی کا وہ داغ دھونا چاہا جو معرکہ حفیر میں شکست کھانے اور میدانِ جنگ میں بری طرح فرار ہونے کی وجہ سے ان پر لگ چکا تھا۔ انھوں نے اپنے لشکر کی ہمت بندھانی شروع کی اور ان کے جذبۂ انتقام کو بھڑکا کر ایک بار پھر مسلمانوں سے مقابلے کے لیے تیار کر دیا۔ ان دو شخصوں اور قارن کا خیال تھا کہ اگر وہ اس وقت خالدؓ کے غیر منظم اور غیر مرتب لشکر پر حملہ کر دیں تو یقیناً مسلمانوں کو شکست دے کر انھیں جزیرۂ عرب کی جانب پسپا کر سکتے ہیں اور اس طرح ایرانی قوم اور کسریٰ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

خالدؓ نے جب ایرانی لشکر کو جنگ کی تیاری کرتے دیکھا تو انھوں نے بھی لشکر کو فوری تیاری کا حکم دے دیا اور ایرانیوں کو موقع نہ دیا کہ وہ ان کے غیر مرتب و غیر منظم لشکر پر حملہ کر سکیں۔

جنگ شروع ہوئی تو خالدؓ کے اس مقولے کی عملی تصویر ایرانیوں کے سامنے آگئی کہ میں ایسے لوگوں کو لے کر تمہارے پاس آ رہا ہوں جو موت کے اتنے ہی عاشق ہیں جتنے تم زندگی کے۔ مسلمان اِس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ ان کے سامنے ایرانیوں کی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ مسلمانوں کی تلواریں بڑی بے دردی سے ایرانیوں کے سر اڑا رہی تھیں۔ قارن، قباذ اور انوشجان، جن کے سپرد تمام ایرانی افواج کی کمان تھی اور جنھیں بہادری اور شجاعت پر ناز تھا ایک ایک کر کے مسلمان سرداروں کے سامنے آئے لیکن اپنے آپ کو قتل ہونے سے نہ بچا سکے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تینوں سردار تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔

اپنے بڑے بڑے بہادروں اور سردارانِ فوج کو ایسی بری طرح قتل ہوتے دیکھ کر ایرانی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کی گھبراہٹ اور بے چینی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھیں گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایرانیوں میں شکست کے آثار تو پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، اس نئے حملے نے ان کے ہوش و حواس بالکل معطل کر دیے اور تھوڑی دیر میں وہ لشکر جو اپنی قوت و طاقت پر نازاں تھا اور جسے فتح سامنے نظر آ رہی تھی خالدؓ کے لشکر کے سامنے بری طرح بھاگ رہا تھا۔ تیس ہزار ایرانی اس دن میدانِ جنگ میں قتل ہوئے۔ اگر ایرانی فوج کا بیشتر حصہ کشتیوں میں سوار ہو کر، جس کا انتظام انھوں نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا، پار نہ اتر جاتا یا بیچ میں نہر حائل نہ ہوتی تو اس دن مسلمانوں کے ہاتھوں ایک بھی ایرانی کا بچنا غیر ممکن تھا۔ فتح کے بعد خالدؓ کچھ عرصے کے لیے مذار ہی میں مقیم ہو گئے اور غنیمت کا پانچواں حصہ فتح کی خوش خبری کے ساتھ سعید بن نعمان کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں مدینہ ارسال کر دیا۔

جنگ کے بعد لڑائی میں حصہ لینے والوں اور ایرانی فوج کی حمایت کرنے والوں کو مع اہل و عیال کے قید کر لیا گیا۔ ان قیدیوں میں ابوالحسن بصری بھی شامل تھے۔

جہاں لڑائی میں شامل ہونے والوں اور ان کے مددگاروں پر اس قدر سختی کی گئی وہاں عام رعایا سے بے حد نرمی کا سلوک کیا گیا۔ کاشت کاروں اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے جزیہ دینے کا اقرار کر لیا تھا کچھ نہ کہا گیا اور انھیں ان کی زمینوں اور جگہوں پر برقرار رکھا گیا۔

ان ابتدائی امور سے فراغت حاصل کر کے خالدؓ نے مفتوحہ علاقے کے نظم و نسق کی طرف

توجہ کی۔ علاقے کے تمام لوگ ذمی قرار پائے اور ان پر جزیہ لگایا گیا۔ جزیہ وصول کرنے کے لیے جا بجا عمال مقرر کیے گئے۔ مفتوحہ علاقے کی حفاظت کے لیے انھوں نے حفیر اور جسر اعظم پر فوجیں متعین کر رکھی تھیں، ان کا انتظام اور بہتر بنایا گیا اور فوجوں کے تمام دستوں کو مختلف افسروں کے زیر نگرانی دے کر انھیں دشمنوں کی خفیہ و علانیہ سرگرمیوں سے خبردار رہنے اور موقع پڑنے پر ان کا مقابلہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

خالدؓ کی جنگی مہارت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ سرزمین ایران میں ان کی پیش قدمی کے آغاز ہی سے کسریٰ کی طاقت ور فوجیں مغلوب ہونی شروع ہو گئیں اور ان کے دم خم، حوصلے اور ولولے سب سرد پڑ گئے۔ جنگِ مذار حیرہ سے کچھ ہی فاصلے پر ہوئی تھی۔ حیرہ خلیج فارس اور مدائن کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔

جنگِ ولجہ

ایرانیوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر ان عربی قبائل کو ساتھ ملانا چاہا جو دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے میں عراق کی سرحدوں کے قریب آباد تھے۔ ان میں سے اکثر قبائل عیسائی تھے جنھیں ایرانی سر توڑ کوششوں کے باوجود مجوسی مذہب قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے تھے۔ جب مسلمان اس سرزمین میں وارد ہوئے تو انھوں نے ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، بصورت دیگر جزیے کا مطالبہ کیا۔ ان کا فائدہ سراسر جزیہ قبول کرنے میں تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنی آزادی بدستور برقرار رکھ کر ان مراعات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل تھیں، لیکن مدتِ دراز تک ایرانیوں کی عملداری میں رہنے کے باعث وہ ان کے احکام سے سرتابی کی جرأت نہ کر سکے۔ عراق میں عیسائیوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ بکر بن وائل تھا۔ کسریٰ اردشیر نے انھیں طلب کیا اور ان کی ایک فوج مرتب کر کے انھیں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے ولجہ کی جانب روانہ کر دیا لیکن اس خیال سے کہ مسلمانوں پر فتح یابی کا فخر کلیۃً عیسائی عربوں کے حصے میں نہ آئے، اپنے ایک بہت بڑے سپہ سالار بہمن جاذویہ کو بھی ایک بھاری لشکر کے ہمراہ ان کے پیچھے پیچھے روانہ کر دیا۔ عیسائی لشکر نے حیرہ اور دجلہ کے درمیان بسنے والے دوسرے

عرب قبائل اور کاشت کاروں کو بھی ساتھ ملا لیا اور اس طرح عربوں کا ایک عظیم الشان لشکر اپنے ہی اہلِ وطن سے لڑنے کے لیے روانہ ہو گیا جس کے پیچھے ایرانیوں کی ایک بھاری جمعیت بھی چلی آ رہی تھی۔

خالدؓ کو مذار میں یہ خبریں پہنچیں۔ انھوں نے اپنے تمام فوجی افسروں کو، جو حفیر، کاظمہ اور عراق کے دوسرے حصّوں میں موجود تھے، کہلا بھیجا کہ وہ دشمن کی کارروائیوں سے خبردار رہیں اور اس دھوکے میں نہ آئیں کہ ماضی میں چونکہ بعض عظیم فتوحات حاصل ہو چکی ہیں اس لیے اب دشمن ان کے مقابلے میں سر اٹھا ہی نہیں سکتا۔ وہ خود لشکر لے کر کسریٰ کی بھیجی ہوئی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ولجہ روانہ ہو گئے اور دشمن کی فوجوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ چونکہ دونوں فریق طاقت و قوّت اور عزم و ارادہ میں ایک دوسرے سے کسی طرح ہیٹے نہ تھے اس لیے خاصے وقت تک فتح یا شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ خالدؓ زیادہ دیر تک یہ صورتِ حال برداشت نہ کر سکے اور لشکر کے دو سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا دستہ لے کر فوج سے علیحدہ ہو جائیں اور دشمن کی صفوں کے پیچھے جا کر چھپ جائیں۔ جب لڑائی شروع ہو تو وہ دشمن پر اچانک پیچھے کی طرف سے حملہ کر کے اس کا نیا پانچا کر دیں۔ لیکن ان دستوں کو کمین گاہوں کے اندر چھپنے میں دیر لگ گئی جس کے باعث وہ وقتِ مقررہ پر میدانِ جنگ میں پہنچ کر دشمن پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

جنگ میں کبھی مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہو جاتا اور وہ دشمن کو پیچھے دھکیل دیتے اور کبھی دشمن کا زور بڑھ جاتا اور وہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ آخر، عین اُس وقت جب فریقین میں سے کسی کو بھی واضح فیصلے کا یقین نہ رہا تھا اور دونوں مایوس ہو کر اپنے اپنے کیمپوں میں واپس جانے اور اگلے روز کی لڑائی کے لیے تیاری کرنے والے تھے، اسلامی فوج کے دستے کمین گاہوں سے نکلے اور عقب سے کسریٰ کے لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ ایرانی پہلے ہی مسلمانوں کی زبردست مقاومت سے گھبرائے ہوئے تھے۔ یہ نئی مصیبت دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے اور حوصلہ ہار بیٹھے۔ خالدؓ کی فوجوں نے سامنے سے اور کمین گاہوں سے نکل کر آنے والے دستوں نے پیچھے سے دشمن کو گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

جنگِ الّیس

اِس شکست نے، جو قبیلہ بکر بن وائل کو اپنے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی، عراق کے عربی النسل عیسائیوں کو آتش زیر پا کر دیا۔ انھوں نے طیش میں آکر مسلمانوں سے ایک بار پھر جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا سردار بنو عجلان کے ایک شخص عبدالاسود عجلی کو بنایا اور حیرہ و ابلہ کے درمیان مقام الّیس پر فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ ساتھ ہی دربارِ ایران سے مدد کی درخواست بھی کی۔ وہاں سے بہمن جاذویہ کو حکم ملا کہ وہ بھاری جمعیت کے ساتھ عیسائیوں کی مدد کو پہنچے۔ یہ احکام ملنے پر بہمن جاذویہ نے مناسب خیال کیا کہ وہ مسلمانوں سے فیصلہ کن مقابلہ کرنے کے لیے شہنشاہ اردشیر سے بالمشافہ گفتگو کرے۔ اس نے فوج کی کمان ایک سردار جابان کے سپرد کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ فوج لے کر الیس پہنچ جائے لیکن جہاں تک ممکن ہو دربارِ ایران سے اس کی واپسی تک جنگ کا آغاز نہ کیا جائے۔ خود وہ شہنشاہ سے مشورہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شہنشاہ اردشیر بیمار ہے۔ وہ وہیں ٹھہر گیا لیکن جابان کو کوئی ہدایت نہ بھیجی۔ ادھر جابان نے الّیس پہنچ کر عیسائی فوجوں کے متصل پڑاؤ ڈال دیا اور انھیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے متعلق مشورے دینے لگا۔

خالدؓ کو معلوم نہ تھا کہ عیسائیوں کی مدد کے لیے ایرانیوں کا لشکر بھی جابان کے زیرِ کمان میدانِ جنگ میں موجود ہے۔ انھیں صرف عربی النسل عیسائیوں کے مقام الّیس میں اجتماع کی خبر ملی تھی۔ وہ اپنا لشکر لے کر پہلے حفیر پہنچے اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ان کے مقرر کردہ عمال وہاں کا نظم و نسق کامیابی سے چلا رہے ہیں اور پشت کی جانب سے کسی حملے کا اندیشہ نہیں، دشمن کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ الّیس پہنچتے ہی انھوں نے عیسائیوں کو تیاری کا موقع دیے بغیر ان سے لڑائی چھیڑ دی۔ یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا کہ عیسائی بالکل نہ سنبھل سکے اور پہلے ہی حملے میں اُن کا سالار مالک بن قیس مارا گیا۔ جب جابان نے محسوس کیا کہ عیسائیوں کی صفوں میں اضطراب پیدا ہونے لگا ہے تو وہ ایرانی فوج کا ایک دستہ لے کر آگے بڑھا اور جوش انگیز جملوں سے عیسائیوں کی ہمت بندھانے اور انھیں جم کر مسلمانوں کے مقابلے کی تلقین کرنے لگا۔ اس کے

مفرور کیسے ہوئے آدمی عیسائیوں کی صفوں میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ بہمن جاذویہ ان کی مدد کے لیے عنقریب ایک لشکر جرار لے کر پہنچنے والا ہے۔ اس کے آنے تک پامردی سے مسلمانوں کا مقابلہ جاری رکھیں اور تمام خطرات کو نظر انداز کر کے بہادروں کی طرح میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں۔ چنانچہ عیسائی سنبھل گئے اور انھوں نے بڑی جرأت و بہادری سے مسلمانوں کے پیہم حملوں کو روکنا اور ان کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہ عزم و ثبات اور صبر و استقلال دیکھ کر خالدؓ حیران رہ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کو جوش دلایا کہ وہ ایک بار بھرپور طاقت و قوت سے دشمن پر حملہ شروع کریں۔

عیسائیوں کو لڑتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان کی امیدوں کا واحد سہارا بہمن جاذویہ تھا کیونکہ اس کے آنے تک ایرانی فوج ان سے مل کر جنگ میں حصہ نہ لے سکتی تھی۔ لیکن بہمن کا کہیں پتا نہ تھا۔ جابان بھی حیران تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ادھر مسلمانوں کا دباؤ برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا اور ان کے مقابلے میں عیسائیوں کی کوئی پیش نہ جا رہی تھی۔ آخر دشمن کی طاقتوں نے جواب دے دیا۔ ایک ایک کر کے ان کی صفیں ٹوٹنے لگیں اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے لگے۔

خالدؓ نے یہ دیکھ کر فوج میں اعلان کر دیا کہ بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے اور انھیں زندہ پکڑ کر ان کے سامنے حاضر کیا جائے۔ صرف اسی شخص کو قتل کیا جائے جو کسی طرح قابو میں نہ آئے اور مزاحمت پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ مسلمانوں اور ان کے مددگار عراق عربوں نے، جو اسلامی فوج میں شامل تھے، ایسا ہی کیا اور عیسائی گروہ در گروہ میدانِ جنگ میں لائے جانے لگے۔

جابان کی ایرانی فوجوں نے جنگ شروع ہونے سے پہلے کھانا تیار کیا تھا اور وہ اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مسلمان بلائے ناگہانی کی طرح ان پر آ پڑے اور وہ کھانا اسی طرح چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ خالدؓ نے اپنی فوج سے کہا:

"یہ کھانا اللہ نے تمھارے لیے تیار کرایا تھا اب تم مزے سے اسے کھاؤ۔"

مسلمان دسترخوانوں کے ارد گرد بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ عجیب عجیب کھانے تھے جنھیں مسلمانوں نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ چکھا تھا۔ وہ کھاتے جاتے تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے جس نے انھیں بے مانگے ان نعمتوں سے نوازا تھا۔

الّیس کے قریب دریائے فرات اور دریائے بادقلی کے سنگم پر ایک شہر امغیشیا یا منیشیا آباد تھا جو آبادی کی کثرت اور مال و دولت کی فراوانی میں حیرہ کا ہم پلہ تھا۔ اس کے باشندوں نے بھی جنگ الّیس میں عیسائیوں اور ایرانیوں کی مدد کی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد خالدؓ نے اس قصبے کا رُخ کر کے اسے فتح کیا۔ یہاں سے بھی مسلمانوں کو کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا جس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے ہر سوار کے حصّے میں علاوہ اِس حصّے کے جو اسے الّیس میں ملا تھا پندرہ سو درہم آئے۔

اس کے بعد خالدؓ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ اور ان جنگوں میں گرفتار ہونے والے قیدی حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں روانہ کر دیے۔ انھیں کے ہمراہ بنی عجل کے ایک شخص جندل کو بھی بھیجا جس نے الّیس کی فتح، مالِ غنیمت، قیدیوں کی کثرت اور خالدؓ کے کارناموں کا حال بالتفصیل حضرت ابوبکرؓ سے بیان کیا۔ یہ واقعات سن کر انھوں نے فرمایا:

"عورتیں اب خالدؓ جیسا شخص پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔"

انھوں نے جنگِ الّیس کے قیدیوں میں سے ایک لونڈی جندل کو مرحمت فرمائی اور سلطنت کے تمام حصوں میں قاصد روانہ کیے جنھوں نے قریہ بہ قریہ پھر کر لوگوں کو خالدؓ اور لشکرِ اسلام کی فتوحات اور عظیم الشان کارناموں سے آگاہ کیا۔ قدیم مؤرخین کے بیان کے مطابق ان جنگوں میں دشمن کے مقتولوں کی تعداد ستّر ہزار تھی۔

بعض مؤرخین نے الّیس اور امغیشیا کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ان جنگوں میں مسلمانوں نے انتہائی قساوتِ قلب کا ثبوت دیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کاش یہ واقعات، جو تاریخوں میں بیان کیے گئے ہیں، غلط ہوتے گو بظاہر انھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ کئی راویوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تہذیب ابھی تک اِس بلند مقام تک نہیں پہنچی جہاں وہ اپنے آپ کو ہر قسم کی بہیمیت سے کاملاً مصئون و مامون کر سکے۔ گو زبان سے اِس کا اقرار نہیں کیا جاتا لیکن درحقیقت آج بھی وحشت و بربریّت کا شمار اِن اسباب میں ہوتا ہے جنھیں تہذیب و تمدّن کی استواری میں ممد و معاون خیال کیا جاتا ہے۔ آج بھی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے

لیے جنگ کا وجود ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ وہی قومیں اقوامِ عالم کی نظروں میں سربلند سمجھی جاتی ہیں جو ہلاکت خیز ہتھیاروں کی تیاری میں اپنی مدِمقابل قوموں سے کسی طرح کم تر نہ ہوں اور جو قوم جنگی تیاریوں میں کوتاہی برتتی ہے اس کا شمار پست اور غیر ترقی یافتہ اقوام میں کیا جاتا ہے۔ اِس صورتِ حال کی روشنی میں اگر کوئی سپہ سالار دورانِ جنگ میں اپنے مدِمقابل سے جابرانہ طور سے پیش آتا ہے اور خونریزی کے لیے غیر معمولی طریقے استعمال کرتا ہے تو انسانی سرشت کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی اہم اور قابلِ اعتراض بات نہیں۔

بعض اوقات سپہ سالار اس خدشے کے پیشِ نظر سختی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مدِمقابل کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو وہ آئندہ چل کر اس کے لیے دوبارہ خطرے کا باعث بن جائے گا، اس لیے وہ بدعہدی اور بغاوت کے ہر امکانی خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی غرض سے میدانِ جنگ میں بے دریغ دشمنوں کا قتلِ عام کرتا ہے اور ان کے ولولوں کو سرد کر کے انھیں دوبارہ سر اٹھانے کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ خالدؓ کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

مذار اور حفیر میں ایرانیوں کو جو عبرت ناک شکست اٹھانی پڑی تھی اس کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے عراق میں مقیم عربی النسل عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما کر دیا اور اس طرح الّیس کا معرکہ پیش آیا۔ فتح یاب ہونے پر خالدؓ نے چاہا کہ ایرانیوں اور ان کے مددگاروں کی جنگی روح کو بالکل کچل دیا جائے کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اِس غرض سے انھوں نے جو طریقے استعمال کیے اُن کے باعث واقعی ایرانیوں کے حوصلے بالکل پست ہو گئے۔ کسریٰ اردشیر کو جو اس وقت بیمار تھا، اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کے اثر سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور نہایت حسرت کے ساتھ اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حیرہ

اردشیر کی موت سے ایرانی دوگونہ مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف شہنشاہ کی موت کا صدمہ دوسری طرف صحرائے شام اور دریائے دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں مسلمانوں کی روز افزوں پیش قدمی۔ ان پر یاس و نومیدی کا غلبہ تھا اور وہ اپنے آپ میں مسلمانوں سے مقابلے کی

طاقت نہ پاتے تھے۔ اپنے علاقوں سے مسلمانوں کو نکالنا انھیں ناممکن نظر آتا تھا۔ پھر بھی خالدؓ ایرانیوں کی اِس پژمردگی سے کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہ ہوئے اور ایرانیوں پر عظیم فتوحات حاصل کرنے کے باوجود اپنی قوت و طاقت پر کبھی نازاں نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ عیسائی قبائل جنھیں ایرانیوں نے مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر الّیس کے میدان میں مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار کر دیا تھا، اگرچہ اس وقت خاموش ہیں لیکن غیظ و غضب اور انتقام کی آگ ان کے دلوں میں بدستور بھڑک رہی ہے اور مناسب موقع آنے پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ اس لیے اگر اسی وقت بغاوت اور سرکشی کے ان جراثیم کا پوری طرح قلع قمع نہ کیا گیا اور جزیرۂ عرب کو جانے والے تمام رستوں کی حفاظت نہ کی گئی تو آئندہ مسلمانوں کو عظیم خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مناسب سمجھا کہ حیرہ پر جلد از جلد تسلّط حاصل کرنا چاہیے تاکہ دریائے فرات کے مغرب سے جزیرہ نمائے عرب کی حدود تک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آجائے اور انھیں پشت کی جانب سے کسی حملے کا اندیشہ نہ رہے۔

اس زمانے میں حیرہ کا حاکم ایک ایرانی مرزبان 'آزاذبہ' تھا۔ پچیس سال پیشتر عراقی عربوں کا یہ دارالحکومت اپنی اس شان و شوکت سے محروم ہو چکا تھا جو اسے ان عربوں کی حکومت کے زمانے میں نصیب ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ لخمیوں کا (جنھوں نے دوسری صدی عیسوی میں بمقام حیرہ اپنی سلطنت قائم کی تھی اور جو صدیوں تک یہاں حکمران رہے) طائیوں سے زبردست اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ کسریٰ نے جنگ و جدل کے اِس سلسلے سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور لخمی بادشاہ نعمان بن منذر کے خلاف طائیوں کی مدد کر کے نعمان کو قتل کرا ڈالا اور ایاس بن قبیصۃ الطائی کو حیرہ اور اس کے گرد و نواح کا حاکم بنا دیا۔ ابھی ایاس کو حاکم بنے چند ہی سال ہوئے تھے کہ ذوقار کے مقام پر بنو بکر بن وائل نے ایرانیوں کے ایک لشکر کو، جسے ایاس کی پشت پناہی حاصل تھی، شکست دے دی جس کے نتیجے میں ایاس کو حکومت سے ہاتھ دھونے پڑے اور کسریٰ نے اپنی طرف سے ایک شخص کو حیرہ کا مرزبان (حاکم) بنا دیا۔ اس طرح حیرہ اپنی شان و شوکت سے محروم ہو گیا۔ پھر بھی عربوں کو اس سے دلی تعلق تھا اور وہ اس کی شان و شوکت دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ جب خالدؓ نے مسلمانوں کے خلاف ان عیسائیوں کا غیظ و غضب

دیکھا تو انھیں خدشہ پیدا ہو گیا کہ مبادا ابوبکر بن وائل طائیوں اور حیرہ میں مقیم دوسرے عربوں کو قومی عصبیت کی بنا پر ساتھ ملا کر ان کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور پیچھے سے اُن کا راستہ کاٹنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے انھوں نے حیرہ پر حملہ کر کے اس پر قابض ہونے اور اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ادھر اہل حیرہ بھی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ انھیں الیس اور امغیشیا کے معرکوں کا مفصل حال معلوم ہو چکا تھا اور یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب خالد کی فوجوں کا رُخ اُن کی جانب پھرے گا۔ حاکم حیرہ نے پہلے ہی سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ خالدؓ حیرہ پہنچنے کے لیے دریائی راستہ اختیار کریں گے اور امغیشیا سے کشتیوں میں سوار ہو کر حیرہ پہنچیں گے۔ وہ اپنی فوج لے کر حیرہ سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے کو دریائے فرات کا پانی روکنے کا حکم دیا تاکہ خالدؓ کی کشتیاں دریا میں پھنس جائیں اور آگے نہ بڑھ سکیں۔

آزاذبہ کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ خالدؓ امغیشیا سے کشتیوں میں سوار ہوئے اور بہ جانب شمال حیرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ انھوں نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی تھی کہ دریا خشک ہو گیا اور تمام کشتیاں کیچڑ میں پھنس گئیں۔ خالدؓ کو بے حد تعجب ہوا اور انھوں نے ملاحوں سے اس کا سبب پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ اہل فارس نے دریا پر بند باندھ کر اس کا پانی روک لیا ہے اور سارا پانی دریا سے نکلنے والی نہروں میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے خالدؓ نے کشتیوں کو تو وہیں چھوڑا اور خود فوج کا ایک دستہ لے کر دریا کے دہانے کی طرف بڑھے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ آزاذبہ کا لڑکا دہانے پر کھڑا دریا کا رُخ پھیرنے کے کام کی نگرانی کر رہا ہے۔ انھوں نے اچانک اُس پر حملہ کر کے اسے اور اس کی فوج کو قتل کر ڈالا اور بند توڑ کر دریا میں دوبارہ پانی جاری کر دیا۔ وہ خود اپنے سواروں کے ہمراہ کھڑے ہو کر اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔ کشتیوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا اور اسلامی لشکر لے کر خورنق پہنچ گئیں جہاں خالدؓ نے لشکر کو اترنے کا حکم دیا اور خورنق کے مشہور محل کے سامنے خیمہ زن ہو گئے۔

آزاذبہ حاکم حیرہ کو اپنے بیٹے کے قتل اور اردشیر کی وفات کی خبر ایک ساتھ ملی۔ اس نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ وہ خالدؓ کے آنے سے پیشتر بھاگ کر جان بچالے، چنانچہ اس نے ایسا

ہی کیا۔ ادھر خالدؓ مکمل تیاری کے بعد فوج لے کر حیرہ کی جانب بڑھے۔ پہلے خورنق اور نجف پر قبضہ کیا جہاں گرمیوں کے موسم میں حیرہ کے امرا آکر ٹھہرتے تھے۔ اس کے بعد حیرہ کے سامنے پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔

اگرچہ آزاذبہ جان بچا کر حیرہ سے بھاگ گیا تھا لیکن اہلِ حیرہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ شہر کے چار قلعوں میں محصور ہو کر بیٹھ گئے اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

خالدؓ نے ان قلعوں کا سختی سے محاصرہ کر لیا اور انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنا شروع کیا۔ جب یہ لوگ کسی طرح صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو خالدؓ نے انھیں کہلا بھیجا کہ اگر انھوں نے ایک دن کے اندر اندر ہتھیار نہ ڈالے اور ان کی پیش کردہ تین باتوں میں سے ایک یعنی 'اسلام' جزیہ یا جنگ قبول نہ کی تو انھیں بالکل تہس نہس کر دیا جائے گا اور ان کی تباہی کی ذمہ داری انھیں پر ہوگی۔

لیکن ان لوگوں نے صلح کی بات چیت کرنے کے بجائے اسلامی فوجوں پر سنگ باری شروع کر دی۔ مسلمان بھی جواب میں ایرانیوں پر تیروں کا مینہ برسانے لگے جس سے ان کے بے شمار آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اہلِ حیرہ بہت گھبرا گئے۔ شہر میں پادریوں اور راہبوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ انھوں نے ایرانی سرداروں سے فریاد کی کہ اس خون ریزی کی ساری ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کے لیے سنگ باری بند کر دو اور لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔

کوئی چارۂ کار اور راہ فرار نہ دیکھ کر قلعوں کے سرداروں نے صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ انھوں نے اسلامی فوج کے سرداروں کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کی پیش کردہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اس لیے براہِ کرم تیر اندازی بند کر دیں اور اپنے سپہ سالار کو اس کی اطلاع دے دیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے تیر اندازی بند کر دی اور خالدؓ کو مطلع کر دیا کہ اہلِ حیرہ صلح کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ خالدؓ نے انھیں اپنے پاس آنے کی اجازت دے دی۔

اپنے وعدے کے مطابق سرارانِ حیرہ اپنے اپنے قلعوں سے نکل کر معززینِ شہر کے ہمراہ

اسلامی لشکر کے سرداروں کے پاس پہنچے جنھوں نے انھیں خالدؓ کے پاس روانہ کر دیا۔ خالد باری باری ہر قلعے کے لوگوں سے ملے اور انھیں ملامت کرتے ہوئے فرمایا:

"تم پر افسوس! تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ کر ہم سے مقابلہ کیا۔ اگر تم عرب ہو تو کس وجہ سے تم اپنے ہی ہم قوم لوگوں کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اگر عجمی ہو تو کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ تم ایک ایسی قوم کے مقابلے میں جیت جاؤ گے جو عدل و انصاف میں نظیر نہیں رکھتی؟"

سرداروں نے جزیہ دینے کا اقرار کر لیا۔

خالدؓ کو امید تھی کہ ہم قوم ہونے کی وجہ سے یہ عراقی عرب ضرور اسلام قبول کر لیں گے لیکن انھیں بے حد تعجب ہوا جب انھوں نے بدستور عیسائی رہنے پر اصرار کیا۔ خالدؓ نے فرمایا:

"مجھے تم سے اس جواب کی امید نہ تھی۔ کفر کا راستہ یقیناً ہلاکت کی طرف جاتا ہے۔ احمق ترین عرب وہ ہے جو عربی شاہ راہ ترک کر کے عجمی راہ اختیار کرتا ہے!"

لیکن خالدؓ کی باتوں کا ان سرداروں پر مطلق اثر نہ ہوا اور انھوں نے بدستور عیسائی رہنے پر اصرار کیا۔ اس کی وجہ غالباً ایک تو یہ ہوگی کہ وہ مذہبی آزادی کے حق سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں گے اور اسلامی سپہ سالار کی طرف سے اسلام قبول کرنے کی دعوت کو اپنے حقوق میں ناجائز مداخلت تصور کرتے ہوں گے۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انھیں خیال ہوگا کہ نہ معلوم مسلمانوں کو عراق میں ثبات و استقلال میسر آتا ہے یا نہیں اور ان کی حکومت برقرار رہتی ہے یا نہیں، اس لیے ان غیر یقینی حالات میں مذہب کیوں تبدیل کریں۔

خالدؓ نے سردارانِ حیرہ سے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیے پر صلح کی تھی۔ اس سلسلے میں باقاعدہ یہ صلح نامہ لکھا گیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ وہ عہد نامہ ہے جو خالدؓ بن ولید نے سردارانِ حیرہ عدی بن عدی، عمرو بن عدی، عمرو بن عبدالمسیح، ایاس بن قبیصۃ الطائی اور حیری بن اکال سے کیا ہے۔ اہلِ حیرہ نے یہ عہد نامہ تسلیم کر لیا ہے اور اپنے سرداروں کو اس کی تکمیل کے لیے مجاز گردانا ہے۔ عہد نامے کے مطابق اہلِ حیرہ کو ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ جزیہ

ادا کرنا ہوگا۔ یہ جزیہ ان کے پادریوں اور راہبوں سے بھی لیا جائے گا البتہ محتاجوں، اپاہجوں اور تارک الدنیا راہبوں کو معاف ہوگا۔

اگر یہ جزیہ باقاعدہ ادا کیا جاتا رہا تو اہلِ حیرہ کی حفاظت کی ساری فرمہ داری مسلمانوں پر ہوگی۔ اگر وہ حفاظت میں ناکام رہے تو جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اگر قول بافعل کے ذریعے سے بدعہدی کی گئی تو یہ ذمہ داری ختم سمجھی جائے گی۔ یہ معاہدہ ربیع الاوّل ۱۲ھ میں لکھا گیا۔"

اہلِ حیرہ نے جزیے کے علاوہ خالدؓ کو کچھ تحفے بھی دیے جو انھوں نے مالِ غنیمت کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیج دیے۔ انھوں نے خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ اگر یہ تحفے جزیے میں شامل ہیں تو خیر ورنہ انھیں جزیے کی رقم میں شامل کر کے باقی رقم اہلِ حیرہ کو واپس کر دو۔

جب حیرہ کی فتح کی تکمیل ہو چکی تو خالدؓ نے آٹھ نفل بہ طورِ شکرانہ پڑھے۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"جنگ موتہ کے دن میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں لیکن جس قدر سخت مقابلہ مجھے اہل فارس سے پیش آیا ہے پہلے کبھی نہیں آیا، اور اہلِ فارس میں سے الیس والوں نے جس جواں مردی سے میرا مقابلہ کیا اس کی نظیر میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھی۔"

فتح کے بعد خالدؓ نے حیرہ کو مسلمانوں کا فوجی مستقر اور مفتوحہ علاقے کا دارالحکومت بنایا۔ یہ پہلا اسلامی دارالحکومت تھا جو جزیرہ عرب کے باہر قائم کیا گیا۔ پھر بھی یہاں کا نظم ونسق آپ نے مقامی سرداروں ہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ وہ اپنی اس قدر افزائی سے بہت خوش ہوئے اور دل وجان سے ان کی اطاعت و فرماں برداری کا دم بھرنے اور حیرہ اور اس کے گرد و نواح میں سکون و اطمینان کی فضا پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونے لگے۔ جب حیرہ کے قریبی شہروں کے باشندوں نے دیکھا کہ اہلِ حیرہ اسلامی عدل و انصاف سے کماحقہٗ بہرہ ور ہو رہے ہیں، انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے، مذہبی رسوم ادا کرنے اور عبادت بجا لانے کی پوری آزادی حاصل ہے اور وہ اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں اور دوسری طرف ایرانی حکومت اُن کی طرف

سے بالکل غافل ہے تو انھوں نے بھی خالدؓ سے مصالحت کرنے اور ان کی اطاعت قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حکومت میں غریب کاشت کار بڑے اطمینان سے کھیتی باڑی میں مشغول ہیں، مسلمان نہ صرف ان سے مطلق تعرض نہیں کرتے بلکہ ایرانی زمینداروں کے ہاتھوں انھیں جن مظالم اور سختیوں سے گزرنا پڑتا تھا، ان کا وجود بھی باقی نہیں، مسلمان ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں تو ان کے دل بے اختیار مسلمانوں کی طرف مائل ہو گئے۔

سب سے پہلے جس شخص نے خالدؓ کی جانب صلح کا ہاتھ بڑھایا وہ دیر ناطف کا پادری صلوبا بن نسطونا تھا۔ اُس نے بانقیا اور بسما کے ان قصبات کی ساری اراضی کے لگان کی ذمہ داری قبول کر لی جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھی۔ کسریٰ کے موتیوں کے علاوہ اس نے اپنی ذات، خاندان اور قوم کی طرف سے دس ہزار دینار دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ باقاعدہ یہ معاہدہ لکھا گیا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"یہ معاہدہ خالدؓ بن ولید کی طرف سے صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے مطابق تم سے دس ہزار درہم سالانہ جزیہ وصول کیا جائے گا۔ کسریٰ کے موتی اس کے علاوہ ہوں گے۔ یہ رقم مستطیع اور کمانے والے افراد سے ان کی آمدنی اور حیثیت کے مطابق سالانہ وصول کی جائے گی۔ اِس جزیے کے بدلے مسلمانوں کی طرف سے بانقیا اور بسما کی بستیوں کی حفاظت کی جائے گی۔ تمھیں اپنی قوم کا نقیب مقرر کیا جاتا ہے جسے تمھاری قوم قبول کرتی ہے۔ اس معاہدے پر میں اور میرے ساتھ کے سب مسلمان رضامند ہیں اور اسے قبول کرتے ہیں اسی طرح تمھاری قوم بھی اس پر رضامند ہے اور اسے قبول کرتی ہے۔"

صلوبا کے بعد عراق کے دوسرے زمینداروں نے بھی خالدؓ کی اطاعت قبول کر لی۔ فلالیج سے ہرمزدجرد تک کے علاقے کے لیے بیس لاکھ درہم پر مصالحت ہوئی۔ اس طرح وہ سارا علاقہ، جو جنوب میں خلیج فارس سے شمال میں حیرہ تک اور مغرب میں جزیرۂ عرب سے مشرق میں دریائے دجلہ تک پھیلا ہوا تھا، خالدؓ کے زیر نگیں آ گیا۔ انھوں نے ان علاقوں میں امرا مقرر کر کے بھیجے

جن کے سپرد امن و امان اور شہری نظام بحال کرنے کے علاوہ خراج کی وصولی کا کام بھی تھا۔ علاوہ بریں انھوں نے مختلف شہروں میں فوجی دستے بھی متعین کیے تاکہ اگر کوئی بغاوت پھوٹ پڑے یا کسی جانب سے حملے کا خطرہ ہو تو اس کا تدارک کیا جائے۔ ان دستوں کے تقرر سے شوریدہ سر لوگوں کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور وہ اسلامی حکومت سے بغاوت کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔

اس زمانے میں جب مسلمان دجلہ کے اس پار فتوحات پر فتوحات حاصل کرنے میں مصروف تھے اہل فارس اپنے اندرونی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اردشیر کی وفات سے ایرانی شہنشاہی کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ تمام شہزادے جنھیں سلطنت کا وارث بننا تھا، اپنے حریفوں کے ہاتھوں قتل کیے جا چکے تھے اور ایرانیوں کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس شخص کے سر پر بادشاہی کا تاج رکھیں۔ یکے بعد دیگرے کئی لوگ تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔

لیکن کسی کو بھی چند دن سے زیادہ بادشاہی کرنا نصیب نہ ہوئی اور اس طرح سلطنت کی کمزوری میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایرانیوں نے مناسب سمجھا کہ خالدؓ کے مفتوحہ علاقوں پر حملہ کر کے انھیں دوبارہ فتح کرنے کی نسبت بہتر یہ ہے کہ جو علاقہ اس وقت ان کے پاس ہے اسے ایرانی افواج کے بل بوتے پر مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے دریائے دجلہ کی دوسری طرف حفاظتی انتظامات شروع کر دیے۔

خالدؓ ان فوجی انتظامات اور ایرانی افواج کو مطلق خاطر میں لانے والے نہ تھے اور نہ ایرانی اپنی پوری قوت و طاقت کے باوجود اسلامی افواج کے مقابلے میں ٹھہر ہی سکتے تھے لیکن جس چیز نے خالدؓ کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا وہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ حکم تھا کہ جب تک عیاض بن غنمؓ دومۃ الجندل کی فتح سے فارغ ہو کر ان کے پاس نہ پہنچ جائیں اس وقت تک خالدؓ نہ حیرہ کو چھوڑیں اور نہ مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھیں۔ ادھر عیاض دومۃ الجندل میں پھنسے ہوئے تھے اور جب سے حضرت ابوبکرؓ نے انھیں وہاں بھیجا تھا انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ خالدؓ کامل ایک سال تک حیرہ میں مقیم رہے۔ بے کاری کا یہ زمانہ خالدؓ جیسے مصروف عمل انسان کو بہت شاق گزر رہا تھا۔ انھوں نے بارہا ساتھیوں سے کہا کہ اگر خلیفہ کا حکم نہ ہوتا تو میں عیاض کا مطلق انتظار نہ

کرتا اور نہ انھیں اپنی فوج میں شامل کرتا۔ اس وقت ایران فتح کرنے سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں۔ ایک سال گزر چکا ہے لیکن محض عیاض کی وجہ سے ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

جب خالدؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو انھوں نے تنگ آکر ایک آدمی حیرہ کا اور ایک انباط کا بلا بھیجا۔ حیری باشندے کے ہاتھ ایک خط ملوکِ فارس کے نام بھیجا اور انباطی کے ہاتھ ایک خط ایرانی مرزبانوں (عمال و امراء) کے نام ارسال کیا۔

ملوکِ فارس کے نام جو خط بھیجا اس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ خط خالدؓ بن ولید کی طرف سے ملوکِ فارس کے نام ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمھارا نظام درہم برہم کر دیا، تمھارے مکر و فریب کو ناکام کر دیا اور تم میں اختلافات پیدا کر دیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس میں تمھارا ہی نقصان تھا۔ اب تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہماری اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہم تمھیں اور تمھارا علاقہ چھوڑ کر دوسری طرف چلے جائیں گے ورنہ تمھیں ایک ایسی قوم کے سامنے مغلوب ہونا پڑے گا جو موت کو اس سے زیادہ پسند کرتی ہے جتنا تم زندگی کو پسند کرتے ہو۔"

ایرانی مرزبانوں کے نام جو خط تھا اس میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ خط خالدؓ بن ولید کی طرف سے ایرانی مرزبانوں کے نام ہے تم لوگ اسلام قبول کر لو، سلامت رہو گے۔ یا جزیہ ادا کرو، ہم تمھاری حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں نے ایسی قوم کے ساتھ تم پر چڑھائی کی ہے جو موت کی اتنی ہی فریفتہ ہے جتنے تم شراب نوشی کے۔"

انبار

ایرانی افواج حیرہ کے بالکل قریب انبار اور عین التمر میں خیمہ زن ہو چکی تھیں اور مسلمانوں کے اس

فوجی مستقر کو سخت خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ دریں حالات اگر خالدؓ خاموشی سے حیرہ میں بیٹھے رہتے اور باہر نکل کر ایرانی فوجوں کے خلاف کارروائی نہ کرتے تو اندیشہ تھا کہ مسلمان اس علاقے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے جو انتہائی مشقت کے بعد ان کے ہاتھ آیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ قعقاع بن عمرو کو حیرہ کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑا۔ اقرع بن حابس کو مقدمتہ الجیش پر مقرر کیا اور انبار روانہ ہو گئے۔

انبار پہنچ کر انھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور لشکر کو حکم دیا کہ قلعے کی محافظ فوج پر تیر برسائیں لیکن مضبوط شہر پناہ اور گہری خندق کے باعث، جو شہر کے ارد گرد کھدی ہوئی تھی، ایرانیوں کو اس تیر اندازی سے کوئی گزند نہ پہنچا اور مسلمانوں کا ابتدائی حملہ ناکام رہا۔

خالدؓ زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے شہر پر حملہ کرنے کی کوئی راہ معلوم کرنے کے لیے خندق کے ساتھ ساتھ شہر کے گرد چکر لگایا چنانچہ ایک جگہ دیکھا کہ وہاں خندق نسبتاً کم چوڑی تھی۔ انھوں نے حکم دیا کہ لشکر کے جو اونٹ بہت بیمار اور بالکل ناکارہ ہوں وہ ذبح کر کے اس جگہ پھینک دیے جائیں۔ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اونٹ ذبح کر کے خندق کے تنگ حصے میں پھینکنے شروع کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی لاشوں سے وہ حصہ پٹ کر ایک پل سا بن گیا جس کے بعد خالد فوج کا ایک دستہ لے کر خندق کے پار ہو گئے۔ اس دستے نے فصیل پھاند کر شہر کا دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔

یہ حالت دیکھ کر ایرانی فوج کے سپہ سالار شیرزاد نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی اور یہ پیش کش کی کہ اگر میری جان بخشی کر دی جائے تو میں سواروں کے ایک دستے کے ساتھ، جس کے پاس سامان وغیرہ کچھ نہ ہو گا، شہر سے نکل جاؤں گا۔ خالد نے یہ پیش کش قبول کر لی اور شیرزاد شہر سے نکل گیا۔ شہر پر مسلمان قابض ہو گئے اور انبار کے نواحی علاقے کے لوگوں نے خالدؓ سے مصالحت کر لی۔

عین التمر

جب خالدؓ کو انبار اور اس کے نواحی علاقے کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو زبرقان بن بدر کو اپنا

نائب بنا کر انبار میں چھوڑا اور خود عین التمر کا قصد کیا جو عراق اور صحرائے شام کے درمیان صحرا کے کنارے واقع ہے۔ انبار سے عین التمر تک پہنچنے میں تین دن لگے۔ ایرانیوں کی طرف سے وہاں کا حاکم مہران بن بہرام چوبین تھا۔ اس نے شہر کی حفاظت کے لیے ایرانیوں کی ایک بھاری فوج جمع کر رکھی تھی۔ ایرانی فوجوں کے علاوہ بنی تغلب، نمر اور ایاد کے بدوی قبائل بھی عقہ بن ابی عقہ اور ہذیل کے زیر سرکردگی بھاری تعداد میں مہران کے پاس جمع تھے۔ جب عین التمر والوں نے اسلامی لشکر کو آتے دیکھا تو عقہ نے مہران سے کہا:

"عرب عربوں سے لڑنا خوب جانتے ہیں اس لیے تم ہمیں مسلمانوں سے نبٹ لینے دو۔"

مہران نے مسکرا کر جواب دیا:

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ عربوں سے لڑنے میں تم اتنے ہی ماہر ہو جتنے ہم عجمیوں سے لڑنے میں ماہر ہیں۔ تم مسلمانوں سے لڑو۔ اگر ہماری ضرورت ہوگی تو ہم بھی میدانِ جنگ میں پہنچ جائیں گے۔"

ایرانی مہران کی چال کو نہ سمجھ سکے اور انھوں نے اس خیال سے کہ مہران کی ان باتوں سے ان کی کم زوری اور ناطاقتی عیاں ہوتی ہے اسے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ مہران نے جواب دیا:

"تم میرے کام میں دخل نہ دو میں نے جو کچھ کیا ہے تمھاری بہتری کے لیے کیا ہے۔ اس وقت تمھارے مقابلے کے لیے ایک ایسا شخص آ رہا ہے جس نے تمھارے بادشاہوں کو قتل اور تمھاری سلطنت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے ان عربوں کے ذریعے سے تمھارا بچاؤ کیا ہے۔ اگر یہ لوگ خالد کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تو کامیابی کا فخر تمھارے ہی حصے میں آئے گا لیکن اگر شکست کھا گئے تو ہماری تازہ دم فوج تھکے ماندے مسلمانوں کو آسانی سے زیر کر سکے گی۔"

یہ سن کر ایرانی فوج مطمئن ہو گئی۔

عقہ فوج لے کر آگے بڑھا اور خالدؓ کے راستے میں حائل ہو گیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو خالدؓ نے بڑی پھرتی سے کمند پھینک کر عقہ کو گرفتار کر لیا۔ اپنے سردار کا یہ حشر دیکھ کر بدوؤں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور انھوں نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور سیکڑوں لوگوں کو قید

کردیا۔ البتہ ہذیل اور بعض دوسرے سرداران لشکر بچ کر نکل گئے۔

مہران بڑے اطمینان سے قلعے میں فروکش تھا اور اسے یقین تھا کہ بدو ضرور مسلمانوں کا حملہ روک لیں گے لیکن جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو بہت سٹپٹایا اور فوج لے کر قلعے سے بھاگ گیا۔ قلعے میں صرف وہ فوج رہ گئی جو پہلے سے اس کی حفاظت کے لیے متعین تھی یا وہ بدو جو عقہ کے لشکر میں شامل تھے اور شکست کھا کر قلعے میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔

خالدؓ نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ روز تو قلعے والے دروازے بلند کیے محاصرے کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان میں خالدؓ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تو انھوں نے اس شرط پر دروازے کھولنے کی پیش کش کی کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے لیکن خالدؓ نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ آخر انھیں یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا اور قلعے کے دروازے کھول دیے۔ خالدؓ نے سب لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد عقہ کو کھلے میدان میں لایا گیا اور اس کی گردن اڑا دی گئی۔

انبار اور عین التمر کی فتح کے بعد خالدؓ نے ولید بن عقبہ کو خمس دے کر فتح کی خوش خبری کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے مدینہ پہنچ کر انھیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ خالدؓ نے ان کے احکام نظر انداز کرتے ہوئے حیرہ اس لیے چھوڑا اور انبار و عین التمر پر اس لیے چڑھائی کی کہ انھیں حیرہ میں قیام کیے ہوئے پورا ایک سال ہو گیا تھا اور عیاض کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کب دومۃ الجندل سے فارغ ہو کر خالدؓ کی مدد کے لیے حیرہ پہنچتے ہیں حضرت ابوبکرؓ بھی عیاض کی سست روی سے تنگ آ چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کر رہے ہیں۔ اگر دشمن کو خالدؓ کے ان کارناموں کی اطلاعات نہ ملتی رہتیں جو انھوں نے عراق میں انجام دیے تو یقیناً وہ عیاض کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو سخت زک پہنچاتے۔

دومۃ الجندل

جب ابوبکرؓ ولید سے عراق کے متعلق تمام رپورٹیں حاصل کر چکے تو انھیں عیاض کی مدد کے لیے دومۃ الجندل جانے کا حکم دیا۔ جب ولید وہاں پہنچے تو دیکھا کہ عیاض بن غنم دومۃ الجندل کا محاصرہ

کیے ہوئے ہیں اور جوابا دومۃ الجندل والوں نے عیاض کا محاصرہ کرکے ان کا راستہ مسدود کر رکھا ہے۔ عیاض سے بات چیت کرنے اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ولید نے محسوس کیا کہ عیاض اپنی فوج کی مدد سے نہ دومۃ الجندل والوں کو شکست دے سکتے اور نہ ان کے چنگل سے نکل سکتے ہیں۔ ولید نے ان سے کہا کہ بعض حالات میں عقل کی ایک بات زبردست لشکر سے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اگر تم میری مانو تو خالدؓ کے پاس قاصد بھیج کر ان سے اعانت چاہو۔

عیاض کے لیے ولید کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ انھیں دومۃ الجندل پہنچے ہوئے سال بھر ہو چکا تھا اور ابھی تک فتح کی کوئی شکل نظر نہ آتی تھی۔ انھوں نے اپنے قاصد کو خالدؓ کے پاس روانہ کیا۔ قاصد ان کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ عین التمر کی فتح سے فارغ ہو چکے تھے۔ خالدؓ نے خط پڑھا اس کے لفظ لفظ سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ انھوں نے عیاض کے نام ایک مختصر خط دے کر قاصد کو فوراً واپس کر دیا تاکہ عیاض کی پریشانی کچھ کم ہو جائے۔ خط میں لکھا تھا:

"خالدؓ بن ولید کی طرف سے عیاض کے نام میں بہت جلد تمھارے پاس آتا ہوں۔ تمھارے پاس اونٹنیاں آنے والی ہیں جن پر کالے زہریلے ناگ سوار ہیں۔ فوج کے دستے ہیں جن کے پیچھے اور دستے ہیں۔"

عیاض کے نام خالدؓ کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حیرہ میں بے کار پڑے رہنے کی وجہ سے حضرت خالدؓ کو کس قدر گھبراہٹ لاحق تھی اور انبار و عین التمر کی جنگیں اور فتوحات بھی ان کی آتشِ شوق کو سرد نہ کر سکی تھیں۔ اسی وجہ سے عیاض کا بلاوا پہنچتے ہی وہ دومۃ الجندل جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔

خالدؓ نے عویم بن کاہل اسلمی کو عین التمر میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود فوج لے کر دومۃ الجندل روانہ ہوئے۔ دومۃ الجندل اور عین التمر کے درمیان تین سو میل کا فاصلہ ہے۔ یہ مسافت خالدؓ نے دس روز سے بھی کم عرصے میں طے کی۔ شمال سے جنوب کو جاتے ہوئے درمیان میں شام اور نفود کے خوفناک اور لق و دق صحرا پڑتے تھے جن میں سے گزرتے ہوئے سیکڑوں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن خالدؓ تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ جب وہ دومۃ الجندل کے قریب پہنچے اور اہل شہر کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے

ان کے سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آئندہ اقدامات کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔

دومۃ الجندل میں اس وقت جو قبائل ڈیرے ڈالے پڑے تھے ان کی تعداد اس وقت سے کئی گنا زیادہ تھی جب ایک سال قبل عیاض بن غنم ان کی سرکوبی کے لیے پہنچے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بنو کلب بہراء اور غسان کے قبائل اپنے ساتھ اور کئی قبائل ملا کر عراق سے دومۃ الجندل چلے آئے تھے اور خالدؓ کے ہاتھوں اپنی عبرت ناک شکستوں کا بدلہ عیاض سے لینا چاہتے تھے۔ ان قبائل کی روز افزوں آمد کے باعث عیاض کے لیے انتہائی صبر آزما حالات پیدا ہو گئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کے مقابلے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔

دومۃ الجندل کی فوج دو بڑے حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصے کا سردار اُکیدر بن عبدالملک کندی تھا اور دوسرے کا جودی بن ربیعہ۔ اکیدر دومۃ الجندل کا حاکم تھا اور اُس نے مدینہ کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اسی کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے عیاض کو روانہ کیا تھا۔ ان تمام قبائل میں جو اس جگہ جمع تھے، اکیدر سے زیادہ خالدؓ سے اور کوئی واقف نہ تھا۔ وہ غزوۂ تبوک کو نہ بھولا تھا جب رسول اللہ اس سے وفاداری کا عہد لے کر مدینہ واپس تشریف لے آئے تھے اور اسے وہ وقت بھی خوب یاد تھا جب رسول اللہ کے احکام کے مطابق خالدؓ پانچ سواروں کے ہمراہ دومۃ الجندل پہنچے تھے اور اُسے قید کر کے دھمکی دی تھی کہ اگر دومۃ الجندل کے دروازے مسلمانوں کے لیے نہ کھولے گئے تو اُسے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مجبور ہو کر اسے دومۃ الجندل کے دروازے کھولنے ہی پڑے اور خالدؓ کو دو ہزار اونٹ، آٹھ سو بکریاں، چار سو وسق گیہوں اور چار سو درہم دے کر صلح کرنی پڑی۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ اسے خالدؓ کے ہمراہ مدینہ آنا، وہاں اسلام قبول کرنا اور رسول اللہ سے دوستی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ یہ تمام باتیں اکیدر کے دل میں میخ کی طرح گڑی ہوئی تھیں۔ اسی لیے جب اُس نے خالدؓ کے دومۃ الجندل پہنچنے کی خبر سنی تو وہ جودی بن ربیعہ سے ملا جو دومۃ الجندل کے لیے عراق سے آنے والے بدوی قبائل کا سردار تھا اور کہنے لگا:

"میں تمھاری نسبت خالدؓ سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ آج دنیا میں خالدؓ سے بڑھ کر کوئی شخص اقبال مند اور فنونِ جنگ کا ماہر نہیں۔ جو قوم خالدؓ سے

مقابلہ کرتی ہے۔ خواہ تعداد میں کم ہو یا زیادہ، ہر حال میں شکست کھا جاتی ہے۔
اِس لیے تم میری بات مانو اور مسلمانوں سے صلح کر لو۔"

لیکن اِن قبائل نے، جن کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، اُکیدر کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اِس پر اُکیدر یہ کہ کر اُن سے علیحدہ ہو گیا: "تم جانو تمھارا کام۔ میں تو تمھارے ساتھ مل کر خالدؓ سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

وہ اپنے حلیفوں سے جدا ہو کر خالدؓ کو ملنے کے ارادے سے ان کے کیمپ میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچ کر روایات میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ جب اُکیدر خالدؓ کے سامنے حاضر ہوا تو انھوں نے ان کی گردن مارنے کا حکم دے دیا لیکن بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے قید کر کے مدینہ بھیج دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اسے رہائی ملی اور وہ مدینہ سے عراق چلا گیا۔ وہاں عین التمر کے قریب ایک مقام دومہ ہی میں اقامت پذیر ہو گیا اور آخر وقت تک وہیں رہا۔

خالدؓ آگے بڑھ کر دومۃ الجندل پہنچے۔ وہاں کی فوج مختلف قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کے ماتحت تھا اور یہ تمام سردار جودی بن ربیعہ کے زیرِ سرکردگی تھے۔ خالدؓ نے دومۃ الجندل کو اپنی اور عیاض بن غنم کی فوج کے گھیرے میں لے لیا۔ جو عربی النسل عیسائی دومۃ الجندل والوں کی امداد کے لیے پہنچے تھے وہ قلعے کے چاروں طرف جمع تھے کیونکہ قلعے میں ان کے لیے گنجائش نہ تھی۔

لڑائی شروع ہوئی تو جودی بن ربیعہ اور ودیعہ خالدؓ کے بالمقابل اور ابن حدرجان اور ابن الایہم عیاض بن غنم کے مقابل صف آرا ہوئے۔ خالدؓ نے جودی کو اور اقرع بن حابس نے ودیعہ کو گرفتار کر لیا۔ باقی لوگ قلعے کی طرف بھاگے۔ لیکن وہاں گنجائش نہ تھی۔ قلعہ بھر جانے پر اندر والوں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنے ان ساتھیوں کو، جو باہر رہ گئے تھے، مسلمانوں کی تلواروں کے حوالے کر دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر خالدؓ کی فوج کے ایک سردار عاصم بن عمرو نے اپنے قبیلے بنو تمیم سے اپنے حلیف بنی کلب کی امداد کی درخواست کی۔ بنو تمیم فوراً ان کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے اور اس طرح بنی کلب کی جانیں بچ گئیں۔

جو لوگ قلعے کی طرف بھاگے تھے خالدؓ نے اُن کا پیچھا کیا اور اتنے آدمی قتل کیے کہ ان کی لاشوں سے دروازہ پٹ گیا اور اندر جانے کا راستہ نہ رہا۔ انھوں نے جودی بن ربیعہ اور دوسرے قیدیوں کی بھی گردنیں اڑا دیں سوائے کلب کے قیدیوں کے جنھیں عاصم بن عمرو نے پناہ دے دی تھی۔ اس کے بعد خالدؓ نے قلعے کا دروازہ اکھڑوا ڈالا اور جتنے بھی لوگ قلعے میں محصور تھے انھیں قتل کر دیا۔ فتح کے بعد انھوں نے اقرع بن حابس کو انبار واپس جانے کا حکم دیا اور خود دومۃ الجندل میں قیام کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے آخر کیا بات تھی کہ مسلمانوں نے دومۃ الجندل پر اتنی توجہ مبذول کی اور اسے ہر قیمت پر فتح کر لینا چاہا۔ رسول اللہؐ کے عہد میں دو بار اس پر چڑھائی ہوئی اور آخر اکیدر سے دوستی کا معاہدہ کر کے اسے اسلامی عمل داری میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مسلمان سال بھر تک اس کا محاصرہ کیے پڑے رہے اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک اُسے کاملاً مطیع کر کے اپنی حکومت میں دوبارہ شامل نہ کر لیا گیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دومۃ الجندل کی جغرافیائی حالت ایسی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا ہر حالت میں ناگزیر تھا۔ دومۃ الجندل اس راستے کے سرے پر واقع ہے جہاں سے ایک طرف حیرہ اور عراق کو راستہ جاتا ہے اور دوسری طرف شام کو۔ رسول اللہؐ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ شام اور جزیرہ عرب کی سرحدوں پر امن قائم رہے اور رومی فوجیں مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر سرزمینِ عرب میں نہ گھس آئیں۔ اسی لیے آپ نے دومۃ الجندل کو اپنے زیرِ نگیں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش فرمائی۔ یہی حال حضرت ابوبکرؓ کا تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی فوجیں ایک طرف عراق میں ایرانی فوجوں سے نبرد آزما تھیں تو دوسری طرف شام کی سرحدوں پر رومیوں سے مصروفِ پیکار تھیں اور ضروری تھا کہ یہ اہم مقام مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔ یہی وجہ تھی کہ عیاض بن غنم ایک سال تک اس کا محاصرہ کیے پڑے رہے اور سخت مشکلات کے باوجود وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ جب خالدؓ کو دومۃ الجندل پہنچنے کے لیے کہا گیا تو وہ بھی بلا توقف اس جانب روانہ ہو گئے۔ اگر خدانخواستہ دومۃ الجندل مسلمانوں کے قبضے میں نہ آتا تو نہ صرف عراق میں ان کی فتوحات کا کوئی بھروسا نہ ہوتا بلکہ شام کی فتح بھی ناممکن ہو جاتی۔

خالدؓ کی عراق میں واپسی

انسانی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ جب تک ایک قوی اور زبردست وجود ان کے درمیان رہتا ہے وہ بھیگی بلّی بنے رہتے ہیں لیکن جونہی وہ شخص انھیں چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے تو وہ میدان خالی پاکر من مانی کرنے پر تل جاتے ہیں۔ یہی حال خالدؓ کی غیر حاضری میں اہلِ حیرہ اور اہلِ عراق کا ہوا۔ ایرانیوں اور ان کے عرب مددگاروں نے سوچا کہ مسلمانوں کی اطاعت کا جُوا سر سے اتار پھینکنے کا موقع اس سے بہتر اور کوئی ہاتھ نہ آئے گا ۔۔۔ بنو تغلب نے یہ خیال کیا کہ عقہ کے قتل کا بدلہ لینے کا موقع اس سے اچھا اور کوئی نہیں۔ قعقاع اس موقع پر صرف یہ کر سکتے تھے کہ جن جن علاقوں پر مسلمان قابض ہو چکے تھے انھیں ہاتھ سے نہ نکلنے دیں اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روکیں۔ لیکن خالدؓ کی اس پالیسی کو لباس عمل پہنانے کی طاقت ان میں نہ تھی کہ دشمن کے حملوں سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آگے بڑھ کر اس کے مقبوضات پر پے در پے حملے کیے جائیں اور اسے اپنے ہی علاقوں میں الجھائے رکھ کر اسلامی مقبوضات کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکا جائے۔

ادھر جب خالدؓ کو ایرانیوں اور عربی النسل عیسائی قبائل کے ارادوں سے آگاہی ہوئی تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی دومۃ الجندل میں نہ رہ سکے اور انھوں نے فوراً کوچ کی تیاری کر لی۔ مقدمے پر اقرع بن حابس کو متعین کیا اور عیاض بن غنم کو ساتھ لے کر حیرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ حیرہ پہنچ کر اسے عیاض کی سپردگی میں دیا اور قعقاع کو حصید کی طرف بھیجا جہاں عربوں اور ایرانیوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ خود قسم کھائی کہ بنو تغلب پر اس طرح اچانک حملہ کریں گے کہ انھیں کسی طرح بھی سنبھلنے کا موقع نہ ملے گا۔

جب اہلِ عراق کو معلوم ہوا کہ خالدؓ ان کی سرکوبی کے لیے ایک بار پھر عراق پہنچ چکے ہیں تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی اور اپنے علاقے کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے جو حسین خواب وہ دیکھ رہے تھے وہ سب آن کی آن میں ختم ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسری اقوام کی طرح مسلمان بھی سرزمین عراق کو تاخت و تاراج کر کے چلے جائیں گے اور وہ بعد میں اپنے

علاقوں پر قابض ہو سکیں گے لیکن ان کے یہ خیالات باد ہوا ثابت ہوئے۔

حصید، خنافس اور مضیح

خالدؓ کے حکم کے مطابق قعقاع حصید کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایرانی لشکر ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اس کا سپہ سالار مارا گیا اور لشکر نے میدانِ جنگ سے فرار ہونے میں اپنی عافیت سمجھی۔ ہزیمت خوردہ لشکر کا خیال تھا کہ وہ شہر خنافس میں پناہ لے سکے گا جہاں پہلے ہی سے ایک اور ایرانی لشکر موجود تھا لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی کیونکہ خنافس میں مقیم ایرانی لشکر کا سپہ سالار مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر پہلے ہی وہاں سے فرار ہو کر مضیح پہنچ چکا تھا جہاں کا حاکم ہذیل بن عمران تھا۔

اس طرح مسلمان بغیر لڑے بھڑے خنافس پر قابض ہو گئے اور اب کوئی فرد ایسا نہ تھا جو ایرانی لشکر کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار کر کے میدانِ جنگ میں لاتا۔

اب خالدؓ نے اپنے سرداروں کو مضیح کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور خود بھی ادھر کا رُخ کیا۔ یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ تمام قائدین کو کس رات اور کس وقت مضیح پہنچنا ہے۔ چنانچہ مقررہ وقت پر تمام قائدین منزلِ مقصود پر پہنچ گئے اور آتے ہی تین اطراف سے ہذیل اور اس کی فوج پر، جو بے خبر پڑی سو رہی تھی، بھرپور حملہ کر دیا۔ ہذیل مع چند ساتھیوں کے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ باقی تمام فوج قتل ہو گئی۔ لاشوں سے میدان اس طرح پٹ گیا گویا بکریاں ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔

اس جنگ کے دوران میں دو ایسے مسلمان اسلامی فوج کے ہاتھوں مارے گئے جو مضیح میں مقیم تھے اور جن کے پاس حضرت ابوبکرؓ کا عطا کیا ہوا ایک صداقت نامہ بھی موجود تھا۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو ان کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ خالدؓ کو ان کے اس فعل کی سزا ملنی چاہیے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جو مسلمان دشمن کی سرزمین میں دشمن کے ساتھ قیام پذیر ہوں گے ان کے ساتھ ایسی صورت کا پیش آنا بہت ممکن ہے۔

جنگ مضیح سے فارغ ہونے کے بعد خالدؓ نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انھوں نے اپنے دو سرداروں قعقاع اور ابولیلیٰ کو بنی تغلب کی بستیوں کی جانب روانہ فرمایا اور خود بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ اس حملے کا پروگرام بھی ویسا ہی بنایا گیا تھا جیسا جنگ مضیح کے موقع پر ترتیب دیا گیا تھا۔ خالدؓ نے اپنے ساتھیوں سے مل کر رات کے وقت تین اطراف سے دشمنوں پر زور شور سے حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بنی تغلب کا کوئی بھی مرد بچ کر نہ نکل سکا۔ عورتیں گرفتار کرلی گئیں۔ فتح کے بعد خالدؓ نے نعمان بن عوف شیبانی کے ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں خمس روانہ کیا حضرت علیؓ نے انھیں قیدیوں میں سے ایک لڑکی صالحہ بنت ربیعہ بن بجیر کو خریدا تھا جس سے ان کے یہاں عمرؓ اور رقیہ پیدا ہوئے۔

فراض

خالدؓ کے ان اچانک حملوں اور قبائل کے ان کے مقابلے سے عاجز رہنے کی خبریں عراق بھر میں پھیل چکی تھیں اور صحرا میں رہنے والے تمام قبائل سخت خوف زدہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈالنے اور ان کی اطاعت قبول کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ خالدؓ نے اپنی فوجوں کے ہمراہ دریائے فرات کے ساتھ ساتھ شمالی علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ جہاں بھی پہنچتے وہاں کے باشندے ان سے مصالحت کر لیتے اور ان کی اطاعت کرنے کا اقرار کرتے۔ آخر وہ فراض پہنچ گئے جہاں شام، عراق اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔

فراض عراق اور شام کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ اگر عیاض بن غنم کی قسمت یاوری کرتی اور وہ ابتدا ہی میں دومۃ الجندل فتح کر لیتے تو غالباً خالدؓ یہاں تک نہ پہنچتے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کا منشا سارے عراق اور شام کو فتح کرنے کا نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں ملکوں کی سرحدوں پر جو عرب سے ملتی ہیں، امن وامان قائم ہو جائے اور ان اطراف سے ایرانی اور رومی عرب پر حملہ آور نہ ہو سکیں لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ یہ دونوں مملکتیں کاملاً مسلمانوں کے قبضے میں آجائیں۔ اس لیے اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ خالدؓ عراقی قبائل کو مطیع کرنے کی غرض سے انتہائی شمال تک چلے گئے اور اس طرح مسلمانوں کے لیے بالائی

جانب سے شام پر حملہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ایرانی سرحدات سے رومیوں پر حملہ کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ایرانی سرحدات سے رومیوں پر حملہ کرنے کا راستہ کھل جانا ایک ایسا معجزہ تھا جس کا خیال حضرت ابوبکرؓ تک کو بھی نہ آسکا اور یہ کارنامہ ایسے شخص کے ہاتھوں رونما ہوا جس کی نظیر پیدا کرنے سے عرب اور عجم کی عورتیں واقعی عاجز تھیں۔

فراض میں خالدؓ کو کامل ایک مہینے تک قیام کرنا پڑا۔ یہاں بھی انھوں نے ایسی جرأت اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا کہ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ مشرقی جانب ایرانی تھے جو ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مغربی جانب رومی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ اگر اس وقت خالدؓ کی جمعیت کو تباہ و برباد نہ کر دیا گیا تو پھر یہ سیلاب روکے نہ رُکے گا۔ رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دریائے فرات حائل تھا۔ ان کے علاوہ چاروں طرف بدوی قبائل آباد تھے جن کے بڑے بڑے سرداروں کو قتل کر کے خالدؓ نے ان کے دلوں میں انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس نازک صورتِ حال سے خالدؓ لاعلم نہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو حیرہ واپس آکر اپنی قوت و طاقت میں اضافہ کرتے ہوئے پھر رومیوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہو سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا نہ کیا کیونکہ دشمن کو سامنے دیکھ کر خالدؓ کے لیے صبر کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان کی نظروں میں کیا ایرانی و رومی اور کیا اہلِ بادیہ سب حقیر تھے۔ ان کی عظیم الشان فوجوں کو وہ نہ پہلے کبھی خاطر میں لائے اور نہ آئندہ خاطر میں لانے کو تیار تھے۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے لڑائی کی تیاریوں میں مشغول تھے۔

ادھر رومیوں کو ابھی تک خالدؓ سے واسطہ نہ پڑا تھا اور وہ ان کے حملے کی شدت سے ناواقف تھے۔ جب اسلامی فوجیں فراض میں اکٹھی ہوئیں اور برابر ایک مہینے تک ان کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑی رہیں تو انھیں بہت جوش آیا اور انھوں نے اپنے قریب کی ایرانی چوکیوں سے مدد مانگی۔ ایرانیوں نے بڑی خوشی سے رومیوں کی مدد کی کیونکہ مسلمانوں نے انھیں ذلیل و رسوا کر دیا تھا اور ان کی شان و شوکت کو تہ و بالا کر کے اُن کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ ایرانیوں کے علاوہ تغلب، ایاد اور نمر کے عربی النسل قبائل نے بھی رومیوں کی پوری پوری مدد کی کیونکہ وہ اپنے رؤسا اور سرآوردہ اشخاص کے قتل کو بھولے نہ تھے۔ چنانچہ رومیوں، ایرانیوں اور عربی النسل قبائل کا ایک لشکرِ جرار

مسلمانوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ دریائے فرات پر پہنچ کر انھوں نے مسلمانوں کو کہلا بھیجا:

"تم دریا کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ گے یا ہم دریا کو عبور کر کے تمھاری طرف آئیں؟"

خالدؓ نے جواب دیا:

"تمھیں ہماری طرف آجاؤ۔"

چنانچہ دشمن کا لشکر دریا عبور کر کے دوسری جانب اترنا شروع ہوا۔ اس دوران میں خالدؓ نے اپنے لشکر کی تنظیم اچھی طرح کر لی اور باقاعدہ صفیں قائم کر کے انھیں دشمن سے لڑنے کے لیے پوری طرح تیار کر دیا۔ جب لڑائی شروع ہونے کا وقت آیا تو رومی لشکر کے سپہ سالار نے فوج کو حکم دیا کہ تمام قبائل علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس گروہ نے زیادہ شان دار کارنامہ انجام دیا ہے۔ چنانچہ ساری فوج علیحدہ علیحدہ ہو گئی۔ لڑائی شروع ہوئی تو خالدؓ نے اپنے دستوں کو حکم دیا کہ وہ چاروں طرف سے دشمن کے لشکر کو گھیر لیں اور انھیں ایک جگہ جمع کر کے اس طرح پے درپے حملے کریں کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلامی دستوں نے رومی لشکر کو گھیر کر ایک جگہ جمع کر لیا اور ان پر پُرزور حملے شروع کر دیے۔ رومیوں اور اُن کے حلیفوں کا خیال تھا کہ وہ قبائل کو علیحدہ علیحدہ مسلمانوں کے مقابلے میں بھیج کر لڑائی کو زیادہ طول دے سکیں گے اور جب مسلمان تھک کر چُور ہو جائیں گے تو ان پر بھرپور حملہ کر کے انھیں مکمل طور پر شکست دے دیں گے لیکن ان کا خیال خام ثابت ہوا اور اُن کی تدبیر خود اُن پر اُلٹ پڑی۔ جب مسلمانوں نے انھیں ایک جگہ جمع کر کے ان پر حملے کرنے شروع کیے تو وہ اُن کی تاب نہ لا سکے اور بہت جلد شکست کھا کر میدانِ جنگ سے فرار ہونے لگے۔ لیکن مسلمان انھیں کہاں چھوڑنے والے تھے۔ انھوں نے اُن کا پیچھا کیا اور دور تک انھیں قتل کرتے چلے گئے۔

تمام مؤرخین اِس امر پر متفق ہیں کہ اِس معرکے میں عین میدانِ جنگ اور بعد ازاں تعاقب میں دشمن کے ایک لاکھ آدمی کام آئے۔

فتح کے بعد خالدؓ نے فراض میں دس روز قیام فرمایا اور ۲۵ ذی القعدہ ۱۲ھ کو انھوں نے اپنی فوج کو واپس حیرہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

خالدؓ کا خفیہ حج

خالدؓ یمامہ میں مرتدین کی سرکوبی کر چکے تھے۔ عراق ان کے ذریعے سے فتح ہو چکا تھا۔ ان کے ہاتھوں کسریٰ کے اقتدار کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ فراض کی فتح سے سلطنت روم میں پیش دستی کرنے کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اللہ کی عنایت تھی ورنہ خالدؓ کی کیا حیثیت تھی کہ وہ یہ عظیم الشان فتوحات حاصل کرتے اور ایرانی سلطنت ان کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتی۔ جب وہ اللہ کے ان افضال و انعامات پر غور کرتے تو ان کا دل تشکر و امتنان کے جذبات سے معمور ہو جاتا تشکر و امتنان کے یہی جذبات تھے جنھوں نے جنگ فراض سے فارغ ہونے کے بعد انھیں حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے پر آمادہ کیا۔ جنگ کے بعد فراض کے دس روزہ قیام نے جذبات کی اس آگ کو اس حد تک بھڑکا دیا کہ اب کوئی طاقت انھیں حج پر جانے سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی غیر حاضری عراق میں مسلمانوں کے لیے سخت خطرات پیدا کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ اُن کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایرانی اس علاقے میں دوبارہ فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکا سکتے تھے۔ پھر بھی حج بیت اللہ کے مقابلے میں انھوں نے ان تمام خطرات کو نظر انداز کر دیا۔

اگر دشمن کو خالدؓ کی غیر حاضری کا علم ہو جاتا تو وہ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کا یہ زریں موقع کسی طرح ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اس خطرے سے بچنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ وہ اس طور پر حج کرتے کہ سوا خاص سرداروں کے اسلامی فوج کے کسی بھی فرد کو یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ ان کا سپہ سالار لشکر سے غیر حاضر ہے۔ خالدؓ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ حج کے لیے پہلے خلیفہ سے اجازت طلب کرتے لیکن اس صورت میں یہ خدشہ تھا کہ اگر خلیفہ کی طرف سے اجازت مل جاتی تو سارے لشکر میں چرچا ہو جاتا کہ خالدؓ حج کو جا رہے ہیں اور جونہی وہ روانہ ہوتے پیچھے سے ایرانی فوجیں مسلمانوں پر حملہ کر دیتیں۔ اس صورت میں اس حج کا کیا فائدہ ہوتا جو مسلمانوں کی تباہی کا موجب بنتا۔ اور اگر خلیفہ کی طرف سے اجازت نہ ملتی تو ان کے پاس اس آتش شوق کو سرد کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ جو حج بیت اللہ کے لیے ان کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس لیے آپ نے یہی مناسب

سمجھا کہ انتہائی خفیہ طور پر حج کیا جائے کہ نہ حضرت ابوبکرؓ کو اس کا پتا چلے اور نہ ان کے لشکر کے کسی فرد کو۔ انھیں یقین تھا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ نے اس فعل پر باز پرس کی تو وہ عذر معذرت کر کے انھیں راضی کر لیں گے۔ دوسری طرف اللہ بھی انھیں اس حج کے ثواب سے محروم نہ کرے گا۔

انھوں نے لشکر کو تو حیرہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا اور اپنے متعلق یہ ظاہر کر کے کہ وہ 'ساقہ' کے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں خفیہ طور پر حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ چند لوگ اور بھی تھے۔ وہ شہروں اور بستیوں سے دور دور سیدھے مکہ کی سمت روانہ ہوئے۔ یہ راستہ بہت عجیب و غریب اور سخت دشوار گزار تھا۔ کوئی رہبر نہ تھا لیکن جوانی کے ایام میں چونکہ انھیں تجارت کے لیے ملک در ملک پھرنا پڑا تھا اور سپہ سالار کی حیثیت سے پورا صحرا چھان مارا تھا اس لیے وہ اس علاقے کی تمام وادیوں، ٹیلوں، راستوں، میدانوں غرض چپے چپے سے واقف تھے اور انھیں راستے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ حج سے پہلے ہی وہ مکہ معظمہ پہنچ گئے اور حج کے فرائض پوری طرح ادا کر کے واپس آ گئے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ قیام مکہ کے دوران میں کسی بھی شخص کو ان کی وہاں موجودگی کا علم نہ ہوا حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ کو بھی پتا نہ چلا جو بعض روایات کے مطابق اس سال حج پر مکہ میں موجود تھے۔

واپسی پر بھی انھوں نے وہی دہشت ناک اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا جو حج کے لیے جاتے ہوئے اختیار کیا تھا۔ ابھی لشکر کا آخری حصہ حیرہ پہنچا بھی نہ تھا کہ وہ 'ساقہ' سے آملے اور اس کے ہمراہ شہر میں داخل ہوئے۔ اس طرح ان کے لشکر کے کسی بھی فرد اور عراق کے کسی بھی شخص کو یہ علم نہ ہو سکا کہ وہ اس نازک وقت میں لشکر سے غیر حاضر تھے اور حج کے لیے مکہ چلے گئے تھے۔

حیرہ میں قیام کے بقیہ دن انھوں نے بڑے اطمینان سے گزارے۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے انھیں حج بیت اللہ کی توفیق مرحمت فرما دی تھی، دوسری طرف یہ اطمینان تھا کہ عراق میں ان کی فتوحات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔ اب ان کا خیال سلطنتِ ایران کے دارالحکومت مدائن کی طرف کوچ کرنے کا تھا لیکن اللہ کو یہ منظور تھا کہ جنگ فراض میں کامیابی حاصل کر کے خالدؓ نے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا اسے پایۂ تکمیل کو پہنچائیں اور رومی سلطنت میں بھی اسی طرح فتوحات حاصل کریں جس طرح

ایرانی سلطنت میں کر چکے تھے۔[1]

بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ جس سال خالدؓ حج پر روانہ ہوئے اس سال امیرالحج حضرت عمرؓ تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایامِ خلافت میں کبھی حج نہیں کیا۔ لیکن مؤرخین اس روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اس سال حج کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ خود مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ بہرحال دونوں روایتوں میں سے خواہ کوئی سی بھی روایت صحیح ہو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے سپہ سالارِ اعظم کے حج پر جانے کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک وہ واپس حیرہ نہ پہنچ گئے۔

---

[1] عراقی فتوحات کے ذیل میں حیرہ کی فتح تک تو مورخین میں اتفاق ہے۔ بعض تفاصیل میں کچھ اختلاف ہو تو ہو لیکن واقعات کی ترتیب اور ان کے نتائج میں کوئی اختلاف نہیں لیکن حیرہ کی فتح کے بعد پیش آنے والے واقعات میں اختلاف ہے۔ ہم نے اس باب میں انبار، عین التمر اور فراض کی جنگوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس پر طبری، ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون تو متفق ہیں لیکن بلاذری، ازدی اور واقدی نہیں۔ یہ مورخین جنگِ فراض کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے۔ انبار اور عین التمر کی جنگوں کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت پیش آئیں جب حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو شام کی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔

(۱۳)

شام پر حملے کے اسباب

رومیوں کو تشویش

سرزمین عراق میں خالدؓ بن ولید نے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے اور جس طرح ہر میدان میں ایرانی افواج قاہرہ کو شکست دی اس کا ذکر ہمسایہ ملکوں کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ان خبروں پر سب سے زیادہ تشویش مشرقی رومی سلطنت کے فرماں رواؤں کو ہو رہی تھی کیونکہ ان کے حالات بھی ایرانی سلطنت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے جس طرح عراقی سرحد پر لخم، بنو تغلب، ایاد اور نمر وغیرہ عربی النسل قبائل آباد تھے۔ اسی طرح شام کی سرحد پر بنو بکر، بنو عذرہ، بنو عدوان، بنو بحرؔ اور غسانی قبائل مقیم تھے۔ رومی سلطنت کا خیال تھا کہ جس طرح مسلمانوں نے عراق پر پے در پے حملے کر کے اسے اپنی عمل داری میں شامل کر لیا ہے اسی طرح وہ شام پر حملے کر کے اسے بھی قبضے میں لانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس خیال کے تحت انھوں نے پوری توجہ شام کی اس سرحد کو مضبوط کرنے پر مبذول کی جو عرب سے ملتی تھی تاکہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو ابتدا ہی میں روک کر انھیں رومی سلطنت پر حملہ کرنے سے باز رکھا جا سکے۔

اس سلسلے میں تعجب خیز امر یہ ہے کہ رسول اللہ کے عہد میں مسلمانوں نے رومیوں کے ڈر سے شام کی ملحقہ سرحدات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ایسا نہ ہو وہ عرب سے جلا وطن کیے ہوئے یہود و نصاریٰ کی انگیخت سے عرب پر حملہ کر دیں۔ مگر چند ہی سال میں حالات اتنے تبدیل ہو گئے کہ جن رومیوں سے ڈر کر مسلمانوں نے اپنی سرحدات مضبوط کرنے کی طرف توجہ کی تھی اب انھیں رومیوں نے مسلمانوں سے ڈر کر اپنی جنوبی سرحدوں کی حفاظت اور انھیں مستحکم کرنے کے کام کو باقی تمام کاموں پر فوقیت دینی شروع کر دی۔

ابوبکرؓ بھی ہرقل شام و روم کے ان جذبات و خیالات سے پوری طرح آگاہ تھے جنھوں نے اسے سخت سراسیمہ کر رکھا تھا۔ لیکن جب تک مرتدین سے جنگیں ختم نہ ہو جاتیں وہ شام پر توجہ مبذول نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگر مرتدین کی پوری طرح سرکوبی سے پہلے ہی اسلامی فوجوں کو شامی سرحدات کی طرف روانہ کر دیا جاتا تو خدشہ تھا کہ مبادا مرتد قبائل، جنھیں رفتہ رفتہ مطیع کیا جا رہا تھا، اسلامی فوجوں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ وسیع پیمانے پر بغاوت کر دیں۔ بعد میں جب مثنیٰ بن حارثہ کی ان تھک کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو عراق میں کامیابی نصیب ہونے لگی اور خالدؓ نے ایرانی سلطنت میں گھس کر مجمیوں کے دارالحکومت حیرہ پر اسلامی پرچم لہرا دیا تو ابوبکرؓ کو شام کا بھی خیال آیا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عراق کی طرح شام کی سرحد پر بھی عرب قبائل آباد تھے اور جس طرح عراق کے بعض عرب قبائل نے عیسائیت پر قائم رہنے کے باوجود مسلمانوں سے مل کر کسریٰ کی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اسی طرح شام کے عرب قبائل کے بارے میں بھی یہ امید کی جا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے کیونکہ رومیوں کی حیثیت حاکم کی تھی اور اہل شام کی محکوموں کی' اور حاکموں اور محکوموں کے درمیان نفرت و عداوت کے جو جذبات پنہاں ہوتے ہیں وہ ہر شخص کو معلوم ہیں۔ حاکم و محکوم کے تعلق کے علاوہ ایرانیوں اور عراق کی سرحد پر بسنے والے عرب قبائل کی طرح رومی اور شامی سرحد پر بسنے والے بادیہ نشین عرب قبائل کے درمیان جنس اور زبان کا بین اختلاف بھی موجود تھا۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو امید تھی کہ شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کر کے جب وہ رومی لشکروں پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو شامی عرب اپنے ہم وطن لوگوں سے آ کر مل جائیں گے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طاقت و قوت میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا اور وہ رومیوں پر مکمل فتح حاصل کر کے اس زرخیز اور آباد سرزمین پر قابض ہو سکیں گے۔

رومیوں پر حملہ کرنے میں ابوبکرؓ کو جو تردد تھا وہ دومۃ الجندل کی فتح عمل میں آنے اور مسلمانوں پر اس کے دروازے کھل جانے کے بعد ختم ہو گیا۔ پھر بھی چونکہ ابھی تک عراق میں جنگوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے رومیوں پر فوری حملہ مناسب نہ سمجھا گیا۔ ابوبکرؓ نے شامی سرحد پر مقیم مسلمان امرا کو واضح ہدایات دے دی تھیں کہ وہ اپنی طرف سے رومی سرحدات پر حملہ کرنے میں پہل نہ کریں اور

جب تک رومیوں کی طرف سے حملہ کرنے کی ابتدانہ ہو وہ مدافعت کا پہلو اختیار کیے رکھیں اور اپنے آپ کو رومی تصادم سے ہر ممکن طریقے پر بچائیں۔ ادھر چونکہ رومیوں کو مسلمانوں کی فتوحات کا سارا حال معلوم تھا۔ اس لیے وہ بھی شام کی سرحد عبور کر کے اسلامی فوجوں پر حملہ کرنے سے ہچکچاتے تھے اور اپنی سرحد ہی کے اندر ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس طرح فریقین کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ڈر اور خوف کے جذبات پائے جاتے تھے اور ہر فریق جنگ کی ابتدا کرنے سے پہلو تہی کر رہا تھا۔

رومیوں کے ڈر اور خوف کی بنیاد زیادہ تر اس پر تھی کہ ابوبکرؓ نے بیعت کے بعد شمالی عرب کے مرتدین کی سرکوبی اور سرحدوں کے استحکام کے لیے جو فوجیں روانہ کی تھیں انھیں اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہوئی تھی اور وہ کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر مظفر و منصور واپس آگئی تھیں۔ تمام قبائل نے بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اور سوا دومۃ الجندل کے باقی تمام علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ بسطینیوں اور شامی سرحد پر بسنے والے عربوں پر مشتمل جو فوجیں شام کے سرحدی مقامات پر موجود تھیں انھیں رومی کسی طرح بھی عربوں کے مقابلے کے لیے تیار نہ کر سکتے تھے کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ مبادا یہ لوگ مسلمانوں سے مل جائیں۔

شامی سرحد پر اسلامی فوجوں کے سردار خالدؓ بن سعید بن عاص تھے۔ ابوبکرؓ نے پہلے انھیں مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجنا چاہا تھا لیکن عمرؓ نے ان کے اس ارادے کی مخالفت کی اور اتنا اصرار کیا کہ آخر ابوبکرؓ نے انھیں مرتدین کے مقابلے میں بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کے بجائے تیما میں امدادی دستے کا امیر مقرر کر کے شام کی سرحد پر بھیج دیا۔ انھیں ہدایت تھی کہ جب تک خلیفہ کے واضح احکام ان تک نہ پہنچیں وہ نہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور نہ اس وقت تک دشمن سے جنگ کا آغاز کریں جب تک دشمن خود پہل کر کے ان کے مقابلے پر آجائے۔ البتہ وہ گرد و نواح میں بسنے والے قبائل کو ساتھ ملانے کی پوری کوشش کریں سوا ان قبائل کے جو ارتداد اختیار کر چکے تھے۔

فریقین کی جنگی تیاریاں

خالدؓ بن سعید نے ابوبکرؓ کے احکام پر پوری طرح عمل کیا جس کے نتیجے میں چند ہی دنوں کے اندر

ان کے جھنڈے کے نیچے ایک جرّار لشکر تیار ہوگیا۔ جب ہرقل کو اپنی سرحدوں پر اس عظیم الشان لشکر کے اجتماع کی خبر ملی تو اس نے بھی پورے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں خالدؓ بن سعید نے فوراً ابوبکرؓ کو خط لکھا جس میں ہرقل کی جنگی تیاریوں کا ذکر کر کے رومی سرحدوں پر چڑھائی کرنے کی اجازت طلب کی مبادا رومیوں کا لشکر اچانک مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائے اور انھیں شکست سے دوچار ہونا پڑے۔

ابوبکرؓ نے خالدؓ بن سعید کے خط پر خوب غور و فکر کیا۔ جنوبی عرب سے آنے والی خبریں بہت حوصلہ افزا تھیں۔ عکرمہ اور مہاجر نے اس علاقے کے مرتدین کا قلع قمع کر دیا تھا اور عکرمہؓ مہاجر کو یمن میں چھوڑ کر خود اپنی فوجوں کے ساتھ واپس آنے والے تھے۔ ان فوجوں کی واپسی پر شام میں مقیم اسلامی فوجوں کو کمک بھیجنا بہت آسان تھا لیکن سوال یہ تھا کہ آیا یہ فوجیں' جن کی تعداد بہرحال رومیوں کے جرار لشکروں سے بہت کم تھی' رومیوں کے مقابلے کے لیے کافی بھی ہوں گی بالخصوص اس حالت میں کہ رومیوں کے پاس سامانِ جنگ کی بھی کمی نہ تھی اور اس سے قبل ہرقل اپنی افواج کی کثرت اور سامانِ جنگ کی فراوانی کی بدولت ایرانیوں کی عظیم الشان فوجوں کو شکست دے چکا تھا۔ اس مشکل صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کا یہی طریقہ تھا کہ جنوبی عرب کے ان قبائل کو' جو بدستور اسلام پر قائم تھے' ساتھ ملایا جائے اور دوسری اسلامی فوجوں کے ساتھ انھیں بھی شام روانہ کر دیا جائے۔ اس طرح امید ہو سکتی تھی کہ اسلامی فوجیں رومیوں کے سامنے ٹھہر سکیں۔

ابوبکرؓ نے انتہائی غور و فکر کے بعد عمرؓ' عثمانؓ' علیؓ' طلحہؓ' زبیرؓ' عبدالرحمٰنؓ بن عوف' سعدؓ بن ابی وقاص' ابوعبیدہؓ بن جراح' معاذؓ بن جبل' ابیؓ بن کعب' زیدؓ بن ثابت اور دوسرے بڑے بڑے مہاجرین وانصار کو طلب فرمایا اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا۔ ابوبکرؓ نے فرمایا:

"رسول اللہؐ کی خواہش تھی کہ اہل عرب کو شامیوں کے متوقع حملوں سے ہر طرح محفوظ رکھا جائے۔ اس غرض سے آپ نے جو تدابیر اختیار کیں انھیں پوری طرح لباسِ عمل پہنانے نہ پائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ اب آپ لوگوں نے سن لیا ہے کہ ہرقل ہمارے مقابلے کی غرض سے کثیر تعداد میں فوجیں جمع کر رہا ہے۔

میرے خیال میں ہمیں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طاقت وجرأت سے کام لینا چاہیے اور رومیوں سے نبرد آزمائی کے واسطے زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوجیں شام روانہ کرنی چاہئیں۔ جو شخص مارا گیا اسے شہادت کا رتبہ نصیب ہوگا اور جو زندہ رہا وہ مجاہدین کے زمرے میں شامل ہوگا۔ اور اللہ کے ہاں اُس کے لیے جو اجر لکھا جائے گا اس کا کوئی حساب و شمار ہی نہیں۔ اب آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

سب سے پہلے عمرؓ اٹھے اور کہنے لگے:

"واللہ! ہم نے جس نیک کام میں بھی سبقت کرنے کی کوشش کی، اس میں آپ کو سب سے آگے پایا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔ اللہ کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم شام کو فتح کر لیں۔ آپ یقیناً زیادہ سے زیادہ آدمی شام روانہ کیجیے۔ اللہ اپنے دین کا مددگار ہے۔ وہ یقیناً اسلام کو شان و شوکت بخشے گا اور اس کی ترقی کے لیے جو وعدے اس نے اپنے رسولؐ سے کیے تھے انھیں ضرور پورا فرمائے گا۔"

عبدالرحمٰن بن عوف میں احتیاط کا مادہ زیادہ تھا۔ عمرؓ کے بعد وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

"اے خلیفۂ رسول اللہ! اس معاملے پر اچھی طرح غور و فکر کیجیے۔ رومی ہم سے بہت زیادہ طاقت ور ہیں۔ یک دم افواج بھیج کر انھیں غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کر دینا قرینِ دانش مندی نہ ہوگا۔ میرے خیال میں رومیوں پر پوری قوت سے حملہ کرنے کی نسبت بہتر یہ ہوگا کہ ابتدا میں چند دستے بھیجے جائیں جو سرحد پر چھاپے مار کر اور رومیوں کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا کر واپس چلے آئیں۔ ان کے بعد چند دستے اور بھیجیں جو پہلے کی طرح سرحدوں پر چھاپے مار کر سرحدی قبائل کو خوف زدہ کر کے واپس آجائیں۔ اسی طرح کچھ کچھ وقفے کے بعد دستے بھیجے جائیں اور کچھ عرصے بعد انھیں واپس بلا لیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا

کہ ایک طرف تو اہلِ شام ہمارے مسلسل حملوں سے خوف زدہ ہو جائیں گے دوسری طرف جب عرب دیکھیں گے کہ ہمارے دستے ہر بار رومیوں کو زک پہنچا کر اور مالِ غنیمت لے کر واپس آتے ہیں تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ان میں رومیوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ بہت آسانی سے اہلِ یمن اور ربیعہ و مضر کو اکٹھا کر کے انھیں رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کی مرضی ہوگی کہ آپ انھیں ساتھ لے کر خود جہاد پر روانہ ہو جائیں یا اپنی جگہ دوسرے سردار مقرر کر کے بھجوا دیں۔"

مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ابوبکرؓ حاضرین کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"بتائیے اب آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

اس پر عثمانؓ بن عفان کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

"آپ مسلمانوں کے دلی خیر خواہ اور حامیِ دین ہیں۔ اگر آپ نے ان کی بھلائی کے لیے کوئی قطعی رائے قائم کر لی ہے تو نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آپ اسے نافذ کرنے کا حکم فرمائیں۔ کوئی شخص آپ کی مخالفت نہ کرے گا۔"

اس موقع پر دیگر حاضرینِ مجلس نے بھی عثمانؓ سے پوری طرح اتفاق کیا اور ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

"آپ کی جو بھی رائے ہو اسی پر عمل کیجیے۔ ہم دل و جان سے آپ کی اطاعت کریں گے اور جو حکم آپ ہمیں دیں گے اسے بسر و چشم قبول کریں گے۔"

یہ سن کر ابوبکرؓ اٹھے اور لوگوں کو شام پر لشکر کشی کے لیے تیار ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"میں تم پر چند امیر مقرر کرتا ہوں۔ تم اپنے رب کی اطاعت کرو اور اپنے امرا کی مخالفت نہ کرو۔ تمھاری نیتیں اور سیرتیں پاک و صاف ہونی چاہئیں کیونکہ اللہ انھیں لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔"

لیکن لوگوں پر رومیوں کی اتنی ہیبت طاری تھی کہ خلیفہ کے احکام سن کر تھوڑی دیر کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ آخر عمرؓ نے اِس خاموشی کو توڑا اور گرج کر کہنے لگے:

"اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خلیفہ کی باتوں کا جواب نہیں دیتے حالانکہ اس کے پیشِ نظر صرف تمھاری بھلائی ہے۔"

عمرؓ کی اس سرزنش نے حاضرین کے دلوں پر فوری اثر کیا اور وہ شام روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے[1]۔

ابوبکرؓ کی مصروفیات اور ذمہ داریاں

شام پر چڑھائی کے معاملے میں ابوبکرؓ کو اس درجہ انہماک تھا کہ دوسرے تمام معاملات ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ جریر بن عبداللہ خالدؓ بن سعید کی فوج میں شامل تھے۔ وہ ان سے اجازت لے کر شام سے مدینہ آئے اور ابوبکرؓ کی خدمت میں بعض مطالبات پیش کیے۔ ابوبکرؓ کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے فرمایا:

"تمھیں معلوم ہے کہ مسلمان اس وقت ایران اور روم، دو شیروں کے مقابلے میں نبرد آزما ہیں لیکن تمھیں اس وقت اپنے مطالبات کی پڑی ہے۔ تم فوراً عراق پہنچ کر خالدؓ بن ولید کی فوج میں شامل ہو جاؤ اور اپنے مطالبات کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔"

ابوبکرؓ کا یہ جواب سننے کے بعد جریر حیرہ چلے گئے جہاں اس وقت خالدؓ بن ولید مقیم تھے۔

ابوبکرؓ کو ابتدائے خلافت ہی سے اہم جنگی مسائل سے واسطہ پڑ چکا تھا جن میں روزبروز

---

[1] ازدی لکھتے ہیں کہ خالد بن سعید اس مجلس میں موجود تھے اور انہی نے سب سے پہلے جہاد پر جانے کی حامی بھری تھی لیکن طبری، ابن خلدون اور ابن اثیر نے اپنی کتابوں میں وہی روایت درج کی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ہم بھی طبری ہی کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ خالدؓ اس زمانے میں تیما میں مقیم تھے اور اس اجتماع میں حاضر نہ تھے۔

اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس لیے ان کا زیادہ تر وقت انھیں مسائل کو حل کرنے اور انھیں گتھیوں کو سلجھانے میں گزر جاتا تھا۔ کبھی عراق میں پھیلی ہوئی فوجوں کی فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ انھیں مدد کی ضرورت تو نہیں کبھی جنگوں میں گئے ہوئے لوگوں کے اہل و عیال کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی کہ ان کی ضروریات بہت اچھی طرح پوری ہو رہی ہیں اور انھیں تکالیف کا سامنا تو نہیں کرنا پڑ رہا کبھی شمالی اور جنوبی عرب کے قبائل کا خیال آتا تھا کہ حکومت سے ان کی وفاداری اور دارالخلافے سے ان کے بظاہر مخلصانہ تعلقات مشکوک تو نہیں۔ کبھی میدان جنگ سے فتوحات کی دل خوش کن خبریں آکر مسرت و بہجت کی لہریں قلب کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی تھیں اور کبھی بعض سرداروں کی لپست ہمتی کی اطلاعات موصول ہو کر دل و دماغ پر تفکرات کے پردے ڈال دیتی تھیں۔ ہر خبر کے متعلق سوچنا پڑتا تھا کہ اسے لوگوں سے بیان کیا جائے یا نہ اور اگر بیان کیا جائے تو کس طریقے سے۔ غرض ان کے شب و روز انھیں تفکرات میں گزرتے تھے اور وہ ناخن تدبیر کے ذریعے سے پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف رہتے تھے۔ اگرچہ ان کے مشیر کار بہت تجربہ کار، مخلص اور تمام معاملات پر گہری نظر رکھنے والے تھے، انھیں ان پر بے حد اعتماد بھی تھا اور اکثر اہم امور کے بارے میں وہ ان سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے پھر بھی وہ ان کے مشوروں کے پابند نہ تھے بلکہ تمام معاملات میں آخری فیصلہ خود ہی کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ عامۃ المسلمین کے سامنے جواب دہ صرف خلیفہ کی ذات ہے اس لیے ہر معاملے کی ذمہ داری بھی اسی کو اٹھانی چاہیے اور یہ بوجھ کسی اور فرد یا جماعت کے سر نہ ڈالنا چاہیے۔

ابوبکرؓ کو اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ جب سے مرتدین کی جنگوں نے شدت اختیار کی تھی انھوں نے مدینہ سے باہر نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ ان کے شب و روز دارالخلافے ہی میں گزرتے تھے اور ہر وقت وہ انھیں افکار میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے کہ پیش آمدہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں، فوجوں کو کس طرح کمک پہنچائی جائے، فلاں علاقے کی بغاوت کس شخص کے ذریعے سے فرو کی جائے، مفتوحین سے کیا سلوک کیا جائے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام و انصرام کس طرح عمل میں لایا جائے!

مرتدین کی سرکوبی سے فراغت کے بعد جب اسلامی فوجوں نے ایران و روم کی عظیم الشان مہ

باجبروت سلطنتوں کی طرف توجہ منعطف کی اور عراق و شام کے میدانوں میں معرکے سر ہونے لگے تو ابوبکرؓ کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں انھیں اِس درجہ انہماک تھا کہ مملکت کے علاوہ دیگر تمام امور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے حتیٰ کہ انھوں نے اپنے آپ کو بھی فراموش کر کے اپنے آرام و آسائش اور صحت تک کو اِس راہ میں قربان کر دیا۔

ابوبکرؓ کی اختیار کردہ سیاست کامیابی اور ظفرمندی کی ضامن تھی۔ ان کا عہد جہاں عدل و انصاف اور رعایا پر رحمت و شفقت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا وہاں اس اولوالعزمی کا بھی جواب نہیں جس کا نمونہ انھوں نے اپنے مختصر سے عہدِ خلافت میں پیش کیا۔ انھوں نے انتہائی شجاعت سے سارے عرب کو اِسلامی حکومت کا مطیع و فرماں بردار بنا دیا لیکن قبائل کو ان کے جائز حقوق دینے سے کبھی پہلوتہی نہ کی بلکہ جو آزادی رسولؐ اللہ نے انھیں مرحمت فرما رکھی تھی اسی آزادی سے انھوں نے بھی انھیں بہرہ در کیے رکھا اور سوا زکوٰۃ کے، جو وہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے، اُن سے اور کسی چیز کی ادائگی کا مطالبہ نہ کیا۔ اس زکوٰۃ کا بھی بیشتر حصہ انھیں قبائل کے فقرا و مساکین پر خرچ ہو جاتا تھا۔

سلطنت کو خراج اور مالِ غنیمت کے ذریعے سے جو آمدنی ہوتی تھی ابوبکرؓ اس میں سے ایک درہم بھی اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام سمجھتے تھے۔ وہ سلطنت کے خزانے سے صرف اتنی رقم لیتے تھے جتنی مسلمانوں نے ان کے لیے گزارے کے طور پر مقرر کر رکھی تھی۔ آمدنی کا بیشتر حصہ جنگوں کی تیاری میں خرچ ہوتا تھا اور بقیہ فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ابتدائی عہدِ خلافت میں بیت المال سنح میں تھا جہاں ابوبکرؓ قیام پذیر تھے لیکن بعد میں جب کام کی زیادتی کے باعث انھیں اپنا قیام مدینہ میں منتقل کرنا پڑا تو بیت المال کو بھی اپنے ساتھ مدینہ لے آئے۔ جب ایران سے بھاری مقدار میں مالِ غنیمت آنا شروع ہوا تو ان سے عرض کیا گیا کہ بیت المال کی نگرانی اور حفاظت کے لیے کسی شخص کو مقرر کر دیں لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ جتنا مال اُن کے پاس آتا تھا وہ اسے اسی وقت لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور بیت المال میں اتنا بچتا نہ تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے نگران کی ضرورت پڑتی۔ ایک مرتبہ ان کے عہدِ خلافت میں مدینہ کے قریب قبیلہ بنو سلیم

میں سونے کی ایک کان دریافت ہوئی سونا بڑی قیمتی دھات ہے لیکن انھوں نے حسب معمول کان سے حاصل ہونے والا سونا بھی مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور کچھ بچا کر نہ رکھا۔

تقسیم اموال میں وہ مساوات کا اصول ملحوظ رکھتے تھے اور ابتدائی دور کے مسلمانوں اور بعد میں اسلام قبول کرنے والوں، آزاد لوگوں اور غلاموں، مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھتے تھے بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ وہ لوگوں کے وظائف اُن کے مرتبے کے مطابق کیوں مقرر نہیں کرتے لیکن انھوں نے یہ جواب دے کر انھیں خاموش کر دیا کہ جو لوگ ابتدا میں اسلام لائے وہ اپنا اجر آخرت میں اللہ سے پائیں گے دنیا میں انھیں وہی کچھ ملے گا جو دوسرے مسلمانوں کو ملتا ہے۔

عدل و انصاف اور مساوات کے اِس سلوک نے تمام لوگوں کو ابوبکرؓ کا گرویدہ کر دیا تھا اور ہر شخص کے دل میں ان کی تعظیم و تکریم کے جذبات پنہاں تھے۔

عمرؓ بن خطاب دلی رفیق اور سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیر تھے عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ وغیرہم کا بھی اپنی اپنی جگہ اُن سے خصوصی تعلق تھا۔ ان لوگوں سے مشورہ لیے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتے تھے لیکن اِس قدر احتیاط کے باوجود ان کے مشوروں کو قبول کرنا ان کے لیے لازم نہ تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر مشورے کے بہانے وہ کسی کام کی ذمہ داری دوسروں پر نہ ڈالتے تھے بلکہ ہر قسم کی ذمہ داری خود اٹھاتے تھے۔ اس کی متعدد مثالیں ان کے عہد میں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ جب اسامہ کے لشکر کو روانہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا تو ان کے تمام مشیروں کی رائے تھی کہ یہ وقت اِس کام کے لیے موزوں نہیں کیونکہ مدینہ کے چاروں طرف مرتدین کا زور ہے اور اسامہ کے لشکر کی روانگی کے باعث مدینہ میں لڑنے والوں کی تعداد بے حد کم رہ جائے گی لیکن ابوبکرؓ نے تمام لوگوں کے مشوروں کو رد کرتے ہوئے اسامہ کو روانہ ہونے کا حکم دیا اور مرتدین سے اِس طرح مقابلہ کیا کہ ان کے تمام مشیروں کو ان کی فراست، عقل مندی اور کمال دور اندیشی کا اعتراف کرنا پڑا۔ بعدازاں جب مالک بن نویرہ کا واقعہ پیش آیا تو عمرؓ نے پورا زور لگایا کہ ابوبکرؓ خالدؓ بن ولید کو معزول کر دیں اور ایک مسلمان کو قتل کرنے کے جرم میں انھیں سزا دیں لیکن ابوبکرؓ نے ہر بار ان کی درخواست کو رد کر دیا اور بعد میں دنیا نے دیکھ لیا کہ ابوبکرؓ کی رائے کتنی صائب اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔

کام کا بوجھ اُن پر جتنا پڑتا جاتا تھا ان کی طبیعت میں اتنا ہی انکسار، فروتنی اور سادگی آتی جاتی

تھی۔ جب تک آپ سنح میں رہے آرام کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ عموماً وہ صبح کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سنح سے مدینہ آیا کرتے تھے اور نماز پڑھا کر امورِ سلطنت میں مصروف ہو جاتے تھے لیکن کبھی کبھی آرام بھی کرتے تھے اور ان کی جگہ عمرؓ نماز پڑھاتے تھے۔ جمعے کے روز وہ دوپہر تک گھر ہی میں رہتے تھے اور سر اور داڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ اس کے بعد مدینہ آ کر جمعے کی نماز پڑھاتے تھے لیکن کام بڑھ جانے کے باعث جب انھیں سنح کا قیام ترک کر کے مدینہ میں رہنا پڑا تو انھوں نے آرام کا سارا وقت مسلمانوں کی خاطر قربان کر دیا اور لمحہ لمحہ سلطنت کے امور کی دیکھ بھال میں صرف کرنے لگے لیکن کام کی انتہائی کثرت کے باوجود انھوں نے اپنے لیے کبھی کوئی خادم مقرر نہ کیا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ مسجد میں تشریف فرما رہتے اور لوگوں کی شکایات سنتے۔ جہاد کے متعلق مختلف ہدایات بھیجتے اور لوگوں کو مشورے دیتے رہتے تھے۔ جب ضروری ہوتا تھا تو ان سے مشورے لیتے بھی تھے۔ سلطنت کے تمام چھوٹے بڑے معاملات مسجد ہی میں اُن کے سامنے پیش کیے جاتے تھے اور وہیں بیٹھے بیٹھے وہ ان کے متعلق احکام صادر فرما دیتے تھے۔

غریبوں اور مسکینوں پر بے حد مہربان تھے۔ سردیوں میں کمبل خریدتے اور انھیں محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر فقرا اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ عمرؓ بن خطاب ذکر کرتے ہیں کہ مدینہ میں ایک بوڑھی اندھی عورت رہتی تھی۔ میں روزانہ علی الصباح اس کی خبرگیری کے لیے جایا کرتا تھا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب وہاں جا کر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص پہلے ہی سے آ کر اس بڑھیا کا سارا کام کاج کر گیا ہے۔ آخر ایک روز میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس شخص کا پتا لگا کر ہی رہوں گا۔ ابھی رات باقی تھی کہ میں بڑھیا کی جھونپڑی کے قریب چھپ کر بیٹھ رہا اور اس شخص کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ابوبکرؓ چلے آ رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی میں نے دل میں کہا "ابوبکرؓ! یقیناً یہ کام تمھارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔" چنانچہ انھوں نے آ کر اس اندھی عورت کا کام کاج کیا اور واپس چلے گئے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ابوبکرؓ کی ذات ان کے تمام عمال کے لیے نمونہ تھی۔ عرب کی آتش فشاں سرزمین میں جہاں ہر طرف بغاوت اور ارتداد کے شعلے بھڑک رہے تھے، مایوس دلوں کے لیے ان کی ذات اس مشعل کی مانند تھی جو اندھیری رات اور تنگ و تاریک مکان میں ضیا افروز ہو اور

تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر رہی ہو۔ سارا عرب اُن کے عدل و انصاف، رحمت و شفقت، حکمت اور حسنِ سیاست سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا اور یہی خصوصیات ان کی کامیابی کا اصل باعث تھیں۔

جہاد اور غنیمت

ابوبکرؓ کو کامل یقین تھا کہ اللہ انھیں ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائے گا۔ اللہ نے اپنے رسول سے دین کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ خواہ زمین و آسمان ٹل جاتے لیکن خدائی باتوں کا ٹلنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اس کے وعدے پورے ہوئے۔ مرتدین کی جنگوں میں مسلمانوں کو شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ عراق کے میدان ہائے جنگ میں فتح و نصرت ان کے قدم چوم رہی تھی اور مسلمان ہر دم تائیدِ ایزدی سے بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ کوئی جنگ ایسی نہ ہوتی تھی جس میں کثیر مالِ غنیمت ہاتھ نہ آتا ہو۔ دربارِ خلافت میں مالِ غنیمت کا صرف پانچواں حصہ جاتا تھا باقی میدانِ جنگ ہی میں لشکر کے درمیان تقسیم ہو جاتا تھا اور ہر سپاہی کے حصے میں ہزاروں درہم آتے تھے جنگوں میں پیچھے رہنے والے لوگ جب یہ دیکھتے تھے تو ان کے دلوں میں بھی لڑائیوں میں شرکت کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا اور جونہی حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے جہاد میں شمولیت کا اعلان ہوتا فوراً ہی قبائلِ عرب دیوانہ وار آگے بڑھ کر ان کی دعوت پر لبیک کہتے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف مالِ غنیمت کا لالچ عربوں کو کشاں کشاں میدان ہائے کارزار کی طرف لے جاتا تھا بلکہ جنگوں میں شامل ہونے کا بڑا سبب وہ جذبۂ شہادت تھا جو ہر مسلمان کے دل میں موجزن رہتا تھا۔ کون شخص اس بات سے بے خبر تھا کہ مجاہدین اور ان کے دشمن کی قوت و طاقت اور تعداد میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ دشمن ہمیشہ بہترین جنگی تیاریوں اور جرار لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل میدانِ جنگ میں آیا اور اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے میں کبھی کسی قسم کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان حالات میں شریکِ جنگ ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن نڈر اور بے خوف مجاہدین نے اللہ کے راستے میں کسی بھی خطرے کی پروانہ کی اور ہمیشہ دشمن کی صفوں میں درانہ گھستے چلے گئے۔ حصولِ شہادت کا یہی جذبہ دیکھ کر خالدؓ بن ولید ایرانی سرداروں کو یہ پیغام بھجوایا کرتے تھے کہ میں تمھارے پاس ایک ایسی قوم کو لا رہا ہوں جو موت کی اتنی ہی

عاشق ہے جتنے تم زندگی کے۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ جو قوم موت سے بے خوف ہوتی ہے اقوامِ عالم میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اپنی خواہشات اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں، قوموں کی سرداری کا تاج انھیں کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے لیے موت پسند کی جس پر انھیں ہمیشہ کے لیے زندگی عطا کی گئی۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف اور مصائب برداشت کیے۔ اس لیے انھیں دونوں جہان کی عزّت سے سرفراز کیا گیا۔

پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مالِ غنیمت کا شوق بھی کسی حد تک انھیں میدانِ جنگ میں لے جانے کا باعث بنا۔ عرب قبائل کی فطرت میں یہ بات داخل تھی کہ وہ غنیمت کو دیکھ کر کسی طرح صبر نہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ اسلام نے آکر اس نفسانی جذبے کو بڑی حد تک مٹا دیا تھا اور غنیمت کے لالچ میں دشمن سے جنگ کرنے کی بجائے اللہ کے دین کی خاطر جہاد میں شرکت کرنے کی تمنا ان کے دلوں میں پیدا کر دی تھی لیکن قدرتی جذبے کو یکسر مٹانا آسان نہ تھا۔ کسی نہ کسی حد تک یہ جذبہ ان کے دلوں میں موجود تھا۔ چنانچہ خود خالدؓ بن ولید نے الیس کی جنگ کے اختتام پر کہا تھا کہ عراق میں مال و دولت کی فراوانی اور مالِ غنیمت کی کثرت، جو عربوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی، آتشِ جنگ بھڑکا دینے کے لیے یقیناً کافی تھی۔

مرتد قبائل جنھیں ارتداد کی سزا میں عراق کی جنگوں میں شرکت سے بہ زور منع کر دیا گیا تھا، اپنے بھائیوں کے گھروں میں دولت کی ریل پیل دیکھ کر اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو لوگ اسلام پر ثابت قدم رہے تھے وہ نہ صرف کامیابی و کامرانی سے ہم کنار بلکہ مال و دولت سے بھی بہرہ ور ہو رہے تھے مگر مرتدین کے حصّے میں حسرت و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

روانگیٔ شام

بایں ہمہ جب ابوبکرؓ نے لوگوں کو شام جانے کی دعوت دی تو ابتدا میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت اور اس کی زبردست جنگی طاقت دیکھ کر مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں جانے کی جرأت نہ ہوتی لیکن ابوبکرؓ جانتے تھے کہ رومیوں کی ہیبت کا یہ اثر عارضی ہے اور جونہی انھیں حالات کی نزاکت کا احساس

ہو گا وہ جوق در جوق جہاد پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لوگوں نے یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو شام جانے کیلئے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اہلِ مدینہ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ابوبکرؓ نے اہلِ یمن کو بھی اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہا اور انھیں یہ خط لکھا:

"اللہ نے مومنوں پر جہاد فرض کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تنگی ہو خواہ فراخیٔ سامان جنگ کی کمی ہو یا افراط انھیں ہر حال میں دشمنوں سے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہئے، چنانچہ وہ فرماتا ہے: وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللّٰہ (اے مومنو! اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعے سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو) جہاد ایک لازم فریضہ ہے اور اس کا ثواب بھی اس قدر عظیم ہے جس کا اندازہ ناممکن ہے۔ تمھارے ان بھائیوں کو جو میرے سامنے موجود تھے میں نے جہاد کے لیے شام جانے پر آمادہ کیا، چنانچہ وہ میری آواز پر لبیک کہ کر خلوص نیت سے شام روانہ ہو رہے ہیں۔ اے اللہ کے بندو! اب تمھاری باری ہے۔ تم بھی میری آواز پر لبیک کہو اور جو فریضہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر عاید کیا گیا ہے اس کی بجاآوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔"

اہلِ یمن پر اس خط کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ جونہی ابوبکرؓ کے قاصد نے اسے مجمع عام میں پڑھ کر سنایا ذوالکلاع حمیری اپنی قوم اور یمن کے بعض اور قبائل کو ہمراہ لے کر شام جانے کے ارادے سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ ذوالکلاع کی پیروی میں قبیلہ مذحج سے قیس بن ہبیرہ مرادی، ازد سے جندب بن عمرو الدوسی اور طے سے حابس بن سعد طائی نے اپنے اپنے ساتھیوں اور قبیلوں کے ہمراہ مدینہ کی راہ لی۔

اس دوران میں جب ابوبکرؓ کا قاصد یمن میں قبیلہ در قبیلہ جا کر ان کا پیام لوگوں تک پہنچانے میں مشغول تھا اور اہلِ یمن کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے، ابوبکر مہاجرین، انصار، اہلِ مکہ اور دوسرے نواحی قبائل کو اکٹھا کر کے شام بھیجنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

ابوبکرؓ نے ان لشکروں کو کس وقت بھیجنا شروع کیا؟ شام کی طرف کوچ کرنے والا سب سے

پہلا لشکر کون سا تھا؟ جو لشکر مدینہ آکر اکٹھے ہوئے تھے ان کے امیر کون تھے؟ ان امور کے متعلق مورخین میں خاصا اختلاف ہے۔

اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کی جانب سب سے پہلا لشکر ۱۲ھ کے اواخر میں ابوبکرؓ کے حج سے واپس آنے کے بعد روانہ ہوا تھا بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ ابوبکرؓ نے ۱۲ھ کے اوائل میں جب خالدؓ بن ولید کو عراق روانہ فرمایا تو انہی کے ساتھ خالدؓ بن سعید بن عاص کو شام جانے کا حکم دیا۔ لیکن ہمارے خیال میں اصل واقعات اس طرح ہیں کہ خالدؓ بن ولید نے ابتدا میں جب اہل یمن، کندہ اور حضرموت میں مرتدین سے جنگیں جاری تھیں عراق جا کر اسلامی افواج کی قیادت سنبھالی تھی۔ خالد بن سعید کو بھی اسی زمانے میں شام بھیجا گیا تھا لیکن ان کے بھیجنے کی اصل غرض محض سرحدوں کی حفاظت تھی نہ کہ رومیوں سے جنگ چھیڑنا۔ ابوبکرؓ کو شام پر چڑھائی کرنے کا خیال یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں میں مرتدین کے کامل استیصال، عراق میں حیرہ کی فتح اور شام کے سرحدی شہر دومۃ الجندل کی تسخیر کے بعد آیا۔

ہماری اس رائے کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ جب شام پر چڑھائی کرنے کا سوال پیدا ہوا تو ابوبکرؓ نے سب سے پہلے اہل یمن کو وہاں جانے کے لیے آمادہ کیا اور یہ اس وقت تک نہ ہو سکتا تھا جب تک وہاں سے فتنہ ارتداد کا بالکل قلع قمع نہ کر دیا جاتا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عکرمہ اور ذوالکلاع یمن میں امن و امان قائم کرنے کے بعد وہیں مقیم نہیں رہے بلکہ مہاجر کو ساتھ لے کر کندہ اور حضرموت میں فتنہ ارتداد کو فرو کرنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے جب جنوبی عرب میں کلیۃً امن قائم ہو گیا اور مدینہ کو عکرمہ کی واپسی کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے اس لشکر کو چھوڑ کر، جس کے ذریعے سے انھوں نے مرتدین کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا تھا، ایک اور لشکر کی قیادت سنبھال لی جسے بدیل نے مرتب کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یمن اور جنوبی عرب کی بغاوتوں کو دبانے، یمن سے مدینہ لوٹنے اور وہاں سے شام روانہ ہونے کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ اکیلا مکہ سے مدینہ تک کا راستہ اونٹوں پر دس دن سے کم میں طے نہیں ہوتا اور مدینہ سے شام کا فاصلہ ایک مہینے کی مسافت سے کسی طرح کم نہیں۔

مذکورہ بالا معاملے کی طرح اس امر میں بھی مورخین میں اختلاف ہے کہ شام پر چڑھائی کا خیال

پیدا ہونے کے بعد ابوبکرؓ نے سب سے پہلے کس شخص کو امیر بنا کر وہاں بھیجا۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ سعادت سب سے پہلے خالد بن سعید بن عاص اموی کے حصے میں آئی۔ ہم قبل ازیں یہ روایت بھی بیان کر چکے ہیں کہ مرتدین سے جنگیں شروع ہوتے ہی انھیں شام کی سرحد پر تیما بھیج دیا گیا تھا تاکہ رومی مسلمانوں کی مصیبت (ارتداد) سے فائدہ اٹھا کر عرب پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ان دونوں روائتوں کے برعکس ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ خالدؓ بن سعید رسول اللہ کی طرف سے یمن کے حاکم تھے اور آپ کی وفات سے ایک مہینا بعد مدینہ پہنچے تھے۔ مدینہ پہنچ کر وہ علی اور عثمان سے ملے اور کہنے لگے:

"اے بنو عبد مناف! تم نے سنہی خوشی خلافت کی باگ ڈور دوسروں کو کیوں سپرد کر دی حالانکہ اس پر تمھارا حق فائق تھا؟"

بعد میں جب ابوبکرؓ نے شام کی طرف اسلامی لشکر بھیجنا چاہا اور خالدؓ بن سعید کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا تو عمرؓ نے ان سے عرض کیا کہ آپ ایسے آدمی کو سالار لشکر بنا کر بھیج رہے ہیں جو قبل ازیں فساد انگیز باتیں کر چکا ہے۔

اس معاملے میں عمرؓ کا اصرار اس حد تک بڑھا کہ آخر حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن سعید کو ہٹا کر ان کی جگہ یزید بن ابوسفیان کو شامی لشکروں کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا خالدؓ بن سعید پر خود غلط اور متکبر انسان ہے اس لیے اسے ایسی مہم پر بھیجنا مناسب نہ ہوگا جہاں ہر قدم پر انتہائی حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی روائتیں بھی آتی ہیں کہ خالدؓ بن سعید کو کبھی امیر بنا کر بھیجا ہی نہیں گیا، وہ ابو عبیدہؓ بن جراح کے لشکر میں شامل تھے۔

ان تمام روایات کے برعکس ہمارا خیال وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی خالدؓ بن سعید کو شام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تیما بھیجا گیا تھا اور وہ اپنے دستے کے ہمراہ وہیں مقیم رہے۔ جب ابوبکرؓ نے جہاد شام کے لیے عام تحریک فرمائی تو وہ مدینہ میں موجود نہ تھے۔ یہ تحریک انھوں نے خالدؓ بن سعید ہی کی طرف سے یہ رپورٹ موصول ہونے پر کی تھی کہ رومی فوجوں میں نقل و حرکت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور اگر دربار خلافت سے ان کی مدد کے لیے فوجیں روانہ

نہ کی گئیں تو خطرہ ہے کہ مبادا رومی ان کے دستے پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیں۔

رومی بھی جنگی تیاریوں اور فوجی نقل و حرکت میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ انھیں پیہم یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ عراق میں مسلمان فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہے ہیں اور عرب میں مسلمانوں کے خلاف مرتدین نے جو جا بجا فتنے کھڑے کیے تھے اُن سب کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ ان کے دلوں میں اب تک غزوۂ تبوک کی یاد باقی تھی۔ جب رسول اللہ کثیر صحابہ کو ساتھ لے کر رومی سرحدات تک پہنچ گئے تھے اور رومی سرحدوں پر بسنے والے قبائل سے معاہدات صلح کر کے مدینہ واپس چلے گئے تھے۔ اب آپ کے متبعین دوبارہ رومی سرحدات تک پہنچ کر اسے عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے رومی سلطنت نے غسانیوں اور شام کی سرحد پر بسنے والے دوسرے قبائل کو ہدایت کی کہ وہ سرحد پر ایک زبردست روک بن کر کھڑے ہو جائیں اور مسلمانوں کو کسی طرح بھی شامی حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دیں۔ چنانچہ ان قبائل نے کثیر فوج فراہم کر کے اسے سرحد پر جمع کر دیا۔

اب رومیوں اور مسلمانوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کیل کانٹے سے لیس تیار کھڑی تھیں۔ مسلمانوں کی فوج سرحد کے اِس طرف عرب کی حدود میں تھی اور غسانیوں کی فوج سرحد کے اُس پار شام کی حدود میں۔ دونوں فوجیں منتظر تھیں کہ کب حکم ملے اور دوسرے فریق پر دھاوا بول دیں۔

اسی دوران میں خالدؓ بن ولید کی پے در پے فتوحات کی خبریں موصول ہو کر رومیوں کے لیے مزید پریشانی اور سراسیمگی کا باعث بن گئیں۔ آج اہل انبار نے عاجز آ کر شہر کے دروازے اسلامی لشکر کے لیے کھول دیے۔ آج عین التمر پر مسلمانوں کا تسلّط ہو گیا۔ آج فلاں شہر کی فوج نے مسلمانوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور آج فلاں فوج نے تاب مقاومت نہ لا کر راہِ فرار اختیار کی۔

رومیوں کو یقین تھا کہ تیما پر مقیم اسلامی فوج بھی چین سے بیٹھنے والی نہیں، وہ بھی اپنے بھائیوں کی تقلید میں شامی سرحد پر دست درازی کرنے سے کسی صورت باز نہ رہے گی۔ چنانچہ انھوں نے ایک نئے جوش اور ولولے سے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

یہ دیکھ کر خالد بن سعید نے دوبارہ ابوبکرؓ کو خط لکھا جس میں رومیوں کے جوش وخروش اور بہراء، کلب، تنوخ، لخم، جذام اور غسان کے قبائل کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دیتے ہوئے شامی سرحد کے اندر پیش قدمی کی اجازت طلب کی۔ ابوبکرؓ اس وقت شام بھیجنے کے لیے فوجوں کی فراہمی میں مصروف تھے۔ انھوں نے خالدؓ کو جواباً لکھا:

"تمھاری درخواست پر تمھیں پیش قدمی کی اجازت دی جاتی ہے لیکن حملہ کرنے میں کبھی پہل نہ کرنا اور ہمیشہ اللہ سے مدد مانگتے رہنا۔"

شامی فتوحات کے سلسلے میں یہ پہلے کلمات تھے جو ابوبکرؓ کے قلم سے نکلے۔

(۱۴)
فتحِ شام

اسلامی فوجوں کی پیش قدمی

خالدؓ بن سعید اپنے مختصر سے دستے اور بدوی قبائل کے ہمراہ شام کی سرحد پر تیما میں مقیم تھے۔ ان کے مقابلے کے لیے سرحدی قبائل پر مشتمل رومیوں کا عظیم الشان لشکر سرحد کے دوسری طرف تیار کھڑا تھا لیکن اپنے سے کئی گنا فوج کو دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے اور ان کے عزم و ارادہ میں پہلے سے زیادہ پختگی آگئی۔ جب خالدؓ بن سعید کو ابوبکرؓ کی یہ ہدایات موصول ہوئیں تو انھوں نے فوراً اپنی فوج کو تیار ہونے کا حکم دے دیا اور اسے لے کر شامی حدود میں داخل ہو گئے۔ رومیوں اور ان کے مددگاروں نے جونہی اسلامی لشکر کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خالدؓ بن سعید لشکر گاہ میں داخل ہوئے اور رومیوں کا چھوڑا ہوا سامان قبضے میں کر لیا۔ اس کے بعد ابوبکرؓ کی خدمت میں اس پہلی فتح کی اطلاع بھیجی۔ وہاں سے جواب آیا:

"آگے بڑھتے چلے جاؤ لیکن جب تک تمھارے پاس مزید فوجیں نہ پہنچ جائیں۔

بہ طورِ خود دشمن پر حملہ کرنے سے پرہیز کرو۔"

چنانچہ خالدؓ بن سعید آگے بڑھتے چلے گئے۔ بحرِ مردار کے مشرقی ساحل کے قریب مقامِ قسطل پر انھیں ایک اور رومی لشکر کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے بھی شکست دی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ یہ دیکھ کر رومیوں اور اہلِ شام کو بہت طیش آیا۔ اُن کی آتشِ حمیت بھڑک اُٹھی اور انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

جب خالدؓ بن سعید نے ان کی یہ جنگی تیاریاں دیکھیں تو انھوں نے ابوبکرؓ کی خدمت میں جلد از جلد کمک روانہ کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ کامیابی سے سفر جاری رکھ سکیں۔ اس دوران میں مدینہ

سے فوجیں روانہ ہو چکی تھیں۔ ابوبکرؓ کو ان کی کامیابی کا پورا یقین تھا اور خدائی امداد پر کامل بھروسا۔ وجہ یہ بھی کہ رومی ایرانیوں سے کسی طرح بھی بہتر نہ تھے۔ جب سے انھوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا تھا انھیں عیش و آرام کے سوا کوئی کام ہی نہ رہا تھا۔ سرحدوں کی حفاظت کا سارا کام انھوں نے بدوی قبائل پر چھوڑ رکھا تھا۔ یہ قبائل اگرچہ شجاعت و بہادری میں تو کسی سے ہیٹے نہ تھے لیکن جنس اور زبان کے لحاظ سے جو تعلق انھیں اہلِ عرب سے تھا وہ رومیوں سے نہ تھا۔ شامی عرب اگرچہ عیسائی مذہب کے پیرو تھے پھر بھی ہرقل کی عیسائیت اور ان کی عیسائیت میں بڑا فرق تھا۔ شامی عرب 'ارثوذکسی' (آرتھوڈکس) عقیدے کے پیرو تھے اور قیصر 'کاثولیکی' (کیتھولک) فرقے کا متبع۔

جب شامیوں نے دیکھا کہ قیصر کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلے میں آنے سے جی چرا رہا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ قیصر کو اپنے اہلِ وطن کی تباہی و بربادی کا خطرہ ہے، اِس لیے وہ انھیں مسلمانوں کے مقابلے میں لانے کے بجائے ہمیں قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہے۔ اِس پر شامی عیسائیوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور اس خیال سے کہ وہ خواہ مخواہ رومیوں کی سلطنت کے بچاؤ کی خاطر اپنی جانیں کیوں قربان کریں، انھوں نے لڑائی سے دست کشی اختیار کر لی اور خالدؓ بن سعید کی پیش قدمی کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

اسلامی لشکروں کی روانگی

مورخین میں اِس کے متعلق اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کون سا لشکر خالدؓ بن سعید کی مدد کے لیے روانہ ہوا تھا؛ طبری، ابن اثیر اور ابنِ خلدون نے اِس سلسلے میں جو روایات بیان کی ہیں وہ ان روایات سے مختلف ہیں جو واقدی، ازدی اور بلاذری نے لکھی ہیں۔ ذیل میں سب سے پہلے ہم طبری اور اس کے مذکورہ بالا ساتھیوں کی روایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد میں واقدی، ازدی اور بلاذری کی روایتیں درج کریں گے۔

عکرمہ بن ابوجہل کندہ اور حضرموت کی بغاوتوں کو فرو کر کے یمن اور مکہ کے راستے مدینہ پہنچے اُس وقت ابوبکرؓ نے انھیں خالدؓ بن سعید کی مدد کے لیے جانے کا حکم دیا۔ عکرمہ اپنا وہ لشکر چھوڑ

چکے تھے جس کے ساتھ انھوں نے جنوبی علاقوں میں مرتدین سے جنگیں کی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک اور لشکر تیار کیا اور عکرمہ کو اس کی قیادت سپرد کر کے شام کی طرف روانہ کر دیا۔ اسی وجہ سے اس لشکر کا نام 'جیش بدال' پڑ گیا۔ عکرمہ کے ساتھ ہی انھوں نے ذوالکلاع حمیری کو، اس لشکر کا سردار بنا کر جو ان کے ساتھ یمن سے آیا تھا، شام روانہ ہونے کا حکم دیا تاکہ خالدؓ بن سعید کو اطمینان رہے اور وہ پیش قدمی جاری رکھ سکیں۔

اسی زمانے میں عمرو بن عاص مرتدین سے فراغت پا کر قضاعہ میں مقیم تھے۔ ابوبکرؓ کی خواہش تھی کہ وہ بھی شام جا کر خالدؓ بن سعید کے ممد و معاون ثابت ہوں لیکن ان کے کارناموں کی وجہ سے جو انھوں نے فتنۂ ارتداد فرو کرنے کے سلسلے میں انجام دیے تھے، ابوبکرؓ نے انھیں اختیار دیا کہ خواہ وہ قضاعہ ہی میں مقیم رہیں، خواہ شام جا کر وہاں کے مسلمانوں کی تقویت کا باعث بنیں۔ ابوبکرؓ نے انھیں لکھا:

"اے ابوعبداللہ! میں تمھارے سپرد ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کے اعتبار سے تمھارے لیے بہتر ہے لیکن تمھاری خوشی مجھے بہر حال منظور رہے۔"

عمرو بن عاص نے جواب میں لکھا:

"میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں اور اللہ کے بعد آپ اس کے تیر انداز۔ جس طرف آپ کو کوئی خطرہ نظر آئے آپ بلا تامل اس تیر کو چلائیے جو بہت سخت اور جگر چھلنی کرنے والا ہے۔"

ابوبکرؓ نے ولید بن عقبہ کو بھی اسی مضمون کا خط لکھا تھا۔ انھوں نے بھی جواب میں عمرو بن عاص کی طرح اخلاص و محبت اور ایثار کا اظہار کیا، چنانچہ ابوبکرؓ نے عمرو بن عاص کو فلسطین اور ولید کو اردن کا حاکم مقرر کر کے شام روانہ ہونے کا حکم دیا۔

تعمیل حکم میں دونوں صاحب شام روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ولید بن عقبہ خالد بن سعید کے پاس پہنچے اور انھیں بتایا کہ اہل مدینہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے بے تاب ہیں اور ابوبکرؓ فوجیں بھیجنے کا بند و بست کر رہے ہیں۔ یہ سن کر خالدؓ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور انھوں نے اس خیال سے

کہ رومیوں پر فتح یابی کا فخر انہی کے حصے میں آئے، ولید بن عقبہ کو ساتھ لے کر رومیوں کی عظیم الشان فوج پر حملہ کرنا چاہا جس کی قیادت ان کا سپہ سالارِ اعظم باہان کر رہا تھا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ جس طرح خالدؓ بن ولید نے مٹھی بھر فوج کے ہمراہ ہرمز کو شکست دے کر عراق میں اپنا سکہ بٹھایا تھا اسی طرح وہ بھی باہان کو شکست دے کر رومیوں پر اپنا رعب قائم کر سکیں گے۔

باہان کو جب خالدؓ بن سعید کے ارادے کا پتا چلا تو اس نے لشکر لے کر دمشق کا رُخ کیا۔ خالدؓ اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ واقوصہ اور دمشق کے درمیان مقام مرج الصفر میں پڑاؤ ڈال کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ باہان کا پیچھے ہٹنا اصل میں ایک چال تھی اور وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر پشت سے اُن پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی خطرے سے ابوبکرؓ نے بار بار انھیں خبردار کیا تھا لیکن کام یابی کے نشے اور فخر و مباہات کی محبت نے خالدؓ بن سعید کے دل سے یہ بات قطعاً فراموش کر دی کہ وہ اپنی پشت کی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر آگے نہ بڑھیں۔ جب وہ مرج الصفر کے قریب پہنچے تو باہان لشکر لے کر پلٹا اور مسلمانوں کا محاصرہ کر کے ان کی پشت کا راستہ کاٹ دیا۔ اتفاق سے اسلامی فوج کا ایک دستہ باقی لشکر سے علحدہ ہو گیا تھا۔ اس دستے میں خالدؓ کا لڑکا سعید بھی تھا۔

باہان نے سب سے پہلے اِس دستے پر حملہ کیا اور تمام لوگوں کو، جن میں سعید بن خالد بھی شامل تھا، قتل کر دیا۔ جب خالدؓ بن سعید کو اپنے بیٹے کے مارے جانے کی اطلاع ملی اور اپنے آپ کو خوں خوار دشمنوں سے محصور پایا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا، انھوں نے لشکر کو عکرمہ کی سرکردگی میں چھوڑ کر چند آدمیوں کے ہمراہ راہِ فرار اختیار کی اور مدینہ کے قریب ذوالمروہ ہی پہنچ کر دم لیا۔ جب ابوبکرؓ کو اِس واقعے کا پتا چلا تو انھوں نے خالدؓ کو بہت سخت خط لکھا اور انھیں مدینہ آنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنے شکست خوردہ ہمراہیوں کے ساتھ انتہائی حزن و الم کی حالت میں ذوالمروہ ہی میں مقیم رہے۔ ابوبکرؓ فرمایا کرتے تھے:

> ”عمرؓ اور علیؓ مجھ سے زیادہ خالد کی سرشت سے واقف تھے۔ اگر میں ان دونوں کا کہا مانتا تو مسلمانوں کو اس شکست سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔“

خالدؓ بن سعید کے فرار کے باوجود ابوبکرؓ کے عزم و حوصلہ میں مطلق فرق نہ آیا۔ جب انھیں

یہ خبر پہنچی کہ عکرمہ بن ابو جہل اور ذوالکلاع حمیری اسلامی لشکر کو رومیوں کے چنگل سے بچا کر واپس شام کی سرحد پر لے آئے ہیں اور وہاں مدد کے منتظر ہیں تو ابوبکرؓ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کمک بھیجنے کا انتظام شروع کر دیا۔

شرحبیل بن حسنہ عراق میں خالدؓ بن ولید کے ساتھ تھے اور اس زمانے میں قیدی اور مالِ غنیمت لے کر مدینہ آئے ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے انھیں ولید بن عقبہ کی جگہ شام جانے کا حکم دیا۔ ولید بن عقبہ بھی ان ہزیمت خوردہ لوگوں میں شامل تھے جو خالدؓ بن سعید کے ہمراہ شام سے فرار ہو کر ذوالمروہ میں مقیم تھے۔ شرحبیل نے ابنِ سعید اور ابنِ عقبہ کے لوگوں کو جمع کیا اور انھیں لے کر عکرمہ کے پاس روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ابوبکرؓ نے ایک اور بھاری لشکر جمع کیا جس میں اکثریت مکہ والوں کی تھی۔ اس لشکر کا سردار انھوں نے یزید بن ابی سفیان کو بنایا اور انھیں شام روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یزید کے پیچھے انھوں نے خالد بن سعید کے بقیہ لشکر پر ان کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو امیر بنا کر اسے بھی شام بھیجا۔ اسی پر بس نہ کیا بلکہ ابوعبیدہ بن جراح کو بھی حمص کا والی بنا کر ایک بھاری لشکر کے ہمراہ شام کی طرف کوچ کا حکم دیا۔

یہ تمام لشکر جرف میں جا کر خیمہ زن ہوتے تھے۔ جب کبھی کسی لشکر کی روانگی کا وقت آتا ابوبکرؓ خود شہر سے باہر تشریف لے جاتے اور سالارِ لشکر کو یہ نصائح فرما کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے:

> "یاد رکھو ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ جس نے اس مقصد کو پا لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ جو شخص اللہ کے لیے کوئی کام کرتا ہے اللہ خود اس کا کفیل ہو جاتا ہے۔ تم کوشش اور جد و جہد سے کام لینا چاہیے کیونکہ جد و جہد کے بغیر کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ یاد رکھو جس شخص میں ایمان نہیں وہ مسلمان کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ جو کام ثواب کی خاطر نہ کیا جائے اس کا کوئی ثواب بھی نہیں ملتا۔ جس کام میں نیک نیتی شامل نہیں وہ کام ہی نہیں۔ کتاب اللہ میں اللہ کی خاطر جہاد کرنے والوں کو بہت بڑے اجر اور ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے لیکن کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس ثواب کو صرف اپنے لیے مخصوص کرنا چاہے۔ جہاد فی سبیل اللہ ایک تجارت ہے جسے اللہ نے مومنوں کے لیے جاری فرمایا ہے۔ جو شخص اسے اختیار

کرتا ہے اللہ اسے رسوائی سے بچا لیتا ہے اور دونوں جہان کی عزت بخشتا ہے۔"

یزید بن ابی سفیان کی روانگی کے وقت انھوں نے انھیں جو نصائح فرمائیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

"اپنے لشکر کے ساتھ اچھی طرح رہنا۔ ان سے عمدہ سلوک کرنا۔ انھیں نصیحت کرتے وقت اختصار سے کام لینا کیونکہ زیادہ باتیں کرنے سے بعض حصے بھول جاتے ہیں۔ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اس طرح لوگ بھلائی سے پیش آئیں گے۔ دشمن کے ایلچیوں کی عزت کرنا اور انھیں زیادہ دیر پاس نہ بٹھانا تاکہ جب وہ تمھارے لشکر سے باہر نکلیں تو انھیں جنگی رازوں کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ جب وہ تمھارے پاس آئیں تو لشکر کے سب سے شاندار حصے میں انھیں ٹھہرانا۔ اپنا بھید چھپانا تاکہ تمھارا نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔ ہمیشہ سچی بات کہنا تاکہ صحیح مشورہ ملے۔ راتوں کو اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھنا اس طرح تمھیں ہر قسم کی خبریں مل سکیں گی۔ لشکر میں پہرے کا انتظام کرنا اور پہرے والے سپاہیوں کو سارے لشکر میں پھیلا دینا۔ اکثر ان کا اچانک معائنہ بھی کرنا۔ اگر کسی ایسے شخص کو سزا دو جو اس کا مستحق ہو تو اس میں کسی قسم کا خوف دل میں نہ لانا۔ مخلص اور وفادار رفیقوں سے میل جول رکھنا۔ جن سے ملو اخلاص سے ملنا، بزدلی نہ دکھانا کیونکہ اس طرح دوسرے لوگ بھی بزدلی کا اظہار کرنے لگیں گے۔"

ان لشکروں کو روانہ کرکے ابوبکرؓ نے اطمینان کا سانس لیا۔ انھیں کامل امید تھی کہ اللہ ان فوجوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو رومیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ وجہ یہ تھی کہ ان میں ایک ہزار سے زیادہ مہاجر اور انصار صحابہ شامل تھے جنھوں نے ہر موقع پر انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور ابتدائے اسلام میں رسول اللہ کے دوش بدوش لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں وہ اہل بدر بھی شامل تھے جن کے متعلق آپؐ نے اپنے رب کے حضور یہ التجا کی تھی:

"اے اللہ! اگر آج تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو آئندہ پھر کبھی زمین پر تیری پرستش نہ کی جائے گی۔"

یہی وہ لوگ تھے جن کی مدد کے لیے اللہ نے آسمان سے فرشتے نازل کیے اور جن کے متعلق یہ آیاتِ مقدسہ نازل ہوئیں:

كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين

(کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے اذن سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

جس لشکر کے ہمراہ خالدؓ بن ولید نے عراق پر چڑھائی کی تھی اور جس کے ذریعے سے انھوں نے سلطنتِ ایران کو پارہ پارہ کر دیا تھا اس میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنھوں نے جنگِ یمامہ میں شرکت کی تھی۔ زیادہ تر تعداد بحرین اور عمان کے ان لوگوں کی تھی جو بدستور اسلام پر قائم تھے اور جنھوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ کیا ان لوگوں کو بہادری شجاعت اور اخلاص و محبت میں بدر، اُحد اور حنین کی جنگوں میں شرکت کرنے والے صحابۂ کرام کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے جنھوں نے ہر موقع پر رسولؐ اللہ کی مدد اور حفاظت کی؟ اسی طرح کیا ان لوگوں کو مکہ، مدینہ اور طائف کے ان عظیم شہسواروں کے ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے جن کا کام ہی ہر وقت ستیزہ کاری میں مصروف رہنا اور اپنی تلواروں کے جوہر عالم پر آشکارا کرتے رہنا تھا؟ اس لیے اگر خالدؓ بن ولید جنوبی عرب کے کمزور اور بے حقیقت باشندوں کے ذریعے سے حکومت ایران پر غالب آسکتے تھے تو کیا عکرمہؓ، ابوعبیدہؓ، عمروؓ بن عاص اور یزید بن ابی سفیان مکہ اور مدینہ کے مشہور بہادروں کے ذریعے سے رومی سلطنت کا قلع قمع نہ کر سکتے تھے؟

عراق میں اسلامی فوجوں کی کامیابی کے بعد ابوبکرؓ نے شام کی جانب تیزی سے فوجیں بھیجنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اگر ابوبکرؓ خالدؓ بن سعید کی شکست سے بددل ہو کر شام پر توجہ مبذول کرنا چھوڑ دیتے اور وہاں سے اپنی فوج واپس بلا لیتے تو اس کا نتیجہ بہت خطرناک نکلتا۔ اس طرح نہ صرف عراق کی تمام فتوحات اکارت چلی جاتیں بلکہ اُلٹا رومی سرزمین عرب میں یلغار شروع کر دیتے۔ اور اسلام ایران و روم کی عظیم الشان طاقتوں کے درمیان پس کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا۔ لیکن ابوبکرؓ کے عہدِ مبارک میں یہ کس طرح ہو سکتا تھا؟

ابوبکرؓ کے احکام کے مطابق امرائے عساکر نے شام پہنچنا شروع کیا، البتہ عمروؓ بن عاص اپنے لشکر

کے ہمراہ عربہ ہی میں مقیم رہے۔ ابوعبیدہ سرزمین بلقار کو عبور کر کے جابیہ پہنچ گئے۔ راستے میں انھیں شامی عربوں کی جانب سے کچھ مزاحمت پیش آئی لیکن انھیں شکست دے دی گئی۔ شرجیل اردن پہنچے اور یزید بن ابی سفیان نے بلقار میں پڑاؤ ڈالا ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ داثن کے مقام پر انھیں رومیوں اور بدوؤں کی ایک فوج کا سامنا کرنا پڑا لیکن لڑائی کے بعد رومیوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔

اس جگہ پہنچ کر روایات میں باہم اختلاف پیدا ہو جاتا ہے بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کو فلسطین کے جنوب میں قابلِ ذکر مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور وہ بے روک ٹوک منزلِ مقصود پر پہنچ گئے لیکن بعض روایات اس کے خلاف ہیں۔ ان روایات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اسلامی لشکر عکرمہ کے پاس نہ پہنچ گئے اس وقت تک رومیوں نے ان کا باضابطہ مقابلہ نہ کیا اور نہ باقاعدہ فوجیں ان کے مقابلے کے لیے ہی لائے بلکہ یہ کام بادیہ نشین لوگوں کے سپرد رہا جنھوں نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کی مزاحمت کی لیکن معمولی لڑائیوں کے بعد پسپا ہوتے گئے فلسطین کی جنوبی جانب رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکے ہوتے وہ بعد میں عمرؓ بن خطاب کے عہدِ خلافت میں پیش آئے۔

لیکن روایات کا اختلاف اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب مسلمانوں کے مختلف لشکر عکرمہ کے لشکر کے قریب دجراہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے دمشق کے راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ شرجیل نے طبریہ اور دریائے اردن کی بالائی جانب غور کے قریب ایک سطح مرتفع میں قیام کیا۔ یزید نے بلقا میں بصرہ کا محاصرہ کر لیا اور عمرؓو بن عاص نے عربہ میں جبرون کو فتح کرنے کی مساعی شروع کر دیں۔

یرموک: رومی فوجوں کی چڑھائی

ابتدا میں رومیوں نے مسلمانوں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح محمدؐ تبوک تک آ کر واپس چلے گئے تھے۔ اسی طرح اب بھی تھوڑی بہت ترکتازیوں کے بعد عرب آخر واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ جب خالد بن سعید نے رومیوں کے مقابلے میں شکست کھائی اور میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کی تو رومیوں کے اس یقین میں

اور بھی پختگی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے ان خبروں کو بھی زیادہ اہمیت نہ دی کہ عکرمہ کی مدد کے لیے مسلمانوں کی فوجیں دم بدم شام کی سرحد کی طرف بڑھی چلی آرہی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان فوجوں کا حشر بھی خالد بن سعید کے لشکر جیسا ہوگا۔ لیکن جب اسلامی فوجیں مجتمع ہونے لگیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے تو رومی خوابِ غفلت سے جاگے اور انھیں حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر انھوں نے پوری قوت سے مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا تو عراق کے حالات یہاں بھی پیش آئیں گے اور سارا شام مسلمانوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ہرقل نے ہر اسلامی لشکر کے مقابلے کے لیے زبردست فوجیں روانہ کیں تاکہ ان پر علٰحدہ علٰحدہ حملہ کر کے ان کی قوت و طاقت کو نابود کیا جا سکے اور انھیں ہمیشہ کے لیے سرزمینِ شام سے نکال دیا جائے۔

مختلف روایات سے پتا چلتا ہے کہ اس موقع پر مسلمان فوجوں کی کل تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے مقابلے میں رومی افواج دو لاکھ چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھیں۔ عکرمہ کے لشکر کی تعداد چھ ہزار تھی اور ابوعبیدہ، یزید اور عمرو بن عاص کے لشکروں میں سے ہر ایک کی تعداد سات اور آٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

رومی افواج میں سب سے بڑا لشکر ہرقل کے بھائی تذارق (تھیوڈورک) کا تھا جو نوّے ہزار سپاہ پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر عمروؓ بن عاص کے بالمقابل صف آرا تھا۔ ابوعبیدہؓ کے بالمقابل فیقار بن نسطوس کا لشکر تھا جس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ شرحبیلؓ بن حسنہ کے مقابلے کے لیے دراقص آیا تھا۔ اس کی فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ یزید بن ابی سفیان سے لڑائی کے لیے جرجہ بن تدر اکو بھیجا گیا تھا۔ ہرقل خود حمص میں مقیم تھا اور تمام حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ پل پل کی خبریں اسے مل رہی تھیں اور اس کی تمام تر کوشش سلطنت کو عربوں کے قبضے میں جانے سے بچانے پر صرف ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی تذارق کو اس عظیم مہم پر مامور کیا تھا۔ تذارق ہی نے اس سے قبل ایرانیوں کے لشکر جرار کو شکست دی تھی۔ اسی تذارق کے ذریعے سے عربوں کو نیست و نابود کرنے اور انھیں ایسا سبق دینے کا تہیہ کیا جا رہا تھا جسے وہ عمر بھر فراموش نہ کر سکیں۔

رومیوں کی عظیم الشان افواج کو دیکھ کر مسلمانوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ انھوں نے عمروؓ بن عاص کے پاس قاصد بھیج کر ان کی رائے طلب کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میری رائے

میں اس نازک ترین موقع پر دشمن سے علحدہ علحدہ جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے کسی طرح بھی سود مند نہ ہوگا اس لیے تمام اسلامی فوجوں کو یک جا ہو کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم یک جا ہو گئے تو دشمن کثرتِ تعداد کے باوجود ہمارے مقابلے پر نہ ٹھہر سکے گا لیکن اگر ہم اپنی موجودہ صورت پر قائم رہے تو ہماری کوئی بھی فوج دشمن کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے گی اور بہت جلد شکست کھا جائے گی۔

دربارِ خلافت سے بھی وہی مشورہ موصول ہوا جو عمروؓ بن عاص نے دیا تھا۔ ابوبکرؓ نے اپنے سپہ سالاروں کو لکھا:

"اکٹھے ہو کر ایک لشکر کی شکل اختیار کر لو اور متحد ہو کر دشمن کے مقابلے کے لیے نکلو تم اللہ کے مددگار رہو۔ جو شخص اللہ کا مددگار رہے گا اللہ بھی اُس کی مدد کرے گا لیکن جو اس کا انکار کرے گا اور ناشکری کا ثبوت دے گا اللہ بھی اُسے چھوڑ دیگا ..... گناہوں سے یکسر اجتناب کرو۔ اللہ تمھارا حافظ و ناصر ہو۔"

چاروں اسلامی لشکروں نے ان مشوروں کے تحت یک جا ہو کر دمشق کے راستے میں یرموک کے بائیں کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ تذارق نے یہ دیکھا تو اپنی پوری طاقت دریا کے دائیں کنارے پر لا کر جمع کر دی۔

دریائے یرموک حوران کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مختلف پہاڑیوں کے درمیان بڑی تیزی سے گزرتا ہوا غور اردن اور بحرِ مردار میں جا گرتا ہے۔ دریائے یرموک اور دریائے اردن کے مقامِ اتصال سے تیس چالیس میل اوپر دریائے یرموک ایک طویل و عریض میدان کے گرد چکر کاٹتا ہے جسے تین اطراف سے اونچی اونچی پہاڑیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ایک عظیم الشان فوج آسانی سے خیمہ زن ہو سکتی ہے۔ رومیوں نے یہ جگہ پسند کی اور وہاں ڈیرے ڈال دیے لیکن اس کے انتخاب میں رومیوں سے سخت غلطی ہوئی۔ یہ میدان وسیع تو بے شک تھا لیکن تین طرفوں سے پہاڑیوں میں محصور ہونے کے باعث باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا اور رومی بالکل گھیرے میں آ گئے۔ عمروؓ بن عاص نے یہ دیکھا تو وہ چلّا اُٹھے:

"مسلمانو! تمھیں خوش خبری ہو۔ رومی گھیرے میں آ چکے ہیں اور محصور فوج محاصرہ کرنے والی فوج کے چنگل سے شاذونادر ہی بچتی ہے۔"

اب صورت حال یہ تھی کہ نہ رومی اپنی طاقت وقوت اور تعداد کے بل بوتے پر مسلمانوں پر غالب آسکتے تھے اور نہ مسلمان اس قدر قلیل امداد کے باوجود رومیوں پر غلبہ حاصل کرسکتے تھے۔ مسلمان رومیوں کے باہر نکلنے کے راستے پر قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ جب رومی اس راستے سے باہر آنے کی کوشش کرتے تو مسلمان انھیں مار مار کر پیچھے ہٹا دیتے اور جب مسلمان رومیوں پر حملہ کرتے تو یہ خیال کر کے بہت جلد واپس اپنی جگہوں پر آجاتے مبادا رومی ان کی قلت تعداد کے باعث ان کا محاصرہ کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیں۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے اور کوئی فریق دوسرے پر غلبہ حاصل نہ کرسکا۔ آخر مسلمانوں نے ابوبکرؓ کو یہ تمام حالات لکھے اور ان سے مدد بھیجنے کی درخواست کی کہ لمبا عرصہ گزر جانے پر لشکر بددل نہ ہو جائے اور جوش و خروش ختم ہو کر طاقت وقوت میں کمزوری کا باعث نہ بنے۔

ابوبکرؓ شامی لشکروں کے امراسے زیادہ بے چین تھے۔ ان کے گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ ابوعبیدہؓ اور ان کے ساتھی یہ طریقہ اختیار کریں گے۔ ان اہل بدر کے متعلق جنھوں نے قلت تعداد کے باوجود اہل مکہ کے کثیر التعداد لشکر کو شکست فاش دی تھی ابوبکرؓ کو یہ خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ وہ رومیوں کے مقابلے میں اس قدر عاجز آجائیں گے کہ ان سے کسی طرح بھی عہدہ برآنہ ہوسکیں گے۔ انھوں نے اس معاملے پر خوب غور و فکر کیا۔ عمرؓ، علیؓ اور مدینہ میں مقیم دیگر اہل الرائے اصحاب سے مشورہ لیا۔ اسی غور و فکر کے دوران میں ان پر اصل حقیقت واضح طور پر منکشف ہو گئی۔

مسلمانوں نے کبھی کثرت تعداد کے بل بوتے پر دشمن کو نیچا نہ دکھایا تھا۔ اعلیٰ قیادت اور ایمانی قوت یہ دو سبب تھے جنھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کیا۔ جہاں تک ایمانی قوت کا سوال تھا وہ شامی لشکروں میں کسی طرح بھی کم نہ تھی کیونکہ ان میں سابقون الاولون اور رسول اللہ کے جلیل القدر صحابہ شامل تھے اور وہ اہل بدر تھے جن کے ہاتھوں فتح مکہ عمل میں آئی اور مرتدین کا خوفناک فتنہ انجام کو پہنچا۔ اس لیے خرابی لازماً قیادت میں تھی۔ رومیوں سے مقابلے

کے لیے ایسے قائد کی ضرورت تھی جو نڈر اور بے باک ہو، نرمی سے نا آشنا ہو، لڑائی میں کسی بھی موقع پر اس کا قدم پیچھے ہٹنے والا نہ ہو، موت کا خوف اس کے پاس بھی نہ پھٹکتا ہو۔ ادھر جب ابوبکرؓ اپنے قائدین پر نظر ڈالتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ ابوعبیدہ باوجود کامیاب جرنیل ہونے کے نرم دل ہیں، عمرو بن عاص انتہائی عقل مند ہونے کے باوجود میدانِ جنگ کے شہسوار نہیں۔ عکرمہ میدانِ جنگ کے شہسوار تو ہیں لیکن ان میں پیش آمدہ امور کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ان تمام سالاروں کو اب تک بڑی بڑی جنگوں سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ مزید برآں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی برتری تسلیم کرنے اور ماتحتی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

یہ حقیقت ابوبکر پر منکشف ہوتے ہی معاً ان کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو ان تمام صفات سے کاملاً بہرہ ور تھا جو ایک عظیم سپہ سالار میں ہونی چاہئیں اور وہ شخص تھا خالدؓ بن ولید۔ یہ خیال آتے ہی ابوبکرؓ نے انھیں شام بھیجنے کا ارادہ کر لیا اور ساتھیوں سے فرمایا:

"واللہ! میں خالدؓ بن ولید کے ذریعے سے رومیوں کے دلوں میں
کوئی بھی شیطانی وسوسہ نہ رہنے دوں گا۔"

خالدؓ کی روانگی شام

کسی بھی شخص نے ابوبکرؓ کی رائے سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کیونکہ شام کے معاملات اب اس نہج کو پہنچ چکے تھے کہ مزید التوا مسلمان افواج کے لیے سخت نقصان کا موجب ہوتا۔ سب لوگ خالدؓ بن ولید کو شام بھیجنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خالدؓ خفیہ حج کر کے عراق واپس پہنچ چکے تھے۔ ابوبکرؓ نے خالدؓ کو یہ خط ارسال فرمایا:

"تم یہاں سے روانہ ہو کر یرموک میں مسلمانوں کی افواج سے مل جاؤ کیونکہ وہاں وہ دشمن کے نرغے میں گھر گئے ہیں۔ یہ حرکت (خفیہ حج) جو تم نے کی ہے آئندہ کبھی سرزد نہ ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ تمھارے سامنے دشمن کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور تم مسلمانوں کو دشمن کے نرغے سے صاف بچا لاتے ہو۔ اے ابوسلیمان! میں تمھیں تمھارے خلوص اور خوش قسمتی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ، اللہ تمھاری مدد فرمائے۔ تمھارے دل میں غرور نہ پیدا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کا انجام نقصان اور رسوائی

ہے۔ اپنے کسی فعل پر نازاں نہ ہونا فضل و کرم کرنے والا صرف اللہ ہے اور وہی اعمال کا صلہ دیتا ہے۔"

خالدؓ اس وقت عراق سے جانا نہ چاہتے تھے۔ وہ عراق میں اس وقت تک مقیم رہنے کے خواہاں تھے جب تک ایرانیوں کا دارالحکومت ان کے ہاتھ پر فتح اور کسریٰ شاہ ایران کا تخت و تاج پاش پاش نہ ہو جاتا۔ ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی دشوار امر نہ تھا کیونکہ ایرانی عساکر خالدؓ کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے ہر میدان سے بھاگ رہے تھے۔ ان کی قوت و طاقت ختم ہو چکی تھی اور ایک ہلے میں ان کی سلطنت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا تھا۔ فتح مدائن کا فخر معمولی فخر نہ تھا، یہ وہ عظیم الشان اعزاز تھا جس کے حصول کی تمنا قیصر روم جیسے بادشاہ کے دل کو بھی بے چین کیے رکھتی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں جب خالدؓ کے پاس عراق کو چھوڑ کر شام جانے کا حکم پہنچا ہوگا تو ان کے دل میں ضرور انقباض پیدا ہوا ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں عراق سے ہٹانے میں عمرؓ بن خطاب کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ طبری میں روایت آتی ہے کہ ابوبکرؓ کا خط پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا:

"یہ کام عیسر بن ام شملہ (عمرؓ بن خطاب) کا ہے۔ انھیں اس بات پر حسد ہے کہ عراق کی فتح میرے ہاتھ سے کیوں ہوئی؟"

غالباً انھیں یہ بھی خیال ہو گا کہ عمر بن خطاب عراق میں ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں جبھی تو انھوں نے ابوبکرؓ پر زور ڈال کر انھیں شام بھیجا ہے۔ بہ ایں ہمہ اگر یہ خیال ان کے دل میں ہو بھی، تو بھی بدظنی کی بنا پر خالدؓ پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ابوبکرؓ نے مرض الموت میں فرمایا تھا:

"میری خواہش تھی کہ جب میں نے خالدؓ بن ولید کو شام بھیجا تھا تو عمرؓ بن خطاب کو عراق بھیج دیتا اور مرنے کے بعد جب اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا تو کہتا کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنے دونوں ہاتھ تیری راہ میں پھیلا دیے تھے۔"

ابوبکرؓ بھی جانتے تھے کہ خالدؓ کے دل میں ضرور یہ خیالات گردش کریں گے اور ان کا اثر ان کے کاموں پر پڑے گا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے خط میں یہ فقرہ لکھ دیا تھا کہ جو حرکت (خنیج) تم سے صادر ہوئی ہے آئندہ کبھی سرزد نہ ہو۔ اس طرح وہ انھیں تنبیہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کا

اوّلین فرض خلیفہ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے اور انھیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو خلیفہ کی مرضی یا احکام کے خلاف ہو۔

گمان غالب ہے چونکہ ابوبکرؓ کو خالدؓ کی طرف سے ناراضی کا اندیشہ تھا اسی لیے انھوں نے خط میں جہاں ان کی بہادری اور ان کے کارناموں کی تعریف کی وہاں انھیں عُجب و تکبر اور فخر و غرور سے بچنے کی تلقین بھی کر دی اور واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ فضل و کرم کرنے والا صرف اللہ ہے کسی بندے کی مجال نہیں کہ وہ اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کر سکے۔

لیکن ابوبکرؓ نے خالدؓ کے دل میں پیدا شدہ شکوک و شبہات کو بھی صاف کر دینا چاہا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ نصف فوج مثنیٰ بن حارثہ کے زیر سرکردگی عراق میں چھوڑ دیں اور بقیہ نصف فوج لے کر خود شام روانہ ہو جائیں۔ خط کے آخر میں لکھا:

"جب اللہ تمھیں شام میں فتح نصیب کرے تو اس فوج کو ہمراہ لے کر عراق چلے جانا اور وہاں اپنا پہلا عہدہ دوبارہ سنبھال لینا۔"

اِس طرح ابوبکرؓ نے خالد پر واضح کر دیا کہ انھیں عراق میں عمرؓ یا کسی اور شخص کے آنے کی پروا نہ کرنی چاہیے کیونکہ ان کے قائم مقام مثنیٰ بن حارثہ ہوں گے اور شام کی فتح کے بعد انھیں عراق میں ان کا پہلا عہدہ دوبارہ تفویض کر دیا جائے گا۔

خالدؓ کو اِس بارے میں کوئی شک نہ تھا کہ اللہ انہیں شام میں فتوحات جلیلہ سے نوازے گا۔ اگرچہ انھیں وہاں کی تمام خبریں مل رہی تھیں لیکن وہ مطمئن تھے۔ ان کا دل اس یقین سے بھرپور تھا۔ کہ وہ سیف اللہ ہیں اور اللہ کی تلوار بندوں کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکرؓ کے حکم کے مطابق شام روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

چونکہ خالدؓ کو شام میں پیش آنے والے حالات کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے انھوں نے تمام صحابہ کو ساتھ لے جانا چاہا۔ ابوبکرؓ نے انھیں آدھی فوج مثنیٰ کے پاس چھوڑ جانے کی ہدایت کی تھی۔ اِس لیے انھوں نے فوج کی تقسیم اِس طرح کی کہ تمام صحابہ تو اپنی فوج میں رکھے اور مثنیٰ کے لیے صحابہ کرام کی تعداد کے برابر ایسے لوگ چھوڑ دیے جنھیں رسول اللہ کی مصاحبت نصیب

نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد باقی فوج کا جائزہ لے کر ایسے لوگوں کو اپنی فوج میں شامل کر لیا جو وفود کی صورت میں آپؐ کے پاس آئے تھے اور ان لوگوں کی تعداد کے مساوی ایسے لوگوں کو مثنیٰ کے لیے چھوڑ دیا جو اپنے اپنے قبیلوں میں مقیم رہے تھے اور رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تھے اس کے بعد جو لوگ بچ گئے انھیں نصف نصف تقسیم کر لیا۔ مثنیٰ کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اور انھوں نے خالدؓ سے کہا:

"واللہ! میں تو آپ کو ابوبکرؓ کے حکم سے سرِ موانحراف نہ کرنے دوں گا۔ ان کے حکم کے مطابق آدھے صحابہ میرے پاس رہنے چاہئیں اور آدھے آپ کے پاس۔ آپ کیوں مجھے ان سے محروم کرتے ہیں حالانکہ میری فتوحات کا انحصار ہی صحابہ پر ہے؟"

جب خالدؓ نے مثنیٰ کا اصرار دیکھا تو ان کی منت سماجت کر کے جلیل القدر اور بہادر صحابہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر رضا مند کر لیا۔

چونکہ خالدؓ کو ڈر تھا کہ ان کے جانے کے بعد کہیں مسلمانوں پر کوئی مصیبت نہ آپڑے اس لیے انھوں نے کم زور مردوں اور عورتوں کو مدینہ واپس بھیج دیا تاکہ اگر خدانخواستہ ایرانی مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو بھی اُن کی عورتوں اور بچّوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان تمام امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ لشکر کے ہمراہ شام کی جانب روانہ ہو گئے۔ مثنیٰ بھی ایک دستہ فوج کے ہمراہ صحرا تک انھیں رخصت کرنے گئے۔

عراق سے شام جانے کے لیے قریب ترین راستہ ایک لق و دق صحرا میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ لیکن اوّل تو یہ صحرا بڑا خوفناک اور سخت دشوار گزار تھا اسے عبور کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور ہوشیار سے ہوشیار رہبر کو بھی اس میں راستہ بھول لینے کا خوف لاحق رہتا تھا۔ دوسرے اگر بہ ہزار دقت و دشواری اسے عبور کر بھی لیا جاتا تو بھی بقیہ راستہ آسانی سے کاٹنا ناممکن تھا کیونکہ شام کی سرحد پر بسنے والے تمام عربی قبائل رومیوں کے مددگار تھے قیصر کا ایک لشکر بھی وہاں مقیم تھا جو بہت آسانی سے اسلامی لشکر کا راستہ قطع کر سکتا تھا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ خالدؓ بن ولید عراق سے عرب پہنچتے اور وہاں سے شام جانے والا عام راستہ اختیار کرتے جس سے قبل ازیں عکرمہؓ، ابوعبیدہؓ اور دوسرے اسلامی سپہ سالار گزر کر شام پہنچے تھے لیکن اس طرح بے حد دیر ہو جاتی اور جس مقصد کے لیے انھیں

شام جانے کا حکم دیا گیا تھا وہ فوت ہو جاتا۔ اب خالدؓ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ شام جانے کے لیے ایسا کون سا راستہ اختیار کیا جائے جس میں نہ تو دشمن سے مٹ بھیڑ کا خطرہ ہو اور نہ ساتھیوں تک پہنچنے میں دیر لگے۔ بہ ظاہر کوئی ایسی تدبیر نظر نہ آتی تھی اور یہی دکھائی دیتا تھا کہ یا تو خوف ناک صحرا سے گزر کر اور صحرا کے دشمن قبائل سے دو دو ہاتھ کر کے ساتھیوں تک رسائی حاصل کرنی ہوگی یا ایک طویل راستہ اختیار کر کے شام پہنچنا ہوگا۔

آخر یہاں بھی اللہ کی نصرت آڑے آئی۔ قدرت کی جانب سے ایک عجیب و غریب راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی گئی۔ ان کے ساتھیوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ اس راستے سے گزرنا کیونکر ممکن ہوگا لیکن خالدؓ کا ارادہ اٹل تھا اور ساتھیوں کو مجبوراً انھیں کی بات ماننی پڑی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خالدؓ نے وہ صحرائی راستہ اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا جو عین التمر سے شروع ہو کر شمالی شام پہنچتا تھا۔ اس راستے کی مسافت اگرچہ دوسرے راستوں کی نسبت کم تھی لیکن درمیان میں چونکہ رومیوں کے حامی قبائل آباد تھے اور قیصر کی فوجیں بھی اس جگہ ڈیرے ڈالے پڑی تھیں اس لیے تصادم کے خطرے سے بچنے کے لیے خالدؓ نے یہ راستہ ترک کر دیا اور وہ راستہ اختیار کیا جو اس سے قبل عیاض بن غنم کی امداد کے لیے حیرہ سے دومۃ الجندل جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔

وہ لشکر لے کر پہلے دومۃ الجندل پہنچے اور دومہ سے یرموک پہنچنے کے لیے وادی سرحان کا راستہ اختیار کیا۔ درمیان میں قراقر کی بستی پڑتی تھی جہاں بنو کلب کے بعض قبائل آباد تھے۔ انھوں نے بستی پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اگر وہ وادی سرحان کے معروف راستے ہی پر سفر کرتے رہتے تو چند روز میں بصریٰ پہنچ جاتے اور وہاں ابو عبیدہ کا لشکر ساتھ لے کر یرموک میں اسلامی افواج سے مل جاتے لیکن ان کا خیال تھا کہ بصریٰ پہنچنے سے پہلے ہی رومی ان کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح انھیں یرموک پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس اندیشے کے پیش نظر انھوں نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ہم رومیوں کے عقب میں پہنچ جائیں اور کسی رومی لشکر سے مقابلہ بھی نہ کرنا پڑے کیونکہ اگر راستے میں رومیوں سے مٹ بھیڑ ہو گئی تو ہم دیر سے یرموک پہنچیں گے۔ سب نے بالاتفاق جواب دیا کہ ایسا راستہ ہے تو ضرور لیکن اس سے لشکر

کسی طرح نہیں گزر سکتا، صرف اکیلا آدمی گزر سکتا ہے۔ اس لیے آپ وہ راستہ اختیار کر کے مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالیں لیکن خالدؓ وہی راستہ اختیار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ انھوں نے فرمایا:

"تم نے اپنے آپ کو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے پیش کیا ہے، اب تمھارا قدم پیچھے ہٹنے اور یقین کم ہونے نہ پائے۔ یاد رکھو تائید الٰہی کا مدار نیت ہی پر ہوتا ہے اور اجر نیکی ہی کے مطابق ملتا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اللہ کی نصرت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے مشکلات سے ڈر جائے اور ہمت ہار دے۔"

جب ساتھیوں نے یہ تقریر سنی تو ان کا خوف وہراس جاتا رہا اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا:

"اللہ نے آپ کی ذات میں ہر قسم کی خیر و برکت جمع کر دی ہے اس لیے آپ بے کھٹکے اپنے ارادوں کو لباسِ عمل پہنائیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

انھوں نے مجوزہ راستے سے سفر کرنے کے لیے رہبر طلب فرمایا۔ لوگوں نے رافع بن عمیرۃ الطائی کا نام لیا۔ انھوں نے اسے بلا کر کہا:

"ہم اس راستے سے سفر کرنا چاہتے ہیں، تم ہماری رہبری کے فرائض انجام دو۔"

اس نے جواب دیا:

"آپ گھوڑوں اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ اس راستے سے نہیں گزر سکتے۔ وہ راستہ ایسا ہے کہ اس سے صرف ایک سوار گزر سکتا ہے اور وہ بھی بے خوف و خطر نہیں۔ پوری پانچ راتوں کا سفر ہے۔ راستے سے بھٹکنے کے خوف کے علاوہ پانی کا بھی کہیں نام و نشان نہیں"

خالدؓ نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور فرمایا:

"خواہ کچھ ہو جائے، مجھے تو اسی راستے سے جانا ہے۔ تم بتاؤ اس راستے سے چلنے کے لیے کیا کیا انتظامات کیے جائیں؟"

رافع نے کہا:

"اگر آپ ضرور اسی راستے سے جانا چاہتے ہیں تو لوگوں کو حکم دیجیے کہ وہ بہت سا

پانی ساتھ لے لیں اور جس جس سے ہو سکے اپنی اُونٹنی کو پانی پلا کر اس کا ہونٹ باندھ دے۔ کیونکہ یہ سفر بے انتہا خطرات کا حامل ہے۔ اِس کے علاوہ بیس اونٹنیاں بڑی موٹی تازی اور عمر رسیدہ مجھے مہیا کی جائیں۔"

خالدؓ نے رافع کی اس خواہش کے مطابق اونٹنیاں مہیا کر دیں۔ رافع نے پہلے انھیں خوب پیاسا رکھا جب پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئیں تو انھیں خوب پانی پلایا جب وہ خوب سیر ہو گئیں تو ان کے ہونٹ چھید کر باندھ دیے تاکہ جگالی وغیرہ نہ کر سکیں۔ اِس کے بعد خالدؓ سے کہا کہ اب فوج کو کوچ کا حکم دیجیے۔ خالدؓ لشکر اور ساز و سامان لے کر اس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ جہاں کہیں پڑاؤ کرتے ان میں سے چار اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر تے۔ جو پانی ان کے معدوں سے نکلتا وہ گھوڑوں کو پلا دیتے اور جو پانی ساتھ لائے تھے وہ خود پیتے۔

جب صحرا میں سفر کا آخری دن آیا تو خالدؓ نے رافع سے جسے آشوب چشم کی شکایت تھی، کہا کہ پانی ختم ہو چکا ہے۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ رافع نے جواب دیا:

"گھبرائیے نہیں ہم انشاء اللہ جلد پانی تک پہنچ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر آگے چل کر جب فوج دو ٹیلوں کے پاس پہنچی تو رافعؓ نے لوگوں سے کہا:

"دیکھو! عوسج کی کوئی جھاڑی آدمی کے سرین کی مانند نظر آتی ہے؟"

انھوں نے کہا ہمیں تو ایسی کوئی جھاڑی نظر نہیں آتی۔ اِس پر رافع نے گھبرا کر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا اگر خیریت چاہتے ہو تو جس طرح ہو سکے اسے ڈھونڈ نکالو۔ آخر بڑی تلاش سے وہ جھاڑی ملی مگر کسی نے اسے کاٹ دیا تھا اور صرف تنہ باقی رہ گیا تھا۔ جھاڑی ملنے پر مسلمانوں نے زور سے تکبیر کہی۔ رافع نے کہا:

"اب اِس جھاڑی کی جڑ کے قریب مٹی کھودو۔"

مٹی کھودنے پر وہاں ایک چشمہ نکل آیا جس سے سب نے سیر ہو کر پانی پیا۔ جب مسلمانوں کو اپنی سلامتی کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو رافع نے کہا:

"مَیں اِس چشمے پر صرف ایک مرتبہ بچپن کے زمانے میں اپنے والد کے ساتھ آیا تھا۔"

اب خالدؓ شام کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر راستے میں انھیں کوئی دقت و پریشانی لاحق نہ ہوئی اور وہ جلد جلد سفر طے کرتے ہوئے سوئی پہنچ گئے۔ وہ صبح سے ذرا پہلے وہاں پہنچے تھے اور پہنچتے ہی بستی پر حملہ کر دیا۔ وہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کی آمد کا سان گمان بھی نہ تھا۔ وہ گھبرا گئے اور مقابلے کی تاب نہ لا کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ آگے چل کر اہل تدمر سے مقابلہ پیش آیا۔ وہ بھی تھوڑی سی مقاومت کے بعد زیر ہو گئے۔ دمشق قریب ہی تھا لیکن خالدؓ نے اس پر حملہ نہ کرنا چاہا کیونکہ اس طرح وہ راستے ہی میں رومیوں سے الجھ جاتے اور اپنے پروگرام کے مطابق مسلمانوں کی مدد کے لیے یرموک نہ پہنچ سکتے۔ اس لیے انھوں نے عام راستہ چھوڑ کر حوارین کا راستہ اختیار کیا اور قصم پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے جو قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے صلح کر لی۔ وہاں سے اذرعات کی جانب مڑے۔ مرج راہط پہنچ کر غسانیوں سے ان کی مٹ بھیڑ ہوئی۔ خالدؓ نے انھیں شکست دے کر وہاں کے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ مرج راہط سے چل کر وہ بصریٰ پہنچے۔ یہاں ابوعبیدہ بن جراح، شرحبیل بن حسنہ اور یزید بن ابی سفیان فوجیں لیے پڑے تھے۔ خالدؓ نے انھیں ساتھ لے کر شہر پر حملہ کر دیا اور اسے فتح کر لیا۔ یہاں سے یہ تمام قائدین فوجوں کے ہمراہ عمروؓ بن عاص کے پاس پہنچے جو فلسطین میں غور کے نزدیک عربات میں مقیم تھے۔ خالدؓ ساتھیوں کے قریب ہی خیمہ زن ہوئے اور اس طرح تمام اسلامی فوجیں یرموک کے مقام پر جمع ہو گئیں۔

یہ ہے وہ روایت جو خالدؓ کے سفر شام سے متعلق بالعموم کتب تاریخ میں پائی جاتی ہے بادی النظر میں یہ روایت ان افسانوں سے زیادہ مختلف نہیں جو عموماً بڑے بڑے لوگوں کے متعلق گھڑ کر مشہور کر دیے جاتے ہیں۔ رافع بن عُمیرہ کی رہبری میں صحرا کو عبور کرنے کا واقعہ بظاہر بہت عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تصدیق سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خالدؓ کی ساری زندگی ہی عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا عیاض بن غنم کی امداد کے لیے عین التمر سے دومۃ الجندل پہنچنے کا واقعہ عجیب و غریب نہیں؟ کیا خالدؓ کے خفیہ حج کرنے کا واقعہ لوگوں کی عقلوں کو حیرت میں نہیں ڈال دیتا؟ اور کیا مسیلمہ کی سرکوبی اور عراق کی عظیم الشان فتوحات لوگوں کو ششدر کرنے کے لیے کافی نہیں؟ خالدؓ مقصد کے حصول کے بے

ہمیشہ ایسے طریقے استعمال کرتے تھے جن کی بنا پر کم سے کم وقت میں بہتر سے بہتر طور پر مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اس موقع پر بھی خالدؓ نے حسب معمول یہی کیا اور اس خوف ناک و دشوار گزار صحرا سے گزر کر شام پہنچے تاکہ راستے میں دشمنوں سے مڈ بھیڑ نہ ہو سکے اور وہ بہ آسانی اسلامی افواج تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور دشمن انھیں راستے میں نہ روک سکا۔

بعض مورخین نے اس روایت کو تو اپنی کتابوں میں درج کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کی ہے کہ روایت میں کوئی حصہ ایسا نہ آنے پائے جو عقل کے خلاف ہو۔ اسی لیے مورخین میں اس لشکر کی تعداد کے متعلق بھی اختلاف موجود ہے جو خالدؓ کے ساتھ عراق سے آیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی تعداد نو ہزار تھی، بعض کہتے ہیں کہ چھ ہزار تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ آٹھ سو اور پانچ سو کے درمیان تھی۔ جو لوگ لشکر کی تعداد نو ہزار بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے حکم کے ماتحت خالدؓ عراق سے آدھی فوج لے کر چلے تھے۔ اس وقت عراق میں مسلمانوں کی فوج اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ جو لوگ فوج کی تعداد ایک ہزار سے کم بتاتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ خالدؓ کو شام محض اس لیے بھیجا گیا تھا کہ عرب اور عجم میں ان کی بہادری، شجاعت اور قیادت کی دھوم مچی ہوئی تھی اور بڑے بڑے سپہ سالار اور پر ہیبت شہنشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ اس لیے ان کا وہاں بھیجا جانا محض دشمن پر رعب ڈالنے کے لیے تھا ورنہ جو فوجیں رومیوں کے بالمقابل صف آرا تھیں، وہ تعداد میں ہرگز کم نہ تھیں، علاوہ بریں مدینہ سے ان کے لیے برابر کمک پہنچ رہی تھی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ خالدؓ عراق سے تو یقیناً آدھی فوج لے کر روانہ ہوئے تھے لیکن قراقر پہنچنے پر جب تنگ و تاریک جنگل سے گزرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو انھوں نے اپنے ساتھ صرف چند سو سپاہی رکھے اور باقی لشکر کو وادی سرحان کے عام راستے سے شام پہنچنے کی ہدایت کی۔ انھیں چند سو ساتھیوں کے ساتھ وہ بصریٰ پہنچے۔ ہماری رائے میں یہی روایت زیادہ قابل قبول ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، خالدؓ راستے میں رومیوں کے تصادم سے بچنا چاہتے تھے اس لیے آسان راہ یہی تھی کہ وہ اپنے لشکر کا بڑا حصہ چھوڑ دیتے اور بہت تھوڑے آدمی لے کر کوچ کرتے کیونکہ ایک معمولی دستے کے لیے تو یہ ممکن ہوتا ہے کہ اگر وہ دشمن کو دیکھ بھی لے تو چابک دستی کی بدولت راہ کاٹ کر پھرتی سے نکل جائے لیکن کئی ہزار پر مشتمل ایک بھاری

لشکر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دشمن کی آنکھ بچا کر ایک طرف کو ہٹ جائے۔

بہرحال اس بارے میں خواہ روایات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، یہ بات یقینی ہے کہ خالدؓ بہ خیریت یرموک پہنچ کر اسلامی لشکروں سے مل گئے اور ان کے ساتھ رومیوں سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہرقل نے باہان کو سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بڑے کروفر سے آیا اور واقوصہ میں مقیم رومی فوج سے جاملا۔ باہان وہی شخص تھا جس نے خالدؓ بن سعید کو شکست دی تھی۔ رومیوں کو باہان کے پہنچنے کی بے حد خوشی ہوئی اور مسلمانوں کو خالدؓ بن ولید کے پہنچنے سے بے اندازہ مسرت۔ اب دونوں فوجیں کیل کانٹے سے لیس ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی تھیں اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور مدمقابل کو زیر کرنے کے لیے ہمہ تن تیار تھیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ موقع بے حد نازک تھا۔ ایک تو رومیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ دوسرے ساز و سامان اور جنگی تیاری کے لحاظ سے بھی مسلمانوں اور رومیوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ رومی پوری سج دھج اور کامل جنگی تیاری سے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلے تھے۔ پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ رومیوں کو عربوں سے زیادہ جنگی مہارت بھی حاصل تھی اور وہ لڑائی کے طور طریقوں کو عربوں سے زیادہ جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کامل دو ماہ تک فریقین کے درمیان کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ رومیوں کو ظاہری قوت و طاقت کے لحاظ سے تو بے شک عربوں پر برتری حاصل تھی لیکن باطنی قوت میں مسلمان ان سے کئی گنا بڑھے ہوئے تھے۔ رومی افواج شام میں مقیم بدوؤں اور ہرقل کے ان لشکروں پر مشتمل تھیں جنھوں نے اس سے قبل ایرانیوں سے جنگ کی تھی۔ اول تو ان دونوں گروہوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی، دوسرے ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا جس کی خاطر وہ جنگ کے لیے نکلے تھے۔ لیکن ان کے مقابل مسلمانوں کی فوجیں تمام تر عربوں پر مشتمل تھیں، دوسرے انھیں کامل یقین تھا کہ رومیوں سے لڑائی جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں شامل ہے۔ جو شخص اس لڑائی میں مارا جائے گا اسے شہادت کا درجہ حاصل ہوگا، آخرت میں اُسے جنت الفردوس ملے گی اور وہ اللہ کی رضا و خوشنودی سے کاملاً بہرہ ور ہوگا مگر جو شہادت حاصل نہ کرسکے گا اللہ کے دربار میں اُسے بھی مجاہدین کا درجہ نصیب ہوگا اور وہ بھی شہدا کی طرح اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔ اس دنیا میں

اسے مالِ غنیمت سے جو حصہ ملے گا وہ اس کے علاوہ ہوگا۔ گویا ایک طرف اپنی زبردست جمعیت کا زعم تھا اور دوسری طرف ایمانی قوت کارفرما تھی۔ ایک طرف ظاہری ساز و سامان پر بھروسا تھا اور دوسری طرف روحانیت جلوہ گر تھی۔

دن اور ہفتے گزرتے چلے گئے لیکن فریقین کی فوجیں اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں اور ان میں حرکت کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ خالدؓ بن ولید کے لیے یہ صورتِ حال قطعاً ناقابلِ برداشت تھی۔ آج تک مدِمقابل کو دیکھ کر ان سے صبر نہ ہو سکا تھا۔ لیکن موقع ایسا تھا کہ خالدؓ اکیلے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت مسلمان افواج چار حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ہر حصہ فوج علٰحدہ علٰحدہ قائد کے ماتحت تھا۔ حدیہ کہ اذان بھی ہر لشکر میں علٰحدہ علٰحدہ ہوتی تھی۔ خالدؓ عراق سے صرف ساتھیوں کی امداد کے لیے آئے تھے، انھیں ان پر امیر بنا کر نہ بھیجا گیا تھا۔ ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قلیل التعداد فوج کے ساتھ اکیلے ہی دشمنوں کے لشکرِ جرار پر حملہ کر دیتے۔ رومیوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملے کرنے شروع کر دیے لیکن ان کے حملے بھی زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکے۔ مسلمان ان کے حملوں کو پسپا کر کے اپنے اپنے کیمپوں میں واپس آجاتے۔

خالدؓ کے لیے یہ ایام بڑے صبر آزما تھے۔ ابوبکرؓ نے انھیں شامی افواج کی قیادت سپرد نہ کی تھی۔ خالدؓ خود بھی ایسی درخواست نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس طرح دوسرے امرا کے دلوں میں حسد پیدا ہو جاتا۔ ادھر مدینہ میں ان کے خلاف ایک طاقت ور محاذ پہلے ہی سے قائم تھا۔ وہ سختی سے اس درخواست کی مخالفت کرتا۔ لیکن یرموک کے کنارے جو واقعات پیش آ رہے تھے وہ مسلمانوں کی ہمتیں پست کر دینے کے لیے کافی تھے۔ رومی برابر صفیں منظم کرنے میں مصروف تھے اور ان کے کیمپ سے آنے والی خفیہ خبروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ مسلمانوں پر بھرپور حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔ خالدؓ کے علاوہ دیگر تمام امرا کو رومیوں کی تیاریوں اور ان کے خوف ناک ارادوں کا علم تھا۔ اس صورت میں خالدؓ کے لیے یہی راستہ تھا کہ وہ ان امرا کو ایک متحدہ قیادت قبول کرنے کا مشورہ دیتے لیکن اپنی ذات کے سوا انھیں اور کسی پر بھروسا نہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے کسی بھی شخص کو تمام اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بنانے کی تجویز پیش کی تو دوسرے لوگ ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ اب کریں تو کیا کریں؟

باہان کے آنے کے بعد رومیوں کی جنگی تیاریاں تیز تر ہو گئیں۔ وہ متعدد پادریوں کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ پادری اشتعال انگیز تقریروں سے رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے اور عیسائیت کی سلامتی کا واسطہ دے کر انھیں جنگ پر ابھارتے تھے۔ واشگاف الفاظ میں رومیوں کو بتاتے تھے کہ اگر اس موقع پر انھوں نے جم کر مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیا اور انھیں ختم کرنے کی تدابیر نہ کیں تو عیسائیت کا خاتمہ ہے اس لیے انھیں عیسائیت کی بقا کی خاطر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے اور کسی طور مسلمانوں کو زندہ نہ چھوڑنا چاہیے۔

ان آتشیں تقریروں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ رومی لشکر میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا اور ہر رومی عیسائیت کی بقا کی خاطر جان دینے کو تیار ہو گیا۔ آخر ایک دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ رومی کیل کانٹے سے لیس اگلے روز ان پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ باہان نے اس طرح ان کی صف بندی کی ہے جس کی نظیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ سن کر مسلمان امرا کو فکر پیدا ہوا اور وہ اکٹھے ہو کر رومیوں سے مقابلہ کرنے کی تدابیر سوچنے لگے۔

ہر امیر نے مختلف تجاویز پیش کیں لیکن لشکر کی صف بندی کے متعلق کسی نے کوئی رائے نہ دی کیونکہ ہر امیر اپنے لشکر کی صف بندی کا خود ذمہ دار تھا۔ جب خالدؓ کی باری آئی تو وہ کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"آج کا دن اللہ کے اہم دنوں میں سے ہے۔ آج کسی کے لیے فخر و مباہات اور خود رائی و خود ستائی مناسب نہیں۔ تمھارا جہاد خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے اور تمھیں اپنے اعمال کو خدا کی خوشنودی کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ یاد رکھو آج کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی ہے۔ ایک ایسی قوم سے، جو ہر طرح منظم و مرتب ہے، تمھارا علحدہ علحدہ لڑنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ جو تم سے دور ہیں (ابوبکرؓ) تمھارے حال کا علم ہوتا تو وہ کبھی تمھیں اس طرح لڑنے کی اجازت نہ دیتے۔ بے شک تمھیں ان کی طرف سے تو کوئی حکم نہیں ملا لیکن تم اس معاملے کو اس طرح انجام دو گویا یہ تمھارے خلیفہ اور ان کے خیر خواہوں کا حکم ہے۔"

خالدؓ کی یہ تقریر سن کر کچھ دیر تک امرائے عساکر پر مکمل خاموشی طاری رہی اور ہر شخص سر

بھکائے اس معاملے کے متعلق سوچتا رہا۔ آخر انھیں یقین ہو گیا کہ جو کچھ خالدؓ نے کہا وہ بالکل سچ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تین مہینے ہونے کو آئے وہ رومیوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے، الٹا مسلمانوں کی حالت . . . . . سے فائدہ اٹھا کر رومیوں نے اپنے آپ کو مضبوط اور طاقت ور بنا لیا۔ اس وقت ان تمام امراء کے دلوں میں یہ خیالات گردش کر رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ رومیوں نے غلبہ پا لیا اور انھیں شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تو ان ولایات کا کیا ہو گا جو ابوبکرؓ نے شام آنے سے قبل ان کے لیے مقرر کی تھیں۔ اگر ابوعبیدہ حمص نہ پہنچ سکے تو وہاں کی ولایت کیونکر حاصل کر سکیں گے؟ اگر مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا تو یزید بلقار کی امارت پر کس طرح قبضہ حاصل کر سکیں گے؟ اگر انھیں پسپائی اختیار کرنی پڑی تو شرحبیل اردن پر کیونکر تسلط بٹھا سکیں گے؟ اگر اس سرزمین میں مسلمانوں کے قدم نہ ٹھہر سکے تو عمروؓ بن عاص عربہ میں کس طرح حکومت قائم کر سکیں گے؟ اگر رومی مسلمانوں پر غالب آ گئے تو یہ امراء کیا منہ لے کر مدینہ میں داخل ہو سکیں گے؟ اور اہل مدینہ سے کیونکر آنکھیں چار کر سکیں گے۔

آخر انھوں نے کہا:

"آپ ہی بتلایئے اس موقع پر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟"

خالدؓ نے جواب دیا:

"ابوبکرؓ نے ہمیں اس خیال سے یہاں بھیجا تھا کہ ہم یہ مہم بہ آسانی سر کر لیں گے۔ اگر انھیں موجودہ حالات کا علم ہوتا تو وہ ضرور تمھیں اکٹھا رکھتے۔ جن حالات میں سے تم گزر رہے ہو وہ پہلے واقعات کے مقابلے میں بہت سخت اور مشرکین کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم علیحدہ علیحدہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو الگ شہر کے لیے نامزد کیا گیا ہے لیکن اگر تم اس موقع پر کسی ایک شخص کو امیر تسلیم کر کے اس کی اطاعت اختیار کر لو تو اس سے نہ تمھارے مراتب میں کوئی فرق پڑے گا اور نہ اللہ اور امیر المومنین کے نزدیک تمھارا درجہ کم ہو گا۔ ذرا دیکھو تو سہی دشمن نے کتنی زبردست تیاری کر رکھی ہے۔ یاد رکھو اگر آج ہم نے انھیں ان کی خندقوں میں دھکیل دیا تو ہم ہمیشہ انھیں دھکیلتے ہی رہیں گے لیکن۔

لیکن اگر انھوں نے ہمیں شکست دے دی تو ہم پھر کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ میری تجویز اس بارے میں یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو باری باری امارت کا موقع ملنا چاہیے۔ اگر آج ایک امیر ہے تو کل دوسرا، پرسوں تیسرا، اترسوں چوتھا یہاں تک کہ ہر شخص کو امیر بننے کا موقع مل جائے۔ آج کے لیے تم مجھے امیر بنا دو۔"

جنگ کا آغاز

خالدؓ کی رائے نہایت معقول تھی۔ تمام امرا اس پر متفق ہو گئے اور پہلے روز کے لیے انھوں نے خالدؓ کو امیر مقرر کر دیا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رومیوں کی یورش آج بھی عام دنوں کی طرح ہو گی اور لڑائی بہرحال طول کھینچے گی اس لیے باری باری ہر ایک کو امیر بننے کا موقع مل جائے گا۔

خالدؓ نے اس ایک مہینے کے دوران میں رومیوں کی ترتیب اور صف بندی کا بہ غور مطالعہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ان کے مقابلے کے لیے ایک ایسا طریقہ استعمال کرنا چاہا جو نہ صرف رومیوں پر رعب ڈالنے والا ہو بلکہ اس کے ذریعے سے فتح بھی حاصل ہو سکے۔ انھوں نے اسلامی لشکر کو اڑتیس دستوں میں تقسیم کیا (ہر ایک دستہ کم و بیش ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا) اور فرمایا:

"تمھارے دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ کثرتِ تعداد پر نازاں ہے۔ اس کے مقابلے میں یہی تدبیر مناسب ہے کہ ہم اپنی فوج کے بہت سے دستے بنا لیں تاکہ دشمن کو ہماری تعداد اصل سے بہت زیادہ نظر آئے۔"

قلب میں انھوں نے اٹھارہ دستے رکھے اور ابوعبیدہ کو ان کا سردار بنایا۔ ان دستوں میں عکرمہ بن ابوجہل اور قعقاع بن عمرو بھی شامل تھے۔ میمنہ پر دس دستے متعین کیے اور ان کا سردار عمرو بن عاص کو بنایا۔

ان دستوں میں شرحبیل بن حسنہ بھی تھے۔ میسرہ پر دس دستے متعین کیے اور ان کا سردار یزید بن ابی سفیان کو مقرر کیا۔ ہر دستے کا علیحدہ سردار بھی تھا جو میمنہ، میسرہ اور قلب کے سرداروں سے احکام حاصل کرتا تھا۔ ان دستوں کے سردار وہ لوگ تھے جو بہادری، جواں مردی اور شجاعت میں اپنی نظیر آپ تھے، مثلاً قعقاع بن عمرو، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ وغیرہ۔

خالدؓ نے اس ترتیب کے علاوہ لشکر کا ایک ہراول دستہ بھی بنایا تھا جس پر غیاث بن اشیم مقرر تھے۔ قاضی کی خدمت ابوالدرداء کے سپرد ہوئی۔ لشکر کے قاری مقداد تھے جو لشکر کو سورۂ انفال پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ سامان کے افسر عبداللہ بن مسعود تھے۔ واعظ ابوسفیان تھے۔ وہ لشکر میں گشت کرتے رہتے اور ہر دستے کے سامنے ٹھہر کر کہتے:

"اللہ اللہ! تم حامیانِ عرب ہو اور دینِ اسلام کے مددگار۔ تمھارے مدِمقابل حامیانِ روم اور شرک کے مددگار ہیں۔ اے اللہ! آج کی جنگ صرف تیرے نام کے لیے ہے۔ اے اللہ! اپنے بندوں پر اپنی مدد نازل فرما!"

خالدؓ نے ایک شخص کو کہتے سنا:

"اوہو! رومی کتنے زیادہ ہیں اور مسلمان کتنے کم!"

یہ سن کر خالدؓ کو سخت طیش آیا اور وہ چلّا کر بولے:

"اوہو، رومی کتنے کم ہیں اور مسلمان کتنے زیادہ! یاد رکھو فوجیں اللہ کی مدد کی بدولت زیادہ ہوتی ہیں اور ناکامی و بزدلی کی وجہ سے کم ہوتی ہیں۔ فتح و شکست کا انحصار آدمیوں کی کثرت و قلت پر نہیں ہوتا۔"

پھر فرمایا:

"کاش (میرے گھوڑے) اشقر کا پاؤں اچھا ہوتا پھر چاہے دشمن تعداد میں ہم سے کتنے گنا زیادہ کیوں نہ ہوتے مجھے ان کی مطلق پروا نہ ہوتی۔"

خالدؓ کے یہ الفاظ سارے لشکر میں پھیل گئے۔ ہر شخص کے سینے میں غیرت و حمیت کے جذبات بھڑکنے لگے اور ہر دل میں شہادت کی تمنا لہریں لینے لگی۔ ہر زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

"فوجیں اللہ کی مدد کی بدولت زیادہ ہوتی ہیں اور ناکامی و بزدلی کی وجہ سے کم ہوتی ہیں۔"

ہر شخص کے سامنے پچھلی جنگوں کے منظر آ گئے جن میں کفار بے پناہ طاقت سے مسلمانوں کے مقابلے میں آئے لیکن ایمانی قوت کے سامنے اُن کی ایک نہ چل سکی اور ہر بار انھیں انتہائی ذلت و رسوائی سے پسپا ہونا پڑا۔

مسلمانوں میں اس وقت اتنا جوش و خروش پیدا ہو چکا تھا کہ شام آنے کے بعد سے اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ خالدؓ نے آج فتح حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب خالدؓ کسی کام کا ارادہ کر لیں تو کوئی طاقت انھیں باز نہیں رکھ سکتی۔ ادھر انھوں نے رومیوں کو پوری طاقت و قوت سے میدانِ جنگ میں صفیں باندھے ہوئے دیکھا۔ وہ مسلمانوں کی طاقت کو کلیۃً ختم کر دینے کے ارادے سے میدان میں آئے تھے۔ اس وقت انھیں خالدؓ کے یہ الفاظ یاد آئے:

"آج کا دن اللہ کے اہم دنوں میں سے ہے ۔۔۔۔ اللہ نے جنت کے دروازے مومنوں کے لیے کھول دیے ہیں۔ آج جو شخص موت قبول کرتا ہے اُسے ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی جائے گی۔"

ان الفاظ نے ان کے عزم و حوصلہ میں بے پناہ زور پیدا کر دیا اور وہ انتظار کرنے لگے کہ کب حملے کا حکم ملتا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔

جس طرح مسلمانوں کو رومیوں کی تیاری کی اطلاع مل گئی تھی اسی طرح رومیوں کو بھی مسلمانوں کی نقل و حرکت کا حال معلوم ہو گیا۔ غالباً اس علاقے کے رہنے والے کچھ بدو دونوں لشکروں کے درمیان جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ خالدؓ کو منجملہ دیگر اطلاعات کے یہ اطلاع بھی ملی کہ ان کے آنے کی وجہ سے رومیوں کے بعض سرداروں کے دلوں میں سخت گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ ان گھبرائے ہوئے بے چین سرداروں میں جرجہ بھی شامل تھا۔ یہ شخص یا تو عربی النسل تھا یا تھا تو رومی لیکن سالہا سال سے شام میں رہنے کے باعث عربی بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اسے مسلمانوں کی بہت سی باتوں کا بخوبی علم تھا۔ جب اس کے جاسوسوں نے اُسے خالدؓ کی بے نظیر اور عظیم الشان فتوحات کی اطلاع دی تو بے اختیار اس کے دل میں خالدؓ سے ملنے اور ان سے گفتگو کی خواہش پیدا ہوئی۔ خالدؓ کو بھی کسی اس خواہش کا علم ہو گیا جب باہان نے رومی دستوں کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلنے کا حکم دیا تو جرجہ ہراول دستے پر متعین تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر خالدؓ کو پکارا۔ خالدؓ فوج سے نکل کر آئے اور دونوں لشکروں کے درمیان اسے ملے دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ رومیوں نے یہ سمجھا کہ جرجہ کو مدد کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مسلمانوں پر زور شور سے حملہ کیا اور انھیں اپنی جگہ سے پیچھے ہٹا دیا۔

عکرمہ خالدؓ کے خیمے کے سامنے اپنا دستہ لیے کھڑے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان رومیوں کے حملے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے لگے تو غیرت و حمیت ان کی رگ رگ میں سرایت کر گئی اور انھوں نے چلا کر رومیوں سے کہا:

"میں رسول اللہ جیسے مقدس انسان سے ہر میدان میں لڑتا رہا ہوں، کیا آج کی لڑائی میں تم سے ڈر کر بھاگ جاؤں گا؟ واللہ! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ ساتھیوں کی طرف مڑے اور کہا:

"آؤ، موت کے لیے کون بیعت کرتا ہے؟"

یہ سن کر ضرار بن ازور، حارث بن ہشام، ان کے لڑکے عمرو بن عکرمہ اور چار سو دوسرے بہادر و معزز مسلمانوں اور شہسواروں نے عکرمہ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور عکرمہ انھیں لے کر رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ رومیوں کے پاؤں اس ناگہانی حملے کی وجہ سے لڑکھڑا گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عین اسی وقت جرجہ نے خالدؓ سے گفتگو کے نتیجے میں اسلام قبول کر لیا اور اپنا دستہ لے کر مسلمانوں سے مل گیا۔ یہ امر رومیوں میں مزید بدحواسی اور ابتری پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

فتح یرموک

جب خالدؓ نے رومی لشکر کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو انھوں نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے اور رومیوں پر زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا۔ عکرمہ کے دستے کا زور کیا کم تھا جو اب خالدؓ کے لشکر نے قیامت ڈھانی شروع کی۔ رومیوں کے لیے اب کوئی جائے فرار نہ تھی۔ پیچھے واقوصہ کی ہولناک گھاٹی اور گہرے کھڈ ان کا راستہ روکے ہوئے تھے اور سامنے سے مسلمانوں کا لشکر انھیں بے دریغ قتل کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ خالدؓ تلوار ہاتھ میں لیے سب سے آگے آگے تھے۔ اس موقع پر مسلمان عورتیں بھی اپنے مردوں سے کم نہ رہیں اور انھوں نے بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ ابو سفیان کی بیٹی جویریہ نے جو نمونہ اس موقع پر دکھایا اس نے اس واقعے کی یاد تازہ کر دی جو غزوۂ احد کے موقع پر اس کی والدہ ہند کے ذریعے سے ظہور پذیر ہوا تھا۔

رومی بھی اپنی مدافعت میں جان توڑ کر لڑے۔ جو مسلمان ان کے قابو میں آگیا زندہ نہ بچ سکا۔

رومیوں کی شجاعت اور جواں مردی کی وجہ سے خاصی دیر تک لڑائی کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا شام ہو گئی مگر لڑائی جاری رہی۔ عکرمہ اور ان کے ہاتھ پر موت کی بیعت کرنے والے لوگوں میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹا۔ یہ لوگ معرکے کے آغاز سے انجام تک انتہائی جواں مردی سے دشمن کے سامنے ڈٹے رہے اور بڑھ چڑھ کر حملے کرتے رہے۔ سورج غروب ہونے پر رومیوں میں ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ان کے سواروں کے چہروں سے شدید تھکاوٹ کے آثار ہویدا تھے اور وہ بھاگنے کے لیے کسی راستے کی تلاش میں تھے لیکن اس وقت ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ واقوصہ کی گھاٹی ان کے پیچھے تھی اور مسلمان ان کے آگے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

خالدؓ نے اندازہ کر لیا کہ رومی سواروں کا فرار ان کے ساتھیوں کے لیے مزید کم زوری کا باعث ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آدمیوں کو ایک طرف ہٹ جانے کا حکم دیا جب ان سواروں نے راستہ کھلا دیکھا تو بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس راستے سے نکلے چلے گئے اور سرزمین شام میں منتشر ہو گئے۔ جب میدان رومی سواروں سے خالی ہو گیا تو خالدؓ اپنے سوار اور پیدل دستے لے کر رومیوں کے پیدل دستوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا صفایا کرنا شروع کیا۔ رومی اپنی خندق میں گھس گئے۔ خالدؓ وہاں بھی پہنچ گئے تو انھوں نے واقوصہ کی گھاٹی کا رُخ کیا۔ اکثر رومیوں نے میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے کے لیے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دھڑا دھڑ اس گھاٹی میں گرنے لگے۔ اگر ایک گرتا تھا تو دس کو ساتھ لے کر گرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی دیوار مع بنیاد زمین بوس ہو گئی ہے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ کھڈ کو نہ دیکھ سکے۔ جو رومی بھاگ کر ادھر آتے انھیں خبر نہ ہوتی کہ آگے والوں پر کیا گزری، وہ بھی اس کھڈ میں گرتے جاتے۔ طبری کے بیان کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار رومی واقوصہ کی گھاٹی کی نذر ہوئے۔ ان میں سے اسی ہزار نے اپنے آپ کو بیڑیوں سے باندھ رکھا تھا۔ یہ تعداد ان سواروں اور پیدلوں کے علاوہ ہے جو میدانِ جنگ میں کام آئے۔ یہ لڑائی دن اور رات کے اکثر حصے میں جاری رہی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی خالدؓ رومی لشکر کے سپہ سالار اعظم کے خیمے تک پہنچ چکے تھے۔

ہرقل کا بھائی تذارق بھی اسی معرکے میں قتل ہوا، فیقار اور اس کے ساتھی جن کا شمار رومیوں کے سرکردہ اور معزز اشخاص میں ہوتا تھا، جنگ میں مارے جانے سے بچ گئے تھے لیکن

وہ اس عبرت ناک شکست کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے آپ کو ذلت سے بچانے کے لیے ٹوپیوں سے منہ چھپا لیے اور میدان کے ایک جانب بیٹھ کر کہا کہ اگر ہم مسرت کا دن دیکھنے اور عیسائیت کی حمایت کرنے کے قابل نہیں تو ذلت و بدبختی کا یہ دن بھی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ وہ لوگ اسی حالت میں قتل کر دیے گئے اور موت انھیں عار سے بچانے کا موجب ہوئی۔ باہان نے بھاگ کر جان بچائی اور بعد کی جنگوں میں دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے پر آیا لیکن اس کا حشر ہمیشہ یرموک سے کم نہ ہوا۔

رومیوں کو کامل شکست ہو چکی تھی مسلمان ان کی لشکر گاہ میں داخل ہوئے۔ خالدؓ نے ہرقل کے بھائی تذارق کے خیمے میں رات گزاری۔ صبح کو جب انھوں نے میدان میں نگاہ دوڑائی تو حد نظر تک کسی رومی کا نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو میدان ایک روز قبل رومی افواج قاہرہ سے بھرپور تھا، جہاں بڑے قیمتی جنگی گھوڑے جولانیاں دکھاتے تھے، جہاں ہر طرف عالی شان اور بلند و بالا خیموں کی قطاریں نظر آتی تھیں وہاں اب ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ کسی رومی کا نام و نشان نظر آتا تھا نہ کسی گھوڑے کا۔ عالی شان اور بلند و بالا خیمے موجود تھے لیکن مالکوں سے خالی تھے اور ان کی جگہ مسلمان ان میں آرام کر رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر خالدؓ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور انھوں نے اللہ کے اس عظیم الشان احسان کا شکر ادا کرنے کے لیے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا لیے۔

جنگ یرموک میں مسلمان شہدا کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ اس لڑائی میں تین ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے جن میں جلیل القدر صحابہ اور بڑے بڑے بہادروں اور شہسواروں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ معرکے کے دوران میں عکرمہ بن ابوجہل اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ کے جسم تلواروں اور نیزوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ فتح کے بعد انھیں تذارق کے خیمے میں خالدؓ کے پاس لایا گیا۔ خالدؓ نے عکرمہ کا سر اپنی ران پر اور عمرو بن عکرمہ کا سر اپنی پنڈلی پر رکھ لیا اور ان کے چہروں سے مٹی پونچھنے اور حلق میں پانی ٹپکانے لگے۔ اسی عالم میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ابوسفیان کی آنکھ میں ایک تیر لگ گیا جسے ابوحثمہ نے نکالا۔

اس جنگ کا انجام رومیوں کے لیے بہت حسرت ناک تھا۔ ان کی تمام امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ تمام منصوبے ملیا میٹ ہو گئے تھے۔ ہرقل ان دنوں حمص میں مقیم تھا جونہی اس نے

اپنے لشکر کی عبرت ناک شکست کی خبر سنی وہ ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنا کر خود وہاں سے بھاگ گیا۔ ادھر مسلمانوں نے جنگ یرموک سے فراغت حاصل کرتے ہی اردن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں اُسے رومیوں سے پاک کرالیا۔ اس کے بعد انھوں نے دمشق کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

دمشق کا محاصرہ، اس کی فتح اور بعد کے واقعات طبری اور اُن کے خوشہ چینوں کے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ کی خلافت کے ایام ہی میں پیش آئے۔ جنگ یرموک کے دوران میں بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا ذکر ہم نے درمیان میں کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ گو تمام مؤرخین نے ان کا ذکر کیا ہے پھر بھی ترتیب میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ہم نے اس سے پہلے صرف انہی واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو طبری اور اس کے خوشہ چین مؤرخین نے بالاتفاق اپنی کتابوں میں بیان کیے ہیں۔ ان واقعات میں سب سے مشہور واقعہ یہ ہے کہ عین اس وقت جب گھمسان کی جنگ جاری تھی، مدینہ سے ایک قاصد محمیہ بن زنیم میدان جنگ میں پہنچا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا اور مدینہ کے حالات پوچھنے شروع کیے۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر کہا کہ مدینہ میں ہر طرح خیریت ہے اور تمھاری امداد کے لیے فوجیں آ رہی ہیں۔ لوگ اسے خالدؓ کے پاس لے آئے۔ اس نے انھیں علیحدگی میں لے جا کر ابوبکرؓ کی وفات کی خبر سنائی اور ایک خط بھی دیا۔ یہ خط عمرؓ کی طرف سے تھا اور اس میں انھوں نے خالدؓ کو امارت سے معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہؓ کو قیادت سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ خالدؓ نے یہ خط پڑھا اور اسے ترکش میں ڈال لیا مبادا یہ خبر لشکر میں پھیل کر لوگوں کی پست ہمتی کا سبب بن جائے۔ جب جنگ ختم ہو چکی اور خالدؓ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے رومیوں پر فتح حاصل کر لی تو وہ لشکر کی قیادت سے علیحدہ ہو گئے اور خلیفۂ ثانی کے احکام کے مطابق امارت ابوعبیدہؓ کو سونپ دی۔

جہاں تک خالدؓ کی معزولی کا تعلق ہے کسی بھی مؤرخ کو اس سے اختلاف نہیں۔ البتہ اختلاف ہے تو اس بات میں کہ آیا یہ خط خالدؓ کے نام تھا یا ابوعبیدہؓ کے نام۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ خالدؓ کی معزولی کا حکم خود ان کے پاس نہیں بلکہ ابوعبیدہؓ کے پاس آیا تھا لیکن ابوعبیدہؓ نے اسے مخفی رکھا اور دمشق کے محاصرے تک اس کی اطلاع خالدؓ کو نہ دی۔ مگر بعض دوسرے مورخین کا کہنا

ہے کہ ابوعبیدہؓ نے یہ حکم اس وقت تک مخفی رکھا جب تک دمشق مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہ ہوگیا۔ شہر پر کامل تسلط کے بعد ابوعبیدہؓ نے یہ خط خالدؓ کو دکھا کر امارت خود سنبھال لی۔

طبری نے شامی افواج کی سپہ سالاری سے خالدؓ کی معزولی کے جو واقعات بیان کیے ہیں انھیں پڑھ کر قارئین کو عجیب پریشانی لاحق ہوتی ہے کیونکہ خالدؓ صرف اس فوج کے امیر تھے جو عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی، شام میں مقیم دوسری اسلامی افواج میں سے کسی کی امارت سے انھیں واسطہ نہ تھا۔ اسی طرح ابوعبیدہ بھی عمرو بن عاص، یزید بن ابی سفیان اور شرحبیل بن حسنہ کی طرح صرف اپنی فوج کے سردار تھے۔ جنگِ یرموک کے دن خالدؓ کو کل فوجوں کا سپہ سالار تمام سرداروں کی رضامندی سے بنایا گیا تھا۔ اور اگر پہلے ہی روز مسلمانوں کو فتح حاصل نہ ہو جاتی تو دوسرے روز کوئی دوسرا سردار سپہ سالار بنتا۔ یہ واقعات ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں طبری کے علاوہ دوسرے مؤرخین کی کتابیں بھی دیکھنی چاہئیں کہ آخر وہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

فتحِ شام کے متعلق دوسری روایات

اصل میں شام کی فتوحات کے بارے میں ازدی، واقدی اور بلاذری کا طبری سے بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ان اصحاب کی بیان کردہ روایات کے مطابق جنگِ یرموک شام کی پہلی جنگ نہ تھی۔ بلکہ اجنادین اور دمشق کی جنگیں اس سے پہلے ہو چکی تھیں۔ ان روایات کے مطابق ابوبکرؓ نے جنگہائے مرتدین ختم ہوتے ہی شام کی فتح کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وقت سرحد پر کوئی مسلمان فوج نہ تھی۔ ایک روز انھوں نے مدینہ کے اہل الرائے حضرات کو طلب فرمایا اور ان کے سامنے شام کی چڑھائی کے متعلق اپنی تجاویز رکھیں جن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ جب انھوں نے تمام لوگوں کو اپنا ہم نوا پایا تو یمن اور جنوبی عرب کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو پیغام بھیجے کہ وہ شام پہنچ کر اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کریں۔ اس اثنا میں وہ مدینہ، مکہ، طائف اور حجاز کے مسلمانوں کو بھی اسی غرض کے لیے تیار کرتے رہے۔ فوجوں کے اکٹھا ہو جانے پر انھوں نے چار آدمیوں کو علم عنایت فرمائے اور انھیں فوجوں کا سردار بنا کر شام کی جانب روانہ کر دیا۔ یہ چار اشخاص یزید بن ابی سفیان، ابوعبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور شرحبیل بن حسنہ تھے۔ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں

نے اِن چاروں اشخاص کے لیے وہ علاقے بھی مخصوص فرما دیے تھے جہاں کا انھیں والی بنایا تھا۔ تصادم سے بچنے کے لیے انھیں یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اگر کسی امیر کے مقرر کردہ علاقے میں کفار سے جنگ چھڑ جائے اور کوئی دوسرا امیر بھی اس وقت اس علاقے میں موجود ہو یا اسے مدد کے لیے طلب کیا گیا ہو تو لشکر کی قیادت عامہ اس امیر کے سپرد ہو گی جس کے علاقے میں جنگ ہو رہی ہو۔ اس کے بالمقابل ایک اور روایت میں یہ ہے کہ انھوں نے ابو عبیدہ بن جراح کو ان تمام افواج کا سپہ سالار اور یزید بن ابی سفیان کو امارت میں ان کا نائب بنایا تھا[1]۔ ان لشکروں کی روانگی کے انتظامات کی تکمیل اس وقت ہوئی جب ذوالکلاع حمیری اور یمن کے دوسرے تمام سردار اپنے قبائل مذحج، طیٔ اور اسد وغیرہ کو لے کر مدینہ میں حاضر ہو گئے۔ تیاری مکمل ہونے پر ابوبکرؓ نے سب سے پہلے یزید بن ابی سفیان کو ان کے لشکر کے ہمراہ شام روانہ فرمایا اور ان کے پیچھے پیچھے زمعہ بن اسود کو ایک فوج دے کر بھیجا۔

باقی لشکر ابھی مدینہ ہی میں تھے۔ جب گلیاں باہر سے آنے والے مجاہدین سے بھر گئیں تو ابوبکرؓ انھیں لے کر مدینہ سے باہر نکلے اور ثنیۃ الوداع پہنچ کر انھیں رخصت کیا۔ خالد بن سعید بن عاص بھی اِن لشکروں کے ساتھ شام روانہ ہوئے لیکن انھوں نے اپنے چچیرے بھائی یزید بن ابی سفیان کے بجائے ابو عبیدہ بن جراح کے لشکر میں شامل ہونا پسند کیا کیونکہ وہ سابقون الاولون میں سے تھے اور انھیں رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے 'امین الامت' کا لقب مل چکا تھا۔ ان لشکروں کی روانگی کے بعد مدینہ میں یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں سے مزید لشکر پہنچنے شروع ہوئے۔ انھیں بھی ابوبکرؓ نے شام کی جانب روانہ فرما دیا اور اجازت دے دی کہ وہ اگلے لشکروں میں سے جس لشکر کے ساتھ چاہیں مل جائیں۔

ہرقل ان دنوں فلسطین میں تھا جب اسے مسلمانوں کی تیاریوں کی خبریں ملیں تو اس نے علاقوں کے سرداروں کو جمع کیا اور ان کے سامنے جوشیلی تقریریں کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے کہا "یہ بھوکے ننگے غیر مہذب لوگ صحرائے عرب سے نکل کر تم پر حملہ آور ہو نا

---

[1] بلاذری کی روایت ہے کہ جب ابوبکرؓ نے ابو عبیدہ کو حکم دے کر شام بھیجنا چاہا تو انھوں نے معذرت چاہی۔ بعد میں عمرؓ بن خطاب نے انھیں اپنے زمانۂ خلافت میں سارے شام کا والی بنا کر بھیجا۔

چاہتے ہیں۔ تم انھیں ایسا منہ توڑ جواب دو کہ پھر یہ کبھی تمھاری طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکیں۔ سامانِ حرب اور فوجوں کے ذریعے سے تمھاری پوری مدد کی جائے گی۔ جو امرا تم پر مقرر کیے گئے ہیں تم دل و جان سے ان کی اطاعت کرو۔ فتح تمھاری ہی ہو گی۔"

فلسطین کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار کر کے ہرقل دمشق آیا۔ وہاں سے حمص اور انطاکیہ پہنچا اور فلسطین کی طرح ان علاقوں میں بھی اس نے جوشیلی تقریریں کر کے وہاں کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ خود انطاکیہ کو ہیڈ کوارٹر بنا کر مسلمانوں سے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔

اسی اثنا میں ابو عبیدہ وادیٔ قریٰ اور حجر سے گزر کر سرزمین شام میں داخل ہو چکے تھے۔ مآب میں ایک رومی لشکر سے ان کی مٹ بھیڑ ہوئی۔ رومی لشکر مسلمانوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور اُسے جلد ہی شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ جابیہ پہنچنے پر ابو عبیدہ کو معلوم ہوا کہ ہرقل نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایسا عظیم الشان لشکر تیار کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس پر انھوں نے ابوبکرؓ کو تمام حالات لکھ کر مشورہ طلب کیا اور امداد کی درخواست بھی کی۔ اِدھر یزید بن ابی سفیان نے بھی ابوبکرؓ کو ایک خط لکھا لیکن اس میں رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں سے خوف کھانے کے بجائے اِس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہرقل کا فلسطین سے انطاکیہ پہنچ جانا خود اس کے خوف و ہراس پر دلالت کرتا ہے۔ ابوبکرؓ کو یزید کے خط سے بہت خوشی ہوئی اور انھیں جواب میں لکھا کہ تم اسی طرح ہمت بلند رکھو، اللہ یقیناً تمھاری مدد فرمائے گا۔ لیکن ابو عبیدہ کو جو جواب بھیجا اس میں اس امر پر تأسف کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ رومیوں کی قوت و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔ پھر بھی دونوں خطوں میں انھوں نے مزید کمک بھیجنے کا وعدہ کیا۔

ابوبکرؓ نے اہلِ مکہ کو خطوط لکھ کر ان سے بھی موجودہ حالات کے متعلق مشورہ طلب فرمایا تھا۔ یہ بات عمرؓ کو ناگوار گزری کیونکہ وہ نہ چاہتے تھے کہ اہم امور کے متعلق مشورہ میں سابقون الاولون اور بعد میں اسلام قبول کرنے والوں کو ایک سطح پر رکھا جائے۔ پھر بھی وہ ابوبکرؓ کو ایسا کرنے سے روک نہ سکے۔ اِس اثنا میں عرب قبائل جہاد کے شوق میں چاروں طرف سے آ کر مدینہ میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ اہلِ مکہ کی بھی ایک کثیر تعداد مدینہ پہنچ چکی تھی۔ ابوبکرؓ نے ان تمام لوگوں کا سردار

عمرو بن عاص کو بنایا اور انھیں شام روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ عمرو بن عاص نے پوچھا:

"کیا شام میں لڑنے والی فوجوں کی قیادت بھی میرے پاس رہے گی؟"

ابوبکرؓ نے جواب دیا:

"تم صرف ان لوگوں کے سردار ہو جو یہاں سے تمھارے ساتھ بھیجے جا رہے ہیں لیکن شام پہنچ کر اگر اسلامی لشکروں کو مل کر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا تو تمھارے امیر ابوعبیدہ بن جراح ہوں گے۔"

روانگی کا وقت آیا تو عمروؓ بن عاص نے عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ ابوبکرؓ سے سفارش کر کے انھیں شام میں لڑنے والی اسلامی افواج کا سپہ سالار مقرر کرا دیں لیکن عمرؓ نے صاف جواب دے دیا اور کہا:

"میں تمھیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں ہرگز ابوبکرؓ سے یہ سفارش نہ کروں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک درجے کے لحاظ سے ابوعبیدہ تم سے افضل ہیں۔"

عمروؓ بن عاص نے کہا:

"میرے امیر بن جانے سے ابوعبیدہ کے درجے اور فضیلت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

لیکن عمرؓ پر عمرو بن عاص کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور انھوں نے جواب دیا:

"عمرو! تمھیں کیا ہو گیا؟ تم اپنے لیے امارت کے خواہش مند ہو اور اس سے تمھاری غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمھیں ایک دنیوی رتبہ اور قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔ تمھیں اللہ سے ڈرنا اور اس کی خوشنودی کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہ ہونا چاہیے۔ تم لشکر لے کر شام روانہ ہو جاؤ۔ اگر اس مرتبہ تم امیر نہیں بن سکے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ امارت کے موقعے آگے چل کر بہت آئیں گے۔"

اس قسم کی باتیں کر کے عمرؓ نے عمرو بن عاص کو راضی کر لیا اور وہ ابوبکرؓ سے قیمتی نصائح حاصل کرنے کے بعد فوج لے کر شام روانہ ہو گئے۔

اگرچہ ابوبکرؓ کی طرف سے ابوعبیدہ کو پیش قدمی کی ہدایات مل رہی تھیں لیکن اس کے

باوجود پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی۔ مدینہ سے بھیجی ہوئی امداد اور عمرو بن عاص کے شام پہنچنے پر بھی اس سست روی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ ابوعبیدہ برابر ابوبکرؓ کو لکھتے رہے:

"رومی اور ان کے حاشیہ نشین قبائل مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بھاری تعداد میں اکٹھے ہو رہے ہیں اس لیے مجھے رائے دیجیے کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟"

ابوعبیدہ کے پے در پے خطوط سے ابوبکرؓ تنگ آ گئے اور انھوں نے خالدؓ بن ولید کو شام بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس وقت عراق میں تھے۔ ابوبکرؓ نے انھیں لکھا:

"جونہی میرا یہ خط تمھارے پاس پہنچے عراق سے شام روانہ ہو جاؤ۔ مثنیٰ کی فوج کو عراق ہی میں چھوڑ دو اور اپنے ساتھیوں میں سے بہترین آدمی چن کر ساتھ لے لو۔ شام پہنچ کر ابوعبیدہ بن جراح سے ملو۔ اس وقت شام کی افواج ابوعبیدہ کے زیر سرکردگی ہیں لیکن آئندہ ان فوجوں کے سپہ سالار تم ہو گے۔ والسلام علیک۔"

جب خالدؓ کو یہ خبر ملی کہ انھیں عراق سے ہٹا کر شام بھیجا جا رہا ہے تو انھیں بہت غصہ آیا۔ ابھی تک انھوں نے خلیفہ کا خط نہ پڑھا تھا۔ انھیں خیال ہوا کہ یہ سارا کام عمرؓ کا ہے۔ وہ انھیں عراق سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس خیال کا اظہار انھوں نے زبان سے بھی کر دیا۔ انھوں نے کہا:

"یہ سب کچھ عمر کا کیا دھرا ہے۔ انھیں اس بات کا حسد ہے کہ اللہ نے عراق میرے ذریعے سے کیوں فتح کرایا۔"

لیکن جب انھوں نے ابوبکرؓ کا خط کھول کر پڑھا جس میں انھیں شام میں مقیم اسلامی افواج کی قیادت سپرد کی گئی تھی تو اطمینان کا سانس لیا۔

جن مورخین نے واقعات اس ترتیب سے بیان کیے ہیں وہ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ جب ابوبکرؓ کا خط خالدؓ کو ملا تو وہ حیرہ میں تھے اور انبار و عین التمر کی فتوحات ابھی تک وقوع میں نہ آئی تھیں۔ خط ملنے پر انھوں نے تیاری کی اور شام روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں مقام راستے میں پڑتے تھے انھیں فتح کیا اور فراقر پہنچے۔ فراقر سے وہ صحرا کو قطع کر کے سوئی پہنچے جہاں سے سرزمین شام شروع ہو جاتی تھی۔

ابوبکرؓ نے خالدؓ کے ساتھ ہی ابوعبیدہؓ کو بھی ایک خط ارسال کیا تھا جس میں لکھا تھا:

"مَیں نے خالدؓ بن ولید کو رومیوں سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا ہے. تم ان کی مخالفت نہ کرنا اور بہ دل و جان ان کے تمام احکام کی اطاعت کرنا. مَیں نے انھیں تمھارا امیر مقرر کیا ہے. مَیں جانتا ہوں کہ دینی لحاظ سے تمھارا مرتبہ خالدؓ سے بلند تر ہے لیکن جو جنگی مہارت خالدؓ کو حاصل ہے وہ تمھیں حاصل نہیں. اللہ ہمیں اور تمھیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے."

ادھر خالدؓ بن ولید نے بھی ابوعبیدہؓ کو یہ خط لکھا:

"میری دعا ہے کہ اللہ ہمیں اور تمھیں خوف کے دن امن عطا فرمائے اور اس دنیا میں دشمنوں کے ہاتھوں شکست کھانے سے محفوظ رکھے. میرے پاس خلیفۂ رسولؐ اللہ کا خط آیا ہے جس میں مجھے شام جانے اور وہاں اسلامی لشکروں کی کمان سنبھالنے کا حکم دیا گیا ہے. واللہ! نہ مَیں نے شامی افواج کی سپہ سالاری کی خواہش کی، نہ میرے خیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ مجھے شامی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا جائے گا، نہ میں نے کبھی خلیفۂ رسولؐ اللہ یا کسی اور شخص کو اشارۃً و کنایۃً کوئی خط ہی لکھا. میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو مرتبہ اس وقت آپ کا ہے آئندہ بھی اسی طرح برقرار رہے گا. نہ آپ کے کسی حکم سے روگردانی کی جائے گی، نہ آپ کی کسی رائے کی مخالفت کی جائے گی اور نہ کوئی کام آپ کے مشورے کے بغیر کیا جائے گا کیونکہ آپ مسلمانوں کے سردار ہیں. آپ کی فضیلت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور نہ آپ کی رائے سے پہلوتہی کی جا سکتی ہے. اللہ ہمیں اپنے احسان کی دولت سے مالا مال کر دے اور آگ کے عذاب سے بچائے.

والسّلام علیک ورحمۃ اللہ."

خالد سوٰی سے لوی پہنچے، وہاں سے قصم آئے جہاں انھوں نے بنو مشجعہ سے صلح کی. یہاں سے وہ غویر اور ذات الصنمین کی طرف مڑے اور راستے میں مقیم قبائل کو مرعوب کرتے ہوئے غوطہ دمشق پہنچ گئے. راستے میں تدمر کی تسخیر بھی عمل میں آئی[1]

[1] بلاذری میں مذکور ہے کہ آپ تدمر سے حوارین اور مرج الرابط ہوتے ہوئے غوطہ، دمشق پہنچے تھے.

غوطہ سے ثنیۃ العقاب کے راستے انھوں نے دمشق کا قصد کیا۔ اس ثنیہ (گھاٹی) کو ثنیۃ العقاب کا نام خالدؓ کے حملے کے بعد دیا گیا کیونکہ یہاں انھوں نے رسول اللہ کا جھنڈا 'عقاب' لہرایا تھا۔ دمشق کے مشرقی دروازے سے ایک میل کے فاصلے پر وہ ایک گرجے میں اُترے جسے بعد میں دیر خالدؓ کا نام دے دیا گیا۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ ابوعبیدہؓ ان سے یہیں ملے تھے اور دمشق کا محاصرہ اصل میں اس روز شروع ہوا تھا۔

بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ خالدؓ نے دمشق کے سامنے زیادہ دن تک قیام نہ کیا بلکہ آگے بڑھ کر قناۃ بصریٰ پہنچے جہاں مسلمانوں کی افواج مجتمع تھیں۔ اس اثنا میں مسلمانوں کو خبریں پہنچنی شروع ہوئیں کہ ہرقل نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اجنادین میں ایک عظیم الشان لشکر جمع کیا ہے۔ یہ خبریں سن کر پہلی روایت کے مطابق مسلمان دمشق کا محاصرہ چھوڑ کر اور دوسری روایت کے مطابق بصریٰ کا محاصرہ ختم کر کے رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اجنادین کی جانب روانہ ہوتے اور ابوبکرؓ کی وفات سے چھبیس روز پہلے اجنادین میں مسلمانوں اور رومیوں کی پہلی مٹ بھیڑ ہوئی۔

خالدؓ نے تینوں امرا یعنی یزید بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ اور عمرو بن عاص کو لکھا تھا کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر اجنادین پہنچ جائیں چنانچہ یہ تینوں قائدین حکم کی تعمیل میں اپنی فوجیں

---

[1] ازدی کی روایت اس بارے میں یہ ہے کہ خالدؓ دمشق سے گزرے تو ضرور تھے لیکن انھوں نے اور ابوعبیدہ نے غوطہ اور اس کے نواحی علاقوں میں اچانک چھاپے مارنے کے سوا کوئی باضابطہ حملہ نہ کیا۔ اسی دوران میں انھیں خبر ملی کہ حمص کا حاکم رومیوں کی ایک عظیم الشان جمعیت کے ہمراہ اس ارادے سے باہر نکلا ہے کہ بصریٰ کے مقام پر شرحبیل بن حسنہ کا راستہ کاٹ دے تاکہ وہ ساتھیوں سے نہ مل سکیں۔ پھر خبر ملی کہ رومیوں کی عظیم الشان افواج اجنادین میں جمع ہوئی ہیں اور تمام اہل شہر اور شام میں مقیم عرب قبائل رومیوں سے مل کر مسلمانوں کے مقابلے کی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر خالدؓ اور ابوعبیدہؓ دمشق سے نکلے اور اجنادین کا قصد کیا۔ ابوعبیدہ فوج کے پچھلے حصے میں تھے۔ اہل دمشق نے موقع پا کر ان کا راستہ کاٹ دیا اور ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ خالدؓ کو معلوم ہوا تو وہ فوج لے کر پلٹے اور ابوعبیدہ کو اہل دمشق کے چنگل سے چھڑایا۔ اہل دمشق خالدؓ کے حملے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گئے اور قلعے میں پہنچ کر پناہ لی۔ خالدؓ ابوعبیدہ کو ساتھ لے کر اجنادین روانہ ہو گئے۔

کے ہمراہ اجنادین پہنچ گئے۔ خالدؓ نے تمام افواج کی کمان سنبھالی اور لشکر کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔ پیدل فوج پر ابو عبیدہ کو مقرر کیا، میمنہ پر معاذ بن جبل کو میسرہ پر سعید بن عامر بن حزیم جمحی کو اور رسالے پر سعید بن زید بن عمرو کو مقرر کیا اور خود مسلمانوں کو جوش دلانے کے لیے صفوں کے درمیان گشت کرنے لگے۔

رومیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ مسلمانوں پر حملہ شروع کر دیا۔ خالدؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ نمازِ ظہر تک جنگ شروع نہ کی جائے لیکن جب سعید بن زید نے دیکھا کہ رومیوں کے حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کو جانی نقصان ہو رہا ہے تو انھوں نے خالدؓ سے رومیوں پر جوابی حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ خالدؓ نے سب سے پہلے گھڑسوار دستے کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد باقی فوج کو بھی لے کر دشمن پر پل پڑے۔ رومیوں کو شکست فاش ہوئی، مسلمانوں نے ان کے بے شمار آدمی قتل کر ڈالے اور بے حساب مالِ غنیمت حاصل کیا۔

معرکۂ اجنادین میں فتح یاب ہو کر خالدؓ واپس دمشق آ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ خالدؓ اس گرجے میں اُترے جو باب شرقی سے متصل تھا۔ ابو عبیدہ نے باب جابیہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ عمرو بن العاص باب توما کے سامنے فروکش ہوئے۔ شرحبیل باب فرادیس اور یزید باب صغیر کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ اِس طرح مسلمانوں نے پوری طرح شہر کا محاصرہ کر لیا۔

اہلِ دمشق نے ہرقل کو لکھا کہ وہ اِس وقت سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، مسلمانوں نے سختی سے ان کا محاصرہ کر رکھا ہے اِس لیے جلد از جلد ان کی مدد کے لیے فوج روانہ کی جائے چنانچہ ہرقل نے ایک فوج روانہ کی۔ مرج الصفر میں خالدؓ کی فوج سے اِس فوج کا مقابلہ ہوا جس میں رُومی فوج کو شکست فاش اٹھانی اور فرار ہوتے ہی بن پڑی۔ خالدؓ دوبارہ دمشق آ گئے اور محاصرہ شروع کر دیا۔

اہلِ دمشق سے جب تک بن پڑا انھوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ شہر کی دیواروں کو مضبوط بنایا اور ان کے اوپر سے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کیے۔ شہر کے دروازوں پر مضبوط دستے متعین کیے کہ مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے سے روکیں۔ لیکن کوئی بھی چیز مسلمانوں کو محاصرے کی سختی سے باز نہ رکھ سکی۔ ناچار امرائے دمشق نے ایک بار پھر ہرقل کو لکھا کہ اگر اس نے اِس نازک موقع پر

ان کی مدد نہ کی تو دشمن سے مصالحت کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔ ہرقل نے جواب میں لکھا کہ جرأت و ہمت سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور کسی بھی قیمت پر اسے شہر پر قبضہ نہ کرنے دو، تمھاری مدد کے لیے میں قاصد کے پیچھے پیچھے فوجیں روانہ کر رہا ہوں اہلِ دمشق نے بے صبری سے ان فوجوں کا انتظار شروع کیا لیکن آخر ان کی امیدیں حسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہرقل کی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچی۔ اہلِ دمشق کی ہمتوں نے جواب دے دیا اور انھیں مسلمانوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور ان سے صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اس صلح کے متعلق مختلف روایات تاریخوں میں بیان ہوئی ہیں بعض روایتوں میں ہے کہ اہلِ دمشق سے صلح ابوعبیدہؓ نے بابِ جابیہ کے قریب کی تھی۔ صلح نامہ پُر کرنے کے بعد جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو انھیں معلوم ہوا کہ خالدؓ بابِ شرقی سے بہ زور اندر گھس آئے ہیں اور اپنے سپاہیوں کی مدد سے شہر پر قبضہ کر رہے ہیں۔ جب دونوں سردار آپس میں ملے تو ابوعبیدہؓ نے کہا کہ شہر والوں نے صلح کر لی ہے اور اب مسلمانوں کو شہر والوں کے مال و جان پر کسی قسم کا اختیار نہیں لیکن خالدؓ نے کہا کہ انھوں نے اپنے زورِ بازو سے شہر کو فتح کیا ہے اس لیے شہر والوں سے مفتوحین جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ آخر تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد دونوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ صلح برقرار رکھی جائے اور شہر والوں سے مفتوحین کا سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ خالدؓ نے اہلِ دمشق سے بابِ شرقی کے قریب صلح کا معاہدہ کیا تھا اور ابوعبیدہ بابِ جابیہ سے بہ زور شہر میں داخل ہوئے تھے۔ پھر بھی تمام روایتوں میں اس امر پر اتفاق ہے کہ آخر صلح کی شرائط ہی برقرار رکھی گئیں اور شہر والوں سے مفتوحین کا سا سلوک نہ کیا گیا۔

روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابھی دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ ابوبکرؓ کی وفات ہو گئی اور ان کی جگہ عمرؓ خلیفہ بنے۔ انھوں نے خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خالدؓ کو ان کے عہدے سے معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہ کو سالارِ لشکر مقرر کر دیا اور اس کی اطلاع ابوعبیدہؓ کو بھی بھیج دی لیکن ابوعبیدہؓ نے یہ حکم اس وقت تک خالدؓ سے چھپائے رکھا جب تک دمشق مسلمانوں کے ہاتھ نہ آ گیا۔ البتہ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ فتح دمشق سے پہلے ہی ابوعبیدہؓ نے یہ اطلاع خالدؓ کو دے دی تھی لیکن ان کی تیوری پر ذرا بھی بل نہ پڑے اور انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے

خلیفۂ ثانی کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یہ ہیں وہ روایات جو ازدی، بلاذری اور واقدی نے شامی فتوحات کے متعلق بیان کیں اور جو ہم نے بالاختصار نقل کر دی ہیں۔ انھیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے یہ روایات جہاں طبری سے مختلف ہیں وہاں خالدؓ بن ولید کی امارت اور ان کی معزولی کے سوال پر بھی دونوں میں بیّن اختلاف موجود ہے۔

پھر بھی دو باتیں ایسی ہیں جن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں اوّل یہ کہ ابوبکرؓ ہی نے عراق کی طرح شام کی فتح کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس غرض کے لیے فوجیں اور ہر قسم کی امداد روانہ کی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عراق اور شام کی ان ابتدائی فتوحات ہی سے جو ابوبکرؓ کے عہد میں ہوئیں، اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ دوم یہ کہ خالدؓ بن ولید نے شام میں بھی وہی کارہائے نمایاں انجام دیے جن کا مظاہرہ وہ عراق میں کر چکے تھے۔ وہ ہر مقام پر مظفر و منصور ہوئے اور قیادت سے معزولی کے باعث نہ اُن کے رتبے میں کوئی کمی واقع ہو سکی اور نہ اُن کی جنگی صلاحیتوں میں۔ یہ اُن کی جنگی صلاحیتیں ہی تو تھیں جنھیں رسول اللہ نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھ کر انھیں سیف اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا تھا اور جن کا اعتراف ابوبکرؓ نے ان الفاظ سے فرمایا تھا:

> "میں اس تلوار کو کسی طرح میان میں نہیں ڈال سکتا جسے اللہ نے کافروں پر مسلط کیا ہو۔"

ان مختلف روایات کی موجودگی میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ یرموک کی جنگ ابوبکرؓ کے عہد میں واقع ہوئی یا حضرت عمرؓ کے عہد میں۔ اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ واقوصہ کی گھاٹی جس کے قریب یہ جنگ لڑی گئی، صحرائے شام، عرب کی سرحد اور وادیٔ سرحان کے راستے کے قریب واقع ہے تو طبری کی رائے کی تائید کرنی پڑتی ہے کہ یہ جنگ ابوبکرؓ کے عہد میں ہوئی کیونکہ ابتدائی جنگیں سرحد کے قریب ہی لڑی جاتی ہیں۔ لیکن ایک اور نقطۂ نگاہ سے بلاذری کی اس روایت کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جنگ عمرؓ کے عہد میں واقع ہوئی۔ اس نے بیان کیا ہے کہ جب ابتدائی جنگیں شروع ہوئیں تو رومیوں نے دمشق کی جانب ہٹنا شروع کیا۔ دمشق کا شہر نہ صرف خود بہت مستحکم تھا بلکہ اس کے ارد گرد بھی ایسی بستیاں آباد تھیں جہاں سے مسلمانوں کے حملے کا دفاع بہت اچھی

طرح کیا جا سکتا تھا۔ رومیوں کا ارادہ تھا کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مسلمانوں کو ایسی جگہ لے آئیں گے جہاں سے ان کے لیے واپس ہونا بے حد مشکل ہوگا، اس وقت وہ یک بارگی ان پر حملہ کرکے انھیں شکست دے دیں گے پھر کبھی مسلمانوں کو شامی علاقے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمان دمشق تک پہنچ گئے لیکن رومیوں کی توقعات کے برعکس شہر کا محاصرہ لمبا ہوتا چلا گیا اور آخر ہار کر رومیوں کو صلح کرنی پڑی اور شہر پر مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔

واقعات کی اصل ترتیب کا فیصلہ تو واقعی مشکل ہے لیکن جہاں تک حضرت خالدؓ کے سپہ سالاری سے معزول کیے جانے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ آسان ہے۔ طبری، بلاذری اور دوسرے تمام مؤرخین کا اس امر پر تو کلی اتفاق ہے کہ ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو عراق سے شام اس غرض کے لیے بھیجا تھا کہ وہ رومیوں کے دلوں سے تمام شیطانی وسوسے دور کر دیں اور اس جمود کو، جو ایک لمبے عرصے سے شام میں مقیم اسلامی فوجوں پر چھا چکا تھا، توڑ دیں۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آیا خالدؓ وہاں تمام اسلامی فوجوں کے سپہ سالار بن کر گئے تھے یا صرف اس فوج کے امیر بن کر جو آپ کے ساتھ عراق سے شام پہنچی تھی۔ اگر یہ اختلاف دور ہو جائے تو معزولی کا سارا واقعہ سمجھ میں آجاتا ہے۔

طبری بیان کرتے ہیں کہ خالدؓ صرف اس فوج کے امیر بن کر شام گئے تھے جو عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی۔ تمام اسلامی فوجوں کی قیادت صرف جنگِ یرموک کے دن ان کے ہاتھ میں آئی تھی اور وہ بھی دیگر امراء کے مشورے اور رضامندی کے بعد۔ لیکن بلاذری اور ان کے خوشہ چین ذکر کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے انھیں شام میں مقیم تمام اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا اور ثبوت میں وہ دو خط پیش کرتے ہیں جو اس معاملے کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید اور عبیدہؓ بن جراح کو بھیجے تھے۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد ہم نے بلاذری کی روایت کو زیادہ قرین قیاس اور درست خیال کیا ہے کیونکہ یہ امر بعید از عقل ہے کہ ایک ہی سلطنت کی مختلف فوجیں ایک جگہ ڈیرہ ڈالے پڑی رہیں اور وہ ایک قیادت کے تحت منظم ہونے کے بجائے علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور امارتوں میں بٹی رہیں۔

طبری خود یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے تمام اسلامی لشکروں کو حکم بھیجا تھا کہ وہ آپس میں ضم ہو کر ایک لشکر کی صورت اختیار کرلیں اور متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ اس حکم کا نفاذ اس

وقت تک ممکن نہ تھا جب تک تمام اسلامی لشکر ایک قیادت کے ماتحت منظم نہ ہو جاتے۔ ابوبکرؓ نے یہ حکم خالدؓ بن ولید کو شام بھیجنے سے پہلے دیا تھا اس لیے لازم تھا کہ اسلامی لشکروں کی قیادت ابوعبیدہؓ، یزید بن ابی سفیان یا اور کسی قائد کے سپرد ہوتی۔ اکثر مورخین کا خیال یہی ہے کہ ان لشکروں کے سپہ سالار ابوعبیدہ تھے گو بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ انھوں نے ابوبکرؓ کی خدمت میں خط لکھ کر یہ ذمہ داری اٹھانے سے معذرت چاہی تھی۔ جب ان باتوں کے تسلیم کرنے سے ہم انکار نہیں کر سکتے تو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو کل شامی افواج کا سپہ سالار مقرر کر کے شام بھیجا تھا اور یہی بات بلاذری نے بیان کی ہے۔

اگر خالدؓ تمام افواج کے سپہ سالار نہ ہوتے تو عمرؓ خلیفہ بنتے ہی سب سے پہلے انھیں اپنے عہدے سے معزول کرنے کا حکم نہ بھیجتے کیونکہ طبری اور دوسرے مؤرخین کی بیان کردہ روایات سے ثابت ہے کہ خالدؓ اپنے معزول ہونے کے بعد بھی ان فوجوں کی قیادت کرتے رہے جو ان کے ساتھ تھیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمرؓ نے انھیں قنسرین کی امارت اور فوج کی سپہ سالاری سے معزول نہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷ھ میں عمرؓ کی خلافت کے پانچویں سال پیش آیا۔ اس صورت میں پہلی معزولی قیادت عامہ سے قرار پاتی ہے اور دوسری معزولی، جو پہلی معزولی سے چار سال بعد وقوع میں آئی، صرف اس امارت سے تھی جو انفرادی طور پر انھیں ایک حصۂ فوج پر حاصل تھی۔

یہ ہے ہماری رائے جس پر ہم مضبوطی سے قائم ہیں۔ اس رائے کو تسلیم کرنے سے ان مختلف شبہات کا ازالہ ہو سکتا ہے جو اس ذیل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر خالدؓ صرف اس فوج کے امیر ہوتے جو عراق سے ان کے ساتھ آئی تھی تو عمرؓ کو ان کی معزولی کا حکم بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی اور طبری کی روایت کے مطابق جنگِ یرموک کے بعد اور بلاذری کی روایت کے مطابق دمشق کی فتح کے بعد ابوعبیدہ دوبارہ، تمام اسلامی فوجوں کی قیادت سنبھال لیتے۔

(۱۵)

مثنیٰؓ عراق میں

عراق میں مثنیٰؓ کے لیے مشکلات

مثنیٰؓ بن حارثہ، خالدؓ بن ولید کو صحرائے شام کی سرحد پر چھوڑ کر حیرہ واپس آ گئے تھے۔ واپس آکر انھوں نے اپنی فوج کے ذریعے سے مفتوحہ شہروں کے دفاع کا بندوبست کرنا شروع کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جونہی ایرانیوں کو خالدؓ بن ولید کے شام جانے کا حال معلوم ہو گا وہ اپنے چھنے ہوئے شہروں کو واپس لینے اور سرزمین عراق سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے پوری جدوجہد شروع کر دیں گے۔

اس وقت حالات واقعی نازک صورت اختیار کر گئے تھے۔ خالدؓ نے عراق میں رہنے والے بدوؤں سے جس سختی کا سلوک کیا تھا اس کے باعث وہ مسلمانوں کے دشمن بن چکے تھے اور ان سے بدلہ لینے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ اِدھر ایرانیوں کو یقین تھا کہ عراق میں اسلامی سلطنت کا قیام اُن کے لیے پیامِ موت سے کم نہیں اس لیے وہ بھی اِس فکر میں تھے کہ کب موقع ہاتھ آئے اور وہ مسلمانوں کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یک بارگی حملہ کر کے انھیں حدودِ عراق سے پیچھے دھکیل دیں۔ خالدؓ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے عراق سے چلے جانے کے بعد ایرانی ضرور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اِسی لیے شام جانے سے پیشتر انھوں نے تمام مسلمان عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کو مدینہ بھجوا دیا تھا۔ مثنیٰؓ کے سامنے یہ تمام باتیں روزِ روشن کی طرح عیاں تھیں اور وہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھے۔ مثنیٰؓ ہی تھے جنھیں ابوبکرؓ نے سب سے پہلے عراق پر چڑھائی کا کام سپرد کیا تھا اور انھیں کی مدد کے لیے خالدؓ بن ولید اور دوسرے اسلامی لشکر عراق بھیجے گئے تھے۔ اِس صورت میں مثنیٰؓ کے لیے یہ بات

قطعاً ناقابلِ برداشت تھی کہ انھیں اسی سرزمین میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ جہاں سب سے پہلے انہی کے فاتحانہ قدم پڑے تھے۔

اِن تمام امور کے علاوہ ایک اور بات بھی مسلمانوں کے لیے حد درجہ پریشان کن تھی اور وہ یہ کہ سالہاسال کی نااتفاقی اور لڑائی جھگڑوں کے بعد اہلِ ایران نے بالاتفاق شہر یران[1] بن اردشیر بن سابور کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا تھا اور ساری رعایا نے بہ دل وجان اس کی اطاعت کرنے کا عہد کیا تھا۔ نئے بادشاہ کو کچھ دن تو سلطنت کا اندرونی نظم ونسق درست کرنے میں لگے۔ جب اس طرف سے فراغت نصیب ہو گئی تو سب سے پہلے اُس نے عراق کی طرف توجہ کی خالدؓ عراق کی آدھی فوج لے کر شام جا چکے تھے۔ شہر یران کو اس سے بہتر موقع مسلمانوں کو عراق سے نکالنے کا نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً ہرمز کو دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مثنیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ ہرمز ایک مہیب ہاتھی پر سوار ہو کر اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کو عراق کے چپے چپے سے نکال کر انھیں عرب کی حدود میں پہنچا کر ہی دم لے گا۔

جب مثنیٰ کو ان تیاریوں اور ہرمز اور اس کے لشکر کی نقل وحرکت کی اطلاعات ملیں تو انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ ہرمز مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں سے گزرتا ہوا حیرہ پہنچے جہاں وہ اس وقت مقیم تھے بلکہ اپنا لشکر لے کر خود اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اپنے دونوں بھائیوں معنیٰ اور مسعود، کو بالترتیب میمنہ اور میسرہ پر مقرر کیا اور حیرہ سے روانہ ہو کر بابل کے کھنڈروں تک آ پہنچے۔ ابھی ان کا سفر جاری تھا کہ انھیں شہر یران شہنشاہ ایران کا خط ملا جس میں لکھا تھا:

"میں نے تمھارے مقابلے کے لیے ایرانیوں کا ایک لشکر بھیجا ہے۔ ہیں تو وہ مرغیوں اور سؤروں کے چرانے والے لیکن تمھارا بھرکس اچھی طرح نکال دیں گے۔"

مثنیٰ نے شہنشاہ ایران کے قاصد کے ہاتھ سے خط لیا، پڑھا اور اسی وقت یہ جواب لکھ کر اس کے حوالے کر دیا:

"مثنیٰ کی جانب سے شہر یران کے نام۔ تمھارا حال دو صورتوں سے خالی نہیں، یا تو

[1] روایات میں اس کا نام شہر بازان، شہر بازاور شہر براز بھی آیا ہے۔

تم سرکش ہو۔ یہ چیز تمھارے لیے بری ہے۔ ہمارے لیے اچھی۔ یا تم جھوٹے ہو اور یہ تمھیں بتا ہی ہے کہ اللہ کے نزدیک اور اس کے بندوں کی نظروں میں عقوبت اور فضیحت کے لحاظ سے سب سے زیادہ جھوٹے بادشاہ ہی ہوتے ہیں۔ تمھارے خط سے ہمیں علم ہو گیا ہے کہ اب تم اس حد تک مجبور ہو گئے ہو کہ مرغیاں اور سؤر چرانے والوں کے سوا تمھیں اور لوگ ہمارے مقابلے میں بھیجنے کے لیے ملتے ہی نہیں پس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمھارا مکر و فریب خود تم ہی پر لوٹا دیا اور تم مرغیاں چرانے والوں سے مدد لینے پر مجبور ہو گئے۔"

جب اہل ایران کو مثنیٰ کے اس خط کا علم ہوا اور یہ بھی پتا چلا کہ وہ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے خود سرحد ایران کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انھیں ہرگز توقع نہ تھی کہ خالدؓ کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمانوں میں اس قدر قوت باقی رہی ہوگی کہ وہ اس بے باکی سے ان کے بادشاہ کو جواب دیں گے بعض لوگوں کو اپنے بادشاہ کا انداز تحریر بھی بہت ناگوار گزرا اور انھوں نے اس سے کہا:

"آپ نے خط لکھ کر مسلمانوں کو اور دلیر بنا دیا ہے۔ براہ مہربانی آئندہ جب آپ کسی کو خط لکھیں تو پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ کر لیا کریں۔"

مثنیٰ مدائن سے پچاس میل دور بابل کے کھنڈروں میں ایک اونچی جگہ خیمہ زن ہو کر ہرمز کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ آخر ہرمز بھی آ پہنچا۔ اُسے کامل اطمینان تھا کہ مسلمان اس کے چنگل سے کسی طرح بھی نہ نکل سکیں گے اور وہ انھیں تباہ کر کے ہی دم لے گا۔ اس کا مہیب ہاتھی دائیں بائیں زور زور سے سونڈ ہلا رہا تھا۔ مسلمانوں کو آج تک کبھی ہاتھی سے پالا نہ پڑا تھا۔ یہ خوفناک جانور دیکھ کر ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہو گئی۔ مثنیٰ کو بھی یقین ہو گیا کہ جب تک ہاتھی میدانِ جنگ میں موجود رہے گا مسلمان اطمینان سے ایرانیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ وہ خود چند لوگوں کو ساتھ لے کر نکلے، تلواریں سونت کر ہاتھی پر پل پڑے اور اسے مار کر ہی دم لیا۔ مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کی بے چینی دور ہو گئی اور انھوں نے نئے جوش اور نئے ولولے سے ایرانیوں پر حملہ کر دیا اور اس وقت تک بس نہ کیا جب تک انھیں شکست فاش نہ دے لی۔ ایرانی

لشکر نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور انھیں مدائن کے دروازوں تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

ایران میں دوبارہ خلفشار

ہرمز کی شکست کی خبر شہر یران پر بجلی بن کر گری۔ اسے اسی وقت بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اُس نے جان دے دی۔ سرداران ایران نے اس کی جگہ کسریٰ کی بیٹی کو تخت پر بٹھانا چاہا تاکہ ایک بار پھر وہ اپنی طاقت و قوت کو مجتمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن ابھی اسے سریر آرائے سلطنت ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ اُسے معزول کر دیا گیا اور اُس کی جگہ سابور بن شہر یران تخت پر بیٹھا۔ اُس نے فرخ زاد کو اپنا وزیر بنایا اور اُس سے کسریٰ کی بیٹی آزرمیدخت کی شادی کرنی چاہی لیکن آزرمیدخت شاہی خاندان کے باہر شادی کرنے پر رضامند نہ تھی۔ اس نے سابور سے کہا "اے ابن عم! کیا تم میرے غلام سے میری شادی کر دگے؟ میں یہ بات کسی طرح منظور نہیں کر سکتی۔" لیکن سابور نے اس کی ایک نہ سنی اور بڑی تلخ کلامی سے پیش آیا۔ اس پر آزرمیدخت نے ایک مشہور عجمی بہادر سیاوخش رازی کو ساتھ ملایا۔ شادی کی رات کو جب فرخ زاد حجلۂ عروسی میں داخل ہوا، سیاوخش نے اس پر اچانک حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد وہ آزرمیدخت اور اس کے اعوان و انصار کو ساتھ لے کر سابور کے محل پر آیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ پہرے داروں نے مزاحمت کی لیکن یہ لوگ انھیں قتل کر کے محل میں گھس گئے اور سابور کو مار ڈالا۔ آزرمیدخت تخت شاہی پر متمکن ہو گئی۔

ان واقعات کی اطلاع مثنیٰ کو ملی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایرانیوں کا اتحاد ان کے لیے سخت خطرے کا باعث تھا لیکن اب اللہ نے ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی اور وہ تخت پر قبضہ کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ موجودہ حالات مثنیٰ کے لیے انتہائی سازگار تھے۔ انھوں نے ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ سوچ کر کہ نہ معلوم آئندہ حالات کیا رُخ اختیار کریں، مدائن کی جانب کوچ کر دیا اور ایرانیوں سے لڑتے بھڑتے شہر کے دروازوں تک جا پہنچے۔ ان کی عین خواہش مدائن کو فتح کرنے کی تھی لیکن اس کے

لیے زبردست جمعیت کی ضرورت تھی جو ان کے پاس موجود نہ تھی۔ ابوبکرؓ بھی ان کے مدد کے لیے کوئی لشکر روانہ نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس وقت تمام فوجیں شام میں رومیوں سے برسرپیکار تھیں۔

بہت کچھ سوچ بچار کے بعد انھوں نے ابوبکرؓ کو ایک خط لکھا جس میں فتوحات کی خوش خبری دینے کے بعد ان مرتد قبائل سے مدد لینے کی اجازت طلب کی جو توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور جن کے متعلق ابوبکرؓ نے حکم دے دیا تھا کہ انھیں کسی اسلامی فوج میں شامل نہ کیا جائے۔ مثنیٰ جانتے تھے کہ ابوبکرؓ ان کی درخواست آسانی سے قبول نہ کریں گے لیکن دوسری طرف انھیں یہ بھی علم تھا کہ سابق مرتد قبائل اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں اور اسلامی افواج میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہیں۔

خط لکھے ہوئے عرصہ ہو گیا لیکن مثنیٰ کو جواب موصول نہ ہوا۔ اس پر انھوں نے خود مدینہ جا کر ابوبکرؓ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ لشکر کو زیریں عراق میں سرحد کے قریب لے آئے اور بشیر بن خصاصیہ کو عراق میں اپنا قائم مقام بنا کر خود مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے ابوبکرؓ کو مرض الموت میں مبتلا پایا۔ پھر بھی ابوبکرؓ نے گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سنیں اور عمرؓ کو بلایا جنھیں وہ اپنے بعد خلیفہ مقرر کر چکے تھے۔ عمرؓ آئے تو انھوں نے فرمایا:

> "عمرؓ! میں جو کہتا ہوں اسے سنو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ مجھے امید نہیں کہ میں آج شام تک زندہ رہ سکوں گا۔ میرے مرنے کے بعد تم کل کا دن ختم ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کے ساتھ لوگوں کو لڑائی پر روانہ کر دینا۔ تمھیں کوئی مصیبت دینی کام اور حکم الٰہی سے غافل نہ کرنے پائے۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں نے رسول اللہ کی وفات کے بعد کیا کیا تھا حالانکہ اس وقت مسلمان ایک بڑے ابتلا میں تھے۔ اگر میں اس وقت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی بجا آوری میں دیر کرتا اور کمزوری دکھاتا تو نہ صرف مدینہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو جاتا بلکہ اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جب اہل شام پر فتح حاصل ہو جائے تو اہل عراق کو عراق واپس بھیج دینا کیونکہ وہ عراق ہی کے کاموں کو خوب انجام دے سکتے ہیں اور عراق ہی میں ان کا دل کھلا

ہوا ہے۔"

عمرؓ نے اس وصیت پر لعینہٖ عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ بعد میں وہ کہا کرتے تھے:

"ابوبکرؓ کو معلوم تھا کہ میں خالدؓ کی امارت ناپسند کرتا ہوں اِسی لیے انھوں نے مجھے خالدؓ کے ساتھیوں کو عراق واپس بھیجنے کا حکم تو دیا لیکن خالدؓ کو ساتھ بھیجنے کی ہدایت نہ کی اور نہ اُن کا ذکر ہی کیا۔"

ابوبکرؓ کی وصیت کے مطابق عمرؓ نے پہلا کام یہ کیا کہ مثنیٰ کے ساتھ ایک فوج عراق بھیجی انھیں سابق مرتدین کو اسلامی افواج میں شامل ہونے کی اجازت بھی مل گئی تھی کیونکہ اب اسلام طاقت پکڑ چکا تھا اور ان کی طرف سے کسی قسم کے فتنہ و فساد کا اندیشہ باقی نہ رہا تھا۔

(۱۶)

جمعِ قرآن

غزوۂ یمامہ کے اثرات

جمع قرآن کریم کی تاریخ بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم غزوۂ یمامہ کا ذکر دوبارہ کریں کیونکہ اسی جنگ کے نتیجے میں اس عظیم الشان کام کو لباسِ عمل پہنانے کا خیال بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ ابتداً ہم نے اس کا ذکر اِس لیے نہیں کیا کہ جنگوں اور فتوحات کے واقعات کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔

جنگہائے مرتدین میں غزوۂ یمامہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنگ نہ صرف بڑی ہولناک تھی بلکہ اثرات کے لحاظ سے بھی دور رس نتائج کی حامل تھی۔ مسیلمہ بن حبیب کے قتل سے سارے عرب کے مدعیانِ نبوت پر ضرب کاری لگی، بحرین میں مرتدین کے استیصال سے بنو حنیفہ کو دوبارہ اسلام لانے کی توفیق ملی اور اِسی امر نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو عراق کی طرف پیش قدمی کرنے کی جرأت دلائی۔ جنگِ یمامہ میں مسیلمہ کے لشکر کو شکست دینے کے لیے خالدؓ بن ولید نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ اِدھر مسیلمہ نے بھی مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو مسیلمہ کو شکست فاش ہو چکی تھی۔ اس کے ہزاروں آدمی میدان جنگ میں مارے جا چکے تھے۔ اور وہ خود بھی وحشی غلام کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اُدھر مسلمانوں کا بھی کچھ کم نقصان نہ ہوا تھا۔ ان کے بارہ سو آدمیوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا جن میں کبار صحابہ اور حفاظِ قرآن کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔

جہاں یہ فتح مسلمانوں کے لیے اِس لحاظ سے دل خوش کن تھی کہ اس کے ذریعے سے عرب میں ایک بہت بڑے فتنے کا خاتمہ ہو گیا وہاں یہ امر سخت غم واندوہ کا موجب تھا کہ اِس جنگ میں کبار صحابہ اور حفاظِ قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی اور اِس طرح اُنھیں ایسے عظیم

نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کی تلافی کی کوئی صورت انھیں نظر نہ آرہی تھی۔ عمرؓ بن خطاب کو بالخصوص سخت رنج پہنچا تھا کیونکہ ان کے بھائی زید اس معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے رنج والم کا یہ عالم تھا کہ جب اُن کے بیٹے عبداللہ اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے کر واپس مدینہ آئے تو اُن سے کہا:

"جب تمھارے چچا زید شہید ہو گئے تو تم کیوں چلے آئے۔ تم نے اپنا منہ مجھ سے کیوں نہ چھپا لیا؟"

عبداللہ نے صرف یہ جواب دیا:

"انھوں نے حصولِ شہادت کی تمنا کی، انھیں مل گئی۔ میں نے بھی اس غرض کے لیے پوری جدوجہد کی لیکن افسوس میں اُسے حاصل نہ کر سکا۔"

عمرؓ کا مشورہ

لیکن اپنے بھائی اور دیرینہ رفقا کی شہادت کا الم ناک حادثہ عمرؓ کو اس کام کے متعلق غور و فکر کرنے سے نہ روک سکا جو بلا شبہ اسلامی تاریخ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے۔ غزوۂ یمامہ میں حفاظ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو چکی تھی اور ابھی جنگوں کا سلسلہ جاری تھا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ یہ دیکھ کر عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور آئندہ جنگوں میں حفاظ کثرت سے شہید ہونے لگے تو قرآن بالکل مٹ جائے گا اس لیے اسے ایک جگہ جمع کر لیا جائے تاکہ اس کے مٹ جانے کا خطرہ جاتا رہے۔ اس معاملے پر انھوں نے کئی دن تک خوب غور و فکر کیا اور اس کے بعد ایک دن مسجد میں ابوبکرؓ کے سامنے اُسے پیش کرتے ہوئے کہا:

"یمامہ کی جنگ میں حفاظ کی بھاری تعداد نے جامِ شہادت نوش کیا ہے مجھے ڈر ہے کہ دوسری جنگوں میں بھی حفاظ کی اکثریت شہید ہو جائے گی اور اس طرح قرآن کریم کا بیشتر حصّہ ضائع ہو جائے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں تاکہ وہ مٹنے سے محفوظ رہے۔"

ابوبکرؓ نے اب تک اس معاملے کے متعلق کچھ نہ سوچا تھا۔ اس لیے جونہی انھوں نے عمرؓ کی

زبان سے یہ باتیں سنیں، فرمایا:

"مَیں وہ کام کیونکر کرسکتا ہوں جسے رسولؐ اللہ نے نہیں کیا۔"

اس پر دونوں بزرگوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی جس کی تفصیل مورخین نے بیان نہیں کی مگر آخر ابوبکرؓ عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے اور انھوں نے زیدؓ بن ثابت کو طلب فرمایا۔

اس کے متعلق صحیح بخاری میں زیدؓ بن ثابت کی ایک روایت درج ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں:

"جنگ یمامہ کے بعد ایک دن ابوبکرؓ نے مجھے طلب فرمایا۔ جب میں اُن کے پاس پہنچا تو عمرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا 'عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جنگ یمامہ میں متعدد حفاظ شہید ہو گئے ہیں۔ اگر جنگوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور کسی وقت خدانہ خواستہ تمام حفاظ شہید ہو گئے تو قرآن کا اکثر حصہ ضائع ہو جائے گا اس لیے میری رائے ہے آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں کہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہے'۔ زید بن ثابت کہتے ہیں ابوبکرؓ نے فرمایا 'میں نے یہ سُن کر عمرؓ سے کہا میں وہ کام کیونکر کرسکتا ہوں جسے رسولؐ اللہ نے نہیں کیا لیکن عمرؓ نے کہا 'اس کام میں امت کی بھلائی ہے اس لیے اسے ضرور کرنا چاہیے'۔ انھوں نے اپنی بات پر اتنا اصرار کیا کہ آخر اللہ نے میرا بھی سینہ کھول دیا اور میں نے بھی عمرؓ کی رائے سے اتفاق کر لیا'۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ اس وقت عمرؓ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا 'تم جوان اور عقل مند انسان ہو۔ ہم تمھاری صداقت اور راست گفتاری میں کسی قسم کا شک نہیں کر سکتے۔ رسولؐ اللہ کے زمانے میں وحی لکھنے کا شرف بھی تمھیں حاصل ہوتا رہا ہے اس لیے تم قرآنِ کریم کو تلاش کر کے اسے ایک جگہ جمع کر دو'۔ واللہ! اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ لے جانے کا حکم دیا جاتا تو یہ کام میرے قرآن جمع کرنے سے زیادہ سہل ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ دونوں وہ کام کس طرح کر سکتے ہیں جسے رسولؐ اللہ نے نہیں کیا لیکن عمرؓ کی طرح ابوبکرؓ نے بھی یہی کہا کہ اس میں امت کی بھلائی ہے۔ وہ برابر میری باتوں

کا جواب دیتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرح میرا بھی سینہ کھول دیا۔ چنانچہ میں نے یہ کام کرنے کی حامی بھرلی اور قرآن کریم کو تلاش کرنے اور چمڑے لکڑی، پتھر کے ٹکڑوں اور آدمیوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا۔ سورۂ توبہ کی دو آیتیں مجھے خزیمہ انصاری سے ملیں۔ ان کے سوا اور کسی کے پاس وہ آیتیں نہ مل سکیں۔ آیتیں یہ تھیں: لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم۔ فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم۔ جب ہم نے قرآن کریم کے اوراق لکھ لیے تو معلوم ہوا کہ ان میں سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں جسے میں رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے سنا کرتا تھا۔ آخر وہ آیت بھی خزیمہ انصاری سے ملی جن کی اکیلی شہادت کو رسول اللہ نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔ وہ آیت یہ تھی: من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر۔ یہ آیت مل جانے پر میں نے اسے سورۂ مذکورۂ بالا میں شامل کر لیا۔ جن اوراق میں قرآنِ کریم جمع کیا گیا تھا وہ ابوبکرؓ کے پاس محفوظ رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حفصہ کے پاس آ گئے۔"

یہ ہے زیدؓ بن ثابت کی وہ حدیث جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں درج کی ہے۔ تمام روایات اس کی صحت پر متفق ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ زید نے جو قرآن جمع کیا تھا اس میں سورتوں کی کوئی خاص ترتیب مقرر نہ تھی اور یہ بالترتیب ابوبکرؓ، عمرؓ اور ام المومنین حفصہؓ کے پاس منتقل ہوتا رہا۔

دیگر روایات

ایک روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ قرآن کریم کو سب سے پہلے جمع کرنے کا شرف عمرؓ کو حاصل ہوا۔[1]

---

[1] کتاب المصاحف، ابن ابی داؤد، صفحہ ۲ و کتاب الاتقان فی علوم القرآن، سیوطی، صفحہ ۵۹۔

انھوں نے ایک آیت کے متعلق دریافت فرمایا تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ آیت فلاں صحابی کو یاد تھی لیکن وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے۔ یہ سُن کر انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فوراً قرآنِ کریم کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ مگر یہ روایت اس سلسلے میں بیان کی ہوئی دیگر تمام روایات کے متناقض ہے۔ عمرؓ نے قرآنِ کریم کو جمع کرنے کا مشورہ تو بے شک سب سے پہلے دیا لیکن اسے جمع کرنے کا فخر ابوبکرؓ کے سوا اور کسی کے حصے میں نہیں آسکتا۔ علیؓ کی مندرجۂ ذیل روایت بھی ہماری رائے کی تائید کرتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"اللہ ابوبکرؓ پر رحمت نازل فرمائے۔ قرآن کریم جمع کرنے کے کام میں وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں کیونکہ انھیں نے سب سے پہلے اسے جمع کیا۔"

جن لوگوں کی رائے میں قرآن کریم جمع کرنے کا کام عمرؓ کے ذریعے سے انجام پذیر ہوا تھا ان کا کہنا ہے کہ جب انھوں نے یہ کام شروع کرنا چاہا تو پہلے ایک خطبہ دیا جس میں صحابہ کو ہدایت کی کہ جس جس شخص نے قرآن کریم کا کوئی حصہ رسول اللہ سے براہِ راست حاصل کیا ہو وہ اسے ہمارے پاس لائے۔ صحابہ کی عادت تھی کہ وہ رسول اللہ سے جو کچھ سنتے اسے چمڑوں، تختیوں اور ہڈیوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب عمرؓ کے پاس لے آئے۔ وہ کسی شخص سے اس وقت تک قبول نہ کرتے تھے جب تک وہ اپنے ثبوت میں دو گواہ نہ پیش کر دیتا تھا جو آکر یہ گواہی دیتے تھے کہ واقعی یہ آیات رسول اللہ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی تھیں۔ عمرؓ اس کام کو ابھی ختم نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی شہادت ہو گئی۔ ان کے بعد عثمانؓ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ انھوں نے زیدؓ بن ثابت کو بلا کر قرآن کریم جمع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا اور ہدایت کی کہ اگر طرزِ تحریر میں کہیں اختلاف واقع ہو تو اُسے مضر کی زبان میں لکھ لیا کرو کیونکہ قرآن کریم مضر ہی کے ایک شخص (رسول اللہ) پر نازل ہوا تھا۔

قرآن جمع ہونے کا زمانہ

قبل اس کے کہ میں تاریخ جمع قرآن پر روشنی ڈالوں ابوبکرؓ کے اس قول کی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ

میں وہ کام کیونکر کرسکتا ہوں جسے رسولؐ اللہ نے نہیں کیا"۔ رسولؐ اللہ وحی کا نزول، نبوّت تفویض ہونے کے وقت سے مدینہ میں وفات کے وقت تک مسلسل تیئیس سال تک ہوتا رہا بعض اوقات چند آیات نازل ہوتی تھیں بعض اوقات پوری سورت نازل ہوجاتی تھی۔ سب سے پہلی وحی جو آپ پر نازل ہوئی وہ سورۂ قلم کی یہ آیات تھیں: اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔ اس سورت کی بقیہ آیات جنھیں ہم آج کل قرآنِ کریم میں مندرجۂ بالا آیات کے ساتھ شامل پاتے ہیں، نہ صرف بعد میں نازل ہوئیں بلکہ ان کا نزول وحی کے بیشتر حصّے کے نزول کے بعد ہوا۔ کیا ابوبکرؓ کے مندرجۂ بالا قول کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ رسولؐ اللہ کی وفات تک قرآن کریم پراگندہ حالت میں تھا۔ نہ اس کی آیات میں کوئی ترتیب تھی نہ سورتوں میں، سب متفرق حالت میں تھیں اور جو ترتیب آج کل نظر آتی ہے وہ اس زمانے میں مفقود تھی؟

بعض مؤرخین کا خیال یہی ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے وقت قرآنِ کریم واقعی منتشر اور پراگندہ حالت میں تھا۔ اپنی تائید میں انھوں نے زیدؓ بن ثابت کی یہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ "رسولؐ اللہ فوت ہوگئے اور قرآن کسی ایک جگہ جمع نہ تھا"۔ مستشرقین کا ایک مخصوص گروہ بھی اسی امر کو قابلِ ترجیح قرار دیتا ہے۔ مشہور انگریز مؤرخ سر ولیم میور تو اپنی کتاب کے مقدمے میں زیدؓ بن ثابت کا یہ قول بڑے زور سے اپنی تائید میں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"قرآن کریم کے اجزا نہایت سادہ طور پر ایک دوسرے سے ملا دیے گئے ہیں، اس میں کسی قسم کا تکلف نہیں برتا گیا اور فنی مہارت اور چابک دستی کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ اس امر سے جمع کرنے والے شخص کے ایمان و اخلاص اور اس سچی عقیدت کا پتا چلتا ہے جو اسے اس کتاب سے تھی۔ ان آیات مقدسہ سے مرتب کی گہری عقیدت اور احترام ہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے انھیں باقاعدہ ترتیب دینے کی کوشش نہ کی بلکہ جو آیات اسے ملتی گئیں، انھیں وہ ایک جگہ جمع کرتا گیا۔" جو مستشرقین اس رائے کے مؤید ہیں وہ کہتے ہیں کہ زیدؓ بن ثابت اور اُن کے معاونین نے قرآن جمع کرتے وقت اس کی نزولی ترتیب ملحوظِ خاطر نہیں رکھی اور مکہ میں اُترنے والی آیات کو مدینہ میں نازل ہونے والی آیات سے پہلے درج

کرنے کا کوئی التزام نہیں کیا بلکہ بلا لحاظ اس بات کے کہ موقع اور محل متقاضی ہے یا نہیں مکی سورتوں کے درمیان مدنی آیات کو داخل کر دیا۔ مستشرقین کی رائے میں اگر زیدؓ بن ثابت تاریخی ترتیب مدنظر رکھتے تو یہ چیز علمی تحقیق کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوتی اور رسول عربی کے حالات کی چھان بین کرنے اور آپ کی سیرت کو پرکھنے میں اس سے بے حد مدد ملتی۔"

مستشرقین یہ بھی لکھتے ہیں کہ قرآن جمع کرنے والوں نے آیات کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے بھی ترتیب نہیں دیا۔ اس کے نتیجے میں ایک ہی سورت میں قصص اور تاریخ کے متعلق بھی باتیں ملتی ہیں اور ایمان و عبادات کے متعلق بھی ——————— تشریعی احکام بھی ملتے ہیں اور انسانی فطرت سے تعلق رکھنے والے قوانین بھی۔ مزید برآں مختلف موضوعات کے متعلق ایک قسم کی روایات کو بجائے ایک جگہ اکٹھا کرنے کے مختلف سورتوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح ایک چیز کو تلاش کرنے کے لیے سارے قرآن کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے تو کہیں جا کر گوہر مراد حاصل ہوتا ہے۔ مستشرقین کی رائے میں جامعین قرآن نے موضوعات کا خیال نہ رکھ کر اور بالخصوص ترتیب نزولی سے غفلت برت کر زبردست کوتاہی کا ثبوت دیا ہے اور اس طرح دنیا کو ایک علمی انکشاف سے محروم کر دیا ہے۔

مستشرقین کی ان تمام آرا کی بنیاد ابوبکرؓ کے اس قول پر ہے کہ میں وہ کام کیونکر کر سکتا ہوں جو رسول اللہؐ نے نہیں کیا لیکن انھوں نے ابوبکرؓ کا یہ قول سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آیاتِ قرآنیہ ابتدائے نزول ہی سے پراگندگی کی حالت میں تھیں تاآنکہ خلیفۂ اول اور خلیفۂ سوم کے زمانوں میں انھیں یک جا کر دیا گیا۔ لیکن یہ خیال قطعاً درست نہیں۔ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ تمام آیات رسول اللہؐ کی زندگی میں آپ کے حکم سے سورتوں میں مرتب ہو چکی تھیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

"مالک کہتے ہیں کہ "قرآن مجید اسی طرح تالیف کیا گیا جس طرح صحابہ اسے رسول اللہؐ سے پڑھتے ہوئے سنتے تھے۔"

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں:

"میں نے رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے ستر سے زیادہ سورتیں سن کر یاد کیں۔
اور ایک دفعہ میں نے آپ کے سامنے ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطہرین
کی آیت تک سورۂ بقرہ تلاوت کی۔"

زید بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے سارا قرآن رسولؐ اللہ کے سامنے پڑھا۔
مسلم اور بخاری میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ "رسولؐ اللہ کی زندگی میں چار اشخاص نے قرآنِ کریم جمع (حفظ) کیا تھا اور چاروں انصار میں سے تھے یعنی ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید۔"

انس کا مطلب یہ نہیں کہ رسولؐ اللہ کے عہد مبارک میں اِن چاروں صحابہ کے سوا اور کسی صحابی نے قرآن کریم حفظ نہ کیا تھا۔ اِس روایت کی تشریح کرتے ہوئے قرطبی لکھتے ہیں:

"یہ امر متعدد شہادتوں سے ثابت ہے کہ رسولؐ اللہ کے عہد میں عثمانؓ، علیؓ، تمیم الداری، عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن عمرو بن عاص نے بھی قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ ان روایات کی موجودگی میں انس بن مالک کی روایت "قرآن کریم انصار کے چار آدمیوں کے سوا اور کسی نے حفظ نہیں کیا" کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان چار آدمیوں کی جماعت کے سوا اور کسی بھی شخص نے براہِ راست رسولؐ اللہ سے سن کر قرآن حفظ نہ کیا۔ صحابہ مختلف اوقات میں رسولؐ اللہ سے قرآن سن کر حفظ کر لیا کرتے تھے اور دوسروں کو سکھاتے تھے۔ پھر بھی تمام صحابہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ انھوں نے قرآن کریم کی تمام آیات رسولؐ اللہ کی زبان مبارک سے سنی ہوں اس طرح اکثر صحابہ نے قرآن کریم کا کچھ حصہ رسولؐ اللہ سے اور کچھ حصہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے حاصل کیا تھا۔ متعدد روایات سے پتا چلتا ہے کہ چاروں اصحاب کو براہِ راست رسولؐ اللہ سے سن کر قرآن کریم حفظ کرنے کا شرف اِس لیے حاصل ہوا کہ یہ بہت مخلص اور سابقون الاولون مسلمانوں میں سے تھے اور آپ اُن سے بہت لطف و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔"

یہ روایت بھی کثرت سے کتب احادیث میں مروی ہے کہ رسولؐ اللہ ہر سال جبریل کے

سامنے قرآنِ کریم کا ایک دور کیا کرتے تھے لیکن وفات والے سال آپ نے ایک کی بجائے دو دور کیے۔

سیرتِ نبوی میں بھی جو واقعات درج ہیں وہ ان متذکرہ بالا روایات کی پوری تائید کرتے ہیں۔ منجملہ دیگر واقعات کے عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی ہے جو رسول اللہ کی بعثت کے دس سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ جب دین اسلام نے مکہ میں فروغ حاصل کرنا شروع کیا اور اہلِ مکہ میں باہم تفرقے پیدا ہونے لگے تو عمرؓ کو جو اس وقت حالتِ کفر میں تھے، سخت طیش آیا اور انھوں نے رسول اللہ کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ وہ قتل کے ارادے سے آپ کی جانب جا ہی رہے تھے کہ راستے میں نعیم بن عبداللہ سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ انھوں نے عمر کو ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے دیکھا تو حیران ہوکر پوچھا کہ اس ہیئت میں کہاں جارہے ہو۔ جب انھیں عمرؓ کے مقصد کا علم ہوا تو انھوں نے کہا "محمدؐ کو تو بعد میں قتل کرنا، پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمھاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔" یہ سن کر عمرؓ رسول اللہ کی طرف جانے کی بجائے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ باہر سے انھوں نے سنا کہ خبابؓ ان دونوں کو قرآن سنا رہے ہیں۔ انھوں نے گھر میں داخل ہوکر بہن اور بہنوئی دونوں کو زدوکوب کرنا شروع کیا لیکن آخر انھیں اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور انھوں نے بہن سے کہا کہ جو کتاب تم پڑھ رہی تھیں مجھے بھی دکھاؤ۔ چنانچہ بہن چند اوراق اٹھا لائیں۔ ان پر سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ جب عمرؓ نے یہ صحیفہ پڑھا تو قرآنی اعجاز اور اس کے جلال کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اسی وقت رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔

وہ اوراق، جن پر سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، منجملہ ان کثیر صحیفوں کے تھے جو مسلمانوں کے درمیان متداول تھے اور جن پر سورۂ طٰہٰ کے علاوہ قرآنِ کریم کی اور بھی کئی سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد رسول اللہ تیرہ برس زندہ رہے۔ آپ نے صحابہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ "مجھ سے سوا قرآن کے اور کچھ نہ لکھا جائے اور اگر کسی نے قرآن کے سوا کوئی حدیث لکھ لی ہے تو وہ اسے مٹا دے۔" یہ امر لازم تھا کہ صحابہ نماز میں تلاوت کرنے اور احکامِ دین سیکھنے کے لیے قرآن کریم کا جس قدر حصہ لکھ سکتے تھے لکھتے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی قرآن کریم لکھتے تھے جنھیں رسول اللہ مختلف قبائل کی طرف قرآن سکھانے اور دینی تعلیم دینے کے لیے روانہ فرماتے تھے۔ یہ لوگ علحدہ علحدہ آیات نہ

لکھتے تھے بلکہ پوری کی پوری سورتیں لکھتے تھے اور رسولؐ اللہ یہ سورتیں انھیں لکھواتے تھے۔

قرآنِ کریم سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ قرآن کریم میں رسولؐ اللہ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلاً نصفہ او انقص منہ قلیلاً او زد علیہ ورتل القرآن ترتیلا (اے اوڑھنے والے رات کو قیام کر، تھوڑے حصے کے لیے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کرلے یا اس پر بڑھا لے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر باترتیب پڑھ[1]) سورۂ مزمل کی آیات رسولؐ اللہ کی بعثت کی ابتدا میں نازل ہوئیں تھیں۔ اللہ کا اپنے نبی سے یہ مطالبہ کہ وہ رات کو اٹھ کر قرآن باترتیب پڑھے ظاہر کرتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کسی بھی وقت بے ترتیب اور پراگندگی کی حالت میں نہ رہیں بلکہ جونہی رسولؐ اللہ پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی آپ اسے اس کی جگہ رکھنے کا حکم دے دیتے تھے۔ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ جب یہ آیت 'واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون' نازل ہوئی تو جبریل نے رسولؐ اللہ سے کہا۔ "اے محمدؐ! اسے سورۂ بقرہ کی دو سو اسیّ ویں آیت کے شروع میں رکھیں۔"

قرآنِ کریم بار بار اپنی تعریف 'کتاب' کے الفاظ سے کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ، فاتحہ کے بعد، قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس کا آغاز ہی اللہ اس آیت سے کرتا ہے، الم۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین (یہ قرآن ایک کتاب ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ یہ متقیوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے) اسی طرح اور بھی کئی جگہ قرآن کے لیے کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کتاب اس چیز کو کہتے ہیں جو لکھی ہوئی ہو اور اس سے پہلے ہم متعدد احادیث کی رو سے ثابت کرچکے ہیں کہ رسولؐ اللہ کے عہد میں قرآن لکھا جاتا تھا۔ زید بن ثابت کا یہ قول ہم پہلے نقل کرچکے ہیں کہ رسولؐ اللہ وفات پا گئے اور قرآنِ کریم کسی ایک جگہ جمع نہ تھا لیکن ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا۔ "ہم رسولؐ اللہ کے پاس ہوتے تھے اور قرآن کو کپڑے کے ٹکڑوں پر تالیف کرتے تھے۔" مطلب یہ کہ وہ رسولؐ اللہ کی ہدایات اور اشارات کے

---

[1] ترتیل کے معنی صرف ٹھہر ٹھہر کر اتارنے اور بیان کرنے ہی کے نہیں بلکہ اس کے معنی میں تالیف اور ترتیب بھی شامل ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے رتل القرآن احسن تالیفہ وابانہ وتمھل فیہ یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کر اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا۔ (مترجم)

مطابق متفرق آیات اپنے اپنے موقع پر لکھ لیا کرتے تھے چنانچہ تالیف کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ علاوہ بریں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نماز میں اور نماز کے علاوہ بھی پوری پوری سورتیں مثلاً بقرہ، آل عمران، نساء، اعراف، جن، نجم، رحمن اور قمر وغیرہ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ آیات کی ترتیب رسول اللہ کے عہد ہی میں آپ کی ہدایات کے مطابق مکمل ہو گئی تھی اور قاریوں، حافظوں اور دوسرے مسلمانوں نے اسے اپنے اپنے سینوں میں مکمل طور پر محفوظ کر لیا تھا۔

صحابہ نے نہ صرف قرآن کو رسول اللہ کی زندگی ہی میں اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا تھا بلکہ چار اصحاب نے تو اسے باقاعدہ لکھ بھی لیا تھا۔ اس امر پر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ جہاں تک آیات کی ترتیب کا سوال ہے رسول اللہ کی وفات سے قبل لکھے ہوئے مصحفوں اور آپ کی وفات کے بعد مرتب کیے ہوئے مصحفوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ آیات کی ترتیب رسول اللہ نے اپنی زندگی میں خود فرما دی تھی، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کام رسول اللہ نے اپنی امت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

جب یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ کی زندگی ہی میں جمع ہو گیا تھا۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ کے اس قول کا کیا مطلب لیا جائے گا جو انھوں نے جمع قرآن کی تجویز پیش کیے جانے پر عمرؓ سے کہا تھا یعنی "میں وہ کام کیونکر کر سکتا ہوں جو رسول اللہ نے نہیں کیا"؟ اور وہ کیا دلیلیں تھیں جنھوں نے آخر ابوبکرؓ اور زید بن ثابت کے دلوں کو کھول دیا اور وہ دونوں عمرؓ کی تجویز کے مطابق قرآن کریم جمع کرنے پر متفق ہو گئے؟

جب ابوبکرؓ کی بیعت ہو چکی تو علیؓ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ لوگوں نے یہ بات ابوبکرؓ سے جا کر کہی۔ انھوں نے علیؓ کو کہلا بھیجا "کیا آپ میری بیعت کرنا پسند نہیں کرتے کہ اپنے گھر جا کر بیٹھ گئے ہیں؟" علیؓ نے جواب میں کہلا بھیجا "واللہ! یہ بات نہیں بلکہ مجھے ڈر ہے کہ مبادا لوگ کتاب اللہ میں زیادتی کر دیں۔ اس لیے میں نے قسم کھالی ہے کہ اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں[1]"

---

[1] علیؓ کا یہ قول "مجھے ڈر ہے کہ مبادا لوگ کتاب اللہ میں زیادتی کر دیں" صرف سیوطی نے کتاب الاتقان میں درج (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۵ پر)

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد قرآن کریم جمع کرنے میں علیؓ اکیلے نہ تھے بلکہ کئی اور صحابہ بھی اس کام میں ان کے شریک تھے۔ ابوبکرؓ نے جمع قرآن کے سلسلے میں علیؓ اور دوسرے صحابہ کے کام کو سراہا اور اس عظیم کام سے کسی ایک شخص کو رد کرنے کا خیال بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ وہ مطمئن تھے کہ اللہ ہی نے قرآن کریم نازل کیا ہے اور وہی اس کا محافظ ہے کسی مسلمان کے دل میں اس بات کا خیال بھی نہیں آسکتا کہ وہ اپنی طرف سے قرآن کریم میں کمی بیشی کرے اور اگر کوئی ایسا کرے گا بھی جس کا خدشہ علیؓ بن ابی طالب نے ظاہر کیا ہے تو اللہ خود ہی اپنی کتاب کی حفاظت فرمائے گا۔ اور اسے اپنے ارادے میں قطعاً ناکام و نامراد رکھے گا۔ اسی لیے جب عمرؓ نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم جمع کرنے کا کام شروع کرائیں تو ابوبکرؓ کو تردد ہوا کیونکہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جو رسول اللہؐ نے نہ کیا ہو اور کسی ایسے کام سے پہلو تہی اختیار نہ کرتے تھے جو آپ نے انجام دیا ہو۔ رسول اللہؐ نے قرآن کریم لکھنے کا کام عامۃ المسلمین کے سپرد کر رکھا تھا، بعض لوگوں کو خود رسول اللہؐ قرآن کریم لکھوا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان کاتبین سے نقل یا سن کر سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ ان کے زمانے میں بھی وہی طریقہ جاری رہے جو رسول اللہؐ کے عہد میں جاری تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ کر قرآن کریم لکھ لیں یا حفظ کر لیں۔ دربارِ خلافت سے بالخصوص اس کے لیے کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۴)

کیا ہے۔ دیگر مؤلفین نے علیؓ کا صرف یہ قول لکھا ہے "میں نے قسم کھائی ہے کہ اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں۔" ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یہ روایت درج کی ہے کہ ابوبکرؓ نے بیعت کے چند روز بعد علیؓ کو کہلا بھیجا "اے ابوالحسن! کیا آپ میری امارت سے ناراض ہیں؟" انھوں نے جواباً کہلا بھیجا "واللہ! نہیں، میں نے قسم کھائی ہے کہ سوا جمعہ کے گھر سے باہر نہ نکلوں گا" پھر خود ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کر کے واپس چلے آئے۔ ابن ابی داؤد روایت کے آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسرے مؤرخین نے علیؓ کی جانب یہ قول منسوب کیا ہے "میں اس وقت تک باہر نہ نکلوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں۔" یہاں جمع کرنے سے مراد حفظ کرنا ہے کیونکہ اس وقت جو شخص قرآن کریم حفظ کر لیتا تھا اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس نے قرآن جمع کر لیا ہے۔

یہ بھی ابوبکرؓ اور زید بن ثابت کی دلیل لیکن جب عمرؓ نے اس بارے میں اصرار کرنا شروع کیا اور اس کے حق میں دلائل بھی دیے تو ابوبکرؓ کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی اور عمرؓ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم جمع کرنے کا حکم دے دیا۔ افسوس ہے کہ تاریخ سے اس گفتگو کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا جو اس باب میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان ہوئی۔ اگر تفصیلات بھی کتب تاریخ میں محفوظ ہوتیں تو اس معاملے کے کئی اور بھی پہلو نظروں کے سامنے آجاتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمع قرآن کریم کے سلسلے میں وہ کون سا کام تھا جو رسول اللہ نے نہ کیا اور ابوبکرؓ اور زیدؓ بن ثابت کو اسے کرتے ہوئے تردد ہوا کیونکہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ اسے فوراً لکھوا کر ہدایت کر دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ لی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو درست ہے آپ اُتری ہوئی آیات کے بارے میں کاتبانِ وحی کو اُن کا محل اور موقع بتا دیا کرتے تھے لیکن یہ تمام آیات منفرق جگہ لکھی ہوئی تھیں۔ چونکہ رسول اللہ پر وحی کا نزول تواتر سے ہو رہا تھا اس لیے آپ اپنی زندگی میں اُسے ایک جگہ جمع نہ کرا سکے لیکن آپ کی وفات کے بعد جب وحی کا نزول بند ہو گیا اور کتاب اللہ کامل ہو گئی تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ جو کام رسول اللہ اپنی زندگی میں انجام نہ دے سکے اُسے ضائع ہونے اور تحریف و تبدل کے خدشے کے پیشِ نظر آپ کے بعد فی الفور مکمل کر لیا جائے۔

یہ تھیں وہ وجوہ جن کے پیشِ نظر عمرؓ نے ابوبکرؓ سے جمع قرآن پر اصرار کیا۔ چونکہ عمرؓ کے دلائل بہت ٹھوس اور وزنی تھے اور اس میں سراسر اسلام اور مسلمانوں کے لیے بھلائی مضمر تھی اس لیے ابوبکرؓ نے عمرؓ کی بات مان لی اور زید بن ثابت کو قرآن کریم جمع کرنے کا حکم دے دیا۔

چنانچہ ابو عبداللہ زنجانی اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھتے ہیں "شواہد سے پتا چلتا ہے عمرؓ کا موقف صرف یہ تھا کہ قرآن کریم کو جو اب تک ہڈیوں، لکڑیوں اور کھالوں پر لکھا ہوا بکھرا پڑا تھا، باقاعدہ اوراق پر لکھ کر ایک جگہ پر جمع کر لیا جائے لیکن صحابہ میں چونکہ حد درجہ احتیاط تھی اور وہ ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہتے تھے جسے رسول اللہ نے نہ کیا ہو اس لیے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ کام بدعت میں شمار نہ ہو۔"

عثمانؓ کے عہد میں جمعِ قرآن

یہ بیان کرنے سے پہلے کہ جمع قرآن کے سلسلے میں کیا کام ہوا، یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ عثمانؓ کے عہد میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے ثابت کر دیا کہ عمرؓ نے جمع قرآن کے سلسلے میں جو رائے دی تھی وہ انتہائی صائب تھی اور انھوں نے اپنی دور رس نگاہوں سے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ اگر قرآنِ کریم ایک جگہ جمع نہ کیا گیا تو آئندہ مسلمانوں کو کس قدر عظیم خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا عمرؓ اور عثمانؓ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ بے حد وسیع ہو گیا تھا مفتوحہ علاقوں میں نومسلموں کو قرآن کریم پڑھانے اور سکھانے کا کام صحابہ کرام کے سپرد تھا لیکن اسلامی سلطنت کی حدود چونکہ بے حد وسیع ہو چکی تھیں اس لیے لوگوں کی قراءتوں میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا پھر یہ اختلاف آہستہ آہستہ وسعت اختیار کرنے لگا اور لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہماری قراءت تمھاری قراءت سے بہتر ہے معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ لوگوں نے قراءت کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر شروع کر دی اور اس طرح ایک زبردست فتنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حذیفہ بن یمان نے، جو اس زمانے میں آرمینیہ اور آذربائیجان میں مصروف پیکار تھے، تکفیر و تفسیق کا بڑھتا ہوا طوفان دیکھ کر سخت خطرہ محسوس کیا۔ وہ فوراً مدینہ پہنچے اور عثمانؓ سے عرض کیا: "امیر المومنین! امت کی خبر لیجیے، وہ ہلاک ہونے کو ہے۔" عثمانؓ نے پوچھا "کیا ہوا؟" حذیفہ نے سارا ماجرا عرض کر کے بتایا "ہماری فوج میں عراق، شام اور حجاز کے لوگ شامل ہیں، ان کے درمیان قراءتوں میں سخت اختلاف واقع ہو گیا ہے اور نوبت ایک دوسرے کی تکفیر تک پہنچ گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بھی کتاب اللہ میں اسی طرح اختلاف نہ کرنے لگیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں کیا تھا۔" حذیفہ کی باتیں سن کر عثمانؓ نے بھی خطرے کی اہمیت محسوس کی اور لوگوں کو جمع کر کے یہ سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ لوگوں نے کہا "آپ ہی بتائیے اس خطرے سے نبٹنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔" انھوں نے فرمایا، "میری رائے تو یہ ہے کہ لوگوں کو ایک قراءت پر اکٹھا کر دیا جائے کیونکہ اگر آج مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تو آئندہ پیدا ہونے والا اختلاف موجودہ رونما ہونے والے اختلاف سے بہت زیادہ سخت ہوگا۔"

تمام صاحب الرائے حضرات نے عثمانؓ کی تجویز کی تائید کی۔ اس پر انھوں نے ام المومنین حفصہؓ کو کہلا بھیجا کہ مصحف ابوبکرؓ کچھ روز کے لیے ہمیں دے دیجیے ہم اس سے نقلیں کرا کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیں گے اور آپ کا مصحف آپ کو واپس کر دیں گے۔ چنانچہ ام المومنین نے وہ مصحف عثمانؓ کو بھجوا دیا اور انھوں نے اس کی نقلیں کرا کے اطرافِ مملکت میں پھیلا دیں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کے باقی نسخوں اور تحریرات کو تلف کرنے کا حکم دے دیا۔

عثمانؓ کے عہد کا یہ اختلاف عمرؓ کی دور بینی اور بالغ نظری کا زبردست ثبوت ہے۔ عثمانؓ نے مصحف ابوبکرؓ کی نقلیں اطرافِ مملکت میں پھیلا کر اور باقی تمام مضمون کو تلف کرنے کا حکم دے کر مسلمانوں کے درمیان قرارت کا اختلاف مٹا دیا۔ اگر ابوبکرؓ قرآن جمع کرنے کا حکم نہ دیتے تو یہ اختلاف بسیع تر ہو جاتا اور مسلمانوں کو ایسے فتنے کا سامنا کرنا پڑتا جو سیاسی فتنوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا۔ اسی امر کو دیکھتے ہوئے علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا تھا اور بالکل سچ فرمایا تھا:

"قرآن کریم جمع کرنے کے کام میں ابوبکرؓ تمام لوگوں سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں کیونکہ آپ وہ شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قرآن جمع کیا۔"

ابنِ مسعود کی ناراضی

عمرؓ سے گفتگو کرنے کے بعد جب ابوبکرؓ کو انشراحِ صدر ہو گیا تو انھوں نے زیدؓ بن ثابت کو قرآن کریم جمع کرنے کا مہتم بالشان کام سپرد کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود کو ابوبکرؓ کا یہ فعل ناگوار گزرا اور انھوں نے کہا:

"مسلمانو! مجھے تو قرآن کریم لکھنے سے ہٹا دیا گیا ہے اور ایسے شخص کے سپرد یہ کام کر دیا گیا ہے جو میرے اسلام لانے کے وقت ایک کافر کے صلب میں تھا۔"

ان کی مراد زید بن ثابت سے تھی جو عبداللہ بن مسعود کے اسلام لانے کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب عثمان نے اپنے عہد میں زید بن ثابت کو قرآن کریم لکھنے کا کام سپرد کیا تھا اور چند صحابہ کو بھی اس کام میں ان کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے عبداللہ بن مسعود نے دونوں مرتبہ ناراضی کا اظہار کیا ہو چنانچہ قرطبی لکھتے ہیں:

"ابوبکر انباری کہتے ہیں ابوبکرؓ اور عثمانؓ کی جانب سے زید کو جمع قرآن کا کام سپرد کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان دونوں حضرات کو ابن مسعود سے کوئی پرخاش تھی عبداللہ یقیناً زید سے زیادہ فاضل، سابقون الاولون میں شامل اور دیگر خدماتِ دینیہ میں ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے تھے لیکن ان تمام خوبیوں اور فضیلتوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں تک حفظ قرآن مجید کا تعلق ہے ابن مسعود زید بن ثابت کے ہم پلہ نہ تھے۔"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی ناراضی ابوبکرؓ اور عثمانؓ دونوں کے عہد میں ظاہر ہوئی۔

ابن مسعود کی ناراضی یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا نہ کرتے تھے "میں نے رسول اللہ کی زبان مبارک سے ستر سے زیادہ سورتیں سن کر یاد کیں لیکن زید بن ثابت اس وقت بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے پھرتے تھے" بلکہ عثمان کے عہد میں انھوں نے اہل عراق کو ابھارنا شروع کیا تھا کہ وہ جمع قرآن کریم کے کام میں زید بن ثابت کی اعانت نہ کریں۔ وہ کہتے تھے "میں نے اپنا مصحف چھپا لیا ہے اور جو بھی شخص اپنا مصحف چھپا سکتا ہے وہ ضرور چھپا لے۔"

ایک دن انھوں نے خطبہ دیا اور کہا:

"اے لوگو! اپنا اپنا مصحف چھپا لو۔ تم مجھ سے یہ امید کس طرح کر سکتے ہو کہ میں زید بن ثابت کی قرارت اختیار کروں گا حالانکہ میں نے رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے ستر سے زائد سورتیں سنی اور یاد کی ہیں لیکن زید بن ثابت اس وقت بچے تھے اور اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مدینے کی گلیوں میں کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔ واللہ! مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ فلاں آیت کہاں اور کس موقع پر نازل ہوئی۔ مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا اور کوئی نہیں لیکن میں تم پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والا موجود ہے تو میں سفر کی سخت صعوبتیں اٹھاؤں گا اور اس کے پاس ضرور پہنچوں گا۔"

پھر بھی بڑے بڑے صحابہ نے ابن مسعود کی ان باتوں کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہ دیکھا کیونکہ

ان سے فتنہ پھیلنے کا اندیشہ تھا جس سے اسلام نے بڑی سختی سے روکا ہے۔ چنانچہ ابوالدردا سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"ہم تو عبداللہ بن مسعود کو بہت نرم دل، نرم خو اور مشفق انسان سمجھتے تھے۔ نہ معلوم انھیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ کیوں امراء پر طعن و تشنیع کرنے لگے ہیں ؟"

یہ صحیح ہے کہ عبداللہ بن مسعود بدری تھے اور زید بن ثابت بدری نہ تھے۔ ابن مسعود کو اسلام لانے میں یقیناً زید اور ان کے والد سے سبقت حاصل تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ ابن مسعود نے رسول اللہ سے ستر سے زیادہ سورتیں سیکھی تھیں لیکن با ایں ہمہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ زید رسول اللہ کے کاتب تھے اور انھوں نے آپ کی وفات تک سارا قرآن آپ سے حاصل کر لیا تھا۔ یہ خصوصیت ایسی تھی جو عبداللہ بن مسعود کو حاصل نہ تھی۔ قرطبی لکھتے ہیں :

"یہ بات بالعموم مشہور ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے سارا قرآن رسول اللہ کی زندگی میں نہ سیکھا تھا بلکہ بعض حصے ایسے رہ گئے تھے جو انھوں نے آپ کی وفات کے بعد سیکھے۔ بعض ائمہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ عبداللہ بن مسعود پورا قرآن سیکھنے سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔"

یہ امر بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ابن مسعود کا مصحف قرآنِ کریم کی آخری دو سورتوں یعنی معوذتین سے خالی تھا۔

ابوبکرؓ نے زید بن ثابت کو جمع قرآن کریم کی ذمہ داری اس لیے سپرد کی تھی کہ وہ انھیں اس کام کا پوری طرح اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے عمرؓ کے اصرار سے یہ کام شروع کرنے کا ارادہ کیا تو زید بن ثابت کو بلا کر کہا تھا :

"تم عقل مند نوجوان ہو۔ ہم تمھارے متعلق یہ خیال نہیں کر سکتے کہ تم کتاب اللہ میں تحریف و تبدل کر دو گے۔ تم رسول اللہ کے زمانے میں وحی لکھتے رہے ہو۔ اس لیے اب ہم تمھیں قرآنِ کریم جمع کرنے کا کام سپرد کرتے ہیں۔"

قرطبی نے عبداللہ بن مسعود پر زید بن ثابت کی فضیلت کے بارے میں ابوبکر انباری کا جو قول اپنی کتاب میں درج کیا تھا اس کا کچھ حصہ ہم پہلے درج کر چکے ہیں بقیہ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

"ابوبکر انباری کہتے ہیں کہ زید، عبداللہ بن مسعود سے بڑھ کر قرآن کے حافظ تھے کیونکہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں انھیں سارا قرآن سکھا دیا تھا لیکن عبداللہ بن مسعود نے رسول اللہ کی زندگی میں آپ سے ستر کے قریب سورتیں سیکھ کر حفظ کی تھیں، باقی سورتیں انھوں نے آپ کی وفات کے بعد سیکھیں۔ اس لیے جس شخص نے رسول اللہ کی زندگی میں قرآن کریم ختم کر کے اسے حفظ بھی کر لیا ہو اسی شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کریم جمع کرے اور اس کام کے لیے اسی کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے۔"

ابوبکرؓ نے زید کو دیگر اصحاب رسول اللہ پر غالباً اس لیے بھی ترجیح دی کہ وہ نوجوان تھے اور زیادہ محنت سے کام کر سکتے تھے۔ نوجوانی کی وجہ سے ان میں اپنی رائے پر اڑ جانے اور اپنے علم و فضل کے جا و بیجا اظہار کا مادہ بھی نہ تھا۔ وہ صحابہ کرام کی باتوں کو غور سے سنتے تھے اور قرآن جمع کرنے میں انتہائی تحقیق و تدقیق اور تفتیش سے کام لیتے تھے حالانکہ انھیں سارا قرآن کریم حفظ تھا۔ مزید برآں متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے سال جب آپ نے جبریلؑ کے سامنے قرآن کریم کا دوبار دور کیا تھا تو زید بن ثابت دوسرے دور کے وقت موجود تھے جو آپ کا آخری دور تھا۔

زید بن ثابت کو بھی اس عظیم الشان ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا جو ابوبکرؓ کی جانب سے ان پر ڈالی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ابوبکرؓ نے ان سے قرآن مجید جمع کرنے کو کہا تو انھوں نے جواب دیا:

"واللہ! اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے کا حکم دیا جاتا تو بھی یہ کام میرے لیے قرآن کریم جمع کرنے سے زیادہ سہل ہوتا۔"

وجہ یہ تھی کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور دیگر بڑے بڑے صحابہ کو قرآن کریم حفظ تھا چار انصاری صحابہ نے (جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے) براہ راست رسول اللہ سے قرآن کریم سیکھا تھا اور اسے باقاعدہ ترتیب دے کر لکھ رکھا تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے بھی ایک مصحف ترتیب دے رکھا تھا۔

. . . . بعض لوگوں کے مصحف مکمل تھے اور بعض . . . . .

. . . . . . کے نامکمل۔ اس صورت میں کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ زید بن ثابت

کی نگرانی اور ان کا شدید محاسبہ کرنے کے لیے موجود تھے۔ ان کا یہ عظیم الشان بوجھ سر پر اٹھا لینا یقیناً پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔

ان جلیل القدر صحابہ کے علاوہ سب سے بڑا محاسبہ کرنے والی ذات اس خدائے بزرگ و برتر کی تھی جس نے اپنے رسولؐ پر قرآن نازل فرمایا تھا اور جس کی نظر سے خفیف سے خفیف غلطی اور کوتاہی بھی مخفی نہ رہ سکتی تھی۔ اللہ کے محاسبے ہی کا ڈر تھا جس کے باعث زید بن ثابت نے انتہائی جاں کاہی سے کام لیا۔ ہڈیوں، چمڑوں، درختوں کی چھالوں، پتھروں وغیرہ پر لکھی ہوئی ایک ایک آیت جمع کرنے، ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے اور انھیں ترتیب وار ایک جگہ لکھنے میں انھوں نے حزم و احتیاط کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس طرح وہ مصحف تیار ہو گیا جس نے آئندہ قرآن کریم کا کوئی حصہ ضائع ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ جب عثمانؓ کو قراءتوں کا اختلاف مٹا کر تمام مسلمانوں کو ایک قراءت پر جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اسی مصحف کو سامنے رکھ کر اس کی نقلیں کرانے اور انھیں اطراف مملکت میں بھیج دینے کے احکام صادر کیے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ زید بن ثابت نے اپنے مصحف میں قرآنی آیات ان کی تاریخ نزول کے لحاظ سے مرتب نہ کی تھیں۔ رسول اللہ اپنے زمانے میں آیات کی ترتیب خود مقرر فرما چکے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آپ مدینہ میں اتری ہوئی آیات مکی سورتوں میں شامل کر دیتے تھے۔ زید بن ثابت کے لیے اپنی طرف سے کوئی ترتیب قائم کرنا غیر ممکن تھا۔ انھوں نے رسول اللہ کی مقرر فرمائی ہوئی ترتیب قائم رکھی اور اسی ترتیب کے مطابق قرآن کریم چمڑے کی کھالوں پر لکھ کر جمع کر دیا۔

زید کا طریق کار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ زید بن ثابت نے جمع قرآن کریم کے سلسلے میں کیا طریق کار اختیار کیا۔ اس کا اب بلا تردد یہی دیا جا سکتا ہے کہ وہی علمی اور تحقیقی طریق کار جو آج کل کے محققین اختیار کرتے

ہیں۔ با ایں ہمہ زید نے جس قدر محنت اور جاں فشانی سے کام کیا موجودہ محققین میں سے کسی کو اِس کا عشرِ عشیر بھی کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ابوبکرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جس جس شخص نے قرآن کریم حفظ کیا ہو یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہو وہ زید کو اس کی اطلاع دے اور لکھا ہوا حصہ ان کے سامنے پیش کرے۔ چنانچہ زید کے پاس ہڈیوں، پتوں، کھجور کے درخت کی چھالوں، چمڑوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی آیات اور سورتیں کثیر تعداد میں جمع ہونے لگیں۔

جب آیات اور سورتوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام مکمل ہو گیا تو زید بن ثابت نے ان کی جانچ پڑتال کی اور ترتیب کا کام شروع کیا۔ کوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کرتے تھے جب تک اچھی طرح تحقیق نہ کر لیتے تھے کہ واقعی یہ آیت اسی طرح رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی۔ ذیل کی مثال سے زید کی غایت درجہ احتیاط کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ عمرؓ نے آیت السابقون الاولون من المہاجرین والانصار الذین اتبعوہم باحسان پڑھا یعنی انصار اور الذین کے درمیان سے واؤ حذف کر دی۔ زید بن ثابت نے سن کر کہا کہ اصل آیت 'والذین اتبعوھم' باحسان ہے لیکن عمرؓ مطمئن نہ ہوئے۔ آخر انھوں نے ابی بن کعب کو بلایا اور اُن سے آیت کے متعلق دریافت کیا۔ ابیؓ نے زید کی قرأت کی تصدیق کی اور عمرؓ کے دل سے ہر قسم کا شک وشبہ دور کرنے کے لیے یہ بھی کہا "واللہ! یہ آیت رسول اللہ نے مجھے اس وقت پڑھائی تھی جب آپ بازار میں گندم کی خرید و فروخت میں مشغول تھے۔" اس پر عمرؓ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور کہا کہ واقعی زید ہی کی قرأت صحیح ہے۔

صرف عمرؓ پر موقوف نہیں بلکہ جب بھی کسی صحابی سے زید بن ثابت کو قرأت میں اختلاف ہوتا وہ تحقیق کی خاطر یہی طریقہ استعمال کرتے تھے اور صحیح قرأت کا تعین کرنے کے لیے دیگر صحابہ سے شہادتیں طلب کرتے تھے۔ اگر پتوں اور ہڈیوں وغیرہ پر لکھی ہوئی آیات میں اختلاف ہوتا تھا تو بھی جب تک ان کی صحت کے بارے میں اچھی طرح اطمینان نہ کر لیتے تھے آگے نہ بڑھتے تھے ز

. . . . اس بارے میں اپنے حافظے پر بھی اعتماد نہ کرتے تھے حالانکہ انھوں نے قرآن کریم حفظ کر رکھا تھا اور رسول اللہ نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل جبریلؑ کے سامنے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا اس وقت

وہ بھی موجود تھے۔ السابقون الاولون والی آیت میں محض ایک واؤ پر اختلاف کرنے کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کی تحقیق و تدقیق میں زید کا پایہ کس قدر بلند تھا اور جو کام ابوبکرؓ نے ان کے سپرد کیا تھا وہ انھوں نے کس قدر محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔

قرآن کریم جمع کرنے میں زید بن ثابت نے جس شدید محنت سے کام لیا اُس نے آئندہ کے لیے کلام اللہ کو ہر قسم کی تحریفات سے پاک کر دیا، چنانچہ تمام منصف مزاج مستشرقین کو اس امر کا اعتراف ہے کہ موجودہ قرآن بعینہٖ وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ پر نازل ہوا تھا اور جو زید بن ثابت نے انتہائی محنت و مشقت سے جمع کیا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"ہمیں علم ہے دنیا بھر میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں جو قرآن کی طرح کامل بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔"

سورتوں کی ترتیب

زید بن ثابت نے آیات کی صحت اور ان کی ترتیب میں تو کمال جان فشانی سے کام لیا لیکن سورتوں کی ترتیب و تنسیق پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔ سورتوں کی موجودہ صورت عثمانؓ کے عہد کی قائم کردہ ہے[1]۔ اس بارے میں مختلف روایات ہیں بعض کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب کا کام رسول اللہ نے اپنی

---

[1] یہ درست نہیں کہ رسول اللہ نے سورتوں کی ترتیب مقرر نہ فرمائی تھی اور موجودہ ترتیب عثمانؓ کے عہد کی قائم کردہ ہے حقیقت یہی ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ نے خود ہی مقرر فرما دی تھی۔ دیگر امور کے علاوہ ابوداؤد اور مسند احمد بن حنبل کی مندرجہ ذیل حدیث بھی اس کا بین ثبوت ہے:

"اوس بن ابی اوس حذیفہ ثقفی کہتے ہیں کہ ثقیف کے اس وفد میں جو اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ آیا تھا میں بھی موجود تھا۔ رسول اللہ نے ہمیں کہا کہ مجھے قرآن شریف کی منزل پوری کرنی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ جب تک وہ ختم نہ کر لوں باہر نہ نکلوں۔ اس پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کریم کو کس طرح حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: تین سورتیں، پانچ سورتیں، سات سورتیں، نو سورتیں، گیارہ سورتیں، تیرہ سورتیں اور ق سے شروع ہو کر آخر قرآن تک جسے مفصل کہتے ہیں۔"

مذکورہ بالا حدیث سے سورتوں کی ترتیب کا وجود صریحاً ثابت ہے کیونکہ وہ منزلیں جن میں اس حدیث

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۵ پر)

امت کے لیے چھوڑ دیا تھا بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے بعض سورتوں کی ترتیب تو متعین فرما دی تھی لیکن باقی سورتوں کو غیر مترتب حالت میں چھوڑ دیا تھا بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے تمام سورتوں کا نظام اور آن کی ترتیب اپنی زندگی ہی میں متعین فرما دی تھی۔ ابن وہب اپنی جامع میں لکھتے ہیں:

"ربیعہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ سورہ بقرہ اور آلِ عمران کو دوسری سورتوں پر مقدم کیوں رکھا گیا حالانکہ ان سے پہلے (۸۰) سے زیادہ سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور یہ دونوں سورتیں بھی مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ . . . .

. . . . ربیعہ نے جواب دیا بے شک ان دونوں سورتوں کو مقدم رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم اسی ترتیب سے ان لوگوں کے سامنے پڑھا جاتا تھا جنھوں نے اسے جمع کیا، لیکن وہ خاموش رہے اور اس بارے میں کچھ نہیں کہا اور اسی ترتیب پر اُن کا اجماع ہوا۔ اس لیے ہمیں اس بارے میں سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔"

بعض اہل علم کہتے ہیں:

"قرآن کریم کی سورتوں کی جو ترتیب آج کل کے مصحفوں میں پائی جاتی ہے وہ رسول اللہ کی مقرر کردہ ہے۔ باقی ابیؓ بن کعب، علیؓ بن ابی طالب اور عبداللہؓ بن مسعودؓ کے مصحفوں میں جو اختلاف پایا جاتا تھا وہ اس لیے تھا کہ آخری بار جبریل کے سامنے قرآن کریم پڑھنے سے پیشتر رسول اللہ نے سورتوں کی ترتیب مقرر نہ فرمائی تھی۔ لیکن اس واقعے کے بعد آپ نے صریحاً صحابہ کو اس کے متعلق ہدایات دے دی تھیں[1]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۴)

کی رو سے قرآن کریم کے حصے کیے ہوئے ہیں آج تک مسلمانوں میں مروج ہیں۔ ان سات حصوں کو اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں اور ہر ایک منزل میں اتنی ہی سورتیں ہیں جتنی اس حدیث میں مذکور ہیں۔ اسی طرح حدیث مذکور کے مطابق ساتویں منزل سورۃ ق سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی چھ منزلوں میں کل اڑتالیس سورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو مذکورۂ بالا حدیث سے ثابت ہے۔ (مترجم)

[1] الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، جلد اوّل صفحہ ۵۲

بعض صحابہ اس رائے کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب رسول اللہ کی مقرر کردہ نہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ علیؓ بن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس نے اپنے مصحفوں کو رسولؐ کی وفات کے بعد جمع کیا تھا۔ اگر آپ نے اپنی زندگی میں سورتوں کی ترتیب مقرر فرمائی ہوتی تو یقیناً علیؓ اور ابن عباس اسے ملحوظ خاطر رکھتے اور اپنے مصحفوں کو رسول اللہ کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق ترتیب دیتے۔ زیدؓ بن ثابت نے ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن جمع کرتے ہوئے سورتوں کو بالترتیب نہیں لکھا تھا۔ یہ ترتیب کلیۃً صحابہ کے اجتہاد سے عمل میں آئی۔ رسول اللہ نے اس کے متعلق خود کوئی حکم نہیں دیا تھا۔[1]

میری رائے بھی یہی ہے کہ رسول اللہ نے بطور خود سورتوں کی ترتیب مقرر نہیں فرمائی بلکہ یہ کام امت کے لیے چھوڑ دیا۔ چنانچہ ابن عباس سے اسی سلسلے میں ایک روایت مروی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

> "میں نے عثمان سے پوچھا کہ آپ نے انفال اور برأۃ کی سورتوں کو، جو بالترتیب (۸۰) اور دو سو آیات پر مشتمل ہیں، اس طرح کیوں ملایا ہے کہ ان کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی اور اس طرح ان دونوں سورتوں کو سات لمبی سورتوں (سبع طوال) میں شامل کر دیا ہے۔ عثمان نے جواب دیا" رسول اللہ پر بعض دفعہ ایک ہی وقت میں کئی سورتوں کی آیات نازل ہوتی تھیں۔ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا لیتے اور اسے حکم دیتے کہ یہ آیت فلاں سورت کے فلاں موقع پر لکھ دو۔ سورت انفال مدنی زندگی کے اوائل میں آپ پر نازل ہوئی تھی اور سورت برأت کا نزول آخری زمانے میں ہوا۔ چونکہ ان دونوں سورتوں کا مضمون آپس میں ملتا جلتا تھا اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ سورت برأت سورت انفال ہی کا حصہ ہے۔ چونکہ آپ نے ہمیں صراحۃً نہ فرمایا تھا کہ یہ سورت کس سورت کا حصہ ہے اس لیے میں نے دونوں سورتیں اکٹھی کر دیں اور ان دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھا۔ اس طرح انھیں سات طویل

---

[1] تاریخ القرآن از ابوعبداللہ زنجانی، صفحہ ۴۸ تا ۵۸

سورتوں میں شامل کر دیا[1]۔"

اصل میں سورتوں کی ترتیب کا تعلق ہمارے اس باب سے نہ تھا۔ اس کا ذکر ضمناً قرطبی کے اس قول کی وضاحت کے سلسلے میں آگیا کہ "زید بن ثابت نے قرآنِ کریم کو سخت محنت و مشقت کے بعد جمع کیا تھا لیکن اس کی سورتیں آپ کی مرتب کی ہوئی نہیں"۔

جمع قرآن کی تکمیل

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زید نے سارا قرآن ہی ابوبکرؓ کے عہد میں جمع کر لیا تھا یا اس کام کی تکمیل عمرؓ کے زمانے میں ہوئی۔ اس کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بخاری کی ایک روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں ذکر ہے کہ وہ اوراق جن میں زید نے قرآن جمع کیا تھا، ابوبکرؓ کے پاس رہے۔ ان کی وفات کے بعد عمرؓ نے انھیں اپنے پاس رکھ لیا۔ عمرؓ کی وفات کے بعد وہ ان کی بیٹی ام المومنین حفصہ کی تحویل میں آ گئے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کا کام ابوبکرؓ کے عہد میں مکمل ہو چکا تھا لیکن بعض روایتیں اس قسم کی بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تکمیل عمرؓ کے عہد میں ہوئی۔

---

[1] اس حدیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عثمانؓ کی رائے کو ترتیب قرآنی میں کوئی دخل تھا بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی رسول اللہ نے خود ہی کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ عثمانؓ کی غایت درجہ احتیاط کا بھی پتا چلتا ہے حالانکہ تمام سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کا عام قاعدہ تھا مگر اس سورت کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سند رسول اللہ سے نہ پا کر اپنی رائے کو اتنا دخل بھی نہ دیا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی اس پر لکھ دیتے۔

اصل بات یہ ہے کہ ابنِ عباس نے عثمانؓ سے اس کی وجہ دریافت کی تھی کہ انفال اور برارت کو ملا کر کیوں رکھا گیا؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ آیتوں اور سورتوں کے نزول کے وقت رسول اللہ خود انھیں خاص خاص مقامات پر رکھواتے تھے جس کا مطلب صاف ہے کہ آپ ہی کی ہدایت سے یہ دونوں بھی اس طرح رکھی گئیں۔ اس کے بعد عثمانؓ اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ میرا خیال یہ تھا، انفال اور برارت ایک دوسری ہی کا حصہ ہیں مگر آپ نے چونکہ ایسا نہ فرمایا اس لیے میں انھیں ایک دوسری کا حصہ نہیں کہتا۔ یہ روایت ایک مضبوط اور زبردست شہادت ہے اس بات پر کہ آیتوں اور سورتوں کی تمام ترتیب خود رسول اللہ نے مقرر فرمائی اور جو کچھ آپ نے کیا یا فرمایا اس سے صحابہ نے سرِمو انحراف نہ کیا۔ (مترجم)

یہ معلوم کرنا بے حد دشوار ہے کہ کون سی روایت صحیح ہے۔ البتہ دونوں قسم کی روایتوں میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ زید بن ثابت نے قرآن کریم کا اکثر حصہ ابوبکرؓ کی زندگی ہی میں جمع کر لیا تھا۔ جن اوراق پر وہ قرآن کریم لکھتے تھے ابوبکرؓ کو دیتے جاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد وہ اوراق عمرؓ نے اپنے پاس منگوا لیے۔ زید نے جب ان کے عہد میں قرآن کریم کی تکمیل کی تو بقیہ اوراق بھی انھیں کے سپرد کر دیے۔ اس طرح قرآن کریم کے مکمل اوراق عمرؓ کے پاس جمع ہو گئے یہی اوراق سامنے رکھ کر عثمانؓ نے دیگر مصاحف تیار کرائے۔ آج ہم جس قرآن کی تلاوت کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہی ہے جو ابوبکرؓ نے زید بن ثابت کے ذریعے سے جمع کرایا تھا۔ اور یہی قرآن انھیں الفاظ اور اسی ترتیب سے قیامت تک پڑھا جائے گا۔

ابوبکر کا سب سے بڑا کارنامہ

"اللہ ابوبکرؓ پر رحمت نازل فرمائے۔ قرآن کریم جمع کرنے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو علیؓ نے ابوبکرؓ کے متعلق بیان فرمائے اور انھیں الفاظ پر ہر مسلمان کا یقین و ایمان ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت دل میں کئی مرتبہ یہ سوال پیدا ہوا کہ ابوبکرؓ کا کون سا کارنامہ سب سے زیادہ عظیم الشان ہے۔ مرتدین کی سرکوبی اور سرزمین عرب سے ارتداد کا مکمل خاتمہ؟ عراق اور شام کی فتوحات جو اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ثابت ہوئیں جس کی بدولت انسان کو تہذیب و تمدن سے آگاہی نصیب ہوئی؟ یا کلام اللہ کو جمع کرنے کا کام جو ایک امی نبی محمد مصطفےٰؐ پر نازل ہوا اور جس نے اپنی روشنی سے دنیا بھر کو منور کر دیا۔ جب بھی یہ سوال ذہن میں آیا، یہ جواب دینے میں قطعاً تردد محسوس نہ ہوا کہ بلا شبہ جمع قرآن کریم ابوبکرؓ کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ ہے اور اسی سے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ برکت نصیب ہوئی۔ جزیرۂ عرب کی حالت میں آہستہ آہستہ اضمحلال پیدا ہوتا گیا اور جو قوت و شوکت اسے خلافتِ راشدہ اور عہد بنی امیہ میں نصیب ہوئی تھی بنی عباس کے زمانے میں وہ مفقود ہو گئی۔ اسلامی سلطنت پر بھی آہستہ آہستہ زوال آ گیا اور مسلمان پستی کی حالت میں گرتے چلے گئے حتیٰ کہ اسلامی سلطنت کا نام بھی لوگوں کے دلوں سے

محو ہونا شروع ہو گیا۔ لوگ عرب کو بھی بھولنے لگے اور اگر اللہ نے مسلمانوں کے لیے حج کرنا فرض قرار نہ دیا ہوتا تو یقیناً ایک دن ایسا بھی آتا کہ عرب کا شمار دنیا کے گم نام گوشوں میں ہونے لگتا لیکن کتاب اللہ ابتدائے نزول سے آج تک زندہ موجود ہے اور جب تک دنیا میں ایک بھی انسان کا وجود باقی ہے کتاب اللہ زندہ اور برقرار رہے گی۔

اس بیان کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں جنگہائے مرتدین اور اسلامی سلطنت کے قیام کی اہمیت سے انکار ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں کام انتہائی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک ابوبکرؓ کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اگر ابوبکرؓ مرتدین کی سرکوبی کے سوا اور کوئی کام نہ کرتے تو بھی یہ ایک کارنامہ ان کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ اسلامی سلطنت کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے سوا اور کوئی کام ہاتھ میں نہ لیتے تو بھی یہ کارنامہ ان کا نام تاریخ کے صفحات پر تا ابد زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا لیکن جب ان عظیم الشان کارناموں کے ساتھ جمع قرآن کا مہتم بالشان کارنامہ بھی ملا لیا جائے جو اپنی شان اور افادیت میں ان دونوں کارناموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مادرِ گیتی ابوبکرؓ جیسے فرزند پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

اللہ ابوبکرؓ پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے جن کی مخلصانہ مساعی اور پیہم جدوجہد کے نتیجے میں آج بھی ہمیں قرآن کی نعمت عظمیٰ اسی طرح میسر ہے جس طرح چودہ سو برس پیشتر صحابہ کرام کو میسر تھی۔

(۱۷)

خلافتِ ابُوبکرؓ

خلافت کا تصوّر

بیعت خلافت کے بعد ایک شخص نے ابوبکرؓ کو 'یا خلیفۃ اللہ' کہہ کر پکارا۔ انھوں نے فوراً اسے ٹوکا اور فرمایا:

"میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔"

ابوبکرؓ کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ مؤرخین نے ان کے کمال انکسار اور فروتنی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ فقرہ گہرے غور و خوض کا مستحق ہے کیونکہ اس سے نہ صرف ابوبکرؓ کا انکسار ظاہر ہوتا ہے بلکہ حکومت کا وہ تصوّر بھی عیاں ہو جاتا ہے جو صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے دل میں جاگزیں تھا۔

رسول اللہ کے عہد سے پہلے لاتعداد صدیاں گزر گئیں اور آپ کے بعد بھی سیکڑوں سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل اور صدہا صدیوں پر محیط زمانے میں ہزاروں بادشاہ اور حکام گزرے ہیں جن کے متعلق خود ان کا اور ان کی محکوم رعایا کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس سرزمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس لیے جو تقدیس انھیں حاصل ہے وہ روئے زمین پر اور کسی شخص کو حاصل نہیں۔ فراعنۂ مصر کا حال کسے معلوم نہیں۔ انھیں فراعنہ میں سے ایک فرعون تو یہاں تک بڑھ گیا کہ اس نے "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمھارا بزرگ و برتر پروردگار ہوں) کا نعرہ لگا کر الوہیت تک کا دعویٰ کر دیا۔ اس زمانے میں فی الحقیقت مصریوں کے سوادِ اعظم کا یہی خیال تھا کہ ان کے بادشاہوں کو ربوبیت کی صفات حاصل ہیں۔ رہی سہی کسر اُن کے مذہبی پیشواؤں نے پوری کر دی اور انھوں نے اپنے متبعین کو بادشاہوں کی تقدیس کا یقین دلانا شروع کر دیا۔ اشور، ایران، ہندوستان اور دوسرے

ملکوں کا بھی یہی حال تھا اور وہاں کے اکثر بادشاہ اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نائب اور ظل اللہ خیال کرتے تھے اور یہی حال اُن کی رعایا کا تھا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے اندر بھی پادریوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے بادشاہوں کے اشارے پر انھیں تقدیس و احترام کا بلند ترین مرتبہ دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ پادریوں کے دعوے کے مطابق بادشاہوں کو یہ مرتبہ خدا کی طرف سے تفویض ہوا تھا۔ اس بنا پر ان کے اقتدار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ وہ زمین پر خدا کے نائب سمجھے جانے لگے۔ ان کی زبانوں سے نکلا ہوا ہر حرف بمنزلہ وحی خیال کیا جانے لگا۔ ان کا حکم خدا کے حکم کی مانند سمجھا جانے لگا جس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ پندرھویں صدی اور بعض اقوام میں سترھویں صدی تک یہی حال رہا۔ اگرچہ اس وقت یورپ نے علم و ہنر اور تہذیب و ثقافت میں خاصی ترقی کر لی تھی لیکن اندھی عقیدت کا جو پردہ لوگوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا وہ اس وقت تک نہ ہٹ سکا جب تک آزادیٔ ضمیر اور مساوات کے علم برداروں نے ان ناروا پابندیوں اور انسانی ضمیر کو کچل دینے والے عقائد کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کر دیا اور ہزاروں لاکھوں جانیں خانہ جنگیوں میں ضائع نہ ہو گئیں۔

بادشاہوں کے لیے تقدیس و احترام کا یہ جذبہ اقوامِ عالم میں صدیوں تک کارفرما رہا اور یورپ نے تو قریب کے زمانے میں اس سے نجات حاصل کی ہے لیکن ابوبکرؓ کی بےنفسی اور انکسار کا عالم دیکھیے کہ جب ایک شخص انھیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارتا ہے تو وہ فوراً یہ کہہ کر اسے ٹوک دیتے ہیں کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔

خلیفۂ رسول اللہ کے الفاظ سے بھی کسی شان و شوکت اور بڑائی کا اظہار مطلوب نہ تھا بلکہ ان کی مراد صرف یہ تھی کہ وہ اللہ کی مقررہ حدود میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی قیادت اور امورِ سلطنت کی انجام دہی کے معاملات میں رسول اللہ کے جانشین ہیں۔ لیکن ابوبکرؓ کو ان امور کی جانشینی کا خیال بھی نہ آسکتا تھا جو صرف رسول اللہ سے خاص تھے۔ اسی امر کو واضح کرتے ہوئے ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا:

> ”مجھے یہ ذمہ داری (امر خلافت) تفویض تو کر دی گئی ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس بارِ گراں اٹھانے کے قابل نہیں پاتا۔ واللہ! میری خواہش تھی کہ تم میں سے کوئی

شخص اسے اٹھائے۔ دیکھو! اگر تم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ میں بھی وہی کام کروں گا جو رسولؐ اللہ نے کیے تو یہ خیال خام ہے۔ رسولؐ اللہ یقیناً اللہ کے بندے تھے لیکن اللہ نے انھیں نبوّت کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا اور ہر قسم کے گناہوں سے منزّہ قرار دیا تھا۔ میں بھی اللہ کا بندہ ہوں مگر تم میں کسی بھی شخص سے بہتر نہیں۔ تم میرے کاموں کی نگہداشت کرو، اگر دیکھو کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے بنائے ہوئے راستے پر جا رہا ہوں تو میری اطاعت کرو لیکن اگر مجھے صراطِ مستقیم سے بھٹکا ہوا پاؤ تو ٹوک کر سیدھی راہ پر لگا دو۔"

ابوبکرؓ نے رسولؐ اللہ کے بعد مسلمانوں کی قیادت اور سلطنت کی نگہداشت کا کام مسلمانوں کے انتخاب اور ان کی رضامندی سے اپنے ذمے لیا تھا۔ اللہ نے انھیں اس طرح خلیفہ بنا کر نہ بھیجا تھا جس طرح رسولؐ اللہ کو رسولؐ بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔ اگر انھیں دوسرے مسلمانوں پر فضیلت تھی اور یقیناً تھی تو صرف تقوے کے سبب، خلافت کی وجہ سے نہیں۔ اسی لیے وہ لوگوں کو صرف وہی حکم دینے کے مجاز تھے جو اللہ کی نازل کردہ اور رسولؐ اللہ کی پیش کردہ تعلیمات کے مطابق ہوں۔ احکامِ الٰہی اور ارشاداتِ مصطفوی کے مخالف نہ وہ کوئی حکم دے سکتے تھے اور نہ مسلمان اُسے قبول کر سکتے تھے۔ چنانچہ خطبۂ اولیٰ میں انھوں نے یہ فقرہ کہہ کر اس معاملے کو بالکل صاف کر دیا تھا:

"میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں لیکن اگر میں اس کے احکام کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔"

عمرؓ کا لقب

ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ خلیفہ ہوئے لیکن انھوں نے اپنا لقب خلیفۂ رسولؐ اللہ نہ رکھا بلکہ اس بارے میں دوسرے لوگوں سے استفسار کیا۔ بعض لوگوں نے امیرالمومنین کا لقب تجویز کیا جو انھوں نے پسند فرما کر اختیار کر لیا اور آئندہ تمام خلفاء کو امیرالمومنین ہی کہا جانے لگا۔ خلیفہ کا لقب ترک کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عمرؓ خلیفۂ خلیفۂ رسولؐ اللہ کی تکرار سے بچنا چاہتے تھے۔ بعد میں تو یہ تکرار عجیب و غریب صورت اختیار کر لیتی کیونکہ اگر عمرؓ کا لقب خلیفۂ خلیفۂ رسولؐ اللہ ہوتا تو عثمان کا لقب خلیفۂ خلیفۂ خلیفۂ رسولؐ اللہ

ہونا چاہیے تھا اور علیؓ کو خلیفہ خلیفہ خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کے لقب سے یاد کرنا پڑتا۔

عمرؓ کے خلیفۂ رسول اللہ کا لقب چھوڑ کر امیرالمومنین کا لقب اختیار کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابوبکرؓ نے "میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۂ رسول اللہ ہوں" کے فقرے میں خلیفہ کا لفظ اس کے لغوی معنی میں لیا تھا اور مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ ان کی حیثیت امور سلطنت کی انجام دہی میں رسول اللہ کے جانشین کی ہے۔ اگر خلیفہ کے لقب سے اس کے لغوی معنی کے سوا کوئی اور معنی مراد لیے جاتے تو عمرؓ کو یہ لفظ چھوڑ کر 'امیرالمومنین' کا لفظ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

امیرالمومنین کا لقب اختیار کرنے کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ عمرؓ کے مشاہدے میں یہ بات آچکی تھی کہ اسلامی نظامِ حکومت نے جزیرۂ عرب اور دوسرے مفتوحہ علاقے میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا اور یہ انقلاب اس سرعت سے برپا ہوا تھا کہ لوگوں کی نظریں حیرت زدہ ہو کر رہ گئی تھیں لیکن کتاب اللہ اور سنتِ نبوی میں نظامِ حکومت کے لیے تفصیلی احکام موجود نہ تھے۔ البتہ قرآن کریم میں شوریٰ کو نظامِ حکومت کے لیے بطور بنیاد ضرور بیان کیا گیا تھا۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "وشاورھم فی الامر" (اے نبی! دنیوی معاملات میں لوگوں سے مشورہ کر لیا کرو) اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: وامرھم شوریٰ بینھم (مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) سیاسی اور ملکی امور کی انجام دہی کے لیے چونکہ اللہ کی طرف سے تفصیلی احکام موجود نہ تھے اور یہ سارا کام عمرؓ کو مشورے اور اپنی صواب دید سے کرنا تھا اس لیے ان کی حیثیت ایک سپہ سالار اور امیرِ لشکر کی تھی جسے جنگ کے سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے اصولی ہدایات تو مل جاتی ہیں لیکن لشکر کی صف بندی اور جنگ کے جملہ امور کی نگہداشت خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ عمرؓ کو امورِ سلطنت کا سارا انتظام وقتی صورتِ حال کے مطابق شرعی حدود میں رہتے اور رسول اللہ کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے خود ہی کرنا تھا۔ وہ پابند نہ تھے کہ اگر کسی معاملے کے متعلق ابوبکرؓ نے کوئی خاص راہِ عمل اختیار کی تھی تو وہ بھی لازماً وہی اختیار کریں۔ اس لیے انھوں نے خلیفہ، خلیفۂ رسول اللہ کے بجائے امیرالمومنین کا لقب اختیار کرنا پسند فرمایا۔

اس انقلاب پر نظر ڈالنے سے، جو ابوبکرؓ نے انتہائی قلیل عرصے میں پیدا کر دیا تھا، یہ حقیقت

واشگاف ہو جاتی ہے کہ سختی اور نرمی کے مواقع علحدہ علحدہ ہوتے ہیں اور اس وقت تک کوئی کام صحیح طور پر نہیں ہو سکتا جب تک سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی سے کام نہ لیا جائے۔ ابوبکرؓ کی عظیم الشان کامیابی اور ان کی بے پناہ قوت کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ ان دونوں خصلتوں کو برتنے کے صحیح مواقع جانتے تھے۔

عرب کا سیاسی نظام

رسول اللہ کے عہد تک عرب بے شمار مذاہب کا گہوارہ تھا اس کے شمالی اور جنوبی حصے ایک دوسرے سے بالکل کٹے ہوئے تھے اور ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے باشندوں سے بالکل مختلف تھے۔ یمن ایرانیوں کی عملداری میں شامل تھا اور وہاں مسیحیت اور بت پرستی پہلو بہ پہلو قائم تھیں وہاں کے لوگ حمیری زبان بولتے تھے جو تلفظ کے اعتبار سے قریش کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ مزید برآں یمن صدیوں سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں حجاز کے لوگوں پر بدویت غالب تھی۔ اس میں صرف تین شہر تھے: مکہ، یثرب اور طائف۔ ان تینوں شہروں کا بھی آپس میں اس کے سوا اور کوئی علاقہ نہ تھا کہ یہ حجاز میں واقع تھے اور ان کے باشندوں کی باہم رشتہ داریاں تھیں۔ ویسے ان شہروں کا نظام قبائل کی طرح ایک دوسرے سے بالکل علحدہ تھا۔ جہاں تک مذاہب کا تعلق تھا، مکہ میں بت پرستی زوروں پر تھی لیکن عیسائیت کو بھی وہاں نفوذ حاصل تھا۔ مدینہ میں یہودی قبائل کو بہت طاقت ور تھے لیکن اکثریت بت پرستوں کی تھی۔ جب جزیرہ نمائے عرب میں توحید کی صدا گونجی اور خدا نے چاہا کہ دین اسلام عرب کے اطراف و جوانب میں پھیل جائے تو اس نے اس کے لیے سامان بھی ویسے ہی مہیا کر دیے۔ یمن کو ایرانیوں کی غلامی سے چھٹکارا مل گیا اور وہ غیر ملکی اثرات سے بالکل آزاد ہو گیا۔ فتح مکہ کے بعد حجاز میں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ حجاز کے بعد دوسرے عرب علاقوں کی باری آئی اور تھوڑے ہی عرصے میں سارا جزیرہ نمائے عرب حلقہ بگوش اسلام ہو کر ایک ہی سلک میں منسلک ہو گیا۔ گو رسول اللہ کی رسالت اور آپ کی تعلیمات پر ایمان لانے میں کل عرب متحد تھا مگر تمام قبائل اپنی اپنی جگہ آزاد و خود مختار تھے۔ البتہ ارکان اسلام میں ایک اہم رکن کی بجا آوری کے سلسلے میں انہیں زکوٰۃ ضرور مدینہ بھیجنی پڑتی تھی۔

یہ دینی وحدت عرب کے سیاسی نظام میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مدینہ کے نواحی قبائل نے رسول اللہ سے دوستی کے معاہدے کر رکھے تھے۔ جب آپ مکہ پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو ان معاہدات کے مطابق قبائل سلیم، مزینہ اور غطفان بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ فتح مکہ کے بعد جب وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے بھی اسلامی غزوات میں شرکت کی خواہش ظاہر کی چنانچہ حنین اور طائف کے غزوات میں رسول اللہ کے لشکر میں اہلِ مکہ بھی شامل تھے۔ بعد ازآں جب اسلام کثرت سے قبائل عرب میں پھیل گیا تو آپ نے نومسلموں کو قرآن سکھانے اور دینی تعلیم دینے کے لیے اپنے عمال کو اطراف وجوانب میں بھیجنا شروع کیا۔ ان عمال کے سپرد جہاں لوگوں کو قرآن سکھانے اور دینی تعلیم دینے کا کام تھا وہاں یہ ذمہ داری بھی تھی کہ صاحبِ نصاب لوگوں سے زکواۃ اکٹھی کر کے مدینہ بھیجا کریں یا اسی علاقے کے فقرا اور غربا میں تقسیم کر دیا کریں طبعی امر تھا کہ اس دینی انقلاب کے نتیجے میں جو ایک قلیل مدت میں عرب کے اطراف وجوانب میں برپا ہو چکا تھا، ایک سیاسی انقلاب بھی برپا ہوتا اور جہاں دینی اور مذہبی لحاظ سے عرب ایک وحدت میں تبدیل ہو چکا تھا، سیاسی اور انتظامی لحاظ سے بھی ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتا لیکن اہلِ عرب اس سیاسی انقلاب سے بالکل ناآشنا تھے کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ رسول اللہ کے بعد انھیں آپ کے جانشین کی اطاعت بھی قبول کرنی ہو گی۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ تعلیمات' جو رسول اللہ کے ذریعے سے انھیں ملی ہیں وہ تو یقیناً ان کے دلوں میں راسخ رہیں گی اور وہ بہ دستور احکامِ اسلام پر عمل کرتے رہیں گے لیکن سیاسی اعتبار سے وہ بالکل خود مختار رہوں گے اور ہر قبیلہ پہلے کی طرح آزاد اور بیرونی حکومت کے اثرات سے بالکل پاک ہو گا۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں جو فتنہ برپا ہوا اور جس کے نتیجے میں جنگہائے مرتدین وقوع میں آئیں اس کا سبب خود مختاری کا یہی جذبہ تھا جو بیشتر عرب قبائل کے دلوں میں راہ پا رہا تھا۔ ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ عرب سیاسی لحاظ سے اسی حالت پر برقرار رہے جس حالت میں رسول اللہ کی زندگی میں تھا لیکن قبائل عرب چاہتے تھے کہ انھیں ان کی گم گشتہ خود مختاری اور آزادی واپس مل جانی چاہیے۔ ابوبکرؓ اس ایمان کی بدولت' جو انھیں اللہ

اور اس کے رسولؐ پر تھا، مصر تھے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والا ہر شخص وہ تمام ذمہ داریاں ادا کرے جو بہ حیثیت ایک مسلمان کے اس پر عائد ہوتی ہیں اور تمام وہ اموال، جو وہ رسول اللہ کے عہد میں مدینہ بھیجا کرتے تھے، بہ دستور بھیجیں لیکن آزادی کے دلدادہ قبائل رسول اللہ کی وفات کے بعد کسی اور شخص کو اپنا حاکم مطلق ماننے، حکومت میں مہاجرین و انصار کا حق فائق سمجھنے اور اموالِ زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ صاف کہتے تھے کہ رسول اللہ کی بات اور تھی۔ وہ اللہ کے نبی تھے، ان پر وحی اُترتی تھی اور بندوں پر اُن کی اطاعت فرض تھی لیکن اُن کے بعد کسی قبیلے یا کسی فرد کا یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے قبائل کو آزادی سے محروم کر کے ان پر حکومت کرے۔

مہاجرین و انصار اور خلافت

ابوبکرؓ کی بیعت کے باعث عرب میں جو حالات رونما ہو رہے تھے ان کا ہمیں ایک اور جہت سے بھی جائزہ لینا ہے یعنی مہاجرین اور انصار مسئلہ خلافت کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کے نظریات کی وجہ سے اس وقت کے سیاسی نظام میں کیا انقلاب رونما ہوا؟ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اپنے تقدمِ اسلام اور رسول اللہ کے دفاع میں پیش پیش رہنے کے باعث مہاجرین اور انصار صرف اپنے آپ کو سلطنت اور حکومت کا مستحق سمجھتے تھے حتیٰ کہ اپنے ان رشتہ داروں کو بھی، جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو چکے تھے، یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرتدین کے فتنے کے بعد جسے فرو کرنے میں اہلِ مکہ نے نمایاں حصہ لیا تھا، جب شام کی جانب پیش قدمی کرنے کا سوال درپیش ہوا اور ابوبکرؓ نے اہلِ مکہ سے بھی اِس نئی مہم کے متعلق مشورہ کرنا چاہا تو عمرؓ نے مخالفت کی۔ اس موقع پر عمرؓ اور سہیلؓ بن عمرو کے درمیان تو اچھا خاصا مباحثہ بھی ہوا۔ سہیل نے عمرؓ کی روش پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

> "ہم تمھارے مسلمان بھائی ہیں۔ ہمارا اور تمھارا حسب نسب بھی ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود تمھیں رشتہ داری کا مطلق پاس نہیں اور تم ہمارے حقوق غصب کرنے پر مصر ہو۔ یہ درست ہے کہ اسلام قبول کرنے میں تمھیں ہم پر سبقت حاصل ہے لیکن

محض اس وجہ سے حکومت اور سلطنت کے معاملات میں انھیں دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی۔"

لیکن عمرؓ اپنی بات پر مصر رہے اور واشگاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ اولین مسلمانوں اور اسلام کی راہ میں قربانیاں دینے والوں ہی کو مجلس شوریٰ میں نمائندگی دی جا سکتی ہے اور وہی نظامِ حکومت چلانے اور سلطنت کی دیکھ بھال کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اپنے ان رشتہ داروں اور ہم وطنوں کے بارے میں جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے، عمرؓ اور ان کے حامیوں کے یہ خیالات تھے تو دیگر عرب قبائل کے بارے میں ان کی طرف سے جتنے بھی تند و تیز احساسات کا اظہار ہوتا کم تھا۔

عمرؓ کے مقابلے میں اہلِ مکہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ کی وفات سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس سے نبٹنے اور نظامِ سلطنت چلانے کے لیے اگر مہاجرین اور انصار نے باہمی مشورے سے ایک راہ اختیار کر لی اور ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کر لیا تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن انھیں ہمیشہ کے لیے یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔ اہلِ مکہ اور اہلِ طائف قبولِ اسلام اور مرتدین سے جنگ کرنے میں ان کے برابر کے شریک ہیں اس لیے امورِ سلطنت اور مشورے میں انھیں مناسب نمائندگی ضرور ملنی چاہیے اور محض اس وجہ سے کہ وہ نافہمی کی بنا پر ابتدا میں اسلام نہ لا سکے، انھیں ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہ کرنا چاہیے۔

ابوبکرؓ کا بھی خیال تھا کہ جب دیگر اسلامی قبائل نے اہلِ مدینہ سے مل کر جنگہائے مرتدین اور فتوحاتِ عراق میں حصہ لیا ہے تو انھیں امورِ سلطنت میں شریک ہونے سے کیونکر روکا جا سکتا ہے؟ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں بھی مشورہ اور امورِ سلطنت میں اسی طرح شریک کیا جائے جس طرح اہلِ مدینہ اور سابقون الاولون مسلمانوں کو کیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب شام پر چڑھائی کا مرحلہ درپیش ہوا تو انھوں نے اس بارے میں اہلِ مکہ سے بھی صلاح مشورہ کیا اور ان سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ مالِ غنیمت اور وظائف کی تقسیم کے وقت بھی انھوں نے یہی اصول پیشِ نظر رکھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مدینہ کے قریب ایک مفتوحہ زمین میں سونے کی کان برآمد ہوئی اور اس کا سونا مدینہ آنا شروع ہوا۔ انھوں نے یہ سونا تمام مسلمانوں میں بحصۂ رسدی تقسیم کر دیا اور یہ خیال نہ

کیا کہ کون شخص سابقون الاولون میں شامل ہے اور کس شخص نے بعد میں اسلام قبول کیا ہے۔ جب بعض لوگوں نے کہا کہ اس سونے میں سے سابقون الاوّلون کو زیادہ حصّہ ملنا چاہیے، تو انھوں نے فرمایا:

"وہ لوگ محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر اسلام لائے تھے۔ اس لیے انھیں اجر دینا بھی اللہ ہی کا کام ہے اور یہ اجر انھیں آخرت میں ملے گا۔ اس دنیا میں تو اُن کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا۔"

جب عمرؓ کا دور آیا تو انھوں نے اپنی پہلی رائے پر اصرار کرتے ہوئے ابوبکرؓ سے مختلف پالیسی اختیار کی اور ہر شخص کے درجے اور مرتبے کے مطابق اس کا وظیفہ مقرر کیا گو آخر عمر میں ان کی بھی یہی رائے ہو گئی کہ ابوبکرؓ ہی کی سیاست اور پالیسی درست تھی۔ انھوں نے وظائف کی تقسیم کا طریق کار بدلنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن اتنی مہلت ہی نہ ملی اور وہ اس طریق کار میں تبدیلی کیے بغیر ہی وفات پا گئے۔

ابوبکرؓ کے حکیمانہ طرزِ عمل اور دانش مندانہ پالیسی نے عرب کو ایک سیاسی وحدت میں تبدیل کر دیا اور ہر شخص یہ سمجھ کر کہ اسے ملک میں مساوی حقوق حاصل ہیں، بہ دل و جان حکومت کی اطاعت میں مشغول ہو گیا۔ اس کی وفاداری کا مرکز و مرجع خلیفہ کی ذات تھی اور اس کے احکام پر عمل کرنا اس کے نزدیک فرض عین تھا۔

اسلام میں حکومت کا نظام

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ کی حکومت کس قسم کی تھی؟ آیا اُسے پاپائیت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، مطلق العنان شخصی حکومت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے[1]؟

---

[1] قارئین کو اس موقع پر یہ امر ذہن نشین کر لینا مناسب ہے کہ دینی اور مذہبی حکومت کو پاپائیت اور تھیوکریسی سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح لادینی حکومت (SECULARISM) سے مراد ہر وہ حکومت ہوتی ہے جس میں کسی مذہبی گروہ یا علماء، پروہتوں اور پادریوں کے طبقے کو حکومت پر اجارہ داری حاصل نہ ہو اور نہ کسی مذہب کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا جائے۔ غیر لادینی حکومت میں مذہبی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۸ پر)

تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے شخص سے بھی یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ابوبکرؓ کی حکومت پر پاپائیت کا شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فراعنۂ مصر اور شاہانِ یورپ جس طرز سے حکومت کرتے تھے، ابوبکرؓ کے ہاں اس کا گمان بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ براہِ راست خدا سے احکام لینے کے دعوے دار نہ تھے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد وحی کا نزول بند ہو چکا تھا۔ اب صرف کتاب اللہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ کتاب اللہ کے احکام ہی مسلمانوں کے لیے حجت تھے اور ان کا دستور العمل سوا قرآن مجید کے اور کوئی نہ تھا۔ ہر حاکم مجبور تھا کہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریق پر چلے اور اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۷)

گروہ بندیاں اور علماء، پروہتوں، درپادریوں وغیرہ کے طبقے کا کچھ نہ کچھ اثر حکومت پر ہوتا ہے اور کسی خاص مذہب کو سلطنت کا سرکاری مذہب بھی قرار دے دیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ملک میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اور سلطنت کا مزاج بالعموم جمہوری ہوتا ہے، پاپائیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ پاپائی طرزِ حکومت میں شہنشاہ کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہر قسم کے گناہوں سے معصوم اور پاک ہوتا ہے۔ اسے براہِ راست خدا کی طرف سے احکام ملتے ہیں اور اسے ان احکام کو نافذ کرنے اور لباسِ عمل پہنانے کا کامل اختیار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس نظامِ حکومت میں شاہی فرمانوں کو خدائی فرمانوں کا درجہ دیا جاتا تھا اس لیے کسی شخص کو ان پر اعتراض کرنے کا حق نہ تھا اور سب کو بے چون و چرا ان کی اطاعت کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ہم اس باب کے شروع میں بیان کر چکے ہیں، فراعنۂ مصر کا شمار اسی قسم کے شہنشاہوں میں کیا جاتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ کے شہنشاہ بھی اپنے آپ کو اسی زمرے میں شامل کرتے رہے۔ اس نظام کا وجود آج کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔

مطلق العنان شخصی حکومت (ARISTOCRACY) سے امراء اور نوابوں کی حکومت مراد ہے۔ یہ طرزِ حکومت بھی یورپ میں عرصے تک رائج رہا۔ مختلف علاقوں میں خود مختار رؤسا حکمران تھے۔ یہ علاقے انھوں نے بالعموم لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے ذریعے سے حاصل کیا ہوتا تھا۔ ان امراء و رؤسا کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ان کے جانشین ہوتے تھے۔ یہ طرزِ حکومت بھی آج کل کہیں رائج نہیں۔

جمہوریت البتہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو قدیم زمانے سے اب تک مختلف صورتوں میں دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا رہا ہے۔ آج کل تو اسی کا دور دورہ ہے۔ جمہوریت سے مراد وہ حکومت ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور عوام ہی کے نمائندے ملکی نظم و نسق چلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کام کرے مسلمان کے لیے اسی وقت تک حاکم کی اطاعت فرض تھی جب تک وہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل پیرا رہے اور اس کی مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے لیکن اگر کوئی حاکم کتاب اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالتے ہوئے خود ساختہ خلاف شریعت احکام پر عمل درآمد کرانا چاہتا تو اس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض نہ تھی۔

اسلام کا مقرر کیا ہوا یہ ضابطۂ عمل اور طرزِ حکومت پاپائیت کے بالکل اُلٹ ہے۔ خلیفۃ المسلمین کو اللہ کے نازل کردہ احکام کا پابند رہنا اور اس کی مقررہ حدود کے اندر مقید رہنا پڑتا تھا۔ مطلق العنانی کی مطلق گنجائش نہ تھی لیکن پاپائی طرزِ حکومت میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں حاکم مختارِ کل ہوتا تھا، جو چاہتا کرتا تھا، کسی کو اس کے آگے دم مارنے یا اعتراض کرنے کی گنجائش نہ تھی، اس کے نافذ کیے ہوئے احکام خدائی احکام سمجھے جاتے تھے۔ اسے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، ہر قسم کا اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور رعایا کو غلاموں کی طرح اس کی فرماں برداری کرنی پڑتی تھی۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کو احکام سلطنت کا سرچشمہ ماننے اور حدودِ شریعت قائم رکھنے کے باعث اسلامی حکومت بھی پاپائیت کا روپ دھار لیتی ہے اور اس میں اور دوسری مستبد حکومتوں میں کوئی فرق نہیں رہتا لیکن یہ اعتراض محض ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآنی شریعت میں صرف اصول بیان کر دیے گئے ہیں لیکن تفصیلات سے بالعموم احتراز کیا گیا ہے۔ اگر تفصیلات آئی بھی ہیں تو صرف ایسی جگہ جہاں ان کا ذکر کرنا ناگزیر تھا۔ اسلامی حکومت میں سارے نظام کی بنیاد ان اصولوں پر رکھی جاتی ہے اور ان اصولوں کی روشنی میں فروعات و تفصیلات کا طے کرنا جمہور مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

جو اصول قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، صالح معاشرے کے قیام اور قومی زندگی کی بقا کے لیے ان کا بروئے کار لانا ازبس ضروری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان ان اصولوں پر عمل پیرا رہے اور انھوں نے اپنی قومی و انفرادی زندگیوں کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالا، وہ ترقی کے زینوں پر چڑھتے رہے لیکن جب انھوں نے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا چھوڑ دیا اور اپنے لیے ایسا نظام تجویز کیا جو ان اصولوں کے مخالف اور ذاتی خواہشات کا مظہر تھا تو

اسی وقت سے اُن کا تنزّل شروع ہو گیا۔

اگر کتاب اللہ کے بیان کیے ہوئے اصولوں کی تشریح و توضیح کا کام کلیۃً ایک خاص گروہ پر چھوڑ دیا جاتا اور دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی کاہنوں جیسا ایک طبقہ وجود میں آجاتا تو یقیناً اس اعتراض کی گنجائش تھی کہ اسلام میں بھی پاپائیت کا وجود موجود ہے لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسلام مذہبی امور میں کسی خاص طبقے کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہر انسان کو بلا استثنا مساوی طور پر یہ حق دیتا ہے کہ وہ قرآنِ کریم پر غور کر کے اس سے اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق نتائج اخذ کر لے۔ اس صورت میں اسلام پر پاپائیت کی تہمت لگانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

اسلامی نظامِ حکومت کی یہ خصوصیّت ہے کہ ایک طرف تو خدائی احکام کی اطاعت اور شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ، غریب و امیر ہر شخص پر یکساں فرض ہے۔ دوسری طرف عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہیں اپنے حاکم سے اس کی غلط روی پر باز پرس کر سکتے ہیں۔ اس نظامِ حکومت میں برسرِ اقتدار طبقے کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے لیے کچھ اور قانون وضع کرے اور غریب رعایا کے لیے کچھ اور، اور نہ اپنے آپ کو دوسروں سے فائق، برتر اور افضل سمجھ کر اپنے لیے ایسی مراعات حاصل کرے جو عوام کو حاصل نہیں۔ ابوبکرؓ کے دورِ حکومت پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی پر سختی سے عمل کرنے کے باعث دنیوی آلائشوں سے بالکل پاک تھے اور ان کے دل میں یہ بات میخ فولاد کی طرح جاگزیں ہو چکی تھی کہ جس شخص کے سپرد قوم کی امانت کی جائے اور وہ اس میں خیانت کر کے اُس کا کچھ حصہ ذاتی تصرف میں لے آئے وہ کسی اور پر نہیں بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور قیامت کے دن اسے اس خیانت کی نہایت دردناک سزا ملے گی۔

ابوبکرؓ نے اس امانت کا حق، جو قوم کی طرف سے ان کے سپرد کی گئی تھی، جس طرح ادا کیا اور ایّامِ خلافت میں جس بے نفسی و پرہیزگاری کا ثبوت دیا اسے موجودہ زمانے کے لوگ غیر ممکن العمل سمجھتے ہیں۔ خلافت و امارت نے اُن کی زندگی میں ذرا بھی تو تغیر و تبدل پیدا نہ کیا۔ مسلمانوں کے اموال سے فائدہ اٹھانے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ خلافت کی ذمہ داریاں تفویض ہوتے ہی وہ اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو بالکل بھول گئے اور اللہ

کے دین کی خدمت اور اس اسلامی سلطنت کے انتظام و انصرام کے لیے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیا۔ عدل و انصاف کا قیام ان کا اولین مقصد تھا اور کمزوروں اور حاجت مندوں کی امداد و اعانت سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ ان کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

جو حکومت اس طرز کی ہو جہاں مطلق انسانی کا مطلق دور دورہ نہ ہو جس کا حاکم اپنے آپ کو فوق البشر ہستی نہ سمجھتا ہو اسے کسی طرح بھی پاپائی اور مطلق العنان شخصی حکومت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ خلیفہ کا انتخاب یقیناً مہاجرین اور انصار ہی نے مل کر کیا تھا اور عرب کے دوسرے قبیلوں سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی لیکن اس پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کیونکہ مہاجر اور انصار ایک ہی قبیلے کے افراد نہ تھے جنھوں نے مل بھگت کر کے اپنے میں سے ایک آدمی کو خلیفہ منتخب کر لیا ہو بلکہ وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کام بھی انھوں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ رسول اللہ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کیا جا سکے اور کسی رہنما کی غیر موجودگی کے باعث امت کی بقا کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس کا فوری طور پر سدباب ہو سکے۔

ابوبکرؓ کی حکومت کی بنیاد کلیۃً صلاح مشورے پر تھی۔ ان کی بیعت عام انتخاب کے ذریعے سے کی گئی اور محض اس لیے کی گئی کہ وہ رسول اللہ کے سب سے محبوب ساتھی اور رفیع الشان شخصیت کے مالک تھے۔ خاندانی وجاہت اور قبائلی عصبیت کا اس انتخاب میں مطلق دخل نہ تھا۔ ابوبکرؓ نے خود اپنے لیے خلافت کا مطالبہ نہ کیا بلکہ انھوں نے تو لوگوں کو اپنے بجائے عمرؓ اور ابوعبیدہ بن جراح میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے خلافت سازشوں کے ذریعے سے حاصل نہ کی بلکہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع عام میں خاصی بحث و تمحیص کے بعد — جس میں انصار اور مہاجرین کے سربرآوردہ اشخاص نے حصہ لیا — ان کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع ہوا۔ پھر جب انہی کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ ہو گیا تو بیعت کرنے میں انصار بھی کسی طرح مہاجرین سے پیچھے نہ رہے۔ انھوں نے نہ صرف صدقِ دل سے ان کی خلافت قبول کر لی بلکہ بعد میں جب کبھی ان کی طرف سے مالی اور جانی قربانیوں کا مطالبہ ہوا، انصار نے بڑھ چڑھ کر اور دلی ذوق و شوق سے ان میں حصہ لیا۔

خلافت کے بعد انھوں نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس کے لفظ لفظ سے یہ بات عیاں ہو رہی

تھی کہ ابوبکرؓ کو جمہوریت کا کتنا پاس تھا اور وہ شوریٰ کو سلطنت کی بہبود کے لیے کس قدر ضروری خیال کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا:

"میں تم پر حاکم تو بنا دیا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں نیکی کی راہ پر چلوں تو میری فرماں برداری کرو لیکن اگر میرا قدم نیکی کی راہ سے ڈگمگا کر بدی کی راہ پر چلا جائے تو مجھے درست کر دو۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں تم میری اطاعت کرتے رہو لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔"

ان الفاظ سے صریحاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عوام النّاس کو خلیفہ کے کاموں کی نگہداشت کرنے اور اسے نیک مشورے دینے کا حق حاصل ہے اور اگر کبھی بہ فرضِ محال خلیفہ سے اللہ کے احکام کی نافرمانی صادر ہونے لگے تو رعایا پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ شوریٰ کی اہمیت کے متعلق اِن الفاظ سے زیادہ اور کون سے پُرزور الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

جنگوں کا سلسلہ طویل تر ہونے کے باوجود ابوبکرؓ کے عہد میں شوریٰ کا نظام علیٰ حالہٖ قائم رہا وہ کوئی بھی اہم کام بغیر مشورہ لیے انجام نہ دیتے تھے۔ تمام مسلمان ان کی نظروں میں مساوی حقوق کے حامل تھے اور کسی شخص کو اس کی دنیوی وجاہت اور مرتبے کی بنا پر دوسرے لوگوں سے برتری حاصل نہ تھی۔ سابق مرتدین کے متعلق انھوں نے ابتدا میں یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ انھیں جنگی مہمات میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ ابھی ان کی طرف سے پورا اطمینان نہ تھا لیکن جب یہ خدشہ دور ہو گیا تو انھیں اسلامی فوجوں میں شرکت کی اجازت دے دی اور عمرؓ کو ہدایت کی کہ عراق کی جنگوں میں مذکورہ بالا لوگوں سے بھی کام لیا جائے۔

ابوبکرؓ اور عرب کی سیاسی وحدت

اِس طرح ابوبکرؓ نے اسلامی نظامِ حکومت کی بنیادیں استوار کر کے اپنے بعد آنے والے خلفاء کے لیے ان بنیادوں پر ایک رفیع الشان عمارت تعمیر کرنے اور عرب کو ایک سیاسی وحدت میں ڈھالنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ابوبکرؓ کی عفو و درگزر کی پالیسی نے عرب کی سیاسی وحدت کے حصول میں بے حد

آسانی پیدا کر دی۔ جو بھی باغی سردار ان کے سامنے حاضر کیا گیا انھوں نے اس کے پچھلے اعمال سے درگزر کرتے ہوئے اس کی جان بخشی کر دی۔ قرہ بن ہبیرہ، عمرو بن معدی کرب، اشعث بن قیس وغیرہ سردارانِ عرب کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ بغاوت اور سرکشی کو سختی سے فرو کرنے اور بعد میں بغاوت کے سرغنوں کو معافی دے دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے سچے دل سے اطاعت اور فرمانبرداری قبول کر لی اور وحدت کی لڑی میں منسلک ہو گئے۔ شوریٰ کے طریق کار نے وحدت کے نظام کو مزید استواری بخشی جس کے نتیجے میں عراق اور شام کی فتح آسان تر ہو گئی۔

اس زمانے میں عوام کی فکری نہج بھی اس امر کی متقاضی تھی کہ نظامِ حکومت کی بنیادیں شوریٰ اور جمہوریت پر استوار کی جاتیں۔ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا تھا۔ اسلامی شریعت عربی زبان میں تھی اور رسول اللہ بھی سرزمینِ عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ عرب قبائل بدوی ہوں یا شہری آزادی اور خود مختاری کے دلدادہ تھے اور آزادی سے بڑھ کر انھیں کوئی شے عزیز نہ تھی۔ بدوی لوگوں میں مساوات کی روح سرایت کر چکی تھی۔ اسلامی تعلیمات نے اس فکر و نظر کو مزید جلا دی کیونکہ اسلام کامل مساوات کا علم بردار تھا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں بہ وضاحت اعلان کر دیا کہ اس کے نزدیک خاندانی وجاہت کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اصل حیثیت بندوں کے اعمال کو حاصل ہے۔ رسول اللہ نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کر دیا تھا کہ اسلام گورے کالے، عربی، عجمی، آقا اور غلام میں کسی قسم کی تمیز رکھنے کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک برتری اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ آج جمہوریت کا دور دورہ ہے اور ہر جا جمہوریت ہی کے گن گائے جاتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو حقیقی جمہوریت کا نظارہ چشمِ بینا نے صرف اسلام کے دورِ اولیں میں دیکھا ہے۔ اس زمانے میں جمہوریت کی بنیاد اخوت و محبت اور حریت و مساوات پر تھی اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم کے نتیجے میں ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ ہر شخص اپنے مومن بھائی کا خیر خواہ تھا۔ چنانچہ رسول اللہ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

رسول اللہ کی زبان سے نکلا ہوا یہ ارشاد کوئی معمولی ارشاد نہیں بلکہ جمہوریت کی جان ہے

اور کوئی جمہوری حکومت اس وقت تک کام یاب نہیں ہو سکتی جب تک اس حکیمانہ فقرے کو مشعلِ راہ بنا کر رعایا کے افراد کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور مونس و غم خوار نہ بنا دے۔

انھیں تعلیمات کے باعث جنھیں رسول اللہ نے لوگوں تک پہنچایا، اس عربی وحدت کا قیام عمل میں آسکا جس کے سہارے ابوبکرؓ نے ایک رفیع الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور ایک نرالا نظام دنیا کے سامنے پیش کر کے ایک عالم کو انگشت بدنداں کر دیا۔

اسلام کی طاقت کا سبب

ابوبکرؓ کی حکومت جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہ تھی بلکہ عرب سے بھی باہر نکل کر دور دور تک پھیل گئی تھی اور اسلامی سلطنت کا قیام عرب کے علاوہ عراق اور شام میں بھی عمل پذیر ہو چکا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر عربی علاقوں میں اسلامی سلطنت کا قیام محض چند حملوں کا نتیجہ تھا جن میں اتفاق سے مسلمانوں کو کام یابی نصیب ہو گئی یا اس انقلاب نے، جس کی نشان دہی ہم پہلے کر آئے ہیں، ان فتوحات کے لیے راستہ صاف کیا اور اس طرح مسلمانوں کو دنیا کے ایک وسیع خطے میں اسلامی سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا موقع مل گیا؟

اسلام کی ابتدائی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے کسی شخص سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اسلامی افواج کی کام یابی کو وقتی اور اتفاقی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ فتوحات واقعات و حوادث کے ایک لمبے سلسلے کی کڑی ہیں۔ اسلام نے دنیا میں آکر جو انقلاب پیدا کیا اس کا برپا ہونا لابدی تھا. کیونکہ اسلامی تعلیمات ایک انقلاب پذیر قوت اپنے اندر رکھتی تھیں اور ناممکن تھا کہ یہ قوت اپنا اثر دکھائے بغیر رہتی۔

اسلام کو طاقت و قوت بخشنے والے عوامل میں عقیدے کی حریت کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اسلام آزادیٔ ضمیر کا سب سے بڑا علم بردار ہے اور دین کے معاملے میں کسی شخص پر جبر کا روادار نہیں۔ گو اس کی دعوت ساری دنیا کے لیے عام ہے لیکن وہ کسی شخص کو اپنا عقیدہ بدلنے پر مجبور نہیں کرتا۔ ہاں، یہ امید ضرور رکھتا ہے کہ اس کی پیش کردہ تعلیمات پر لوگ غور کریں۔ اسے اطمینان ہے کہ جو لوگ سچے دل سے ان تعلیمات کا مطالعہ کریں گے ان کے لیے انھیں قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا

کیونکہ وہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں اور عقلِ سلیم انھیں قبول کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرسکتی۔

جہاں اسلام آزادیٔ ضمیر کا سب سے بڑا علم بردار ہے وہاں اسلام کے مخالف آزادیٔ ضمیر کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر لوگوں کو عقائد و اعمال میں آزادی دے دی گئی اور انھیں اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو مذہب اور طریقہ چاہیں اختیار کرلیں تو اسلام کی پاک تعلیم انھیں اپنی طرف کھینچ لے گی اور ان کے حق میں سوا نامرادی اور ناکامی کے اور کچھ نہ آئے گا۔

اسلام نے آزادیٔ ضمیر کا جو اصول دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس پر مسلمانوں نے پوری طرح عمل کرکے دکھا دیا۔ انھوں نے لاتعداد ممالک فتح کیے لیکن کسی شخص کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے جس شہر کو فتح کیا وہاں کے باشندوں کو کامل مذہبی آزادی دے دی۔ جو شخص برضا و رغبت اسلام قبول کرلیتا اُسے وہی حقوق مل جاتے تھے جو دوسرے مسلمانوں کو ملے ہوئے تھے لیکن جو شخص اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتا تھا اسے جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ جزیہ کوئی تاوان نہ تھا جو غیر مسلموں سے نفرت و حقارت کے باعث ان پر عاید کیا گیا ہو بلکہ اس کی حیثیت زکوٰۃ کی طرح ایک ٹیکس کی تھی جو سلطنت کی طرف سے اُن کی حفاظت کے بدلے اُن پر عائد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اہلِ عراق اور اہلِ شام سے صلح کے جو معاہدات کیے گئے ان میں یہ صراحت کردی گئی تھی کہ غیر مسلموں سے جزیہ صرف ان کے مال و جان کی حفاظت کے بدلے وصول کیا جائے گا۔ اور اسلامی حکومت ذمہ دار ہوگی کہ غیر مسلم اپنے اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرسکیں اور دینی عبادات بے خوفی سے بجا لاسکیں۔ آج بھی کتبِ تاریخ میں جو معاہدات محفوظ ہیں ان میں اسلامی حکومت کی طرف سے غیر مسلموں کے گرجوں، کلیساؤں، معبدوں، مذہبی پیشواؤں اور راہبوں کی حفاظت کی ضمانتیں موجود ہیں۔ اگر کبھی ایسی صورتِ حال پیش آجاتی کہ مسلمان اپنے مواعید کی بجا آوری سے قاصر ہوجاتے تو نہ صرف آئندہ کے لیے جزیہ لینا بند کردیا جاتا بلکہ پچھلی وصول کی ہوئی رقم بھی انھیں واپس کردی جاتی۔

رسول اللہ کے فدائیوں کے ہاتھوں قائم شدہ حکومت، جس کی بنیاد حریت و مساوات اور اخوت و محبت کے اعلیٰ اصولوں پر قائم کی گئی تھی، رومی شہنشاہیت سے یکسر مختلف تھی اور آج کل کی جمہوریتیں بھی افادیت کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اسلامی سلطنت کا یہ مقصد قطعاً

نہ تھا کہ لوگوں کو عربوں کا مطیع و منقاد بنایا جائے اور انھیں رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی غلامی میں دے دیا جائے۔ اس کے برعکس اس کا اولیں مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا جائے اور ان کے درمیان اخوت و مودت اور رحمت و شفقت کے ناقابلِ شکست رشتے پیدا کر دیے جائیں۔ اسلامی سلطنت میں مفتوح اقوام کا درجہ فاتحین سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مفتوح اقوام عربوں کی طرح تمام بنیادی حقوق سے بہرہ ور تھیں۔ جو شخص اسلام لے آتا تھا اس سے مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور جو شخص اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتا تھا اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے تھے جو عرب کے دوسرے غیر مسلموں کو حاصل تھے۔ عرب فاتحین نے اپنے کسی بھی فعل سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے حامی ہیں۔ اہلِ عراق اور اہلِ شام میں جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے اُن سے وہی سلوک کیا گیا جو نجران اور عرب کے دوسرے علاقوں کے عیسائیوں سے کیا جاتا تھا۔ بے شک مسلمان ان لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور ان پر اتمامِ حجت کرنے میں کوئی دقیقہ سعی فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص ان کی دعوت پر کان نہ دھرتا اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا تو یہ خدائی فرمان ذہن میں رکھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے:

من اھتدی فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا وما انا علیکم بوکیل

(جو شخص ہدایت قبول کرتا ہے اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور جو شخص گمراہی کے راستے پر گامزن رہنا چاہتا ہے اس کے نقصان کا ذمہ دار بھی وہ خود ہے۔ اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دو "میرا کام صرف یہ ہے کہ تم لوگوں تک آواز پہنچا دوں، ماننا یا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔ تمھاری ہدایت اور گمراہی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔")

ابوبکرؓ کا نظامِ حکومت

اسلام نے حکومت کا جو نظام تجویز کیا تھا ابوبکرؓ کو مفتوحہ ممالک میں اسے پوری طرح رائج کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ عراق میں خالدؓ بن ولید نے بلدیاتی نظم و نسق کا کام خود وہاں کے باشندوں کے

سپرد کر رکھا تھا مسلمان صرف عام نگرانی اور سیاسی امور کی نگہداشت کرتے تھے۔ اس طرح کوئی باقاعدہ منظم حکومت معرض وجود میں نہ آسکی جنگی صورت حال کے پیشِ نظر ایک عبوری طرزِ حکومت اختیار کر لیا گیا اور بیشتر توجہ جنگی امور کی تکمیل پر دی گئی۔

شام کا حال بھی عراق سے مختلف نہ تھا۔ شورائی نظام حکومت یہاں کے باشندوں کے لیے اسلام کی طرح بالکل نئی چیز تھا۔ فتوحاتِ اسلامیہ کے وقت یہاں مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ شہنشاہ ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور من مانی کرتا تھا۔ پادری اور راہب شہنشاہ کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے اور مطلق العنانی کو جائز ٹھہرانے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ ایک طرف حکومت کے دباؤ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں کے وعظ کے نتیجے میں عوام الناس اپنے فرماں رواؤں کو انتہائی تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اور انھیں ان کے آگے سجدہ کرنے میں بھی باک نہ تھا۔ اسلامی فتوحات کے موقع پر جب انھوں نے ایسے نظامِ حکومت کا مشاہدہ کیا جس کی بنیاد عدل و انصاف اور شوریٰ پر تھی اور جہاں اس شاہی کروفر اور رعب و دبدبہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جسے دیکھنے کے وہ صدیوں سے عادی تھے تو ان کے دل بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے شروع ہوئے اور انھوں نے بڑی گرم جوشی سے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اسلام کی طرف لوگوں کے اس میلان کے باعث مسلمانوں کی سلطنت بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ڈانڈے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف افریقہ سے جا ملے۔ مسلمان جہاں بھی گئے حق و صداقت، عدل و انصاف اور ایمان و صداقت کا علم لہراتے ہوئے گئے اور حریت و مساوات اور محبت و شفقت کے بیج ہر زمین میں بو دیے۔

ابوبکرؓ کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ عرب اور دوسرے مفتوحہ علاقے میں اسلامی نظام حکومت کا ملاً رائج کر سکتے۔ ان دنوں اس سلسلے میں جو کام ہوا وہ ابتدائی نوعیت کا تھا۔ بعد میں آنے والے خلفاء کے عہد میں سلطنت نے جس طرح منظم صورت اختیار کر لی تھی اور جس طرح باقاعدہ محکموں کا قیام عمل میں آچکا تھا اس طرح ابوبکرؓ کے عہد میں نہ تھا۔ ان کے عہد میں نہ حکومت نے باقاعدہ تنظیمی شکل اختیار کی تھی اور نہ مختلف محکمے قائم ہوئے تھے۔

اس کے دو طبعی سبب تھے:

اوّل یہ کہ ابوبکرؓ کا عہد پچھلے تمام زمانوں سے مختلف تھا اور انھیں بالکل نئے سرے سے ایسے وقت میں ایک حکومت کی تشکیل کرنی پڑی تھی۔ جب پچھلی تہذیبیں دم توڑ چکی تھیں اور ان کی جگہ ایک نئی تہذیب لے رہی تھی۔ عقائد کے لحاظ سے ایک انقلاب آچکا تھا اور جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ فکر و نظر کے انداز بدل چکے تھے اور معاشرے میں زبردست تبدیلی آ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قلیل وقفے کے اندر ایک بالکل نیا نظامِ حکومت رائج کرنا کس قدر دشوار امر تھا۔

منظم حکومت عمل میں نہ آنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ زمانہ حرب و پیکار کا تھا۔ ابوبکرؓ کی حکومت عسکری حکومت کہلانے کی زیادہ مستحق تھی۔ جنگ و جدل کے مواقع پر مقررہ نظم و نسق کا قیام تک ناممکن ہوتا ہے چہ جائیکہ ایسے علاقے میں ایک منظم حکومت کا قیام عمل میں لایا جاسکے جہاں اسلام سے قبل نظم و نسق کا وجود ہی نہ تھا۔

خلافت کے بعد ابوبکرؓ کو سب سے پہلے مرتدین کا سامنا کرنا پڑا اور پہلا سال اُن کی بغاوتیں فرو کرنے میں گزر گیا۔ ابھی مرتدین سے جنگوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ایرانیوں سے جھڑپیں شروع ہوگئیں اور ابوبکرؓ کی توجہ عراق کی طرف منعطف ہوگئی۔ عراق میں کامل امن و امان نہ ہوا تھا کہ شام پر چڑھائی کا مسئلہ درپیش ہوگیا۔ اِس صورت میں نظامِ حکومت وسیع بنیادوں پر قائم کرنا اور اس کی تفاصیل طے کرنا ناممکن تھا۔ اس وقت ابوبکرؓ کے سامنے دو بڑے مقصد تھے اور انھیں کی تکمیل میں وہ ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ اوّل مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر کے انھیں دشمن کے مقابلے کے لیے تیار کرنا، دوم دشمن پر فتح حاصل کر کے وسیع اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنا۔

ابوبکرؓ کی عسکری حکومت کا نظام اس بدوی طریق کے زیادہ قریب تھا جو رسول اللہؐ کے عہد سے بھی پہلے قبائل عرب میں رائج تھا۔ اس وقت حکومت کے پاس کوئی منظم لشکر موجود نہ تھا بلکہ ہر شخص اپنے طور پر جنگی خدمات کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔ جب طبلِ جنگ پر چوٹ پڑتی اور لڑائی کا اعلان کر دیا جاتا تو قبائل ہتھیار لے کر نکل پڑتے اور دشمن کی جانب کوچ کر دیتے۔ ہر قبیلے کا سردار ہی اپنے قبیلے کی قیادت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان کی عورتیں بھی انھیں ہمت دلانے اور جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے ساتھ ہوتی تھیں۔ سامانِ رسد اور اسلحہ کے لیے وہ

مرکزی حکومت کی طرف نہ دیکھتے تھے بلکہ خود ہی ان چیزوں کا انتظام کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے انھیں تنخواہ بھی ادا نہ کی جاتی تھی بلکہ وہ مالِ غنیمت ہی کو اپنا حق الخدمت سمجھتے تھے۔

میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس کا ۵/۴ حصہ جنگ میں حصہ لینے والوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا اور پانچواں حصہ خلیفہ کی خدمت میں دارالحکومت ارسال کر دیا جاتا تھا جسے وہ بیت المال میں جمع کر دیتا تھا۔ خمس کے ذریعے سے سلطنت کے معمولی مصارف پورے کیے جاتے تھے اور مدینہ کے مفلس و قلاش اور محتاج لوگوں کی امداد کی جاتی تھی۔ ابوبکرؓ کی خواہش تھی کہ جونہی خمس مدینہ پہنچے اسے تقسیم کر دیا جائے اور ایک درہم بھی آئندہ کے لیے اٹھا نہ رکھا جائے۔ بعض لوگوں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ بیت المال پر پہرے دار مقرر کیے جائیں لیکن انھوں نے یہ تجویز نامنظور کر دی کیونکہ بیت المال میں کچھ بچتا ہی نہ تھا جس کی حفاظت کے لیے پہرے دار مقرر کیے جاتے۔

ابوبکرؓ کی حکومت کا نظام نہایت سادہ اور بدویانہ طرز کا تھا۔ اپنے عہد کی منظم اور متمدن سلطنتوں کا رنگ انھوں نے بالکل قبول نہ کیا۔ عہدِ رسالت سے اتصال کے باعث ان کا عہد رسول اللہ کے عہد سے بڑی حد تک مشابہ ہے۔ ابوبکرؓ بھولے سے بھی وہ کام نہ کرتے تھے جو رسول اللہ ناپسند کرتے تھے اور وہ کام کرنا سعادت سمجھتے تھے جو آپ نے کیا تھا لیکن وہ جامد مقلدین کی طرح نہ تھے بلکہ رسول اللہ کا کامل نمونہ اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھل چکا تھا۔ یہی اجتہاد تھا جس کے باعث اللہ نے ان کے ذریعے سے عراق اور شام فتح کرائے اور ان کے ہاتھ سے ایسی متحدہ سلطنت کی بنیاد رکھوائی جس کا دستور العمل احکامِ الٰہی اور شوریٰ پر مبنی تھا۔ وہ افراط و تفریط سے ہمیشہ پاک اور اللہ کے نور سے حصہ لے کر ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہے۔ یہ خیال ہر وقت ان کے دل میں جاگزیں رہتا تھا کہ جہاں وہ بندوں کے سامنے جواب دِہ ہیں وہاں اللہ کے سامنے بھی جواب دہ ہیں اور وہ قیامت کے دن ان سے ان کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ اللہ اور بندوں کے سامنے جواب دہی کا یہی تصور تھا جس نے ہمیشہ آپ کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیے رکھا اور ان کا قدم ایک لمحے کے لیے بھی جادۂ استقامت سے ہٹنے نہ پایا۔

ابوبکرؓ کے بعد اسلامی حکومت مختلف ادوار میں سے گزرتی رہی۔ عمرؓ بن خطاب نے ایرانی

اور رومی سلطنتوں کا نظامِ حکومت سامنے رکھ کر مختلف شعبوں کی تشکیل کی لیکن کتاب اللہ اور اس کی مقررہ حدود سے مطلق تجاوز نہ کیا۔ عثمانؓ اور علیؓ کے عہد میں عمرؓ کا مقررہ طرزِ حکومت ہی جاری رہا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب سلطنت امویوں کے ہاتھ میں آئی تو شورائی طرزِ حکومت کی جگہ موروثی بادشاہی نے لے لی۔ عباسیوں کے زمانے میں بھی موروثی بادشاہی کا سلسلہ قائم رہا۔ عباسیوں کے عہد میں سلطنت پر اہلِ روم اور اہلِ ایران کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ خلفاء ان کے ہاتھوں میں بے بس ہو کر رہ گئے۔ ایران اور روم کی مکمل فتح عمرؓ اور عثمانؓ کے عہد میں ہوئی تھی لیکن اس وقت سلطنت پر عجمی باشندوں کا اثر بہت کم تھا۔ امویوں کے عہد میں ان کا اثر قدرے بڑھا مگر سلطنت کاملاً عربی رنگ میں رنگی رہی۔ عباسیوں نے چونکہ خلافت اہلِ ایران کی مدد سے حاصل کی تھی اس لیے ان کے عہد میں ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خلفاء ان کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے۔

اس اثناء میں علماءِ اسلام، جن میں اکثریت غیر عربوں کی تھی، حکومت کے لیے قواعد اور تفاصیل مرتب کرنے میں مصروف رہے۔ ان علماء میں اکثر اختلاف ہو جاتا تھا جو بعض اوقات بڑھتے بڑھتے فساد اور شورش کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور حاکمِ وقت کو سختی سے اسے فرد کرنا پڑتا تھا۔ کتنا بڑا فرق تھا ابوبکرؓ کی اور امویوں اور عباسیوں کی حکومتوں میں۔ اوّل الذکر حکومت بالکل سادہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ایک دن کے لیے بھی ملک کے امن و امان میں خلل نہ پڑا۔ مؤخر الذکر حکومتیں شان و شوکت کے لحاظ سے جواب نہ رکھتی تھیں، بڑے بڑے علماء و فضلاء حکومت کا آئین تیار کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن اندرونی بغاوتوں نے ان سلطنتوں کو ایک دن کے لیے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور یہ ہمیشہ داخلی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں ہی میں مصروف رہیں۔

ابوبکرؓ کا ایمان تھا کہ جس طرح انھیں ایک دن اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑے گا اسی طرح امورِ سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں وہ بندوں کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ اللہ اور بندوں کی اسی جواب دہی کے ڈر سے وہ جب بھی کسی اہم کام میں ہاتھ ڈالتے اللہ کے احکام کو پیشِ نظر رکھتے اور لوگوں کے سامنے وہ معاملہ رکھ کر ان سے بھی مشورہ لیتے۔ اسی طرح جب کوئی معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو جب تک اس کے بارے میں خوب غور و فکر نہ کر لیتے اور اس کے نتائج و عواقب کو اچھی طرح جانچ نہ لیتے فیصلہ نہ فرماتے۔ مرض الموت میں بھی ان کا طرزِ عمل یہی رہا

اور وہ برابر مسلمانوں کی آئندہ فلاح و بہبود کے طریقوں پر غور فرماتے رہے۔ اسی دوران میں مثنیٰ شیبانی عراق سے مدینہ آئے اور باریابی کی اجازت چاہی تو انھوں نے باوجود حددرجہ ضعف و نقاہت کے انھیں اپنے پاس بلوا لیا اور بڑے غور سے اُن کی معروضات سنیں۔ اسی وقت عمرؓ کو حکم دیا کہ شام ہونے سے پیشتر مثنیٰ کی مدد کے لیے مسلمانوں کا لشکر عراق روانہ کر دیا جائے غرض اس طرح ابوبکرؓ زندگی کے آخری سانس تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔

(۱۸)

ابوبکرؓ کی وفات

ابوبکرؓ نے ارتداد کا وہ فتنہ، جو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد عرب کے گوشے گوشے میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، کمال مستعدی سے فرو کر دیا تھا۔ عراق میں اسلامی فوجیں دُور دُور تک گھس گئی تھیں اور ایرانی دارالحکومت مدائن، کی فتح چند دن کی بات رہ گئی تھی۔ شام میں رومی افواج قاہرہ کو ذلت آمیز شکستوں سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا اور فتوحات اسلامی کے اثرات پایۂ تخت شام، دمشق تک محسوس کیے جا رہے تھے۔ ایک طرف ان حیرت انگیز فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف ابوبکرؓ مدینہ میں ایک ایسی متحدہ عربی حکومت کی تشکیل میں مصروف تھے جس کی اساس باہمی مشورے پر تھی۔ قرآن کریم کی تدوین ہو چکی تھی۔ اسلامی سلطنت کی تشکیل کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا اور حقیقی عدل و انصاف پر مبنی حکومت کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ یہ تمام عظیم الشان اور اہم امور دو سال تین مہینے کی قلیل ترین مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچے تھے۔

کیا یہ تاریخ کا ایک معجزہ نہیں؟ ستائیس مہینے کی قلیل مدت میں ایک طویل و عریض علاقے کی خطرناک بغاوت بالکل فرو ہو جاتی ہے اور آنِ واحد میں سارا عرب وحدت کی سلک میں اس طرح منسلک ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہاں کبھی بغاوت اور شورش کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر یہی اہل عرب، جو پہلے فتنہ و فساد اور شورش و اضطراب کے شکار رہتے تھے، ان دو عظیم الشان سلطنتوں پر ہلہ بول دیتے ہیں جنھیں اپنی عسکری قوت اور تہذیب و تمدن کی بنا پر دنیا کی تمام اقوام پر برتری حاصل تھی اور یہ سلطنتیں اپنے عساکر جرار اور وافر اسلحہ کے باوجود حقیر و ذلیل عربوں کے سامنے عاجز رہ جاتی ہیں اور ایرانی و رومی تہذیب کی جگہ اسلامی تمدن کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ عربوں کا اپنی ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر جلد غلبہ ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ کسی شخص

کی مجال نہیں کہ وہ بغیر تائید ایزدی اور توفیق خداوندی کے ایسے کارنامے انجام دے سکے جن پر ایک عالم حیران و ششدر رہ جائے۔ ابوبکرؓ اللہ کی قدرتوں پر کامل ایمان رکھتے تھے چنانچہ ان کی انگوٹھی کا نقش بھی 'نعم القادر اللہ' تھا۔ اسی ایمان کے نتیجے میں اللہ نے ان کے لیے اپنی قدرتوں کا نزول کیا اور جو کام بڑے بڑے سیاست دان اور سپہ سالار برسوں میں انجام نہ دے سکتے تھے وہ ایک نحیف و نزار شخص نے مہینوں میں انجام دے دیے۔

موت کے بارے میں روایات

ابوبکرؓ کے مرض الموت کی تعیین کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہود نے انھیں کھانے میں زہر دے دیا تھا۔ کھانے میں ان کے ساتھ عتاب بن اسید اور حارث بن کلدہ بھی شریک تھے۔ حارث بن کلدہ نے تو چند لقموں ہی پر اکتفا کیا اس وجہ سے وہ زہر کے اثر سے محفوظ رہے لیکن ابوبکرؓ اور عتاب پر زہر نے پورا پورا اثر کیا۔ زہر سریع التاثیر نہ تھا بلکہ کمیں سال بھر میں جاکر اس کا اثر ظاہر ہوتا تھا چنانچہ جس روز ابوبکرؓ نے مدینہ میں وفات پائی اسی روز عتاب نے مکہ میں انتقال کیا۔

لیکن یہ روایت قابل اعتماد نہیں۔ اوّل تو اس کے راویوں میں کوئی ثقہ آدمی نہیں، دوسرے ابوبکرؓ اور یہود کے درمیان کوئی ایسا نزاع نہ تھا جس کی بنا پر خیال کیا جاسکے کہ یہود نے مطلب براری کے لیے انھیں زہر دے دیا تھا۔ تمام یہود رسول اللہ کے زمانے ہی میں مدینہ سے جلا وطن کیے جاچکے تھے۔

اس سلسلے میں وہ روایت قابل اعتبار ہے جو ان کی بیٹی ام المومنین عائشہؓ اور بیٹے عبدالرحمن سے مروی ہے یعنی مرض الموت کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ سخت سردیوں کے دنوں میں وہ ٹھنڈے پانی سے نہا لیے جس سے انھیں بخار چڑھ آیا اور پندرہ روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پاگئے۔ اس دوران میں ان کے حکم سے عمرؓ بن خطاب لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔

مرض کی شدت انھیں امور سلطنت کے بارے میں غور و فکر کرنے سے نہ روک سکی۔ مرض کی ابتدا ہی میں انھیں یقین ہوگیا تھا کہ ان کی وفات قریب آچکی ہے اور وہ بہت جلد اپنے محبوب رسول اللہ سے ملنے والے ہیں۔ وہ اس اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے کہ

اللہ نے ان کے سپرد جو کام کیا تھا اس کی انجام دہی میں انھوں نے حتی المقدور کوئی دقیقۂ سعی فروگزاشت نہ کیا۔ ایک روز لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ طبیب کو بلا کر مشورہ لیتے تو بہتر ہوتا۔ انھوں نے فرمایا "میں نے مشورہ کیا تھا۔" لوگوں نے پوچھا "پھر اس نے کیا بتایا؟" جواب دیا "اس نے کہا میں جو چاہوں گا کروں گا۔" ابوبکرؓ کا مطلب اصل میں یہ تھا کہ وہ راضی بہ قضا ہیں اور ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اب اللہ انھیں اپنے پاس بلا لے۔

جانشینی کا مسئلہ

مرض الموت میں ابوبکرؓ کو سب سے بڑا فکر مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے سے پچھلے واقعات ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ رسول اللہ کی وفات کے معاً بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان خلافت پر جھگڑا برپا ہو گیا تھا اور اگر اللہ مسلمانوں کو ان کے ہاتھ پر متحد نہ کرتا تو زبردست فتنہ برپا ہونے کا خدشہ تھا۔ یہ فتنہ صرف مہاجرین و انصار تک محدود نہ رہتا بلکہ سارے عرب کو لپیٹ میں لے لیتا۔ پہلے اس کے شعلے مکہ اور طائف میں بھڑکتے پھر یمن کی باری آتی۔

اس اختلاف کی نوعیت دینی نہ ہوتی بلکہ خالص دنیوی ہوتی اور محض شخصی اقتدار کے قیام کے لیے قبائلی عصبیت کا یہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ اوّل تو کسی بھی طبقے کی طرف سے اقتدار کی ہوس قومی اتحاد میں رخنہ ڈال دیتی ہے، دوسرے ایسے وقت میں، جب ایرانی اور رومی سلطنتیں شیر کی طرح منہ پھاڑے عرب کی طرف دیکھ رہی تھیں، مسلمانوں کا باہم دست و گریبان ہو جانا ان سلطنتوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا اور وہ بہ آسانی مسلمانوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر عرب پر تسلط بٹھا لیتیں۔ ابوبکرؓ کی خلافت کے باعث ان کی زندگی میں تو اس فتنے کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ آئندہ کے لیے بھی اس کا سدِ باب ہو چکا ہے۔

مرض الموت میں ابوبکرؓ کا دل برابر انھیں افکار کی جولان گاہ رہا۔ انھوں نے تمام حالات کا بہ غور جائزہ لیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو آئندہ اختلاف سے بچانے کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ زندگی ہی میں آئندہ ہونے والے خلیفہ کا تعین کر جائیں۔ رسول اللہ نے ایسا نہ

کیا تھا۔ آپ کسی شخص کو خلیفہ مقرر کیے بغیر وفات پا گئے تھے لیکن اس میں بھی اللہ کی ایک حکمت تھی یعنی لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ اس شخص کو چونکہ رسول اللہؐ نے خود اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے اس لیے یہ براہِ راست اللہ سے احکام حاصل کرتا ہے اور اس طرح اس کی حیثیت اصل میں خلیفۃ اللہ کی ہے۔

ابوبکرؓ زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کرنا تو ضرور چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی اُن کی خواہش یہ تھی کہ اہل الرائے اصحاب سے اس کے متعلق مشورہ لے لیا جائے اور ان کی رضامندی سے ہونے والے خلیفہ کا تقرر عمل میں آئے۔

ان کے خیال میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی ذات ایسی تھی جو صحیح معنی میں ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے سکتی تھی لیکن انھیں خطرہ تھا کہ مشورہ لیے بغیر عمرؓ کی نامزدگی لوگوں پر گراں گزرے گی اور مسلمان اس انتخاب کو اچھی نظروں سے نہ دیکھیں گے چنانچہ انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا اور ان سے پوچھا:

"عمرؓ بن خطاب کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا:

"جس امر کے متعلق آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں خود اسے بہتر جانتے ہیں۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"پھر بھی؟"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا:

"اے خلیفۂ رسول اللہؐ! واللہ عمرؓ بہترین شخص ہیں لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"عمرؓ میں سختی صرف اس لیے ہے کہ میں نرمی سے پیش آتا ہوں۔ اگر خلافت کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے تو اُن کی سختی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ میں خود

بھی دیکھتا ہوں کہ اگر میں کسی شخص پر ناراض ہوتا ہوں اور سختی سے پیش آتا ہوں تو عمرؓ اس سے نرمی کا سلوک کرنے پر مائل ہوتے ہیں اور اگر میں کسی سے نرمی کا سلوک کرتا ہوں تو وہ میرے سامنے اس شخص کے بارے میں درشتی کا اظہار کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ابوبکرؓ خاموش رہے پھر فرمایا:

"اے ابو محمد! جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

عبدالرحمٰن بن عوف کے بعد ابوبکرؓ نے عثمانؓ بن عفان کو بلایا اور فرمایا:

"اے ابوعبداللہ! عمرؓ کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

عثمانؓ نے جواب دیا:

"ان کے متعلق آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"اس کے باوجود میں تم سے ان کے متعلق رائے دریافت کرتا ہوں۔"

عثمانؓ نے جواب دیا:

"عمرؓ کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور وہ علم و فضل کے لحاظ سے ہم میں یکتا ہیں۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"اے ابوعبداللہ! اللہ تم پر رحم فرمائے۔ واللہ! اگر میں عمرؓ کو تمھارا امیر مقرر کر جاؤں تو وہ تم پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں گے۔"

عبدالرحمٰن کی طرح ابوبکرؓ نے عثمان کو بھی یہ ہدایت کر دی کہ وہ کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کریں۔

ابوبکرؓ نے صرف عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور عثمانؓ بن عفان سے مشورہ لینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ سعید بن زید، اسید بن حضیر اور دیگر مہاجرین و انصار سے بھی اس کے متعلق گفتگو کی۔ بعض صحابہ نے جب یہ سنا کہ ابوبکرؓ آئندہ ہونے والے خلیفہ کے بارے میں لوگوں سے مشورہ لے رہے ہیں اور اپنے بعد عمرؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں تو انھیں بے حد فکر پیدا ہوا کیونکہ عمرؓ کی سختی ضرب المثل تھی اور انھیں خطرہ

تھا کہ مبادا ان کے خلیفہ بن جانے سے مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو جائے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ ابوبکرؓ کے پاس جاکر انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کا ایک وفد اجازت لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کے قائد طلحہ بن عبداللہ نے عرض کیا "ہم نے سنا ہے کہ آپ عمرؓ بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کر رہے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو جب اللہ آپ سے عمرؓ کو خلیفہ بنانے کے متعلق باز پرس کرے گا تو آپ اسے کیا جواب دیں گے؟ آپ کی موجودگی میں تو وہ لوگوں سے جس طرح پیش آتے ہیں اس کا حال آپ پر عیاں ہے مگر آپ کے بعد تو ان کے ظلم و ستم کی کوئی حد نہ ہوگی!"

یہ سن کر ابوبکرؓ کو سخت طیش آیا اور بخار کی حالت میں چلّا کر بولے:

"مجھے بٹھا دو۔"

چنانچہ آپ کو بٹھا دیا گیا۔ آپ نے ان لوگوں کی طرف منہ کر کے فرمایا:

"کیا تم مجھے اللہ کے غضب سے ڈراتے ہو؟ واللہ! جب میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گا تو عرض کروں گا کہ اے اللہ! میں نے تیرے بندوں پر تیرے سب سے بہتر بندے کو خلیفہ بنایا ہے۔"

اس کے بعد طلحہ سے مخاطب ہو کر بولے:

"جو کچھ میں نے اس وقت کہا ہے اسے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچا دینا۔"

اس تند و تیز گفتگو کے بعد ابوبکرؓ دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور یہ لوگ شرمندہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اگلے روز صبح سویرے عبدالرحمٰن بن عوف ان کے پاس پہنچے اور انھیں دیکھ کر کہنے لگے:

"اللہ کا شکر ہے آج آپ کی صحت بحال معلوم ہوتی ہے۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"کیا واقعی؟"

انھوں نے جواب دیا:

"جی ہاں۔"

ابوبکرؓ کچھ دیر خاموش رہے پھر درد انگیز لہجے میں بولے:

"میں نے تمھارا امیر اس شخص کو مقرر کیا ہے جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے لیکن یہ سنتے ہی تم میں سے ہر شخص کا منہ سوج جاتا ہے اور وہ میرا انتخاب ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

عبدالرحمٰن بن عوف نے بھانپ لیا کہ ابوبکرؓ کو کل کی باتوں سے سخت تکلیف پہنچی ہے انھوں نے عرض کی:

"آپ لوگوں کی باتوں کی پروا نہ کریں۔ اس وقت بعض لوگ تو ایسے ہیں جو عمرؓ کی خلافت کے بارے میں آپ سے بالکل متفق ہیں، ان کے بارے میں تو کسی فکر کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ بعض لوگ عمرؓ کی خلافت پر راضی نہیں لیکن اگر انھوں نے آپ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے تو صرف بطور مشورہ۔ انھیں آپ کی مخالفت مقصود نہیں۔ بہر حال جو فیصلہ آپ فرمائیں گے وہ انھیں منظور ہوگا کیونکہ انھیں یقین ہے کہ آپ جو کچھ کریں گے وہ مسلمانوں کی بہتری ہی کے لیے کریں گے۔"

جب ابوبکرؓ عمرؓ کی خلافت کے بارے میں کاملۃً مطمئن ہو گئے تو انھوں نے اپنے کاتب عثمانؓ بن عفان کو بلایا اور کہا:

"جو کچھ میں تمھیں بتاؤں اسے لکھ لو۔"

اس کے بعد یہ عبارت لکھوائی:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ وصیت ہے جو ابوبکرؓ بن ابو قحافہ نے اس دنیا سے رخصت اور آخرت کی زندگی میں داخل ہونے وقت لکھوائی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب بڑے سے بڑا کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور جھوٹے سے جھوٹا شخص بھی سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو تمھارا خلیفہ نامزد کرتا ہوں۔ تم اس کے احکام کی کامل اطاعت کرو۔ میں نے حتی الامکان تم سے بھلائی کرنے میں کوئی دقیقہ سعی فروگذاشت نہیں کیا۔ اگر عمرؓ نے عدل و انصاف سے کام لیا تو مجھے اس سے بھی یہی امید ہے لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو ہر شخص قیامت کے دن

اللہ کے سامنے اپنے برے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔ بہرحال میں نے اپنی دانست میں تمھاری بھلائی ہی کی تدبیر کی ہے۔ ورنہ غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے —
وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ ابوبکرؓ نے عثمانؓ کو وصیت لکھوانی شروع کی جب ان الفاظ پر پہنچے کہ "میں تم پر خلیفہ بناتا ہوں" تو ان پر غشی طاری ہو گئی۔ عثمانؓ کو ابوبکرؓ کا منشا معلوم ہی تھا۔ انھوں نے حالت غشی ہی میں یہ الفاظ لکھ دیے:

"میں عمرؓ بن خطاب کو تم پر خلیفہ مقرر کرتا ہوں اور میں نے تمھاری بھلائی میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہیں کیا۔"

جب ابوبکرؓ کی غشی دور ہوئی تو انھوں نے فرمایا: "جو میں نے لکھوایا تھا اسے دوبارہ پڑھو۔"

جب عثمانؓ نے پوری عبارت پڑھی تو ابوبکرؓ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا:

"معلوم ہوتا ہے تمھیں ڈر تھا کہ اگر غشی کی حالت میں میری جان نکل گئی اور میں پوری وصیت نہ لکھوا سکا تو لوگوں میں خلیفہ کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔"

عثمانؓ نے کہا:

"آپ درست فرماتے ہیں۔ واقعی میرا یہی خیال تھا۔"

ابوبکرؓ نے عثمان کی لکھی ہوئی عبارت برقرار رکھی اور فرمایا:

"اللہ تمھیں اس کی بہترین جزا دے۔"

لیکن اس پر بھی ابوبکرؓ کو اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے اس وصیت کا اظہار عام لوگوں میں بھی کرنا چاہا تاکہ آئندہ کے لیے کسی اختلاف کا خدشہ باقی نہ رہے۔ انھوں نے مسجد کی طرف کا دروازہ کھلوایا اور اس میں کھڑے ہو گئے۔ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس دونوں ہاتھوں سے انھیں تھامے ہوئے تھیں۔ انھوں نے لوگوں کو، جو مسجد میں موجود تھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں جس شخص کو تم پر خلیفہ مقرر کر دوں تم اس پر راضی ہو؟ کیونکہ واللہ میں نے

تمھاری بھلائی کے لیے کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہیں کیا اور نہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار ہی کو خلیفہ بنایا ہے بیں نے اپنے بعد عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ نامزد کیا ہے۔ تم اس کے احکام کی کامل اطاعت کرو۔"

لوگوں نے یہ سن کر کہا:

"ہم آپ کے انتخاب پر راضی ہیں اور آپ سے عہد کرتے ہیں کہ ہر حال میں عمرؓ کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے۔"

ابنِ سعد کی بعض روایات میں یہ ذکر بھی ہے کہ ابوبکرؓ کی وصیت تحریر کرنے اور اس پر مہر لگانے کے بعد عثمانؓ باہر آئے۔ مہر شدہ وصیت ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے لوگوں سے کہا:

"جس شخص کی خلافت کا اس وصیت میں ذکر ہے تم اس کی بیعت کرلوگے؟"

لوگوں نے جواب دیا:

"یقیناً۔"

چنانچہ انھوں نے عثمانؓ کے کہنے کے مطابق عمرؓ بن خطاب کی بیعت کرلی۔ بیعت کے بعد ابوبکرؓ نے عمرؓ کو اپنے پاس بلا کر انھیں امورِ سلطنت کے متعلق بعض اہم ہدایات دیں۔

روایات میں ان ہدایات کی تفصیل اس طرح آئی ہے:

"میں اپنے بعد تمھیں اپنا جانشین مقرر کرکے اللہ کا تقویٰ کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اللہ نے بعض عمل رات کو کرنے کے لیے مقرر فرمائے ہیں، وہ انھیں دن میں قبول نہیں کرتا اور بعض عمل دن کو کرنے کے لیے مقرر فرمائے ہیں، انھیں وہ رات کو قبول نہیں کرتا جب تک فرض عبادات کی بجاآوری نہ کی جائے نفلی عبادتیں قبول نہیں ہوتیں۔ جس شخص کے پلڑے قیامت کے دن بھاری ہوں گے وہ دنیا میں نیک اعمال بجالانے والا ہوگا کیونکہ حق کی بجاآوری کے بغیر پلڑوں کا بھاری ہونا غیر ممکن ہے اور جس شخص کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ دنیا میں برے اعمال بجالانے والا ہوگا کیونکہ باطل کی پیروی کیے بغیر پلڑوں کا ہلکا ہونا غیر ممکن ہے۔ اللہ نے قرآنِ کریم میں جہاں اہلِ جنت کا ذکر کیا ہے وہاں نیک اعمال بجالانے کی وجہ سے

ان کی تعریف اور ان کی برائیوں سے درگزر کی ہے۔ جب تم ان آیات کی تلاوت کرو تو کہو "اے اللہ! مجھے ڈر ہے کہ مبادا میرا شمار ان لوگوں میں کیا جائے۔" اسی طرح جہاں اہل دوزخ کا ذکر کیا ہے وہاں ان کے برے اعمال کا تو ذکر کیا ہے لیکن ان کی اچھی باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ جب تم ان آیات پر پہنچو تو کہو "اے اللہ! مجھے امید ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہو گا۔" اللہ نے اکثر جگہ رحمت اور عذاب کی آیات یک جا کر دی ہیں تاکہ بندے کو جہاں ذوق و شوق سے نیکی کی طرف قدم اٹھانے کی رغبت پیدا ہو۔ وہاں اسے خدائی عذاب کا ڈر بھی پیدا ہو۔ وہ صرف حق کی پیروی کرے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔ اے عمرؓ! اگر تم میری ان نصائح پر کان دھرو گے اور ان پر عمل کرو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تمھیں محبوب نہ ہو گی اور تم بڑی بے قراری سے اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کے انعامات سے بہرہ ور ہونے کی خواہش ظاہر کرو گے لیکن اگر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دو گے تو موت سے زیادہ اور کوئی چیز تمھارے لیے ڈر کا باعث نہ ہو گی اور یاد رکھو کہ اس طرح تم ہرگز اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے۔"

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب یہ نصائح سن کر عمرؓ ابوبکرؓ کے کمرے سے باہر آئے تو ابوبکرؓ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی:

"اے اللہ! میں نے عمرؓ کو اپنا جانشین بنا کر اپنی دانست میں مسلمانوں کے لیے بھلائی کا سامان کیا ہے۔ مجھے اپنے بعد فتنے کا ڈر تھا۔ میں نے یہ کام محض فتنے کی روک تھام کے لیے کیا ہے۔ میں نے خوب غور و فکر کر کے ایسے شخص کو ان کا امیر مقرر کیا ہے جو ان میں سب سے بہتر، سب سے زیادہ مستعد اور مسلمانوں کی بھلائی کا سب سے زیادہ خواہش مند ہے۔ میری موت نزدیک آچکی ہے۔ میرے بعد تو ہی مسلمانوں کی نگہداشت فرما کیونکہ وہ تیرے بندے ہیں اور تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اے اللہ! ان کے امیر کو نیک اعمال بجا لانے کی صلاحیت عطا فرما۔ اسے خلفاء راشدین میں سے بنا اور اس کی رعایا کو بھی اس کا مطیع و فرماں بردار بنا۔"

مذکورہ بالا ہدایات اور دعا کی توثیق کرنا ہمارے لیے بے حد مشکل ہے خصوصاً اس فقرے سے کہ "اے اللہ اسے خلفاء راشدین میں سے بنا!" یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ عبارات فرضی طور پر ابوبکرؓ کی طرف منسوب تو نہیں کر دی گئیں کیونکہ جب ایک شخص نے انھیں خلیفۃ اللہؐ کے لقب سے پکارا تو انھوں نے فوراً کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۂ رسولؐ اللہ ہوں۔ چنانچہ اپنے انکسار کے باوصف وہ اپنے لیے "راشد" کا لفظ شاید ہی استعمال کرتے۔ ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے عہد کے متعلق مصادر روایات کتب تاریخ میں درج ہیں تو ہمارے لیے ان روایات کی چھان بین کرنا اور انھیں قبول کرنے میں بے حد احتیاط سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

محاسبۂ نفس

جب ابوبکرؓ عمرؓ کے تقرر سے فارغ ہو چکے اور انھیں اطمینان ہو گیا کہ انھوں نے اپنے بعد مسلمانوں کی نگہداشت کا کامل انتظام کر دیا ہے تو اپنے نفس کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ ابوبکرؓ کو مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق جو پریشانی تھی میں اسے دور کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان سے تشفی آمیز گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا: "آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کی تمام خواہشات پوری کر دیں اور آپ کے دل میں دنیا کی کسی بات کے متعلق کوئی حسرت باقی نہیں رہی۔"

یہ سن کر ابوبکرؓ نے فرمایا:

"تم ٹھیک کہتے ہو میں کوئی حسرت لیے ہوئے اس دنیا سے نہیں جا رہا۔ البتہ تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق مجھے افسوس ہے کہ میں نے انھیں کیوں کیا، کاش میں انھیں نہ کرتا۔ تین کام میں نے نہیں کیے، کاش میں انہیں کر لیتا اور تین باتیں ایسی ہیں جنھیں میں رسولؐ اللہ سے دریافت نہ کر سکا، کاش انھیں دریافت کر لیتا۔

تین باتیں جو مجھے نہ کرنی چاہیے تھیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کاش میں فاطمہؓ کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہوتا خواہ ان لوگوں نے لڑائی ہی کی خاطر اسے بند کیا ہوتا[1]

[1] جو لوگ علیؓ کے بیعت نہ کرنے کا واقعہ تسلیم نہیں کرتے وہ اس روایت کو بھی تسلیم نہیں کرتے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۴ پر)

۲۔ کاش میں فجارۃ السلمی کو آگ میں نہ جلاتا۔ یا تو اسے تلوار سے قتل کر دیتا، یا اس کی جان بخشی کر کے چھوڑ دیتا۔

۳۔ کاش میں سقیفہ بنی ساعدہ والے دن خلافت کا بار عمرؓ اور ابوعبیدہ میں سے کسی پر ڈال دیتا۔ ان میں سے کوئی امیر ہوتا اور میں اُس کا وزیر۔

جو امور مجھے بجا لانے چاہئیں تھے وہ ہیں:

۱۔ جب اشعث بن قیس حالتِ اسیری میں میرے پاس لایا گیا تھا تو مجھے اس کی گردن اُڑا دینی چاہیے تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ فتنہ پرداز آدمی ہے اور کوئی فتنہ پیدا ہونے پر اسے ضرور بڑھ کر کمانے میں حصّہ لے گا۔[۱]

۲۔ اسی طرح جب میں نے خالدؓ بن ولید کو مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا تو مجھے مدینہ سے نکل کر ذوالقصہ میں مقیم ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر مسلمان کامیاب ہو جاتے فبہا ورنہ میں ذوالقصہ میں پڑاؤ ڈالنے کی وجہ سے فوراً ان کی مدد کے لیے پہنچ سکتا۔

۳۔ جب میں نے خالدؓ بن ولید کو شام بھیجا تھا تو اس کے ساتھ ہی عمرؓ بن خطاب کو عراق بھیج دیتا اور یوں دونوں ہاتھ خدا کی راہ میں پھیلا دیتا۔

وہ تین باتیں جن کے متعلق رسول اللہؐ سے دریافت کر لینا چاہیئے تھا یہ ہیں:

۱۔ خلافت کے متعلق آپ سے دریافت کر لیتا تاکہ بعد میں کسی کے لیے جھگڑا کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۳

اسی طرح بعض لوگ یہ روایت بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ابوبکرؓ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش وہ انصار کے حقِ خلافت کے بارے میں رسول اللہؐ سے دریافت کر لیتے۔

[۱] ابوبکرؓ کی فراست کا کمال دیکھیے کہ ان کا یہ خدشہ ہو بہو پورا ہوا۔ جنگِ صفین میں علیؓ کے لشکر میں شامل ہونے کے باوجود اشعث درپردہ امیر معاویہ سے مل گیا اور جب تحکیم کا فتنہ برپا ہوا تو یہ اسے بھڑکانے میں پیش پیش تھا۔ (مترجم)

۲۔ آپ سے یہ بھی دریافت کرلیتا کہ خلافت میں انصار کا بھی حصہ ہے یا نہیں۔
۳۔ بھتیجی اور پھپی کی میراث کے متعلق استفسار کرلیتا کیونکہ ان دونوں رشتہ داروں کی میراث کے متعلق میرے دل میں خلش باقی ہے۔"

وظیفے کی واپسی

ابوبکرؓ مرض الموت میں صرف انھیں باتوں کے متعلق غور و فکر میں مشغول نہ تھے بلکہ بعض اور خیالات بھی ان کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ خلافت سے پہلے وہ تجارت کیا کرتے تھے لیکن جب امور سلطنت کا بار ان کے کندھوں پر پڑا تو انھوں نے مجبوراً اس پیشے کو خیرباد کہا اور بیت المال سے اپنے لیے وظیفہ مقرر کرا لیا جو ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لیے کافی ہوتا۔ مرض الموت میں انھیں اس وظیفے کا بھی خیال آیا۔ انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو بلا کر ہدایت کی کہ میں نے دوران خلافت میں بیت المال سے جو رقم لی تھی اُسے واپس کر دیا جائے اور اس غرض سے میری فلاں زمین بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم بیت المال میں جمع کرا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب عمرؓ نے ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق وہ رقم بیت المال میں جمع کی تو فرمایا:

"اللہ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد کسی بھی شخص کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئے۔"

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب ابوبکرؓ کی وصیت کے مطابق ان کے متعلقین نے بیت المال سے لی ہوئی رقم عمرؓ کو لوٹائی تو انھوں نے ابوبکرؓ کے لیے دعا کی اور فرمایا:

"ان کے بعد میں امیر مقرر ہوا ہوں اور میں یہ رقم تم ہی کو لوٹاتا ہوں۔"

اس سلسلے میں تیسری روایت یہ ہے کہ وفات کے وقت ابوبکرؓ کے پاس ایک بھی دینار یا درہم نہ تھا۔ انھوں نے ترکے میں ایک غلام، ایک اونٹ اور ایک مخملی چادر چھوڑی جس کی قیمت پانچ درہم تھی۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ وفات کے بعد ان چیزوں کو عمرؓ کے پاس بھیج دیا جائے۔ وصیت کے مطابق جب یہ چیزیں عمرؓ کے پاس پہنچیں تو وہ رو پڑے اور کہا:

"ابوبکرؓ نے اپنے جانشین پر بہت سخت بوجھ ڈال دیا ہے۔"

ہمیں اس روایت کی صحت میں تامل ہے کیونکہ اس کے بالمقابل اکثر روایات ایسی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ابوبکرؓ نے کچھ نہ کچھ ترکہ ضرور چھوڑا تھا گو وہ بہت ہی قلیل تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے رشتہ داروں کے لیے اپنے ترکے کے پانچویں حصے کی وصیت کی تھی اور کہا تھا کہ جس طرح مالِ غنیمت میں سے حکومت کو پانچواں حصہ ملتا ہے اسی طرح میرے رشتہ داروں کو بھی میرے مال کا پانچواں حصہ ہی ملنا چاہیے۔ جب بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بجائے پانچویں حصے کے چوتھے حصے کی وصیت کر دیں تو انھوں نے کہا کون شخص نہیں چاہتا کہ اپنے متعلقین کے لیے وافر مال اسباب چھوڑ کر جائے لیکن اللہ کا حق مقدم ہوتا ہے۔ اگر میں بجائے پانچویں حصے کے چوتھے حصے کی وصیت کر جاؤں تو تم کہو گے کہ تیسرے حصے کی وصیت کرو۔ اور جو شخص اپنے رشتہ داروں کے لیے تیسرے حصے کی وصیت کرتا ہے وہ اللہ کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔"

اگر ابوبکرؓ نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا تھا اور عائشہؓ کی طرف منسوب کی ہوئی یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ ابوبکرؓ نے ایک بھی دینار اور درہم باقی نہیں چھوڑا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ابوبکرؓ نے پانچویں حصے کی وصیت کیونکر کر دی؟ وصیت تو وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس مال ہو خواہ تھوڑا ہو خواہ بہت۔

رسول اللہ نے وفات سے قبل ابوبکرؓ کو ایک قطعہ زمین مرحمت فرمایا تھا جسے انھوں نے درست کر کے اس میں درخت وغیرہ لگوائے تھے۔ بعد میں انھوں نے یہ قطعہ اپنی بیٹی عائشہؓ کو دے دیا۔ جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے عائشہؓ سے کہا:

> "اے میری بیٹی! میں یہ بالکل نہیں چاہتا کہ میرے بعد تمھیں مالی اعتبار سے کسی قسم کی تنگی برداشت کرنی پڑے۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم بافراغت زندگی بسر کرو پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ جو قطعہ زمین میں نے تمھیں دیا تھا وہ تم مجھے واپس کر دو تاکہ میں احکامِ وراثت کے مطابق اسے تمھارے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر دوں۔"

عائشہؓ کی صرف ایک بہن تھی۔ وہ بہت حیران ہوئیں کہ بہنوں کا کیا مطلب۔ انھوں نے والد سے اس کی وضاحت چاہی۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ تمھاری سوتیلی والدہ حبیبہ بنت خارجہ کو حمل ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کے لڑکی پیدا ہو گی۔

اِس روایت سے بھی ابوبکرؓ کے ترکے کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔

تجہیز و تکفین کے متعلق وصیّت

ابوبکرؓ نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق بھی ورثا کو وصیّت کر دی تھی۔ ان کی ہدایت تھی کہ انھیں دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے کیونکہ نئے کپڑے پہننے کا زیادہ حق دار زندہ شخص ہے[1]۔ غسل اسماء بنت عمیس دیں اور اگر وہ اکیلی یہ کام نہ کر سکیں تو اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو بھی ساتھ ملا لیں۔

ابوبکرؓ اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق ہدایات دینے میں مشغول تھے کہ مثنیٰ عراق سے مدینہ پہنچے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ انھوں نے باوجود حد درجہ نقاہت کے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ مثنیٰ نے درخواست کی کہ عراق کی صورتِ حال کے پیشِ نظر ان لوگوں کو اسلامی فوج میں داخل ہونے کی اجازت دے دیجیے جو مرتد ہو گئے تھے اور اب اپنے کیے پر پشیمان ہیں۔ انھوں نے عمرؓ کو بلا کر کہا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کی مدد کے لیے فوج روانہ کر دو، میری وفات تمھیں ایسا

---

[1] تجہیز و تکفین کے متعلق متعدد روایات مروی ہیں اور وہ تمام عائشہؓ سے منسوب ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ایک کپڑا پہنے رہا کرتے تھے۔ وفات کے وقت انھوں نے کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو میرا یہ کپڑا دھو کر اور دو نئے کپڑے اس سے ملا کر مجھے کفن دیا جائے۔ عائشہ کہتی ہیں، میں نے کہا ہم تین کپڑے نئے کیوں نہ لے لیں؟ انھوں نے فرمایا:

"نہیں بیٹی! کفن تو اس لیے ہوتا ہے کہ خون اور پیپ وغیرہ جسم سے نکلے تو اس میں جذب ہو جائے۔ نئے کپڑے پہننے کا زیادہ حق دار زندہ شخص ہے۔" ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابوبکرؓ نے عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ کو کتنے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا "تین میں۔" آپ نے فرمایا "میرے یہ دونوں کپڑے دھو لینا اور ایک کپڑا ساتھ ملا کر ان میں مجھے کفن دے دینا۔" عائشہؓ نے کہا "ابا جان! ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ ہم نئے کپڑوں میں آپ کو کفن دے سکیں۔" انھوں نے فرمایا "اے میری بیٹی! زندہ شخص نئے کپڑے کا زیادہ حق دار ہے۔ کفن تو اس کے لیے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جائے۔" ان کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جو طبقات ابن سعد میں درج ہیں۔

کرنے سے مطلق نہ روکے۔

وفات

نزع کے وقت ان کی بیٹی عائشہ ان کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے باپ کی یہ حالت دیکھ کر حاتم کا یہ شعر پڑھا:

لعمرک ما یغنی الثراء عن الفتیٰ اذا حشرجت یوماً وضاق بہا الصدر

(جب نزع کی حالت طاری ہوتی ہے اور سینہ سانس نہ آنے کی وجہ سے گھٹنے لگتا ہے تو دولت انسان کے کام نہیں آتی۔)

یہ شعر سن کر ابوبکرؓ نے غصے سے عائشہ کی طرف دیکھا اور کہا:

"بیٹی اس کے بجائے یہ آیت پڑھ:

وجاءت سکرۃ الموت بالحق ذالک ماکنت منہ تحید

(نزع کی حالت طاری ہو گئی ہے یہ وہ وقت ہے جس سے تو خوف کھایا کرتا تھا)

اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو عائشہؓ نے ان کے سرہانے بیٹھ کر یہ شعر پڑھا:

وکل ذی غیبۃ یؤوب وغائب الموت لا یؤوب

(ہر جانے والے کی واپسی کے لیے امید کی جا سکتی ہے مگر اس شخص کی واپسی ناممکن ہے جسے موت ساتھ لے جائے۔)

ایک روایت میں مذکور ہے کہ یہ شعر ابوبکرؓ نے پڑھا تھا آخری بات جو ان کے منہ سے نکلی وہ یہ تھی:

رب توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین (اے میرے پروردگار! مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دینا اور مرنے کے بعد مجھے صالحین کے پاس جگہ دینا)

ابوبکرؓ کی وفات ۲۱ جمادی الآخریٰ ۱۳ھ (مطابق ۲۲ اگست ۶۳۴ء) پیر کو سورج غروب ہونے کے بعد ہوئی اور اسی رات انھیں دفن کر دیا گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر تریسٹھ برس کی تھی۔ وصیت کے مطابق ان کی بیوی اسماء بنت عمیس نے انھیں غسل دیا۔ اور ان

کے بیٹے عبدالرحمٰن نے جسم پر پانی ڈالا۔ اس کے بعد ان کی نعش اسی چارپائی پر رکھ کر مسجد نبوی میں لے گئے جس پر رسول اللہ کا جسد اطہر اٹھا کر قبر میں اتارا گیا تھا۔

مسجد نبوی میں ان کا جنازہ رسول اللہ کے مزار اور منبر کے درمیان رکھا گیا۔ نماز عمرؓ نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ عائشہؓ کے حجرے میں لے گئے جہاں رسول اللہ کے پہلو میں ان کے لیے قبر تیار کی گئی تھی۔ عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ساتھ گئے۔ عبداللہ بن ابی بکرؓ نے حجرے میں داخل ہونا چاہا مگر عمرؓ نے کہا "جگہ نہیں۔"

ابوبکرؓ کو رسول اللہ کے پہلو میں اس طرح دفن کیا گیا کہ ان کا سر رسول اللہ کے کندھوں کے متوازی تھا۔ قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد سب لوگ باچشم گریاں حجرے سے باہر نکل آئے اور خلیفہ رسول اللہ کو رسول اللہ کے پہلو میں چھوڑ آئے۔ زندگی بھر دونوں ساتھ رہے۔ یہ رفاقت مرنے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی اور رسول اللہ کا سب سے محبوب خادم اپنے آقا کے برابر ہی آرام کر رہا ہے۔

ابوبکرؓ کی وفات سے مدینہ لرز اٹھا اور لوگوں پر کرب و اضطراب کی وہی کیفیت طاری ہو گئی جس کا نظارہ رسول اللہ کی وفات کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔ علیؓ ابن ابی طالب روتے ہوئے آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر کہنے لگے:

> "اے ابوبکرؓ! اللہ تم پر رحم کرے۔ واللہ! تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا تھا۔ ایمان و اخلاص میں تمہارا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اخلاق، قربانی، ایثار اور بزرگی میں تمہارا ثانی کوئی نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت تم نے کی اور رسول اللہ کی رفاقت میں جس طرح ثابت قدم رہے اس کا بدلہ اللہ ہی تمہیں دے گا۔ جب ساری قوم رسول اللہ کی تکذیب میں مشغول تھی تو تم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ جب ساری قوم آپ کو اذیتیں پہنچانے کے درپے تھی تو تم نے آپ کی حفاظت کی۔ جب رسول اللہ کی باتوں پر لوگ مطلق کان نہ دھرتے تھے۔ تو تم نے آپ سے مل کر اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ تمہیں اللہ نے اپنی کتاب میں 'صدیق' کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ فرماتا ہے "والذی جاء بالصدق

وصدق بہ" (اے کافرو! اس شخص کے حالات پر غور کرو جو تمھارے پاس صدق ویقین سے بھرپور باتیں کرنے آیا ہے (رسول اللہ) اور اسے بھی دیکھو جو ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے (ابوبکرؓ)۔) واللہ! تم اسلام کے حصن حصین تھے۔ کافروں کے لیے تمھارا وجود انتہائی اذیت بخش تھا۔ تمھاری کوئی دلیل وزن سے خالی نہ ہوتی تھی اور تمھاری بصیرت اور فہم و فراست کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمھاری سرشت میں کم زوری کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ تم ایک پہاڑ کی مانند تھے جسے تند و تیز آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ اگرچہ تم جسمانی لحاظ سے کم زور تھے لیکن دینی لحاظ سے جو قوت تمھیں حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ تم اپنے آپ کو بندۂ پر تقصیر سمجھتے تھے لیکن اللہ کے نزدیک تمھارا مرتبہ بے حد بلند تھا۔ تم دنیا والوں کی نظروں میں واقعی ایک جلیل القدر انسان تھے اور مومنوں کی نگاہوں میں انتہائی رفیع الشان شخصیت کے مالک۔ لالچ اور نفسانی خواہشات تمھارے پاس بھی نہ پھٹکتی تھیں۔ ہر کم زور انسان تمھارے نزدیک اس وقت تک قوی تھا اور ہر قوی انسان اس وقت تک کم زور جب تک تم قوی سے کم زور کا حق لے کر اسے نہ دلوا دیتے تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمھارے اجر سے محروم نہ رکھے اور ہمیں تمھارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ ہمارے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے۔" ام المومنین عائشہؓ نے کہا:

"اے ابا جان! اللہ آپ کے چہرے کو تر و تازہ رکھے اور دین اسلام کو آفات و مصائب سے بچانے کے لیے جو مساعی آپ نے کی ہیں ان کا بہتر بدلہ آپ کو دے۔ آپ نے اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اسے ذلیل کر دیا ہے اور آخرت کو اپنے دم سے عزت بخشی ہے۔ آپ کی وفات رسول اللہ کے بعد ہمارے لیے سب سے زیادہ دردناک حادثہ ہے۔ اللہ نے اپنے کلام میں بندوں کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے بدلے بہترین انعامات کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم بھی آپ کی وفات پر صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ سے ان انعامات کے طالب ہیں جو اس نے صبر کرنے کے بدلے میں ہم سے کر رکھے ہیں۔ اللہ آپ پر

اپنی رحمت اور سلامتی نازل فرمائے۔"

عمرؓ کو تو اس صدمے کے باعث گفتگو کا یارا ہی نہ رہا تھا۔ وفات کے بعد جب وہ حجرے میں داخل ہوئے تو صرف یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل سکے:

"اے خلیفۂ رسول اللہ! تمھاری وفات نے قوم کو سخت مصیبت اور مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہم تو تمھاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تمھارے مرتبے کو کس طرح پا سکتے ہیں؟"

جب ابوبکرؓ کی وفات کی خبر مدینہ سے باہر قبائل عرب میں پھیلی تو کوئی دردمند آنکھ ایسی نہ تھی جو اس سانحۂ عظیمہ کے باعث پرنم نہ ہوئی ہو۔ جب مکہ میں یہ خبر پہنچی تو وہاں بھی ہر طرف سے آہ و شیون کی آوازیں آنے لگیں۔ ابوبکرؓ کے والد ابوقحافہ اس وقت تک زندہ تھے۔ جب انھوں نے گریہ و زاری کی آوازیں سنیں تو لوگوں سے واقعہ پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کا لڑکا فوت ہو گیا۔ یہ سن کر ان کے دل پر اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد اور کوئی بات نہ کی۔ جب لوگوں نے ابوبکرؓ کے ترکے میں سے ان کا حصّہ ان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا:

"ابوبکرؓ کے لڑکے اس کے زیادہ حق دار ہیں۔"

ابوبکرؓ کی وفات کے بعد ان کے والد کو بھی زیادہ عرصہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا اور وہ اس عظیم حادثے کی تاب نہ لاتے ہوئے چھ مہینے بعد وفات پا گئے۔

صحابہ کی بے چینی اور بے قراری یقیناً حق بجانب تھی۔ ابوبکرؓ نے اسلام کی سربلندی کی خاطر جو مشکلات اور تکالیف برداشت کیں اور جس طرح اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لیے وقف کیا اس کی نظیر اور کوئی نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنے پاک نمونے سے دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں بھی دین کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے ہر قسم کی سختیاں جھیل کر اور ایمان و استقامت اور عزم و استقلال سے کام لے کر اسلام کو ہر امکانی خطرے سے بچایا اور اس راہ میں اپنی جانوں کی بھی پروا نہ کی۔ اللہ نے خلیفۂ اوّل کے عہد میں مومنوں کا امتحان لیا تھا۔ وہ اس امتحان میں پورے اُترے اور خلیفہ کے ایمان و ایقان اور مسلمانوں کی جرأت و ہمت کی بدولت اسلام عرب کی حدود سے نکل کر

رومی اور ایرانی مقبوضات میں دور دور تک پھیل گیا۔ ابوبکرؓ کے ذریعے سے اللہ جو کام کرانا چاہتا تھا جب وہ پورا ہو چکا تو اس نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

اگر ابوبکرؓ، عمرؓ کو جانشین مقرر نہ کرتے تو نہ معلوم اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔ یہ آخری کارنامہ جو ابوبکرؓ نے انجام دیا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی بدولت اسلام عروج کی آخری منزل تک پہنچ گیا۔ عمرؓ کے عہد میں اسلام کو جو ترقی نصیب ہوئی اسے دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ عمرؓ کا انتخاب خدائی انتخاب تھا جو اسی کی دی ہوئی توفیق سے ابوبکرؓ نے کیا۔ اس انتخاب میں زبان ابوبکرؓ کی لیکن مشیت خدا کی کام کر رہی تھی۔

لاریب ابوبکرؓ اور عمرؓ وہ مقدس وجود تھے جنھوں نے اپنے آپ کو دنیوی آلائشوں سے کلیۃً پاک کر کے خالصتہً اللہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دونوں کی طبیعتیں مختلف تھیں لیکن مقاصد ایک ہی تھے — یعنی عدل و انصاف کا قیام اور اعلاء کلمۃ الحق — دونوں بزرگوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنی زندگیاں یکسر وقف کر دی تھیں اور دونوں نہایت درجہ کامیاب و کامران ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے۔

اللہ ابوبکرؓ پر فضل فرمائے اور انھیں اس دنیا کی طرح بہشت میں بھی اپنی نوازش ہائے بے پایاں سے نواز کر اپنے محبوب محمد مصطفیٰ کے قرب میں جگہ دے آمین!

حرفِ آخر

میں نے کتاب کے آغاز ہی میں بیان کیا تھا کہ ابوبکرؓ کا عہد اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور ان کے کارنامے ذہنِ انسانی پر رعب و ہیبت طاری کر دیتے ہیں۔ میری اس رائے کی تائید وہ اصحاب بھی کریں گے جنھوں نے اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھا ہے اور ان عظیم الشان کارناموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو ابوبکرؓ نے اپنے انتہائی مختصر عہدِ خلافت میں انجام دیے۔ ابوبکرؓ کے عہد کی یہ تاریخ درس و موعظت کا بے پایاں دفتر بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور اسے پڑھنے سے قوموں کے عروج و زوال کا واضح نقشہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اُس وقت دنیا کے پردے پر دو ہی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔ جن میں سے ایک مغربی تہذیب و تمدن، عقاید اور علوم و فنون کی علم بردار تھی اور دوسری مشرقی تہذیب و تمدن، عقاید اور علوم و فنون کا مظہر۔ سلطنتِ روما لاطینی، یونانی، فینیقی اور فرعونی تہذیب و آثار کا مجموعہ تھی اور سلطنتِ ایران ایرانی اور ہندوستانی تمدن اور مشرقِ بعید کے مذاہب کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ مقدم الذکر سلطنت وسطی یورپ بلکہ اس سے بھی پرے بحیرۂ روم کے مشرق تک پھیلی ہوئی تھی اور مؤخر الذکر مملکت وسطی ایشیا سے لے کر دجلہ اور فرات کے طویل و عریض میدانوں پر محیط تھی۔ ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے درمیان ایک ہولناک اور لق و دق صحرا حائل تھا جہاں دور دور تک روئیدگی کا نام و نشان تک نہ ملتا تھا۔ یہ ریگستان، جسے صحرائے شام کہا جاتا ہے، ان خانہ بدوش قبائل کا مسکن تھا جو جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر رومی اور ایرانی سرحدوں پر آباد ہو گئے تھے۔ یہ دونوں عظیم قوتیں کبھی چین سے نہ بیٹھتی تھیں بلکہ ہمیشہ جنگ و جدل میں مصروف اور آئے دن ایک دوسری کے خلاف طاقت و قوت کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔ صدیوں سے ان کا یہی مشغلہ چلا آرہا تھا اور دنیا پر اپنی عظمت و ہیبت کا سکہ بٹھانے کے لیے حرب و پیکار کے سوا اور کوئی وسیلہ ان کے پاس نہ تھا

باہم جنگ وجدل کا سبب یہ نہ تھا کہ ان سلطنتوں میں افلاس و ناداری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور تنگ دستی دور کرنے کی غرض سے انھوں نے ایک دوسرے کے علاقے پر دست درازی و غارت گری کو وتیرہ بنا رکھا تھا بلکہ اس کے برعکس یہ سلطنتیں بے حد خوش حال تھیں۔ ان کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی، سرسبز و شاداب علاقے اور سونا اگلنے والی زمینیں ان کے قبضے میں تھیں۔ ہر قسم کی صنعتیں ان ملکوں میں فروغ پا رہی تھیں، علم و ادب کے چشمے ہر طرف جاری تھے غرض دونوں سلطنتوں کو کسی چیز کی قلت نہ تھی۔ وہاں کے باشندے ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال تھے اور بافراغت زندگی بسر کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے ہر سلطنت یہ خیال کرتی تھی کہ ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ اسی ذہنیت کے زیر اثر وہ دوسروں کا مال غصب اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہ سمجھتی تھیں بلکہ اسے فرض اولیں خیال کرتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متواتر سات سو سال تک ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں کبھی ایک سلطنت کو فتح حاصل ہو جاتی تھی اور کبھی دوسری حکومت خوشی کے شادیانے بجاتی دوسرے کے علاقے پر قابض ہو جاتی تھی لیکن فتح و شکست کے اس پیہم سلسلے کے باوجود دوسری اقوام کے دلوں سے ان کی ہیبت کم نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ جو فریق آج کسی کمزوری کی وجہ سے شکست کھا گیا ہے وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک اس شکست کا انتقام لے کر فاتح قوم پر اپنی برتری ثابت نہ کر دے گا۔ جو آج غالب ہے وہ کل مغلوب ہو گا اور جو آج مغلوب ہے وہ کل غالب آجائے گا اور فتح و شکست کا یہ سلسلہ باری باری چلتا چلا جائے گا۔

اس زمانے میں جب ہر جگہ ان دونوں سلطنتوں کا غلغلہ بلند تھا ہر طرف انھیں کی ثقافت کا ڈنکا بج رہا تھا، عرب کی سرزمین سے ایک بظاہر غیر مہذب قوم اٹھی اور آن کی آن میں ربع مسکون پر چھا گئی۔ یہ ایسا حیرت آفریں واقعہ تھا جس کی تہ کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا کسی کے سان گمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ عرب کی سنگلاخ سرزمین سے ایک ایسی امت و ملت جنم لے سکتی ہے جو ایران اور روم کے اقتدار اور ان کی صدیوں پرانی تہذیب کو آن کی آن میں پیوند خاک کر دے۔ کون خیال کر سکتا تھا کہ اس سرزمین سے تہذیب و تمدن کے سوتے پھوٹ سکتے ہیں ـــــ سوتے پھوٹنا تو بڑی بات ہے وہاں سے علم و عمل کی کوئی ہلکی سی کرن بھی ضوفشاں ہو سکتی ہے ـــــ جس کے باشندوں کی حیثیت

کسریٰ شاہ فارس کے نزدیک، اونٹوں اور بکریوں کے چرواہوں سے زیادہ نہ تھی اور قیصر روم بھوکے اور ننگے کا لقب دے کر جن کی تذلیل کرتا تھا کیا یہ بھوکی ننگی، مویشی چرانے والی قوم جس کی طرف اہل ایران اور اہل روم حقارت کی وجہ سے آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ایسے فرزند پیدا کر سکتی تھی جو کسریٰ اور قیصر کی سلطنتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتے؟

لیکن یہ سب منصۂ شہود پر آیا۔ اس قوم نے انتہائی کس مپرسی کی حالت سے ترقی کی، بہت ہی قلیل عرصے میں عرب کی سرزمین سے نکل کر قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مقابل صف آرا ہو گئی اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک دونوں مملکتوں کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل نہ کر دیا۔ آپ نے اس کتاب میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ عرب ان سلطنتوں پر جنگی ساز و سامان کی برتری یا تعداد کی زیادتی کے باعث غالب نہ آئے بلکہ یقین محکم اور عزم راسخ کی بدولت کامیاب و کامران ہوئے اور اسی ایمان و یقین نے اس اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس نے متواتر دس صدیوں تک اقصائے عالم میں علم و عرفان کا چراغ روشن کیے رکھا۔ یہی چراغ تھا جس نے اہل یورپ کو روشنی بخشی اور انھیں جہالت کے اتھاہ اندھیروں سے نجات دلا کر علم و عمل کی وہ راہ دکھائی جس پر آج وہ گامزن ہیں۔ اسلام نے اپنا دائرہ عرب، ایران اور شام ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اس نے ایشیا میں ہند، چین اور ترکستان، افریقہ میں مصر، تونس، الجزائر اور مراکش اور یورپ میں روس، اطالیہ اور ہسپانیہ تک ضوفشانی کی اور ان علاقوں کی پیاسی سرزمین کو باران رحمت سے سیراب کیا۔

اس معجزے کا ظہور کس طرح ہوا اور تہذیب و تمدن سے کورے، علوم و فنون سے ناآشنا، حقیر و ذلیل عرب کم مائیگی اور قلت تعداد کے باوجود ایران اور روم کی مہذب و شائستہ اقوام پر کس طرح غالب آ گئے؟ کیا یہ سب کچھ اتفاقاً واقع ہو گیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسلام کا یہ غلبہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا جس کی نظیر اقوام عالم کی تاریخ میں ملنا غیر ممکن ہو۔ اگر بفرض محال ابوبکرؓ کے عہد میں بعض اتفاقی حوادث کی وجہ سے مسلمانوں کو عدیم النظیر کامیابی نصیب ہو بھی گئی تھی تو لازماً اس کا اثر صرف ابوبکرؓ کے عہد تک محدود رہنا چاہیے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عمرؓ اور عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں بھی فتوحات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مسلمانوں کو سلطنت ایران اور سلطنت روم کے مقابلے میں روز افزوں کامیابیاں نصیب ہوتی چلی گئیں اور کوئی طاقت انھیں آگے بڑھنے سے روک نہ

سکی۔ اس لیے ان کامیابیوں کو اتفاقی حوادث کا نام دے کر ان کے اصل اسباب نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

واقعات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ پیش آیا وہ طبع دوراں کے اقتضار کے عین مطابق تھا۔ زمانے کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا ہے کہ افراد کی طرح قوموں پر بھی لازماً انحطاط کا زمانہ آتا ہے اور جس قوم پر انحطاط کا دور آ جائے فتنہ و فساد اور شورش و اضطراب اس میں راہ پا کر اس کی زندگی کا خاتمہ نزدیک لے آتے ہیں۔ اس وقت اس زوال پذیر طاقت کی جگہ لینے کے لیے ایک اور قوم کھڑی ہو جاتی ہے جو پرانی ثقافت کے آثار کو مٹا کر ایک نئی ثقافت کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔

اس کتاب میں پہلے بھی کئی بار شورش و اضطراب کے ان عوامل کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے جو بار بار فارس اور روم میں برپا ہوتے رہتے تھے چھٹی صدی عیسوی میں ان عوامل نے اثر دکھانا شروع کیا اور فارس میں فتنہ و فساد نقطۂ عروج تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں وہاں ہر جانب بدنظمی اور ابتری کا دور دورہ تھا۔ تختِ شاہی کے متعدد دعوے دار پیدا ہو گئے تھے۔ اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے تھے اور خود غرضی لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ اس فساد کا اثر دوسرے شعبہ ہائے حیات پر بھی پڑا۔ ملک کے باشندے اتحاد و اتفاق کی دولت کھو بیٹھے۔ گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ مختلف جھگڑے جنم لینے لگے اور لوگوں کے عقاید میں انتشار پیدا ہو گیا۔ یگانگی اور اخوت کی جگہ عصبیت اور مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں نے لے لی۔ اس لیے جو بھی گروہ برسرِ اقتدار آ جاتا وہ مخالفین کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے سے نہ چوکتا اور دوسروں کو مال و دولت اور جاہ و جلال سے محروم کر کے ہر قسم کا آسائش و آرام اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا۔ یہ انتشار اس امر کا متقاضی تھا کہ سلطنتِ ایران کی بساط لپیٹ دی جائے۔ خدائی نعمت اس سے چھین لی جائے اور اس قوم کے حوالے کر دی جائے جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کرنا جانتی ہو۔

سلطنتِ روما کا حال بھی ایرانی سلطنت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مذہبی مناقشات اور حصولِ اقتدار کا سلسلہ وہاں بھی جاری تھا۔ مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان لامتناہی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور ہر فرقہ اپنے عقاید دوسرے فرقے کے لوگوں پر زبردستی ٹھونسنا چاہتا تھا۔ حصولِ اقتدار

کی خواہش بھی وہاں کے سرداروں کو بے چین کیے ہوئے تھی اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سرپھٹول اور جنگ و جدل کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں بھی ضعف و انحطاط کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ گو جسٹینین نے بالغ نظری، اثر و رسوخ، عدل و انصاف اور زور و قوت کے بل بوتے پر سلطنت روما کے نیم مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن بیماری اس قدر بڑھ چکی تھی اور ضعف اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں سلطنت کی حالت برابر ابتر ہوتی چلی گئی۔ اس کے جانشینوں میں نہ وہ . . . . حکمت عملی تھی اور نہ وہ بالغ نظری، نہ وہ اثر و رسوخ تھا نہ وہ زور و قوت جس کے بل بوتے پر سلطنت کی بگڑی ہوئی حالت بنا سکتے۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں فوکاس سریر آرائے سلطنت ہوا اور اس نے ڈنڈے کے زور سے ملک پر حکومت کرنی شروع کی لیکن یہ حکومت اُسے راس نہ آئی۔ کچھ عرصے کے بعد سلطنتِ روما کے افریقی مقبوضات کے حاکم ہرقل نے فوکاس کے خلاف بغاوت کر دی اور اُسے قتل کر کے خود سلطنت پر قابض ہو گیا۔ فوکاس کے آخری اور ہرقل کے ابتدائی عہدِ حکومت میں رومیوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے سلطنت روما کے بہت سے حصے پر قبضہ جما لیا تھا۔ جب ہرقل کی حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی تو اس نے چھنے ہوئے مقبوضات کو رومی عمل داری میں واپس لانے کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ چنانچہ ایک بار پھر رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ چھڑ گئی جس میں انجام کار رومیوں کو فتح نصیب ہوئی اور ہرقل نے اپنے تمام مقبوضات ایرانیوں سے واپس لے لیے۔ اس طرح ہرقل کی قوت و طاقت میں معتد بہ اضافہ ہو گیا اور لوگ خیال کرنے لگے کہ جسٹینین کا عہد لوٹ کر آ گیا ہے۔

بیرونی دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل نے سلطنت کی اندرونی حالت کو مستحکم کرنا چاہا ملک کے استحکام میں سب سے بڑی رکاوٹ نا اتفاقی اور سلطنت کے باشندوں کی باہمی عداوت نے ڈال رکھی تھی۔ عیسائی بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کا جانی دشمن تھا۔ ہرقل نے اس رکاوٹ کو دور کرنے اور مذہبی اختلاف مٹا کر سلطنت کے تمام باشندوں کو ایک ہی مذہب پر جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس غرض کے لیے اس نے جو طریق کار اختیار کیا اس نے تمام فرقوں کے لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکا دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہرقل ہمارے

فرقے اور مذہب کی بیخ کنی پر تلا ہوا ہے اور تمام لوگوں کو بجبر اپنے فرقے میں داخل کرنے کا خواہاں ہے تو وہ اس کے مقابلے پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سارا ملک مہیب خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ اِس طرح ہرقل نے جس طریق کار کو اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے مفید خیال کیا تھا وہی اس کی سلطنت کے ضعف کا باعث بن گیا۔

یہ تھے وہ عوامل جن کی بنا پر دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں کو عروج کی آخری منزلوں تک پہنچنے کے بعد آخر ضعف و اضمحلال سے ہم کنار ہونا پڑا۔ گردشِ ایام کا تقاضا یہ تھا کہ ان نحیف و نزار اقوام کی جگہ نئی امنگوں سے بھرپور ایک اور قوم کھڑی ہوتی جو حیرت انگیز کارناموں کی بدولت دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی۔ عروج و زوال کے طبعی قوانین کے ماتحت اس نئی قوم کے مقدر میں اس وقت تک کامیابی کے مراحل طے کرنے لکھے تھے جب تک وہ حقیقتاً پیغامِ الٰہی کی حامل رہتی اور دنیا کو اسی کی پیروی میں اپنی نجات کے سامان نظر آتے۔

انسان کی آزادی اور خود مختاری کا چھن جانا اس کے لیے مادی تکالیف سے بدرجہا زیادہ اذیت بخش ہوتا ہے۔ آزادی پر قدغن عائد ہونے اور ضمیر کی حرّیت کا گلا گھونٹ دینے والے قوانین و عقائد سے انسانی ذہن پر جمود کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور انسان غور و فکر کی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں شگفتگی مطلق باقی نہیں رہتی۔ اطمینان اور سکون کی کیفیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ جب قوم کے افراد دیکھتے ہیں کہ ان کی آزادی چھینی جا رہی ہے، اُن کے افکار و خیالات اور عقائد و اعمال پر قیود عائد کی جا رہی ہیں تو ان کے دل و دماغ میں باغیانہ خیالات پیہم گردش کرنے لگتے ہیں، باغیانہ روح ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقصد براری کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز وسائل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لاریب جب کسی قوم کے فکر و نظر پر پابندیاں عائد کر دی جائیں اور انسانی ذہن کو منجمد کر کے اسے اپنے کمالات ظاہر کرنے کا موقع نہ دیا جائے تو اسی وقت سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور ترقی کی رفتار آہستہ آہستہ بالکل رک جاتی ہے۔

ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ فکر و نظر کے دروازے کھلے ہوں اور ہر شخص کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہو۔ تاریخ ارتقائے عالم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش

سے بنی نوع انسان کی ترقی کا راز آزادیٔ فکر و عمل میں مضمر رہا ہے۔ ہمارے اوّلین اسلاف کا جو جنگلوں اور پہاڑوں کی کھوہوں میں زندگی بسر کرتے تھے، شب و روز جنگلی جانوروں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ ان خون خوار درندوں کے مقابلے میں وہ اسی لیے کامیاب ہو جاتے تھے کہ وہ ذہنی آزادی کے سبب ایسے ہتھیار ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ان جانوروں کے مقابلے میں کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اس کے بعد جب بنی نوع انسان کی پہلی جماعت جنگلوں اور پہاڑوں کی کھوہوں سے نکل کر دریائے نیل کے کنارے آباد ہوئی اور پہلی بار دنیا میں تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی گئی تو فطرتِ انسانی نے لوگوں کو ایسے نظام کی ضرورت کا احساس دلایا جس کے ذریعے سے امن و امان اور حریتِ عمل کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے بعض اصول و ضوابط مرتب کیے اور ہر شخص کے لیے ان پر عمل پیرا ہونا اور ان کا احترام کرنا لازم قرار دیا۔ جب ذہن انسانی نے ترقی کی مزید راہیں طے کیں اور قدرت کے بعض اور راز اس پر منکشف ہوئے تو انسانی ضمیر نے انگڑائی لی، انسان کے لیے غور و فکر کے راستے کھل گئے اور ان راستوں کی بدولت اس نے علم و ادب اور فنون تک رسائی حاصل کر لی۔ انسانی ذہن اسی طرح کبھی ترقی کی منازل طے کرتا اور کبھی تنزل کی راہوں پر قدم مارتا رہا۔ جب کبھی انسان نے عقل و خرد کا آزادانہ استعمال کیا ترقی نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چومے لیکن جب عقل پر جمود کی کیفیت طاری ہو گئی تو ترقی بھی رک گئی۔ آزادیٔ فکر و نظر کی بدولت عجیب و غریب ایجادیں عمل میں آئیں۔ انسان نے کائنات کو مسخر کرنے کے پروگرام تیار کیے۔ علم و عمل کی راہیں کھلیں۔ غرض ترقی کی منازل تیزی سے طے ہوتی رہیں اور انسان کہیں کا کہیں . . . . . جا پہنچا لیکن جب انسانی ذہن پر قیود عائد کر دی گئیں یا اس نے خود اپنے آپ پر عقل و فکر کے دروازے بند کر لیے تو کاروانِ انسانیت کے بڑھتے ہوئے قدم بھی رک گئے اور ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

یہی حال ایرانیوں اور رومیوں کا بھی ہوا۔ جب تک ان میں فکر و عمل کی آزادی برقرار رہی وہ ترقی کے زینے طے کرتے چلے گئے لیکن جب حریتِ فکر اٹھ گئی اور لوگوں کے ذہنوں پر پہرے بٹھا دیے گئے تو ترقی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور ان کی عظیم الشان تہذیب آہستہ آہستہ نابود ہونے لگی۔ خدائی قانون کے تحت ضروری تھا کہ ایک اور تہذیب ان مٹتی ہوئی تہذیبوں کی جگہ لے۔ یہ شرف ازل سے عربوں کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اللہ نے محمد مصطفیٰؐ کو اس غرض کے لیے چنا اور آپ کے ہاتھ

سے اس تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی گئی جس نے ایرانی اور رومی تہذیب و تمدن کی جگہ لے کر دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ رسول اللہ نے دنیا میں آکر بت پرستی اور آتش پرستی میں جکڑے ہوئے انسانوں کو ان بھاری زنجیروں سے نجات دلائی اور تلقین کی کہ اگر وہ اپنے لیے ترقی کی راہیں کھولنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ غور و فکر کو کام میں لائیں اور آسمان و زمین کی لاتعداد طاقتوں اور قوتوں کو مسخر کر کے انھیں اپنے فائدے کی خاطر استعمال کریں۔

رسول اللہ نے دنیا کے سامنے جو تعلیم پیش کی تھی وہ ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جنھوں نے سادہ لوح عوام کو پھانس کر انھیں بے بنیاد توہمات عقائد اور رسوم کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ بھلا کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے پیرو انھیں چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کریں۔ اس لیے انھوں نے آپ کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا اور سالہا سال تک آپ سے جنگوں میں مصروف رہے لیکن رسول اللہ کو اللہ کی طرف سے عزمِ راسخ عطا ہوا تھا۔ آپ نے نہایت پامردی سے اُن کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک میدانِ مبارزت میں موجود رہے جب تک اللہ نے اپنے دین کو کامل فتح عطا نہ فرما دی مشیتِ ایزدی یہی تھی کہ اللہ کے رسولؐ کی پیش کردہ تعلیم کو فروغ حاصل ہو اور وہ اپنی سادگی و پاکیزگی کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور رسول اللہ کی وفات سے پہلے ہی اسلام اقصائے عرب میں پھیل گیا اور سارے ملک سے بت پرستی کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

رسول اللہ ہی کے زمانے سے مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی حق و صداقت کی آواز بلند ہوئی اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا اور علم بردارانِ حق کو ان لوگوں کے ہاتھوں سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں جنھیں اپنی لیڈری ان آسمانی تحریکوں کے سامنے ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ حق و باطل کے درمیان یہ آویزش ابتدائے آفرینش سے اب تک جاری ہے۔

پھر بھی اس سلسلے میں ایک فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ انسانی ضمیر ابھی تک دورِ طفولیت سے گزر رہا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس کی جو حالت تھی کم و بیش وہی اب بھی ہے۔ اس دوران میں جنگہائے مرتدین اور عراق و شام کے سوا باقی جتنی جنگیں ہوئیں اُن کا مقصد تو کچھ اور تھا لیکن دنیا پر یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ جنگیں حریت، عدل و مساوات اور اخوت کے قیام کے لیے لڑی جا رہی

ہیں۔ سادہ لوح عوام ہمیشہ عدل و انصاف اور مساوات کا بلند بانگ دعویٰ کرنے والے لیڈروں کے دام تزویر میں پھنستے رہے۔ انھوں نے ایک خوش آئند مستقبل کے حصول کی خاطر لیڈروں کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو کر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور جانیں تک قربان کرنے سے نہ ہچکچائے۔

جنگوں کے اختتام پر لوگوں کو بجا طور پر یہ امید ہوتی تھی کہ ان سے کیے ہوئے وعدے پورے کیے جائیں گے اور جن اصولوں کے قیام اور بقا کی خاطر انھوں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ انھیں لباس عمل پہنایا جائے گا لیکن ہمیشہ ہی لوگوں کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا اور آخر ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کے لیڈروں اور حاکموں کے سامنے صرف ذاتی مفاد تھا اور اسی ذاتی مفاد اور مادی اغراض کے حصول کے لیے انھوں نے سیکڑوں ہزاروں جانیں میدان جنگ میں تلف کرا دیں۔ ان کے عدل و انصاف اور حریت و مساوات کے قیام کے وعدے جھوٹے تھے اور ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بیشتر جنگیں جو عدل و انصاف اور حریت و مساوات کے نام پر لڑی گئیں ان کا فائدہ صرف خود غرض، لالچی اور حریص لیڈروں کو پہنچا۔ انھوں نے ذاتی مطلب براری کے لیے عوام الناس کو جنگ کے شعلوں میں جھونکا اور ان کی لاشوں پر اپنے لیے عالی شان محل تعمیر کر لیے۔

عوام الناس کے بار بار دھوکا کھانے کی وجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ انسانی ضمیر ہنوز عالم طفلی میں ہے۔ بچہ جب چلنے کی کوشش کرتا ہے تو لڑکھڑاتا ہے اور بار بار زمین پر گرتا ہے لیکن باز نہیں آتا۔ ایک مرتبہ زمین پر گرنے کے بعد اٹھتا ہے پھر لڑکھڑاتا ہوا چلنے لگتا ہے۔ دوبارہ گرتا ہے پھر اٹھتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن یہی لغزشیں بچے کو توازن قائم کرنا سکھاتی ہیں اور آخر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ باقی نہیں رہتی اور وہ بالکل سیدھا ہو کر چلنے لگتا ہے۔ عالم طفلی سے نکل کر وہ جوانی کی عمر تک پہنچتا ہے اور جوانی کا زمانہ گزار کر بڑھاپے کی عمر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس طرح بچہ لڑکھڑانے اور بار بار منہ کے بل زمین پر گرنے کے باوجود اٹھنے اور دوبارہ چلنے سے باز نہیں آتا اور یہی لغزشیں آخر اس کی چال میں توازن پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں اسی طرح اقوام عالم کا حال ہے۔ فارس اور روم کی سلطنتوں کے اوندھے منہ زمین پر آگرنے سے انسانیت کو ایک زبردست دھکا لگا۔

لیکن یہی دھکا اس کے لیے باعثِ رحمت ثابت ہوا۔ اِن عظیم الشان سلطنتوں کی جگہ اسلامی سلطنت کی صورت میں دنیا کے لیے امن و راحت کا سامان پیدا ہو گیا اور انسانی ضمیر کو پختگی حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ اسلام نے آکر انسانیت کی لاج رکھ لی اور حریت و مساوات کا وہ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے جزیرہ نمائے عرب کو نبی آخر الزماں کی بعثت کے لیے کیوں چنا اور اس خطۂ زمین کو اپنے غیر مختتم الوار کے نزول کے لیے کیوں منتخب فرمایا؟

اس سوال کا قطعی اور یقینی جواب دینا تو ہمارے بس کی بات نہیں لیکن اقوامِ عالم کے سلسلہ عروج و زوال پر نظر ڈالنے سے ہمیں اس امر کا تھوڑا سا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کیوں اللہ نے اپنی مشیت سے جزیرہ نمائے عرب کو اس غرض کے لیے چنا۔

مصر، یونان، اشور اور روما کی سرزمین صدیوں سے انسانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ دنیا کے دوسرے خطوں میں علم و فضل اور تہذیب و تمدن کی جو روشنی نظر آ رہی تھی وہ سب انھیں علاقوں سے فیضان حاصل کرنے کا نتیجہ تھا۔ ان علاقوں میں عقل انسانی پختگی کی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ دوسرے ممالک کے لوگ اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اسی لیے فارس اور روم کی سلطنتیں اپنے زمانے میں دنیا بھر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ مگر عروج و زوال کے طبعی قوانین کے تحت آخر ان سلطنتوں پر بھی زوال آ گیا اور تہذیب و تمدن اور علم و شائستگی کے چراغ کی روشنی، جو صدیوں سے ایک عالم کو منور کر رہی تھی، آہستہ آہستہ مدہم پڑنی شروع ہو گئی۔ جزیرہ نمائے عرب ایران اور روم کے متصل واقع تھا۔ چونکہ یہ علاقے صدیوں سے تہذیب و تمدن اور علم و شائستگی کے مرکز تھے اس لیے ان میں کتنا ہی ضعف و اضمحلال راہ پا جاتا پھر بھی یہ امید کی جا سکتی تھی کہ اگر اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر مشتمل کوئی تعلیم ان کے سامنے پیش کی جائے گی تو وہ نہ صرف اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کریں گے بلکہ پہلے کی طرح اسے دوسرے علاقوں تک پہنچانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ خدائی نوشتوں میں جہاں ایران و روم کے زوال کی تفصیل مندرج تھی وہاں یہ بھی مذکور تھا کہ ان علاقوں کے بالکل متصل عرب کی آزاد و خود مختار سرزمین میں ایک جلیل المنزلت شخصیت مبعوث کی جائے گی جسے قبول کرنے میں دنیا کی نجات مضمر ہو گی،

عرب سے یہ تعلیم ایران اور روم کے علاقوں میں جائے گی اور وہاں سے دنیا بھر میں پھیلے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے اپنے نوشتوں کے مطابق عرب کی سرزمین میں اپنے پیغام بر کو مبعوث کیا اور کیا بھی اس شہر میں جو اپنے تقدس اور احترام کے لحاظ سے عرب کے تمام شہروں میں منفرد حیثیت رکھتا تھا۔

رسول اللہ نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دے کر اس کے سامنے انسانیت کی اعلیٰ قدریں متعین کر دی تھیں۔ عربوں کے قلوب فتح کرنے کے بعد آپ نے اپنی توجہ ایران اور روم کی طرف منعطف کی اور ان لوگوں کو اس شریعت غرا اور آسمانی تعلیم پر ایمان لانے کی دعوت دی جو ہر خطے کے لوگوں کے لیے یکساں مفید اور ہر زمانے کے تقاضوں کو یکسر پورا کرنے والی تھی۔ جب تک آپ زندہ رہے اعلائے کلمۃ الحق کے کام میں تن من دھن سے مصروف رہے اور اپنے بعد وفادار صحابہ کا ایک ایسا مقدس گروہ چھوڑ گئے جنھوں نے آپ کا مشن پورا کرنے اور اللہ کا پیغام اقصائے عالم تک پہنچانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

ابوبکرؓ کو اسی مقدس گروہ کی قیادت کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے فرائض جس تن دہی سے انجام دیے حق وصداقت کا بول بالا کرنے کے لیے جس جاں نشانی سے کام کیا اور تائید دین کی خاطر جن مہیب خطرات کا سامنا کیا انھیں ہم مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انھوں نے عشق الٰہی، حب رسولؐ، بے نفسی اور اخلاص و استقامت کے جو نمونے دکھائے ان کی نظیر پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے۔ یہ دلیل ہے اس امر کی کہ ان کی ذہنی پختگی کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اگر تمام انسانوں میں اسی طرح ذہنی پختگی پیدا ہو جائے تو لڑائیوں کا نام و نشان مٹ جائے اور دنیا بھر میں امن و امان اور سلامتی کا دور دورہ ہو جائے۔

لیکن ابھی یہ وقت دور ہے۔ لوگوں کی سرشت میں اب بھی یہ بات داخل ہے کہ جب ان سے ان کے آبائی عقائد اور رسم ورواج کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو خواہ وہ کتنی ہی مفید اور دل نشین کیوں نہ ہو، وہ ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اسے ماننے سے انکار کر دیں گے اور اپنے باپ دادا کے عقائد اور پرانے رسم ورواج پر قائم رہیں گے خواہ وہ کتنے ہی مضحکہ خیز اور بعید از عقل کیوں نہ ہوں۔ وجہ یہی ہے کہ ابھی تک ان کی ذہنی افتاد اس حد تک نہیں پہنچی جسے پختگی سے تعبیر کیا جا سکے

ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شور وغوغا کر کے اور خاندانی عزت و وجاہت کی دہائی دے کر حق وصداقت پر غالب آسکتے ہیں۔ ان کی حالت بالکل اس بچے کی سی ہوتی ہے جو شور وغل مچا کر اور چیخ پکار کر کے والدین سے اپنا کہا منوالیتا ہے لیکن جب ماں باپ دیکھتے ہیں کہ ان کا بچہ بے جا ضد کر رہا ہے اور اس کی بدتمیزیاں حد سے بڑھ رہی ہیں تو وہ اسے سرزنش کرتے ہیں اور بچہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ کے عہد میں بھی مرتدین نے اسلامی حکومت کے خلاف شورش برپا کر کے من مانی کرنی چاہی تھی لیکن ابوبکرؓ کی بروقت کارروائی سے یہ فتنہ بڑھنے نہ پایا اور جس طرح نافرمان بچے ماں باپ کی گوشمالی کے بعد ان کا کہا ماننے اور اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اسی طرح مرتد قبائل ابوبکرؓ کی جنگی کارروائی کی تاب نہ لا کر ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مرتدین کے استیصال سے عرب میں اسلام کا بول بالا تو ہو ہی چکا تھا، اللہ نے چاہا کہ ایران اور روم میں بھی اسلام کے درخت کی آب یاری کرے۔ اس غرض کے لیے اس نے صدہا برس پیشتر سے انتظام شروع کر دیا تھا اور اپنی خاص تقدیر کے تحت جزیرۂ عرب کے ہزاروں باشندوں کو ایران اور روم کے درمیان صحرائے شام میں آباد کر کے انھیں بطور بیج کے استعمال کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معجزہ ابوبکرؓ کے عہد میں رونما ہوا وہ دو متحارب طاقتوں کی باہمی آویزش کا ثمرہ نہ تھا بلکہ اس خدائی تقدیر کے تحت ظہور پذیر ہوا تھا۔ جسے بہرحال پورا ہو کر رہنا تھا اور جس کے پورا ہونے کے اسباب اللہ نے پہلے ہی سے مہیا کر دیے تھے۔ اگر جزیرہ نمائے عرب شام اور عراق کے متصل واقع نہ ہوتا، اگر عربی زبان ان قبائل کی زبان نہ ہوتی جو صدیوں سے صحرائے شام میں مقیم تھے، اگر اللہ عین اس وقت اپنے رسولؐ کو مبعوث نہ فرماتا جب زمین علم و عرفان کی پیاسی اور عالمِ نورِ حق کے لیے بے تاب تھا تو اس دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ نہ رومی اور ایرانی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذیب جلوہ گر ہو سکتی اور نہ آفتابِ ہدایت اقصائے عالم پر ضوفشاں ہو سکتا۔

جب خدائی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو اس کے لیے اسباب بھی مہیا ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کے ذریعے سے خدا کی تقدیر کا ظہور مقدر ہوتا ہے ان کی مخفی صلاحیتیں آپ سے

آپ ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ ابوبکرؓ، عمرؓ بن خطاب، خالدؓ بن ولید اور دیگر امرائے عساکر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسلامی سلطنت کی تشکیل انھیں لوگوں کے ذریعے سے ہوئی۔ لیکن کیا کوئی شخص خیال کر سکتا ہے کہ اگر اللہ کا ارادہ سرزمینِ عرب میں ایک حیرت انگیز معجزہ بروئے کار لانے کا نہ ہوتا تو بھی یہ لوگ ایسے ہی عظیم الشان کارنامے انجام دے سکتے جیسے اسلامی فتوحات کے وقت انجام دیئے؟ اگر اللہ کی مشیت کارفرما نہ ہوتی تو ابوبکرؓ کی حیثیت عام لوگوں میں ایک معمولی تاجر سے زیادہ نہ ہوتی جسے ہر وقت مال و دولت کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور قوم میں ان کا مرتبہ زیادہ سے زیادہ قبیلہ تیم بن مرہ کی سرداری سے بڑھ کر نہ ہوتا۔ اگر اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو خالدؓ بن ولید کی حیثیت بنی مخزوم اور قریش کے ایک معمولی بہادر آدمی سے زیادہ نہ ہوتی اور تاریخ میں ان کا نام کبھی سکندرِ اعظم، جولیس سیزر، ہنی بال، چنگیز خاں اور نپولین بوناپارٹ جیسے عظیم سپہ سالاروں کے ساتھ نہ لیا جاتا۔ اگر رسول اللہ کی بعثت نہ ہوتی تو عمرؓ بن خطاب کا شمار کسی گنتی میں نہ ہوتا اور امیر المومنین کی حیثیت سے جو عظیم الشان کام انھوں نے انجام دیے اور جس طرح ایران و روم کی سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا ان کا کہیں نام و نشان بھی نظر نہ آتا۔ آج اگر ان لوگوں کا نام تاریخ کے صفحات پر ابدی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور ان کے کارنامے درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں تو محض اس لیے کہ یہ لوگ اس مشیت کی عملی تصویر تھے جس کا ظہور ازل سے مقدر ہو چکا تھا۔

مخالفینِ اسلام اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ میں نے 'حیاتِ محمد' میں یہ ثابت کیا تھا کہ قرآنِ کریم جارحانہ جنگ کی مذمت کرتا ہے اور اسے کسی صورت میں بھی جائز نہیں ٹھہراتا۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا
(اے مومنو! اللہ کے راستے میں جہاد کرو لیکن یاد رکھو تمھیں صرف ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو تم سے لڑتے ہیں۔ تمھیں بطور خود جارحانہ جنگ چھیڑنے کی اجازت نہیں)۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے:

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ

علیکم واتقوا اللّٰہ واعلموا ان اللّٰہ مع المتقین۔

(جو قوم تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس سے اتنی ہی سختی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم سے کی تھی۔ اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے)۔

اسلام لوگوں کو صلح کی دعوت دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی غلطیوں پر عفو اور درگزر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ دشمن سے بھی نرمی کا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آزادیٔ رائے کا وہ سب سے بڑا علم بردار ہے اور مذہب و عبادات میں کسی قسم کی مداخلت وہ قطعاً برداشت نہیں کرتا۔

اسلام کی اس تعلیم کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اعلیٰ، بلند اور پاکیزہ اصولوں کی موجودگی میں ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو مرتدین سے جنگ کرنے کا حکم کیوں دیا اور عراق و شام کی فتوحات کس غرض سے کی گئیں؟ ابوبکرؓ اللہ اور رسول اللہ کے احکام کی دل و جان سے اطاعت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ خدائی احکام کی خلاف ورزی کا ان پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام اگرچہ رحمت و شفقت، عفو و درگزر اور صلح و آشتی کا داعی ہے پھر بھی وہ مسلمانوں پر یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ وہ اسلام کی اشاعت کے لیے جبر و تعدی کو کام میں نہ لائیں بلکہ انھیں اجازت دیتا ہے کہ جہاں ممکن ہو وہ اس غرض کے لیے سختی اور جبر سے بھی کام لیں اور اسی لیے مسلمانوں نے ملکوں اور شہروں پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کو تلوار کے زور سے اسلام میں داخل کیا؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک مرتدین کا تعلق ہے ابوبکرؓ نے ان سے خدائی احکام کے مطابق جنگ کی تھی جو اللہ نے سورۂ براءت میں نازل فرمائے ہیں:

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین ونفصل الآیات لقوم یعلمون۔ وان نکثوا ایمانہم من بعد عہدہم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انہم لا ایمان لہم لعلہم ینتہون۔

(اگر کافر توبہ کر لیں، نمازیں پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ تم ان سے مسلمانوں کا سا سلوک کرو۔ ہم اپنی آیات گوش و ہوش رکھنے والی قوم کے

لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں لیکن اگر وہ عہد شکنی کریں اور دین اسلام میں طعنہ زنی کریں تو ان ائمہ کفر سے لڑو کیونکہ ان کی قسمیں ذرا بھی اعتبار کے لائق نہیں۔ شاید اسی طرح یہ شرارتوں سے باز آجائیں۔)

اس لیے جب مرتدین عہد شکنی کر کے کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلے میں آگئے اور دینِ اسلام پر طعنہ زنی شروع کر دی تو خدائی حکم کے مطابق ان سے لڑنا ضروری ہو گیا۔

اسی طرح جب ابوبکرؓ نے ایران اور روم کی طرف اسلامی فوجیں روانہ کیں تو بھی انھوں نے خدائی احکام سے سرِمو تجاوز نہ کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کی بقا کے لیے جنگ و جدل بہ ہر حال ضروری ہے اور جب تک تلوار کے ذریعے سے قوموں کو زیر نہ کیا جائے اسلام کے اعلیٰ اور بلند مقاصد پورے ہو ہی نہیں سکتے۔ بات یہ ہے کہ انسانی ضمیر چونکہ ان دنوں عالمِ طفلی میں سے گزر رہا تھا اس لیے اسے راہِ راست پر لانے اور تربیت دینے کے لیے مناسب حال طریقے استعمال کیے گئے کہیں ملامت اور نرمی سے سمجھایا گیا اور کہیں سختی و درشتی سے۔

مسلمانوں نے جب اسلام کے تابندہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیے تو وہ اس امر سے غافل نہ تھے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے اس وقت تک کاملاً پورے نہیں ہو سکتے جب تک انسانی ضمیر پختگی کی حد کو نہ پہنچ جائے۔ اس بات کی تکمیل کے لیے ابھی ہزاروں سال چاہئیں۔ اسلام چونکہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس لیے اس نے ان کی فلاح و بہبود کے لیے جو راستہ تجویز کیا ہے وہ ان کے حالات کے عین مطابق ہے۔ اس راستے پر چلنے سے انسان آہستہ آہستہ منزلِ مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ اسلام کی مثال اس باپ کی سی ہے جو بچے کی تربیت کے وقت اس کی جسمانی نشوونما اور ساخت کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔ وہ کبھی اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور اس سے کبھی یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ بچپن کی حالت میں جوانوں کی طرح کام کرے گا۔ تربیت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ باپ کبھی تو اپنے بچے کی معصوم خواہشات کا احترام کرتے ہوئے انھیں قبول کر لیتا ہے لیکن بعض اوقات جب وہ دیکھتا ہے کہ اس طرح بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو وہ انھیں رد بھی کر دیتا ہے اور بچے کی ناراضی کی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح کبھی تو وہ پیار و محبت سے بچے کی تربیت کرتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ پیار اور محبت کا سلوک بچے پر اثر انداز نہیں ہوتا تو وہ اس کی

گوش مالی کرنے سے دریغ نہیں کرتا لیکن ہر حال میں اُس کے پیشِ نظر بچے کی بھلائی ہی ہوتی ہے۔ وہ اگر پیار اور محبت کرتا ہے تو بچے کے فائدے اور اصلاح کی خاطر، اور ڈانٹتا اور گوشمالی کرتا ہے تو بھی بچے کے فائدے اور اصلاح کی خاطر۔ یہی حال اسلام کا بھی ہے۔ وہ ضمیرِ انسانی کو تدریجاً پختگی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اِس غرض کو پورا کرنے کے لیے وہ سب سے پہلے والدین کی طرح اس کی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اسے کبھی محبت اور پیار سے کام چلانا پڑتا ہے اور کبھی سختی کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے لیکن ہر حال میں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اس منزل کے قریب ہوتا چلا جائے جو اس کے لیے متعین کر دی گئی ہے اور ان اعلیٰ اقدار کو پالے جو اس کا منتہائے مقصود ہیں اور جن کا ذکر بالتفصیل کلام اللہ میں کر دیا گیا ہے۔

انسانی ضمیر پر بسا اوقات جمود کی حالت بھی طاری ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نشوونما بالکل رُک چکی ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں مسلمانوں کے ادبار اور پستی کی وجہ یہی ہے کہ طبعی قوانین کے مطابق اِنسانی ضمیر پر جمود کی حالت طاری ہو چکی ہے لیکن جمود کی یہ حالت ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رہ سکتی۔ یقیناً ایسا وقت آئے گا جب یہ حالت ختم ہو گی، انسان کی مخفی صلاحیتیں ایک بار پھر بیدار ہوں گی اور انسانی ضمیر آہستہ آہستہ پختگی کی آخری حد تک پہنچ جائے گا۔ یہ حالت خواہ صدیوں بعد پیدا ہو، بہر حال پیدا ضرور ہو گی۔ یہی وہ دن ہو گا جب انسان اخلاق کے اس بلند ترین مرتبے تک پہنچ جائے گا جس کا اسلام اس سے تقاضا کرتا ہے۔ زمین پر ہر طرف امن و سلامتی . . . . کا دور دورہ ہو گا اور بنی نوع اِنسان کی باہمی کدورت و شکر رنجی یکسر مفقود ہو جائے گی۔

لیکن یہ صورتِ حال جبھی پیدا ہو گی کہ کل روئے زمین کے لوگ آسمانی آواز پر کان دھر کر اللہ کی بادشاہی میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ انسانی ضمیر جبھی حدِ کمال کو پہنچ سکتا ہے کہ زمین کا چپہ چپہ اللہ کے نور سے معمور ہو جائے۔ اگر زمین کا ایک گوشہ تو آسمانی نور سے حصہ پالے لیکن باقی حصے بدستور ضلالت و گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈھکے رہیں تو منافشات اور جنگ و جدل کا سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ اس صورتِ حال کا مداوا کرنے کے لیے ہر زمانے میں ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں گے جو ابوبکرؓ کے نقشِ قدم پر چل کر انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کا کام انجام دیں گے اور جس طرح والدین اور اُستاد ہر ممکن طریقے سے اپنے بچوں اور شاگردوں کی تربیت کرتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی بنی نوع

انسان کی تربیت کے لیے مناسب حال طریقے استعمال کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

انسانی ضمیر نے حدِکمال کو پہنچنے کے لیے اب تک جو ترقی کی ہے اس میں بڑا اثر اسلامی تعلیمات کا ہے اور آئندہ بھی وہ ترقی کی منازل اسی وقت طے کر سکے گا جب وہ اسلام کی پیش کردہ تعلیمات کو اپنا لے۔ یہ وقت یقیناً آئے گا اور زمین کا گوشہ گوشہ اللہ کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔

ہم یہ بات محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کہہ رہے بلکہ مغربی مفکرین بھی غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شا کا ایک حوالہ پیش کرتے ہیں جسے پڑھنے سے ہماری رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ برنارڈ شا لکھتا ہے:

"محمدؐ کے پیش کردہ دین کو ادیانِ عالم میں بہت ہی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ دیگر ادیان کے برعکس اس دین میں دائماً زندہ رہنے کی حیرت انگیز قوت موجود ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اپنے اندر مختلف طریقہ ہائے حیات کو سمو لینے کی اہلیت اور بنی نوعِ انسان کے ہر طبقے کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ ۔ ۔ کہ یورپ میں بھی اسے روز بروز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ جہالت و تعصب کے باعث ازمنۂ وسطیٰ میں اسلام کو انتہائی بھیانک صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام یسوع مسیح کا سب سے بڑا دشمن ہے لیکن میں محمدؐ کو انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتا ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ اگر آج بھی دنیا کو محمدؐ کی خو بو رکھنے والے کسی شخص کی خدمات میسر آ جائیں تو بنی نوعِ انسان کی تمام مشکلات یکسر کافور ہو سکتی ہیں اور زمین میں امن و امان اور خوش بختی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ آج زمانے کو انھیں چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

"انیسویں صدی عیسوی میں کارلائل اور گبن جیسے جلیل القدر مفکرین نے اسلام کو حقائق و انصاف کی کسوٹی پر پرکھا اور جو نتائج اخذ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے ان کی بنا پر یورپ والوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اور انھوں نے اسلام پر ہمدردانہ نظر سے غور و فکر کرنا شروع کیا۔ موجودہ بیسویں صدی

میں تو اسلام کے متعلق اہلِ یورپ کے نقطۂ نظر میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی ہے
اور نفرت وعداوت کی جگہ اسلام کی محبت نے لے لی ہے۔ اس رفتار کو دیکھتے ہوئے
کچھ تعجب نہیں کہ اگلی صدی تک اسلام پورے طور پر اہلِ یورپ کے دلوں میں گھر کر جائے
اور اسے وہ نجات کا ذریعہ سمجھ کر جوق در جوق اس میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

"میری اپنی قوم اور یورپ کے دیگر ممالک کے متعدد اشخاص اسلام قبول کر چکے
ہیں اور اب یہ بات بلا شک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ یورپ کے کلیتہً اسلام قبول
کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے[1]"

برنارڈ شا کے علاوہ دنیا کے اور بھی بڑے بڑے مفکرین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق
انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ انسانی ضمیر آہستہ آہستہ تکمیل مدارج
طے کر رہا ہے اور یہ مقدر ہو چکا ہے کہ جلد یا بدیر دنیا آلام ومصائب کے چکر سے نجات حاصل کر کے
قرار واقعی امن وسکون حاصل کرے۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آرہے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ چکی
ہیں۔ باشندگانِ ارض کو میل ملاپ کی جو سہولتیں آج میسر ہیں ایسی پہلے کبھی نہیں ہوئیں، چھاپا خانوں
کی بدولت کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے اور کسی بھی علم وفن اور مذہب وملت کے
متعلق کتابوں کا دستیاب ہونا دشوار امر نہیں رہا صحافت، جو خیالات وعقائد کی اشاعت کا
سب سے موثر ذریعہ ہے، عروج پر ہے۔ ریڈیو اور ٹیلیفون کے ذریعے سے سات سمندر پار کی خبریں
پل بھر میں لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ سب سامان اس یومِ موعود کو نزدیک تر لانے کے لیے کیے جا
رہے ہیں جب ساری دنیا کا ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی دین جو فضائیں آج جنگ کے
نعروں سے گونج رہی ہیں وہ کل امن وسلامتی کے ترانوں سے معمور ہوں گی اور جہاں اس وقت
تعصب اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں وہاں آفتابِ اسلام طلوع ہو کر ہر قسم کی
تاریکی دور کر دے گا۔

اس صبح درخشاں کا ظہور کب ہوگا اور آفتابِ سعادت کب جلوہ دکھائے گا؟ گو ہمارے

---

[1] کلمات برنارڈ شا۔ ماخوذ از رسالہ نور الاسلام نمبر ۴ صفحہ ۵۷۲۔ ۱۳۵۳ھ

ظاہری اندازوں کے مطابق یہ وقت ابھی دُور ہے پھر بھی اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ یہ دن ہمارے لیے قریب تر آجائے۔ اس دن انسان اپنے اوج کمال کو پہنچ جائے گا۔ عدل وانصاف، رحم وشفقت، بر وتقویٰ سے زمین بھر جائے گی۔ ہر شخص اپنے بھائی کا خیر خواہ ہو گا۔ تمام اقوام بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیش آئیں گی۔ منافست کا جذبہ بالکل مفقود ہو جائے گا۔ کوئی قوم دوسری قوم پر للچائی ہوئی نظر نہ ڈالے گی بلکہ ترقی کی راہ میں چھوٹی بڑی اقوام ایک دوسری کے دوش بہ دوش گامزن نظر آئیں گی۔

اس دور کا انسان جب پچھلے زمانے پر نظر دوڑائے گا تو اسے جنگ وجدل، قتل وغارت، خونریزی وسفاکی، عیاری ومکاری اور ظلم وتعدی کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ وہ حیرت واستعجاب سے بنی نوع انسان کے ان کارناموں کو دیکھے گا جو انھوں نے شخصی مفاد اور ذاتی اقتدار کی خاطر انجام دیے اور یہ کارنامے انجام دیتے ہوئے انھوں نے اخوت ومحبت، عدل وانصاف اور رحمت وشفقت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سنگ دلی اور ناانصافی کو شعار بنا لیا۔ اپنے آبا واجداد کی یہ کارستانیاں دیکھ کر اس کا دل بے اختیار ان پر نفرین بھیجنے کو چاہے گا لیکن یکایک اس کی نظر ابوبکرؓ کے نہایت مختصر مگر انتہائی درخشاں دورِ حکومت پر پڑے گی اور وہ مبہوت ہو کر پکار اُٹھے گا:

"اللہ کی ہزاروں برکتیں اور رحمتیں ہوں اس مقدس اور پاک باز انسان پر جس نے اپنی ساری عمر رسول اللہ کی رفاقت اور اسلام کی اشاعت میں صرف کر دی۔ وہ ضعیف تھا لیکن دین کی راہ میں اس نے عدیم المثال استقامت کا ثبوت دیا۔ وہ غریب تھا لیکن اللہ کے راستے میں اپنا ایک ایک پیسا خوش دلی سے خرچ کر دیا۔ اس کے راستے میں سنگ گراں حائل تھے مگر اس کے پائے استقلال میں خفیف سی بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور وہ اسلام کی کشتی کو خوفناک طوفانوں اور مہیب چٹانوں سے صحیح سلامت نکال کر لے گیا۔"

ابوبکرؓ کے کارناموں کو آنے والی کوئی بھی نسل فراموش نہ کر سکے گی اور قیامت تک ان پر سلام بھیجنے والے پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ ہم بھی ان کی مقدس ومطہر روح پر ہزاروں سلام بھیجتے ہوئے ان کا مبارک تذکرہ ختم کرتے اور اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم میں پھر صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور خالدؓ سیف اللہ جیسے صف شکن، اولوالعزم اور پہاڑ کی مانند مستقل مزاج انسان پیدا کر دے جن کی اس وقت اسلام کی کشتی کو کھینے کے لیے اشد ضرورت ہے۔

کتبہ محمد ظریف عباسی لاہور
۲۵-۱۱-۹۰

عربی ماخذ

کتاب	مصنف
الجامع لاحکام القرآن	ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی
جامع البیان فی تفسیر القرآن	ابو جعفر محمد بن جریر طبری
تاریخ الرسل والملوک	ابو جعفر محمد بن جریر طبری
تاریخ الیعقوبی	احمد بن ابو یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح الکاتب العباسی
سیرۃ سیدنا محمد رسول اللہ	ابو محمد بن عبدالملک بن ہشام
الطبقات الکبیر	محمد بن سعد کاتب الواقدی
تاریخ ابن خلدون	عبدالرحمان بن محمد بن خلدون
الکامل فی التاریخ	عزیزالدین ابوالحسین علی محمد بن ابوالکرم الشیبانی المعروف بہ ابن اثیر
وفیات الاعیان	ابن خلکان، شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن علی بن ابی بکر الشافعی
فتوح البلدان	احمد بن یحیٰی بن جابر بلاذری
فتوح الشام	محمد بن عمر واقدی
فتوح الشام	ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ ازدی بصری
الفتوحات الاسلامیہ بعد مضی الفتوحات النبویۃ	سید احمد بن سید زینی دحلان
الاغانی	ابوالفرج اصفہانی علی بن حسین القرشی الاموی
الامامۃ والسیاسۃ، عیون الاخبار، المعارف	ابو محمد عبداللہ بن قتیبہ دینوری

کتاب	مصنف
الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام	قطب الدین محمد بن احمد المکی الحنفی المعروف بالنہروانی
مروج الذہب ومعادن الجوہر	ابوالحسن علی بن حسین بن علی المسعودی
الاتقان فی علوم القرآن	عبدالرحمٰن بن ابی بکر جمال الدین السیوطی
کتاب المصاحف	ابوداؤد الحافظ ابوبکر عبداللہ بن ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی
تاریخ القرآن	ابوعبداللہ الزنجانی
اشہر مشاہیر الاسلام	رفیق العظم بک
بیت الصدیق	محمد توفیق البکری
فجر الاسلام	احمد امین بک
خلفاء محمد	عمر ابوالنصر
عمرو بن العاص	حسن ابراہیم حسن
دائرۃ المعارف الاسلامیہ	
دائرۃ معارف القرآن العشرین	فرید وجدی

لہریں —— حماقتیں —— مزید حماقتیں

۱/۵۰ ۳/- ۳/-

اردو کے مشہور و مقبول ترین افسانہ نگار شفیق الرحمان کے ہنستے مسکراتے، افسانوں اور خاکوں کے یہ تین مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ "شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے"۔ ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور

سنگ و خشت —— شیشہ و تیشہ

۱/۵۰ ۱/۵۰

کنہیا لال کپور کے طنز کے تیروں اور مزاح کی پھلجھڑیوں سے معمور مضامین اور خاکوں کے یہ دو مجموعے ہماری معاشرتی، ادبی اور اخلاقی زندگی کو بے نقاب کرنے میں مثال نہیں رکھتے۔ کپور کے مضامین میں ظرافت ہے، زندگی ہے، گہما گہمی ہے۔

مصنفہ: قرۃ العین حیدر

میرے بھی صنم خانے

تین روپے
پہلی قیمت: چھ روپے

قرۃ العین حیدر اردو میں ایک بالکل نئے اسلوبِ نگارش کی موجد ہیں۔ ان کا یہ ناول اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے کرداروں کی ذہنی زندگی کی ایسی مؤثر تصویریں کھینچی گئی ہیں کہ یہ کردار پڑھنے والوں کے دوستوں کی طرح دل و دماغ میں بس جاتے ہیں اور ان کی یاد اسی طرح دلوں میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے جس طرح دوستوں کی یاد —" ان کرداروں کے صبح و شام کا مرقع جس سچائی اور چابکدستی سے کھینچا گیا ہے یقیناً داد کا مستحق ہے۔" —— فیض

دیوانِ غالب

دیوانِ غالب اردو کی سب سے مقبول کتاب ہے۔ آج بھی اکثر لوگ غالب کو اردو کا سب سے اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ میری لائبریری میں اب اس اردو کے مقبول ترین شاعر کے اردو کلام کے واحد مجموعے دیوانِ غالب کا صحیح ترین نسخہ بے داغ طباعت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ دس بیس روپے کی بجائے یہی نسخہ صرف سوا دو روپے میں مل جائے۔

رہبن پریس ، لاھور